BNHS401DCT

تاریخ ہندوستان

(1526 تا 1707 عیسوی)

History of India

(1526–1707 CE)

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

چوتھا سمسٹر (تاریخ)

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

Copyright © 2026, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-687130-6-2
Course : History of India (1526 –1707 CE)
First Edition : July, 2026
Copies : 3500
Price : 230/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**, Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Editorial Board/Editors

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**
Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Dr Syed Meer Abul Hussain
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Mr Mohd Aasim
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Dr Ikramul Haque
Asst. Professor, Dept. of History, MANUU

Dr Zeyaul Haque
Asst. Professor, CAS, Dept. of History, AMU

Dr Daud Ibrahim
Asst. Prof. (Cont.), Dept. of History, MANUU

Dr Khursheed Ahmad Bhatt
Asst. Prof. of History (Cont.) Lucknow Campus, MANUU

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Dept. of History & Culture, JMI

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Dept. of History, MANUU

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies, Dept. of History, AMU

Prof. Danish Moin
Dept. of History, MANUU

Prof. Alauddin Khan
Head, Dept. of History, Shibli National College

Dr Samana Zafar
Associate Professor, Dept. of Woman Studies, MANUU

Dr Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (Cont.), CDOE, MANUU
(Language Editor)

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu),
CDOE, MANUU

Mr P Habibulla
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (Cont.),
CDOE, MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE, MANUU

Shaik Ismail
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone Number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by **Mr. Mohd Aasim**, CDOE, MANUU, Hyderabad, Telangana
Printed at: **Print Time & Business Enterprises**, Hyderabad, Telangana

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	6
پیغام	ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	7
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر (تاریخ)	8

اکائی نمبر	اکائی کا نام	مصنف	صفحہ نمبر
بلاک I	**ہندوستان میں مغل حکمرانی کا آغاز**		
1	سولہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات	جناب سعید احمد	9
2	مغل سلطنت کا قیام: بابر اور ہمایوں	ڈاکٹر اکرام الحق	22
3	سور خاندان: شیر شاہ اور اس کا نظم و نسق	جناب محمد عاصم	39
بلاک II	**مغل سلطنت: توسیع اور نظم و نسق**		
4	اکبر اور اس کے کارنامے	ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	59
5	جہانگیر اور شاہجہاں	جناب سعید احمد	82
6	اورنگزیب	جناب محمد عاصم	102
7	مراٹھوں کا عروج	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	130
8	مغلوں کے ماتحت دکن	جناب محمد عاصم	145
9	مغل نظم و نسق: مرکزی اور صوبائی	پروفیسر علاؤالدین خان	160
بلاک III	**مغل دور میں ہندوستانی معیشت**		
10	زرعی معیشت	ڈاکٹر ضیاء الحق	182
11	غیر زرعی معیشت	ڈاکٹر ضیاء الحق	194

12	تجارت اور کاروبار: یورپی تجارتی کمپنیاں	جناب محمد عاصم	210
بلاک IV	**مغل دور میں سماج اور ثقافت**		
13	سماجی تشکیل: امراء، زمیندار، علماء اور خواتین	ڈاکٹر سمانہ ظفر، ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	227
14	فن تعمیر اور مصوری	پروفیسر علاؤالدین خان	244
15	زبان، ادب اور مخلوط ثقافت	پروفیسر علاؤالدین خان	261
16	مذہب	ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا، ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	280
	تجویز کردہ اکتسابی مواد		297
	نمونہ امتحانی پرچہ		301

مصنفین کی تفصیلات

(Writers' Details)

Mr. Said Ahmad Research Scholar, Dept. of History & Culture, JMI	**جناب سعید احمد**، شعبہ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Dr Ikramul Haque Asst. Professor, Dept. of History, MANUU	**ڈاکٹر اکرام الحق**، شعبہ تاریخ، مانو، حیدرآباد
Mr Mohd Aasim Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**جناب محمد عاصم**، سی ڈی او ای، مانو، حیدرآباد
Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha** Associate Professor (History), CDOE, MANUU	**ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا**، سی ڈی او ای، مانو، حیدرآباد
Dr Syed Meer Abul Hussain Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**ڈاکٹر سید میر ابوالحسین**، سی ڈی او ای، مانو، حیدرآباد
Dr. Mansoor Ahmad Siddiqui Asst. Prof., Dept. of Ancient History and Culture, Gandhi Faiz-E-Aam (P.G.) College, Shahjahanpur	**ڈاکٹر منصور احمد صدیقی**، شعبہ قدیم تاریخ وثقافت، گاندھی فیض عام کالج، شاہجہانپور
Prof. Alauddin Khan Head, Dept. of History, Shibli National College	**پروفیسر علاؤالدین خان**، شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
Dr Ziaul Haque Asst. Professor, CAS, Dept. of History, AMU	**ڈاکٹر ضیاء الحق**، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Dr Samana Zafar Associate Professor, Dept. of Women Studies, MANUU	**ڈاکٹر سمانہ ظفر**، شعبہ تعلیم نسواں، مانو، حیدرآباد
Dr. Khanday Pervaiz Ahmad Asst. Professor, Dept. of History, MANUU	**ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد**، شعبہ تاریخ، مانو، حیدرآباد

پروف ریڈرس (Proof Readers)

اول : جناب محمد عاصم

دوم : ڈاکٹر سید میر ابوالحسین

فائنل : ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا

ٹائٹل پیج(Title Page): ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ A+ حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری/گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات واطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہوگا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم وتدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلامعاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو/ہندی/انگریزی/عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی اوای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدر آباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی اوای، مانو

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب۔ کورس 'تاریخ ہندوستان (1526 تا 1707 عیسوی)' میں خوش آمدید۔ این ای پی-2020 کے تقاضوں کے مطابق تاریخ کے مضمون پر یہ خود اکتسابی مواد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے ان طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے جو چار سالہ یو جی پروگرام کے سمسٹر چہارم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس میں، آپ سولہویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات سے لے کر مغل سلطنت کے قیام اور اس کے عروج کا مطالعہ کریں گے۔ آپ بابر اور ہمایوں کے دور، شیر شاہ سوری کے شاندار نظم ونسق، اور اکبر سے لے کر اورنگزیب تک مغل سلطنت کی توسیع اور استحکام کو سمجھیں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ مغلوں کے مرکزی اور صوبائی نظم ونسق، زرعی اور غیر زرعی معیشت، تجارت، اور یورپی تجارتی کمپنیوں کی آمد کا جائزہ لیں گے۔ مزید برآں، یہ کورس آپ کو مغل دور کے سماجی ڈھانچے (امراء، زمیندار، علماء اور خواتین کی حیثیت)، فن تعمیر، مصوری، زبان وادب کی ترقی، اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں مغلوں کے تعاون کو سمجھنے میں مدد دے گا، ساتھ ہی یہ مرہٹوں کے عروج اور دکن میں مغلوں کی پالیسیوں کا بھی احاطہ کرے گا۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد وخواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

اکائی 1۔ سولہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات

(Political Conditions in India during 16th Century)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 سولہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات

1.2.1 سکندر لودی

1.2.2 ابراہیم لودی

1.2.3 بابر

1.2.4 ہمایوں

1.2.5 شیر شاہ سوری

1.2.6 شیر شاہ کے جانشین

1.2.7 جلال الدین محمد اکبر

1.3 دکن

1.3.1 تلوا خاندان

1.3.2 اراویڈو خاندان

1.4 مالوہ

1.5 گجرات

1.6 بنگال

1.7 آہوم

1.8 اکتسابی نتائج

1.9 کلیدی الفاظ

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.0 تمہید (Introduction)

سولہویں صدی کا ہندوستان عبوری دور کا حامل ہے۔اس دور میں کسی ایک طاقتور مرکزی حکومت کے بجائے مختلف علاقوں میں مختلف حکومتیں موجود تھیں جن کے ہندوستان کی سرزمین پر دوررس اثرات پڑے۔آج بھی ان کے نقوش بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔اس صدی میں شہروں کے ارتقا کے ساتھ ہی صنعت اور تجارت کا فروغ ہوااور سماجی ڈھانچہ میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں۔لیکن یہ تمام تبدیلیاں کئی صدیوں تک شمالی ہندوستان یایوں کہئے کہ جوگنگا کے میدانوں تک منحصر رہے۔سولہویں صدی لودی حکومت، مغل سلطنت، سوری سلطنت اور علاقائی حکومتوں کی کش مکش کا زمانہ تھا۔اس دور میں جہاں لودی، سور اور مغل شمالی ہند میں تھے اسی طرح ملک کے دیگر علاقوں میں متعدد علاقائی حکومتوں کا قیام تھاجو ہر لحاظ سے اپنے علاقوں کو ترقی دے رہی تھیں اور ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس اکائی میں آپ لودیوں، سوریوں اور ابتدائی مغلوں کے علاوہ گجرات، بنگال، وجے نگر اور آہوم (آسام) کی سلطنتوں کو جانیں گے اور ان کے آپسی تعلقات سے بھی واقف ہوں گے۔سماج میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ یہ حکومتیں کس طرح کام کررہی تھیں؟کاروباری سرگرمیوں میں ان کا کیا کردار تھا؟ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے ذریعہ جاننے کی کوشش کریں گے ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشان دہی کرسکیں گے۔تجارت اور صنعت کی ترقی سے شہر کاری کا عمل کس طرح متاثر ہوااور سیاسی حالات پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا اندازہ لگاسکیں گے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- لودی حکومت اور مغل سلطنت کے قیام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- شیر شاہ سوری اور دوسری افغان سلطنت کا مختصر تجزیہ کرسکیں گے۔
- گجرات، بنگال، وجے نگر اور آہوم حکومتوں سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- علاقائی حکومتوں کے اہم سیاسی کردار کو جان سکیں گے۔
- اس دور کی اہم سیاسی تبدیلیوں کا تجزیہ کرسکیں گے۔

1.2 سولہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی حالات

(Political Conditions of India in the Sixteenth Century)

1.2.1 سکندر لودی (Sikander Lodi, 1489 –1517)

سولہویں صدی میں شمالی ہند میں سب سے اہم سلطان سکندر لودی تھا جو گجرات کے محمود بیگھڑااور میواڑ کے رانا سانگا کا ہمعصر تھا۔سکندر لودی نے دہلی کی حکومت کو ان دونوں طاقتوں کی طرف سے دہلی پر منڈلاتے خطرے سے نمٹنے اور آئندہ کشمکش کے لیے مضبوط

کیا۔انہوں نے ان افغان سرداروں کو بھی کسی حد تک دبانے یا قابو میں رکھنے کی کوشش کی جو قبائلی آزادی اور خود مختاری کا شدید احساس رکھتے تھے اور سلطان کو کچھ برابر حیثیت والوں میں صرف پہلا مان لینے کے عادی تھے۔ سکندر نے امراء کو اپنے سامنے کھڑے رہنے پر مجبور کیا تاکہ اس کی اعلی حیثیت اور اقتدار کا اثر ان کے دلوں پر بیٹھ جائے۔ جب کوئی فرمان یا شاہی حکم پہنچتا تھا تو شہر کے تمام امراء کو اسے اعزاز واحترام کے ساتھ وصول کرنے شہر سے باہر آنا پڑتا تھا۔اس طرح سکندر نے اپنے امراء کے ذہن میں سلطان کی اعلی حیثیت کو مستحکم انداز میں قائم کر دیا۔ جن جن امراء کے پاس جاگیریں تھیں انھیں پابندی سے ان کا سالانہ حساب پیش کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی روپئے پیسے میں غبن یا کسی قسم کی بد عنوانی کرتا تھا تو اسے بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ بہر حال اپنے امراء پر مکمل گرفت قائم کر لینے کے سلسلے میں سکندر لودی کو صرف محدود کامیابی نصیب ہوئی۔اپنی موت کے وقت بہلول لودی نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور عزیزوں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن سکندر نے بڑی سخت جدوجہد کے بعد اس تقسیم کو ختم کر دیا تھا لیکن افغان سرداروں کے دماغ میں سلطنت کی تقسیم کا خیال بہر طور باقی تھا۔

سکندر لودی اپنی حکومت میں ایک چست اور مستعد انتظامیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عدل وانصاف پر وہ بہت زور دیتا تھا اور سلطنت کی ساری شاہراہوں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ تمام ضروریات زندگی کی قیمتیں کافی کم تھیں۔ سلطان نے زراعت میں بھی گہری دلچسپی لی۔اس نے اناج پر محصول ختم کر دیا اور گز کا ایک نیا پیمانہ رائج کیا جسے گز سکندری کہا جاتا تھا جو مغل عہد تک جاری رہا۔ جو لگان کھاتے اس کے دور میں تیار کیے گئے تھے بعد میں شیر شاہ سوری کے زمانے میں انہی کی بنیاد پر لگان کھاتے تیار کیے گئے۔ سکندر لودی کو ایک قدامت پرست بادشاہ مانا گیا ہے۔اس نے ان تمام کاموں پر مسلمانوں کے لیے پابندی لگادی۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ دوبارہ عائد کیا اور ایک برہمن کو اس لیے قتل کروادیا کہ اس کا ماننا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مقدس کتابیں یکساں طور پر قابل احترام ہیں۔ اپنی فوجی مہموں کے دوران اس نے کئی مشہور ومعروف مندروں کو بھی منہدم کروادیا جیسے نگر کوٹ کا مندر وغیرہ۔

سکندر لودی نے عالموں، فلسفیوں اور دانشوروں کو بہت قیمتی عطیات سے نوازا جس کی وجہ سے عرب اور ایران سمیت ہر سمت اور ہر ملک کے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ لوگ اس کے دربار میں بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ سلطان کی کوششوں سے سنسکرت کی بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔اسے موسیقی میں بھی دلچسپی تھی چنانچہ سنسکرت کی موسیقی پر کچھ نادر اور نایاب کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کروایا گیا۔اسی دور میں بہت بڑی تعداد میں ہندوؤں نے فارسی سیکھی اور انہیں بہت سے انتظامی عہدوں پر مقرر کیا گیا۔اس طرح سے اس کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی مصالحت یا قربت کا ماحول متواتر آگے بڑھتا رہا۔ سکندر لودی نے دھولپور اور گوالیار کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ان فوجی مہموں کے دوران احتیاط سے سروے کروا کر اور گفت وشنید کے بعد 1506ء میں آگرہ کو مرکز کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہیں سے دوآب کے باغی امراء پر بھی گرفت رکھنا آسان تھا۔ کچھ عرصے میں آگرہ ایک بڑا شہر ہو گیا اور اسے ہی لودیوں کا دوسرا پایہ تخت بنادیا گیا۔ سکندر لودی کی دلچسپی متواتر مشرقی راجستھان میں بڑھ رہی تھی جس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ پہلے اس نے ناگور کے خان کو اپنی حفاظت میں لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ رنتھمبور اپنی وفاداری کا الحاق مالوہ کے بدلے دہلی سلطنت سے کر لے۔اس کا جانشین ابراہیم لودی تو میواڑ کے خلاف ایک فوجی مہم بھی لے کر گیا جو پسپا کر دی گئی۔ مالوہ میں رانا کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کی فوج کے آگرہ اور بیانا

کی طرف بڑھنے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی تھی کہ میواڑ اور لودیوں کے درمیان ٹکراؤ کے امکانات مستقبل میں بڑھ رہے تھے۔ اگر بابر نے اس بیچ مداخلت نہ کی ہوتی تو اس ٹکراؤ کے نتائج کیا ہوتے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔

1.2.2 ابراہیم لودی (Ibrahim Lodi, 1517–1526)

یہ سکندر لودی کا بیٹا تھا۔ اس کی دو بار تاج پوشی ہوئی۔ سرداروں کے ایک گروپ نے ابراہیم کے بھائی جلال خاں کو جونپور کا حکمراں بنا کر حکومت کو تقسیم کر دیا، لیکن بعد میں ابراہیم نے اسے شکست دے دی۔ ابراہیم لودی 1517ء میں میواڑ کے رانا سانگا سے ختولی کی جنگ میں شکست کھا گیا۔ ابراہیم نے گوالیار کے حکمراں وکرم دتیہ کو شکست دے کر گوالیار کو سلطنت میں ملا لیا۔ وکرم دتیہ بھی پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر سے شکست کھا کر میدان جنگ میں مارا گیا۔ تاریخ خان جہانی و مخزن افاغنہ کے مصنف نعمت اللہ کے مطابق میدان جنگ میں مرنے والا وہ دلی سلطنت کا پہلا سلطان تھا۔ سولہویں صدی میں شمالی ہند میں مغل سلطنت کا قیام ہوا جو کہ بابر کا حیرت انگیز کارنامہ تھا۔

1.2.3 بابر (Babur, 1526–1530)

مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو اس کے وسطی ایشیائی وطن فرغانہ سے دشمن ازبکوں نے نکال باہر کیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر 1526ء میں علاقوں اور وسائل کی تلاش میں ہندوستان آیا۔ بابر نے ابراہیم لودی اور رانا سانگا کو شکست دے کر بنگال کی سرحد تک پورے شمالی ہند پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس نے آگرہ اور دیگر مقامات پر کئی باغ اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔ 1530 میں جب اس کا انتقال ہوا تو اسے آگرہ میں دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر خود اس کے تعمیر کیے ہوئے باغ میں دفن کیا گیا۔ بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کابل پہنچا دی گئی اور وہاں بابر ہی کے تعمیر کردہ باغ میں دفن کر دی گئی۔

1.2.4 ہمایوں (Humayun, 1556–1530)

بابر کا بیٹا ہمایوں باپ کی طرح شریف، نیک اور رحم دل تھا۔ میدان جنگ میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ باپ کے ساتھ بیشتر لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پانی پت اور کنواہہ کی جنگ میں تھا۔ آگرہ اسی نے فتح کیا تھا، لیکن سست اور آرام طلب تھا اور اپنی فوج اور سرداروں کو وہ بابر کی طرح پوری طرح قابو میں نہیں رکھ سکا۔ اس کے ابتدائی چند سال کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اس نے افغانوں کو لکھنؤ کے پاس شکست دے کر مشرق کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ایک باغی سردار نے جب گجرات کے سلطان بہادر شاہ کو شکست دے کر 1535ء میں مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں نے بنگال کا رخ کیا جہاں ایک افغان سردار شیر خاں قابض ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے بنگال کے دارالحکومت کو آسانی سے فتح کر لیا لیکن وہ آرام طلبی کا شکار ہو گیا۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا حریف شیر خاں صلاحیت، بہادری اور جفاکشی میں دوسرا بابر ہے۔ شیر خاں نے اس کی واپسی کے سب راستے بند کر دیئے۔ اور جب ہمایوں گھبرا کر واپس ہوا تو شیر خاں نے چوسا کے مقام پر اس کو شکست دی، اس کے بعد دوسری شکست فاش قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے دی۔ ہمایوں نے اپنی جان بڑی مشکل سے بچائی۔ ہمایوں اب آگرہ کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا لیکن شیر خاں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے اب ملک چھوڑنے ہی میں عافیت

سمجھی۔اس کے دو بھائی کامران اور عسکری کابل چلے گئےاور تیسرا بھائی ہندال قندھار چلا گیا۔ ہمایوں نے کچھ مدت سندھ میں قیام کیا۔اس کے بعد وہ بھی 1545ء میں قندھار کے راستے ایران چلا گیا۔تاکہ ایران کے فرمانرواشاہ طہماسپ سے مدد حاصل کر سکے۔ ہمایوں تقریبادو سال ایران میں رہا۔قزوین کے قریب شاہ طہماسپ سے اس کی ملاقات ہوئی اور طہماسپ نے اس خواہش کے تحت تیرہ ہزار سواروں سے ہمایوں کی مدد کی کہ وہ شیعہ عقیدہ اختیار کر لے گااور بارہ اماموں کے نام خطبے میں شامل کر دیگا۔ ہمایوں نے ایرانی فوجیوں کی اس مدد سے 1545ء میں قندھار اور کابل واپس لے لیے جن پر اس کے بھائی عسکری اور کامران قابض ہو گئے تھے، لیکن دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اس کو دس سال اور انتظار کرنا پڑااور یہ اس وقت ہی ممکن ہواجب شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

1.2.5 شیر شاہ سوری (Sher Shah Suri, 1545–1540)

شیر شاہ تاریخ کے ان لوگوں میں سے ہے جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بادشاہت تک پہونچا۔بلند حوصلہ رکھنے والے لوگوں کے لیے شیر شاہ کی زندگی ایک نمونہ ہے۔اس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ صوبہ بہار میں سہسرام کے علاقے کے جاگیر دار کا بیٹا تھا۔ یہ علاقہ اس زمانہ میں دہلی کے لودی بادشاہوں کے قبضہ میں تھا۔شیر خاں بڑاہونے کے بعد جونپور چلا گیا جو اس زمانہ میں علم وادب کا بہت بڑامرکز تھا۔ یہاں اس نے عربی اور فارسی کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سہسرام واپس آگیااور باپ کی موت کے بعد اپنی جاگیر کا اتنا اچھاانتظام کیا کہ اس کی دور دور شہرت ہو گئی۔اس نے اپنے علاقے سے چوری، ڈکیتی، رہزنی ختم کر دی۔کاشتکاروں پر محصول لینے والے جو ظلم کرتے تھے اس کا خاتمہ کر دیا۔اس کے اس انتظام سے پیداوار بڑھ گئی اور لوگ خوش حال ہو گئے۔اس نے جوانی میں اپنی تلوار سے شیر کو مارا تھا،اس لیے اس کو شیر خان کا لقب ملا۔ شیر خاں اپنی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا کہ اسی زمانہ میں بابر نے دہلی پر قبضہ کر کے لودی حکومت کا خاتمہ کر دیااور مغلوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ شیر خاں اگرچہ صرف ایک جاگیر کا مالک تھا۔ لیکن اس کو اپنی قابلیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع ملا تو ایک دن مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔ایک مرتبہ وہ بابر کی ایک دعوت میں شریک ہوا۔ کھانے میں ایک ایسی چیز بھی تھی جسے چھری سے کاٹ کر کھانا ہوتا تھا۔ شیر خاں کے پاس دستر خوان پر کوئی چھری نہیں تھی لیکن اس نے چھری مانگنے کے بجائے کمر سے پیش قبض نکالا اور کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ بابر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔شیر خاں کی یہ جرأت وہمت دیکھ کر بابر کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ جوانمرد اس کی حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، چنانچہ بابر نے اپنے وزیر کو ہدایت کر دی کہ شیر خاں خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے اس پر نظر رکھی جائے۔ بابر کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ شیر خاں اس دعوت کے بعد سہسرام واپس آگیااور جب بابر کا انتقال ہو گیا تو اس نے صوبہ بہار اور بنگال پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد ہمایوں سے لڑائیاں شروع ہو گئیں جس میں ہمایوں کو شکست ہوئی اور شیر خاں نے سلطنت پر قبضہ کر کے شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ شیر شاہ نے لاہور اور سرگودھا تک ہمایوں کا تعاقب کیا۔اس کی فوجوں نے ملتان اور سندھ پر بھی قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے ہمایوں کو ایران جا کر پناہ لینی پڑی۔اس کے بعد شیر شاہ اجمیر، چتوڑ اور مالوہ پر قابض ہو گیااور اس طرح ایک ایسی سلطنت کا حکمراں بن گیا جو لودی سلطنت سے بڑی اور خلجی سلطنت کے برابر تھی۔ شیر شاہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ ایک توپ کا گولہ پھٹنے سے اس کا انتقال ہو گیا۔

1.2.6 شیر شاہ کے جانشین (Successors of Sher Shah)

شیر شاہ پٹھانوں کے قبیلے سور سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے لیکن سوری خاندان کی یہ حکومت زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ نہ تو شیر شاہ کے جانشیں لائق ثابت ہوئے اور نہ اس کے پٹھان امراء جو حکومت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ شیر شاہ کے بعد صرف اس کے لڑکے اسلام شاہ نے کامیابی سے نو سال حکومت کی۔ اسلام شاہ کے بعد اس کا لڑکا فیروز بارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا، لیکن اس کا ماموں مبارز خاں اس کو قتل کر کے محمود شاہ عادل کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ پنجاب میں شیر شاہ کے بھتیجے سکندر شاہ نے بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ محمد شاہ سوری نے بنگال میں اور دوسرے سرداروں نے بہار اور دہلی میں تخت کے دعوے شروع کر دیے۔ ہمایوں نے جب ہندوستان کے حالات کو پراگندہ پایا، تو موقع سے فائدہ اٹھایا اور کابل کی طرف سے حملہ کر دیا۔ نومبر 1554ء میں اس نے پشاور پر اور فروری 1555ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکندر شاہ سوری نے سرہند کے قریب مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور جولائی 1555ء میں ہمایوں دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس طرح ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ لیکن ابھی وہ اپنی حکومت کو مستحکم نہیں کر پایا تھا کہ فتح دہلی کے چند ماہ بعد وہ دہلی میں اپنے کتب خانہ کے زینے سے گر کر 24 جنوری 1556ء کو انتقال کر گیا۔

1.2.7 اکبر (Akbar, 1605–1556)

ہمایوں کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا اکبر دہلی میں نہیں تھا۔ وہ اپنے اتالیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں باقی ماندہ افغانوں کے خلاف کارروائی میں مصروف تھا۔ جب ہمایوں کے انتقال کی خبر ملی تو بیرم خاں نے وہیں ضلع گورداسپور کے ایک گاؤں کلانور میں اکبر کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ ہمایوں اگرچہ دہلی پر قابض ہو گیا تھا لیکن سوری افغانوں کی طاقت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ ہمایوں کے انتقال کے بعد عادل شاہ سوری کے ہندو سپہ سالار ہیمو نے آگرہ اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ پانی پت کے تاریخی میدان جنگ میں جہاں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تھی، اکبر اور ہیمو کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اکبر کی فوج نے جس کی قیادت بیرم خاں کر رہا تھا ہیمو کو شکست فاش دی اور اس کو قتل کر دیا گیا اور دہلی اور آگرہ پر ایک بار پھر تیموری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اکبر سندھ کے امرکوٹ میں 1542ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اسی پریشانی کی حالت میں اکبر پیدا ہوا۔ اکبر جس وقت کلانور میں تخت نشیں ہوا تو اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اکبر کی نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام کئی سال تک اس کے قابل اور وفادار اتالیق بیرم خاں نے سنبھالا۔ اس کی کوششوں سے چند سال ہی میں اکبر کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور 1560ء میں جب اکبر نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی حکومت اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ ملک کی صوبائی حکومتوں کے خلاف فوجی کارروائی کر سکے۔ چنانچہ اکبر نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو تیزی سے بڑھانا شروع کر دیا۔ فتوحات کا یہ کام زیادہ تر اس کے سپہ سالاروں نے انجام دیا، لیکن اکبر خود بھی ایک اچھا فوجی اور سپہ سالار تھا۔ وہ جفاکشی اور سخت کوشی میں بابر سے کم نہیں تھا۔ اکبر نے ایک ایک کر کے شمالی ہند کی ان تمام حکومتوں کو ختم کر دیا جو سلطنت دہلی کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ اکبر کی فوجوں نے 1564ء میں مالوہ، 1569ء میں راجپوتانہ، 1573ء میں گجرات، 1575ء میں بنگال اور پھر

کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ 1591ء میں سندھ 1592ء میں اڑیسہ اور 1595ء میں بلوچستان اور قندھار پر بھی تیموری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

1.3 دکن (Deccan)

شمالی ہند پر قبضہ ہو جانے کے بعد اکبر نے دکن کا رخ کیا۔ دکن میں خاندیس کی فاروقی ریاست اور احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کی سرحدیں مغل سلطنت سے ملتی تھیں۔ ان میں خاندیس کے حکمراں راجا علی خاں فاروقی نے اکبر کی طاقت کا اندازہ کر کے پہلے ہی دہلی کی بالادستی قبول کر لی تھی لیکن احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور راجا علی فاروقی کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا بہادر خاں بھی اکبر کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ اکبر نے 1600ء میں برہان پور اور قلعہ اسیر گڑھ فتح کر کے خاندیس میں فاروقی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور احمد نگر فتح کر کے برار اور احمد نگر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن احمد نگر کے جنوب مغرب کا علاقہ نظام شاہیوں کے قبضہ میں رہ گیا۔ اکبر نے کل پچاس سال حکومت کی اور اس عرصہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو وسعت میں تقریباً دہلی کی سلطنت کے برابر تھی۔ سولہویں صدی میں شمالی ہند میں مذکورہ بالا حکومتیں تھیں تو جنوبی ہند میں تلوا خاندان اور اس کے بعد اراویدو خاندان نے حکومت کرنے کی کوشش کی۔

1.3.1 تلوا خاندان (Tuluva Dynasty)

1505ء میں نرسا نایک کے لڑکے ویر نرسنگھ نے عمادی نرسنگھ کو قتل کیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ ویر نرسنگھ نے سلوا خاندان کا خاتمہ کیا اور تلوا خاندان کی بنیاد رکھی۔ ویر نرسنگھ نے اپنی رعایا کی بھلائی میں دلچسپی لی۔ ویر نرسنگھ کی موت کے بعد کرشنا دیورائے حکمراں بنا۔ ویر نرسنگھ نے اپنی گھڑ سوار فوج کو طاقتور بنانے کے لیے پرتگالی گورنر المیڈا سے پرتگالیوں کے ذریعہ گھوڑوں کو خریدنے کے لیے ایک سمجھوتہ کیا۔

کرشنا دیورائے (Krishnadeva Raya)

کرشنا دیورائے وجے نگر کا سب سے عظیم حکمراں تھا۔ 1509ء میں بیدر کے سلطان محمود شاہ نے بیجاپور کے عادل شاہ کے ساتھ مل کر وجے نگر پر حملہ کیا، لیکن انہیں شکست ہوئی اور اس جنگ میں یوسف عادل شاہ مارا گیا۔ 1512ء میں کرشنا دیورائے نے بیجاپور کو شکست دے کر پورے رائے چور دوآب کو فتح کر کے اسے وجے نگر ریاست میں ملا لیا۔ 1520ء میں اس نے بیجاپور کے سلطان اسماعیل عادل شاہ کو رائے چور میں پھر شکست دی۔ اس لڑائی میں پرتگالی فوج بھی شریک تھی۔ باغیوں کا خاتمہ کر کے 1513ء میں اڑیسہ کے گجپتی حکمراں پرتاپ رودر دیو سے ادے گیری، تلنگانہ، وارنگل، راجمندری وغیرہ فتح کر کے اپنی ریاست کی توسیع کی۔ پرتاپ رودر دیو نے اپنی لڑکی کی شادی کرشنا دیو رائے سے کر دی۔ اس عظیم فتح کی خوشی میں کرشنا دیورائے نے ایک وجے استمبھ (منارہ ظفر) تعمیر کروایا۔ کرشنا دیو نے گلبرگہ اور بیدر پر حملہ کر کے بہمنی سلطان محمود شاہ کو قید سے آزاد دلائی اور اسے بیدر کے تخت پر بیٹھایا جس کے بعد اس نے 'یون راج استھاپنا چاریہ' کا لقب اختیار کیا۔ اس کے علاوہ اس کے وزیر تمارا سونے گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ کو شکست دی۔ کرشنا دیورائے کے پرتگالیوں سے اچھے تعلقات تھے اور اس نے گوا فتح کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس نے پرتگالیوں سے معاہدہ کیا کیونکہ وہ گھوڑوں کی تجارت پر اجارہ داری رکھتے تھے اور وجے

نگر کی طرح بہمنی سلطنت کے دشمن تھے۔پرتگالی گورنر البقرق نے 1510ء میں فادر لوئی کی صدارت میں ایک تجارتی مشن وجے نگر بھیجا۔کرشنادیورائے نے اس پرتگالی مشن کو بھٹکل میں ٹھکانہ بنانے کی اجازت دی۔

اچیوتادیورائے (Achyutadeva Raya)

کرشنادیورائے کے بعد اس کے مقرر کردہ جانشیں اچیوتادیورائے کی تاج پوشی تروپتی مندر میں ہوئی۔اس نے وزیر رام رائے کے ساتھ مل کر حکومت کی۔اس کے دور حکومت میں حکومت کی باگ دوڑ ترومال نامی دو بھائیوں کے ہاتھ میں تھی جو اچیوتا کے سالے تھے۔اچیوتا دیورائے نے مہامنڈلیشور نامی افسر کو مقرر کیا۔پرتگالی سیاح اور گھوڑوں کے تاجر نونیز نے اس کے دور حکومت میں سفر کیا۔

سداشیو (Sadashiva Raya)

سداشیو تلوا خاندان کا آخری اور برائے نام حکمراں تھا۔ حقیقی اقتدار وزیر رام رائے کے ہاتھ میں تھا۔رام رائے نے فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی اور پرتگالیوں کے ساتھ کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں جیسا رویہ اپنایا۔رام رائے نے دکن کی سلطنتوں کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھایا۔1558ء میں رام رائے نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے ساتھ مل کر احمد نگر کو لوٹا۔ جلد ہی دکنی سلطنتیں رام رائے کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی کو سمجھ گئیں۔ برار کو چھوڑ کر دیگر چار بہمنی ریاستوں (بیجاپور، گولکنڈہ،احمد نگر اور بیدر) نے وجے نگر کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔بیجاپور کا علی عادل شاہ اس اتحاد کا قائد تھا۔ برار اس اتحاد میں گولکنڈہ سے دشمنی کے سبب شامل نہیں ہوا۔ جنوری 1565ء میں حسین نظام شاہ کے ماتحت متحدہ فوج نے تالی کوٹا کی جنگ میں وجے نگر کی فوج کو بری طرح شکست دی۔وجے نگر کی فوج کا سپہ سالار رام رائے جنگ میں کام آیا۔اس جنگ کے ساتھ ہی جنوب میں وجے نگر کے شاندار دور کا خاتمہ ہو گیا۔

1.3.2 اراویڈو خاندان (Aravidu Dynasty)

تالی کوٹا کی جنگ کے بعد رام رائے کے بھائی ترومال نے وجے نگر کی جگہ پر پنو گونڈا کو اپنی راجدھانی بنایا۔اس نے تلوا خاندان کے سداشیو کو برخواست کر کے 1570ء میں اراویڈو خاندان کی بنیاد ڈالی۔ترومال کو زوال پذیر وجے نگر ریاست کو بحال کرنے والا بھی کہا جاتا ہے۔ترومال کے بعد اس کا لڑکا وینکٹ ثانی حکمراں بنا۔وینکٹ ثانی نے راجدھانی پینگونڈا سے چندر گری منتقل کر دی۔وینکٹ کا اسپین کے حکمراں فلپ سے رابطہ تھا۔1598ء میں وینکٹ نے عیسائی پادریوں کا اپنے دربار میں استقبال کیا۔اسے فن مصوری میں دلچسپی تھی۔

1.4 مالوہ (Malwa)

سولہویں صدیء میں مالوہ میں خلجی حکومت کا دور تھا۔یہ ایک قسم کی علاقائی حکومت تھی اس کا سب سے مشہور حکمراں محمود خلجی اول تھا جس نے مالوہ کو ایک عظیم ریاست میں تبدیل کیا

ناصرالدین شاہ (Nasiruddin Shah)

اس نے 1500ء سے 1510ء تک مالوہ پر حکومت کی۔ یہ ایک خود سر اور عیاش حکمراں تھا۔اس کا تعمیر کردہ محل بعد میں باز بہادر اور رانی روپ متی کا محل کہلایا۔اس نے حبشی اور ترک غلاموں کی ایک فوج بھی منظم کی تھی۔

محمود خلجی ثانی (Mahmood Khalji II)

محمود ثانی مالوہ کا آخری حکمراں تھا۔اس نے باغی امیروں کو کچلنے کے لیے چندیری کے راجپوت حکمراں میدنی رائے کو اپنا وزیر متعین کیا۔ محمود کو چتوڑ کے حکمراں رانا سانگا نے شکست دی۔1513ء میں گجرات کے حکمراں بہادر شاہ نے مانڈو پر حملہ کر کے محمود ثانی کو شکست دی اور مالوہ کو گجرات میں ملالیا اور اس طرح مالوہ ریاست کی خود مختاری ختم ہو گئی۔1535ء میں جب ہمایوں نے گجرات فتح کیا تو مالوہ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا، لیکن جلد ہی اس کے ہاتھ سے نکل کر شیر شاہ کے قبضے میں چلا گیا۔اسلام شاہ سور کی موت کے بعد مالوہ کے گورنر باز بہادر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ بالآخر اکبر نے باز بہادر کو شکست دے کر مالوہ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ باز بہادر کے خلاف اکبر کی مہم کی قیادت ادہم خاں نے کی۔ باز بہادر نے اکبر کی ماتحتی قبول کر کے دو ہزار کا منصب قبول کیا۔ باز بہادر اعلی پیمانے کا موسیقار بھی تھا۔

1.5 گجرات (Gujarat)

گجرات کو سب سے پہلے 1297ء میں علاءالدین خلجی نے فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کیا۔اس کے بعد ایک صدی تک گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ تیمور کے حملہ کے بعد 1401ء میں یہاں کے صوبہ دار نے ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔

احمد شاہ (Ahmad Shah)

گجرات بڑا زرخیز اور آباد صوبہ تھا۔ یہاں تقریباً دو صدیوں کے عرصہ میں کئی بادشاہ ہوئے جنہوں نے ملک کو ترقی دی۔ان میں ایک احمد شاہ تھا۔احمد آباد کا مشہور شہر اسی نے آباد کیا۔اس زمانہ میں احمد آباد میں 300 محلے تھے اور ہر محلہ میں ایک مسجد اور ایک بازار تھا۔اس شہر کے بازار اتنے کشادہ تھے کہ دس گاڑیاں ایک ساتھ گزر سکتی تھیں۔ عمارتیں زیادہ تر اینٹوں اور چونے کی تھیں۔ جب شہر بن گیا تو بادشاہ نے شہر کے مکان اور دوکانیں لوگوں کو بغیر کسی معاوضہ کے دے دیں۔احمد آباد اس وقت سے آج تک گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔احمد شاہ نے گجرات ریاست کو بڑی وسعت دی اور جوناگڑھ اور سورت فتح کیے۔ وہ جب کوئی علاقہ فتح کرتا تھا تو ہر شہر میں ایک مسجد، ایک سرائے اور ایک مدرسہ تعمیر کرتا تھا۔احمد شاہ کے عدل وانصاف کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے۔اس کے داماد نے ایک آدمی کو بغیر کسی قصور کے قتل کر دیا۔ جب احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے قتل کے جرم میں داماد کو سولی دے دی۔ جب اس سے کہا گیا آپ خون بہا دے سکتے تھے تو اس نے کہا، اس طرح رعایا کے خون کو امراء اور شہزادے جائز سمجھ لیں گے۔ اپنے خزانوں سے خون بہا دیتے رہیں گے اور خون کرتے رہیں گے۔

محمود بیگڑہ (Mahmud Bigada)

احمد شاہ اگرچہ بہت اچھا بادشاہ تھا لیکن گجرات کا سب سے مشہور بادشاہ محمود بیگڑہ (1458 تا 1511) ہوا ہے۔ اس نے 52 سال حکومت کی اور اپنے زمانہ حکومت میں گجرات کے ساحلوں سے بحری قذاقوں کا خاتمہ کر دیا اور کئی شہر آباد کیے محمود بیگڑہ نے بڑی قابلیت اور انصاف سے حکومت کی۔ وہ شریعت کا پابند تھا اور وعدہ کا پکا تھا۔ اس کی شہرت یورپ تک ہو گئی تھی اور دہلی کے سلطان سکندر لودی نے اس کو تحفے بھیجے۔ محمود بیگڑہ مسلم حکومتوں سے لڑنا اچھا کام نہیں سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کا انتقال ہوا تو امراء نے مالوہ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کی اسلام میں یہ جائز نہیں کہ مسلمان مسلمان سے لڑیں اور ایک ہمسایہ ملک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر چڑھ دوڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے کہا ہماری ماں سندھ کی رہنے والی ہے اور ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے ننھیال پر حملہ آور ہوں۔ محمود بیگڑہ نے مسافروں کے آرام کے لیے سرائیں، طلباء کے لیے مدرسے اور مسلمانوں کے لیے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کا دربار علما فضلاء سے بھرا رہتا تھا۔ گجرات پر 1573ء میں مغلوں نے قبضہ کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

1.6 بنگال (Bengal)

بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا تھا۔ شروع میں یہاں کے تین صوبہ داروں نے تین حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ یہ حکومتیں مشرقی بنگال، شمالی بنگال اور مغربی بنگال پر مشتمل تھیں۔ مشرقی بنگال کی حکومت کا بانی فخر الدین مبارک شاہ تھا۔ کتاب الرحلہ کا مصنف ابن بطوطہ اسی کے زمانے میں بنگال آیا تھا اور مشرقی بنگال کے دار الحکومت سنار گاؤں اور سلہت تک گیا تھا۔ سنار گاؤں ڈھاکہ کے قریب تھا۔ ابن بطوطہ نے بنگال کی زرخیزی اور ارزانی کی بہت تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک بنگال کے برابر سستا نہیں۔ فخر الدین مبارک شاہ کے بارے میں اس نے لکھا ہے کی وہ بڑا فاضل بادشاہ ہے اور پردیسیوں اور صوفیوں سے محبت رکھتا ہے۔ سولہویں صدی میں بنگال میں حسین شاہی خاندان کا عروج تھا

حسین شاہی خاندان

علاء الدین حسین شاہ اور اس کے بیٹے نصرت شاہ کا زمانہ بنگال کے سیاسی عروج اور تمدنی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں بہار، اڑیسہ اور آسام کا ایک حصہ بھی بنگال کی حکومت کے تحت آگیا تھا۔ لکھنوتی، بنگال کا دار الحکومت تھا۔ اس شہر اور دوسرے مقامات پر مساجد اور دوسری شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جو بنگال کے طرز تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ علماء کی سرپرستی کی گئی اور رفاہ عام کے کام انجام دیے گئے۔ ایک چینی سیاح نے اس زمانے کے بنگال کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کی پیداوار وافر اور باشندے خوشحال ہیں۔ ہندو اور مسلم دونوں ہی اپنے معاملات میں راستباز اور فراخ دل ہیں۔ نصرت شاہ کے حکم پر سنسکرت کی مشہور رزمیہ داستان مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے زمانے میں بنگالی زبان میں پہلی مرتبہ کتابیں لکھیں گئیں۔ مالادھر بسو نے حسین شاہ اور نصرت شاہ کے نگرانی میں بھگوت گیتا کا ترجمہ شری کرشن وجے نام سے

بنگلا زبان میں کیا۔ حسین شاہ اور نصرت شاہ نے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، چنانچہ اس دور کا ایک ہندو شاعر لکھتا ہے کہ نصرت شاہ کا باپ ایک عظیم بادشاہ تھا اور ملک پر ایک دوسرے رام کی طرح حکومت کرتا تھا۔ حسین شاہ نے ہندوؤں کے لیے نرم پالیسی اپنائی اور انہیں اعلیٰ عہدے دیے۔ حسین شاہ کے وزیر گوپی ناتھ تھے اور روپ اور سناتن نامی دو ویشنو بھائی اس کے اہم افسر تھے۔ حسین شاہ نے اپنے ہمنام جونپور کے شکست خوردہ شرقی سلطان کو لودیوں کے خلاف پناہ دی، اس لیے اسے سکندر لودی سے جنگ کرنی پڑی۔ حسین شاہ نے خلیفۃ اللہ کا لقب اپنایا۔ حسین شاہ نے راجدھانی ایکدلا منتقل کی۔ ہندوؤں کے لیے ہمدردی اور انصاف کے سبب اس کو کرشن کا اوتار مانا جاتا ہے۔ بابر نے حسین شاہ کو سید کہا ہے۔ نصرت شاہ نے فن تعمیر میں خوب دلچسپی دیکھائی۔ اس نے گوڑ میں بڑا سونا مسجد اور قدم رسول مسجد بنوائی۔ بابر نے نصرت شاہ کو گھاگھرا کی لڑائی میں شکست دی۔ شیر شاہ سوری نے آخری حکمراں غیاث الدین محمود کو ہرا کر 1538ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔

1.7 آہوم (Ahom)

آہوم قوم بارہویں صدی میں آج کے میانمار کے علاقے سے ہجرت کر کے برہم پتر وادی میں پہنچے۔ انہوں نے یہاں کے پرانے سیاسی نظام، بھوئیاں، (زمینداروں) کو کچل کر ایک ریاست بنائی۔ سولہویں صدی کے درمیان انہوں نے 1523 میں چھوٹیاؤں کی ریاست کو 1581 میں کوچ ہاجو کی ریاست کو اپنی ریاست میں شامل کیا اور بہت سے قبیلوں کو مطیع بنالیا۔ آہوموں نے ایک بڑی ریاست قائم کر لی اور اس کے لیے انہوں نے 1530ء کے دہوں سے ہی بارودی ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیے تھے۔ 1660ء تک تو یہ بہت اعلی درجے کا بارود اور توپیں بنا سکتے تھے۔ بہر حال آہوموں کو جنوب مغرب کی طرف سے بہت سے حملے برداشت کرنے پڑے۔ 1662 میں میر جملہ کی قیادت میں مغلوں نے اہوم ریاست پر حملہ کیا۔ پوری بہادری سے مدافعت کرنے کے باوجود آہوم ہار گئے۔ مگر اس علاقے پر مغلوں کا براہ راست تسلط زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا۔

آہوم ریاست جبریہ مزدوری پر قائم تھی۔ ریاست کے لیے جبریہ مزدوری کرنے والوں کو 'پیک' کہا جاتا تھا۔ آبادی کی مردم شماری کی گئی تھی۔ ہر گاؤں کو باری باری جبریہ مزدوروں کی ایک متعینہ تعداد بھیجنی ہوتی تھی۔ بہت زیادہ گنجان آبادی والے علاقوں سے لوگوں کو بکھری ہوئی آبادی والے علاقوں کی طرف منتقل کیا جاتا تھا۔ اس طرح آہوم خاندانی گروہ یا گوتر ٹوٹ گئے۔ سترھویں صدی کے پہلے نصف زمانے تک انتظامیہ میں کافی مرکزیت آگئی تھی۔ جنگ کے دوران لگ بھگ سارے جوان مرد فوجی خدمت انجام دیتے تھے۔ دوسرے وقتوں میں یہ لوگ باندھ بناتے، آبپاشی کے منصوبوں کی تعمیر کرتے اور دوسرے عوامی کام انجام دیتے تھے۔ اہوموں نے چاول کی کاشت کے نئے طریقے شروع کیے۔ آہوم سماج خیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان میں کاریگروں کی ذاتیں کم تھیں اور ان کے کاریگر پاس پڑوس کی ریاستوں سے آتے تھے۔ خیل عام طور پر کئی گاؤں پر گرفت رکھتا تھا۔ کسان کو گاؤں کا سماج زمین دیتا تھا۔ سماج کی مرضی کے بغیر بادشاہ بھی اس زمین کو کسان سے واپس نہیں لے سکتا تھا۔ شروع میں آہوم لوگ اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بہر حال تیرہویں صدی کے پہلے نصف حصے میں برہمنوں کا اثر بڑھا۔ برہمنوں اور مندروں کو بادشاہوں نے زمینیں دیں۔ سب سنگھ کے دور حکومت میں یہاں کی زیادہ تر آبادی کو زبردستی ہندو بنالیا گیا۔

آہوم بادشاہوں نے ہندو مذہب قبول کر لینے کے بعد بھی اپنے روایتی عقیدوں کو نہ چھوڑا۔آہوم سماج بہت مہذب سماج تھا۔شاعروں اور عالموں کو زمینی عطیات دیے جاتے تھے۔ناٹکوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ سنسکرت کی اہم کتابوں کا مقامی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔تاریخی کتابیں جنہیں 'برنجی' کہا جاتا تھا، پہلے آہومی میں اور پھر آسامی میں لکھی گئیں۔

1.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ سولہویں صدی میں ہندوستان کا سیاسی نقشہ کافی منقسم تھا جہاں ملک کے مختلف علاقوں میں متعدد علاقائی ریاستیں قائم تھیں۔ شمال میں لودی سلطنت، جونپور کی شرقی سلطنت کو ختم کر کے دہلی سلطنت کی وراثت کا دعویٰ کر رہی تھی اور سکندر لودھی کے عہد میں ہندوستان کی سب سے طاقتور ریاست تھی۔ شمال مشرق میں حسین شاہ اور نصرت شاہ کے تحت بنگال سلطنت اپنے عروج پر تھی جب کہ شمال بعید میں اہوم، آسام میں اپنی ریاست قائم کر چکے تھے۔ مغرب میں راجستھان میں رانا سانگا کی قیادت میں راجپوت طاقت کو غلبہ حاصل تھا اور وہ لودی سلطنت اور آس پڑوس کی ریاستوں کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ گجرات اور مالوہ میں بھی آزاد سلطنتیں قائم تھیں۔ دکن میں بہمنی سلطنت سے ٹوٹ کر بننے والی بیجاپور، احمد نگر، برار، خاندیش اور گولکنڈہ ریاستوں کو عروج حاصل تھا، جب کہ جنوب بعید میں کرشن دیورائے کی قیادت میں وجے نگر سلطنت جنوب کی سب سے طاقتور ریاست بن کر ابھری۔اسی دوران ہندوستان میں مغلوں کی آمد ہوئی۔ مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو اس کے وسطی ایشیائی وطن فرغانہ سے دشمن ازبکوں نے نکال باہر کیا تھا۔اس نے سب سے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر 1526ء میں علاقوں اور وسائل کی تلاش میں ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کی۔ بابر کے جانشیں نصیر الدین ہمایوں نے سلطنت کی سرحدوں کی توسیع کی لیکن افغان قائد شیر شاہ سوری کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اسے جلا وطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمایوں نے ایران کے صفوی حکمران شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ شیر شاہ نے ہندوستان میں ایک عظیم سور سلطنت قائم کی مگر اسے سلطنت کو پروان چڑھانے کا وقت نہیں مل سکا اور 5 سال بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔1555ء میں ہمایوں نے سور حکمرانوں کو شکست دی مگر ایک سال بعد ہی اس کی موت ہو گئی۔اس کا جانشیں اکبر عظیم مغل بادشاہ تھا جس نے نہ صرف سلطنت کی توسیع کی بلکہ اس نے اپنے زمانے کی مستحکم، وسیع ترین، طاقتور اور خوشحال سلطنت بھی بنائی۔اکبر ہندوکش پہاڑوں تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں کامیاب رہا۔اس نے توران کے ازبکوں اور ایران کے صفویوں کے توسیع پسند منصوبے پر روک لگائی۔

1.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

برنجی : آسام کی تاریخ سے متعلق وہ تاریخی کتابیں جنہیں پہلے آہومی میں اور پھر آسامی میں لکھا گیا۔

پیک : جبریہ مزدوری کرنے والوں کو پیک کہا جاتا تھا۔

گوڑ : بنگال کی دوسری راجدھانی

1.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر نے کسے شکست دی تھی؟

(الف) سکندر لودی (ب) ابراہیم لودی (ج) رانا سانگا (د) محمود بیگڑا

2. وجے نگر سلطنت کا سب سے عظیم حکمران کون تھا؟

(الف) کرشنا دیورائے (ب) رام رائے (ج) سداشیو (د) ویر نرسنگھ

3. سنسکرت کی مشہور کتاب 'مہابھارت' کا بنگالی میں ترجمہ کس کے دور میں ہوا؟

(الف) حسین شاہ (ب) نصرت شاہ (ج) محمود شاہ (د) سکندر لودی

4. پیمائش کے لیے "گزِ سکندری" کس نے متعارف کرایا تھا؟

(الف) بہلول لودی (ب) ابراہیم لودی (ج) سکندر لودی (د) شیر شاہ

5. محمود بیگڑا کس علاقائی سلطنت کا مشہور حکمران تھا؟

(الف) مالوہ (ب) بنگال (ج) وجے نگر (د) گجرات

1.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سکندر لودی پر ایک مختصر مضمون لکھئے۔
2. محمود بیگڑہ کے بارے میں لکھئے۔
3. بابر کی فتوحات سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

1.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. لودی سلطنت کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ لکھئے۔
2. نصرت شاہ نے بنگال میں کیا کردار نبھایا، وضاحت کیجئے۔

جوابات: 1-(ب), 2-(الف), 3-(ب), 4-(ج), 5-(د)

اکائی 2۔ مغل سلطنت کی بنیاد: بابر اور ہمایوں

(Foundation of the Mughal Empire: Babur and Humayun)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 مغل کون تھے؟

2.3 بابر اور وسط ایشیا کے سیاسی حالات

2.4 بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات

2.5 بابر کا ہندوستان پر حملہ

2.6 پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب

2.7 کھانوا کی جنگ

2.8 ہمایوں

2.9 ہمایوں اور بہادر شاہ

2.10 ہمایوں اور شیر شاہ

2.11 ہمایوں کی شکست کے اسباب

2.12 اکتسابی نتائج

2.13 کلیدی الفاظ

2.14 نمونہ امتحانی سوالات

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں ہم مغل سلطنت کے قیام پر بحث کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ مغل سلطنت کے ابتدائی دنوں کی سیاسی تاریخ پیش کی جائے تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ بابر اور ہمایوں نے کن حالات میں شمالی ہندوستان میں ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس سلسلہ میں انہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ ہم نے 15 ویں صدی کے دوسرے نصف میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے اور ان عوامل پر بھی غور کیا ہے جنہوں نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ حالانکہ بابر اور ہمایوں کو حکومت کی توسیع اور نظم ونسق درست کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، لیکن افغان اور راجپوت راجاؤں کی متحدہ مخالفت کے باوجود ایک ایسے ملک میں مغل سلطنت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جو ثقافتی اور سماجی طور پر ان کے آبائی وطن سے بہت مختلف تھا۔ ہم نے پانی پت اور کھانوا کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سیاسی کشمکش کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان حالات ووجوہات کا بھی تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو ہمایوں کی شکست کے ذمہ دار تھے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل کے تعارف، ابتدائی حالات اور بابر کی ہندوستان میں آمد کے اسباب سمجھ سکیں گے۔
- شمالی ہند میں مغلیہ حکومت کے قیام اور اس کے عوامل کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- پانی پت اور کھانوا کی جنگوں میں بابر کی فتح اور اس کے اسباب کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہمایوں کو درپیش اندرونی اور بیرونی مسائل سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان کشمکش اور ہمایوں کی جلاوطنی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہمایوں کی ایران سے واپسی اور مغل سلطنت کے دوبارہ قیام سے واقف ہو سکیں گے۔

2.2 مغل کون تھے؟ (Who Were the Mughals?)

مغلوں کا تعلق وسط ایشیا کے ترک و منگول قبائل سے تھا، یعنی وہ نسلاً ترک بھی تھے اور منگول بھی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو ترک اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ والد کی طرف سے وہ امیر تیمور کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور منگول اس لیے کیونکہ والدہ کی طرف وہ چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ اس طرح مغلوں کا تعلق وسط ایشیا کے دو عظیم جنگجو حکمرانوں سے تھا، یعنی امیر تیمور جس نے چودھویں صدی میں وسط ایشیا اور خراسان کے علاقوں پر ایک بڑی ریاست قائم کی تھی، اور چنگیز خاں جس نے 13 ویں صدی میں وسط ایشیا، ایران، مغربی روس اور مشرقی یورپ تک کے علاقہ پر مشتمل ایک وسیع منگول ریاست قائم کی تھی۔

مغل نام در حقیقت۔'منگول' لفظ سے مأخوذ ہے۔ سولہویں صدی میں یورپینوں نے سب سے پہلے اس نام کا استعمال ان تیموری بادشاہوں کے لیے کیا، جو ہندوستان کے حکمراں تھے۔ بعد کے دور میں بالخصوص انیسویں صدی کے بعد انگریز افسروں اور مؤرخین نے بھی اپنی تحریروں میں مغلوں کو یہی نام دیا ہے۔ حالانکہ آج یہ نام 'مغل' ایک عظیم الشان حکومت کی نشاندہی کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن دلچسپ یہ ہے کہ اس حکومت کے حکمرانوں نے کبھی بھی خود کے لیے مغل نام کا استعمال نہیں کیا بلکہ وہ سرکاری دستاویزوں، تاریخوں اور فرمانوں میں ہمیشہ اپنے آپ کو تیموری کہتے تھے، یعنی امیر تیمور کے جانشین۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ منگول، بالخصوص چنگیز خان، کی ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس سے خاندانی یا سیاسی رشتہ قائم کرنا ابھی حکمت عملی کے خلاف تھا۔ لیکن یہ انگریزی نام کچھ اس طرح ہماری کتابوں اور زبانوں پر غالب آگیا کہ یہی اس حکومت کا مقدر بن گیا۔

2.3 بابر اور وسط ایشیائی سیاسی حالات (Babur, and the Political Conditions of Central Asia)

ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کے مراحل پر گفتگو کرنے سے پہلے وسط ایشیا کے سیاسی ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جن کے سبب بابر کو ہندوستان پر چڑھائی کرنے کو مجبور ہونا پڑا۔ 1404ء میں امیر تیمور کے انتقال کے بعد تیموری ریاست اس کے جانشینوں میں تقسیم ہوگئی اور اس طرح ایک مضبوط ریاست چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر کمزور ہوگئی۔ یہ تیموری ریاست اور النہر (آمو دریا اور سیر دریا کے درمیان کا علاقہ) اور خراسان (موجودہ ایران کا شمال مشرقی حصہ) کے خطے میں پھیلی ہوئی تھیں، جو وسط ایشیا کے سب سے زرخیز حصہ تھا۔ اِسی کی ایک چھوٹی ریاست فرغانہ تھی جس پر بابر کے والد عمر شیخ مرزا کی حکمرانی تھی۔ اس کے علاوہ بابر کے چچا سلطان محمود مرزا سمرقند و بخارا کے حکمراں تھے جبکہ حصار، ترمذ اور بدخشان بابر کے دوسرے چچا سلطان احمد مرزا کے قبضہ میں تھا۔ محمد حسین بیقرہ بلخ اور خراسان کا حکمراں تھا جس کی دارالحکومت ہرات علم و فن کا شاندار مرکز تھی۔ پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں وسط ایشیا کے سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تمام تیموری ریاستیں ماراؤالنہر کے اس اہم خطہ پر قبضہ جمانے کے لیے آپس میں مستقل لڑتی رہتی تھیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر تیموری حکمراں اپنی ریاست کی سرحدوں کو پھیلانا چاہتا تھا۔ ان حالات میں اپنے والد عمر شیخ مرزا کے انتقال کے بعد بابر نے 1496ء میں صرف 12 سال کی عمر میں ریاست فرغانہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ حالانکہ بابر کے رشتہ داروں نے، خاص طور سے چچا سلطان محمود مرزا اور سلطان احمد مرزا اور ماموں محمود خان اور احمد خان، بابر کی کم عمری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد بار فرغانہ پر ناجائز قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

وسط ایشیا کے سیاسی حالات اور پیچیدہ اس وقت ہوئے جب پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے ابتدائی دہائی میں دو اور بڑی طاقتیں وسط ایشیا اور مغربی ایشیا میں ظاہر ہوئیں، ایک ازبیک سلطنت اور دوسرے صفوی حکومت۔ ازبیک خانہ بدوش تھے جن کا تعلق ترک و منگول قبیلہ سے تھا۔ یہ ترکی زبان بولتے تھے اور ان کا ابتدائی مسکن موجودہ قزاقستان کا علاقہ تھا۔ پندرہویں صدی کے وسط سے ازبیک رفتہ رفتہ ماوراءالنہر کی سیاست میں دخل اندازی کرنے لگے، کیونکہ ماوراءالنہر کی تیموری ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف ازبکوں کی مدد لیتی تھیں بالآخر پندرہویں صدی کے آخر میں ازبیک اپنے لیڈر شیبانی خان کی قیادت میں ماوراءالنہر کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کرنے

میں کامیاب ہو گئے۔ازبکوں نے دھیرے دھیرے تمام چھوٹی بڑی تیموری ریاستوں کو ختم کر دیا۔اس دوران بابر نے دو بار (1497ء اور 1501ء) شیبانی خان کے خلاف سمرقند اور بخارا کے خطے کو واپس حاصل کرنے کے لیے فوجی مہم کی لیکن وہ بہت دیر تک ان علاقوں پر اپنا اقتدار نہیں برقرار رکھ سکا۔1497ء کی فوجی مہم میں بابر اپنی ریاست فرغانہ بھی اس کے ہاتھوں سے چھن گئی اور بغیر ریاست کا بادشاہ بن کر رہ گیا۔دوسری بار 1502ء میں شیبانی خان نے بابر کو زبردست شکست دی، جس کے نتیجہ میں بطور مصالحت بابر کو اپنی بڑی بہن خان زادہ بیگم کو شیبانی خان کے نکاح میں دینا پڑا۔اس ہار کے بعد بابر کے حوصلے پست ہو گئے چنانچہ وسط ایشیا میں سیاسی میدان تنگ ہو جانے کے بعد بابر نے افغانستان کا رخ کیا اور 1504ء میں کابل قبضہ کر لیا جو آئندہ سالوں میں اس کے لیے اہم سیاسی مرکز کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔دوسری طرف 1506ء میں شیبانی خان نے محمد حسنین بیقرہ کی موت کے بعد ہرات پر بھی قبضہ کر لیا اور ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقہ میں موجود آخری تیموری ریاست کا بھی خاتمہ کر دیا۔

ازبکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایران کے صفوں حکمراں کو تشویش ہوئی کہ خراسان کے بعد ازبیک کہیں ایران پر نہ حملہ کر دیں۔ چنانچہ 1510ء میں صفوں حکمراں شاہ اسماعیل نے 'مرو' کے مقام پر ازبکوں سے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی جس میں ان کا لیڈر شیبانی خان قتل ہوا۔اس تبدیلی حالات نے بابر کو ایک تیسرا موقع دیا اپنی ریاست فرغانہ واپس حاصل کرنے اور تیموری دارالحکومت سمرقند پر قبضہ کرنے کا۔ لیکن اس پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ازبکوں کو ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقوں سے نکال سکے۔ مجبوراً بابر نے ایرانی بادشاہ شاہ اسماعیل سے مدد چاہی۔ شاہ اسماعیل نے بابر کی درخواست قبول کر لی لیکن اس کی چند شرائط تھیں، جیسے بابر خطبہ میں ایرانی بادشاہ کا نام شامل کرے گا، اس کے نام سے سکے ڈھالے گا، اور شیعہ مسلک کو فروغ دے گا وغیرہ۔ بابر نے بظاہر یہ شرائط قبول کر لیں اور ایرانی فوجوں کی مدد سے 1511ء میں سمرقند اور بخارا واپس لینے میں کامیاب رہا۔ لیکن جلد ہی 1512ء میں عثمانی ترکوں نے ایرانی بادشاہ شاہ اسماعیل کو شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر ازبکوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ بہر حال اب ازبیک پورے ماوراءالنہر کے سب سے طاقتور حکمراں بن چکے تھے۔ آخر کار بابر پھر کابل لوٹ آئے اور 1514ء میں چلدیران کی جنگ کے بعد جس میں ترکوں نے ایرانی فوجوں کو زبردست شکست دی تھی، بابر کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

2.4 بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات

(Political Conditions in North India before Babur's Invasion)

بابر کے حملہ سے پہلے شمالی ہندوستان میں مختلف چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں، جن میں دو نہایت اہم اور مضبوط تھیں۔ایک لودی حکومت اور دوسرے میواڑ کی ریاست۔ ہندوستان میں لودی حکومت کی بنیاد بہلول لودی نے رکھی لیکن ریاست کی اصل توسیع سلطان سکندر لودی کے دور میں ہوئی۔ سکندر لودی نے سولہویں صدی کی ابتدائی دور کی دو دہائیوں میں جونپور کی شرقی حکومت پر مکمل قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ مالوہ اور راجستھان کے کچھ حصوں پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔اس طرح سکندر لودی کے دور میں لودی افغانوں کی حکومت مغرب میں پنجاب سے لے کر مشرق میں بہار تک پھیل چکی تھی۔

لیکن 1517ء میں سکندر لودی کی موت کے بعد شمالی ہندوستان کے سیاسی ماحول میں میں تبدیلی آنے لگی۔ سکندر لودی کے انتقال کے بعد اس کے جانشین ابراہیم لودی اور قدیم بزرگ افغان امراء کے درمیان اقتدار کو لیکر کشمکش شروع ہوگئی۔ ابر ہیم لودی مرکزیت پسند نظریۂ بادشاہت کا حامی تھا جس میں تمام قوت اور اقتدار حکمراں کے پاس ہوتی ہے، جبکہ قدیم افغان امراء مرکزیت پسند اقتدار کو اپنے اختیار اور آزادی پر حملہ سمجھتے تھے۔ اس سیاسی بحران سے ابھرنے کے لیے ابراہیم لودی نے دربار میں اپنے چہیتے اور پسندیدہ امراء کو جگہ دی اور بزرگ افغان امراء کو دور دراز کے صوبوں میں بھیج دیا تاکہ مرکز میں اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجربہ کار اور قدیم افغان سرداروں نے اپنی قوت بڑھانی شروع کی اور رفتہ رفتہ ان تمام افغان امراء کے مرجع بن گئے جو ابراہیم لودی سے ناخوش تھے۔ آخر کار بغاوت شروع ہوگئی۔ بہار کے گورنر دریاخان نوحانی نے خود کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہیں دوسری طرف ابر ہیم لودی کے چچا اور بہلول لودی کے بیٹے عالم خان لودی نے گجرات کے حکمراں کی شہ پر بادشاہ ہونے کا دعویٰ پیش کیا۔ پنجاب کے گورنر دولت خان نے بھی بغاوت کر دی اور عالم خان لودی کو سلطان علاؤالدین کے لقب سے اپنا سلطان تسلیم کر لیا۔ سلطان اور امراء کے درمیان اس کشمکش کو بہتر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب دولت خاں نے بابر کو ابراہیم لودی کے خلاف چڑھائی کرنے کی دعوت دی تو اس نے سلطان پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک ظالم اور جابر حکمراں ہے جس نے سکندر لودی کے امراء کے ساتھ بدسلوکی کی اور ان میں 25 کو بے سبب قتل کر دیا۔ ظاہر ہے اس طرح کے سیاسی ماحول میں کسی بڑے خطرہ اور حملے کا مقابلہ کرنے کی گنجائش کم تھی۔ چنانچہ اس غیرہ متحدہ سیاسی بداندیشی کے سبب بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے آسانی ہوئی۔

میواڑ کی ریاست شمالی ہندوستان کی دوسری بڑی قوت تھی۔ میواڑ کے راجا رانا سانگا پندرہویں صدی کے اختتام تک پورے راجپوتانہ پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ رنتھمبور اور چندیری کے قلعے بھی اس کے قبضے میں آچکے تھے۔ اس کے علاوہ مالوہ کے خطے پر بھی اس کا اثر قائم تھا۔ مالوہ کا علاقہ لودی سلطنت اور رانا سانگا کے درمیان جنگ کا اصل سبب تھا، کیونکہ اس خطہ کی زرخیزی اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر دونوں طاقتیں اس پر اپنا قبضہ قائم کرنا چاہتی تھیں۔ غالباً اس سیاسی حکمت عملی کے مد نظر رانا سانگا نے بابر کو شمالی ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تاکہ ابراہیم لودی کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد وہ مالوہ اور اس کے ساتھ ساتھ درمیانی گنگا ندی کے علاقوں پر مکمل طور پر قبضہ کر لے۔ ان دو بڑی طاقتوں کے علاوہ متحدہ چھوٹی چھوٹی افغان ریاستیں آگرہ کے گردونواح میں قائم تھیں۔ جیسے میوات میں حسن خان، بیانہ میں نظام خان، وصول پور میں محمد زین، گوالیار میں تاتار خان، اٹاوہ میں قطب خان، کالپی میں عالم خان اور سنبھل میں قاسم وغیرہ۔ ان چھوٹی چھوٹی افغان ریاستوں کا کردار بابر کے حملے کے وقت اہم ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ مغل سلطنت کے قیام کے بعد یہ افغان ریاستیں دوبارہ اپنی طاقت حاصل کرنے کے لیے بابر کے خلاف متحدہ سیاسی محاذ بنا کر مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔

2.5 بابر کا ہندوستان پر حملہ (Babur's Invasion of India)

حالانکہ بابر نے اپنی سوانح۔ 'تزک بابری' میں ذکر کیا ہے کہ 1504ء میں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد ہی سے اس کی نظر ہندوستان پر تھی، لیکن یہ صرف ایک دعویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کابل پر حملہ کرنے کے ایک دہائی بعد تک بابر وسط ایشیا کے سیاسی حالات میں الجھا ہوا

تھا۔ چنانچہ اس دوران، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اس نے تیسری بار سمرقند اور بخارا پر قبضہ کرنے کے لیے کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا۔ لیکن چند مہینوں میں ازبکوں نے پلٹ وار کیا اور 1511ء میں ایک بار پھر بابر کو ناکام کابل واپس لوٹنا پڑا۔ 1514ء میں عثمانیوں کے ہاتھوں ایرانی بادشاہ کی شکست کے بعد وسط ایشیائی سیاست میں اب ایسی کوئی طاقت باقی نہیں بچی جو بابر کو اس کی ریاست اور تیموری دارالحکومت واپس دلانے میں مدد کرسکتی تھی۔ چنانچہ غالب گمان یہ ہے کہ 1514ء کے بعد بابر نے ہندوستان کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا ہوگا، جبکہ اس کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بابر کا ہندوستان پر حملہ اصل میں وسط ایشیائی حالات کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اہم عوامل بھی تھے جس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

کابل اور اس کے اطراف، جن پر بابر کا قبضہ تھا، گرچہ بہت خوبصورت تھے، جیسا کہ بابر نے خود تعریف کی ہے، لیکن معاشی وسائل اور ذرائع پیداوار کے اعتبار سے ناکافی تھے۔ کابل، قندھار اور بدخشاں پر مکمل کنٹرول قائم رکھنے اور قبائل افغانوں کو قابو میں رکھنے کے بابر کو ایک بڑی اور مشہور فوج کی ضرورت تھی جس کا انتظام مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ممکن نہیں تھا۔ اسی مالی تنگ دستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دربار اکبری کے مشہور مورخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بعض سرحدی علاقوں پر حملہ بابر کے لیے ایک بہتر متبادل تھا، جس سے اس کی معاشی پریشانیاں بھی بہت حد تک دور ہوسکتی تھیں۔ ابراہیم لودی اور افغان امراء کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف قدیم افغان سرداروں نے بغاوت کی، وہیں دوسری طرف پنجاب کے گورنر دولت خان نے اپنے بیٹے کو کابل بھیج کر بابر کو ابراہیم لودی کے خلاف فوجی مہم کی دعوت دی۔ ابراہیم لودی کے چچا عالم خان لودی نے بھی بابر کو اس حملہ کے لیے اکسایا۔ اس کے علاوہ میواڑ کا طاقتور راجا رانا سانگا نے بھی بابر کو دہلی پر حملہ کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ کیونکہ وہ ابراہیم لودی کو اقتدار سے ہٹا کر پورے مالوہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بابر کے مطابق رانا سانگا نے اس وعدہ کیا تھا کہ بابر دہلی پر حملہ کرے جبکہ وہ خود آگرہ پر حملہ کرے گا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ رانا سانگا نے واقعی بابر کو خط لکھا یا نہیں یا کس نے کس سے تعاون مانگا۔ لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ ان رانا سانگا بھی ابراہیم لودی کے اقتدار کو چیلنج کررہا تھا۔ لہذا ایسے سیاسی ماحول میں جس میں غیر مرکزیت تھی اور مختلف سیاسی قوتیں آپس میں لڑ رہی تھیں، باہر کو ہندوستان میں تیموری حکومت قائم کرنے کا حوصلہ ضرور ملا ہوگا۔

تیموری خاندان کے جانشین ہونے کے حیثیت سے بابر کا یہ دعویٰ تھا کہ ہندوستان کے وہ حصے جو امیر تیمور کے حملہ کے بعد تیموری حکومت کا حصہ تھے بالخصوص شمال مغربی سرحدی علاقے، ان پر بابر کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1578ء میں بھیرا اور باجور کے علاقوں پر حملہ کرنے کے بعد بابر نے ابراہیم لودی کے دربار میں ایک قاصد روانہ کیا اور ان علاقوں پر اپنا موروثی سیاسی حق جتاتے ہوئے ابراہیم لودی سے ان علاقوں کو اس کے حوالے کرنے کی مانگ کی۔ حالانکہ یہ قاصد لودی دربار تک نہیں پہونچ سکا، کیوں کہ پنجاب میں دولت خان نے اس کو روک لیا۔ نہ خود اس سے ملاقات کی اور نہ ہی ابراہیم لودی تک اس کو جانے دیا۔ لیکن اس سے صاف واضح ہے کہ بابر ہندوستان پر حکومت اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کی نظر میں ہندوستان پر حملہ صرف ایک فوجی مہم نہیں بلکہ اپنے موروثی حق کی حصولیابی تھا۔

پانی پت کی جنگ سے پہلے بابر نے شمال مغربی علاقے بالخصوص پنجاب صوبہ پر چار بار حملے کیے۔ 1519ء میں بابر نے۔ 'باجور' اور 'بھیرا' کے قلعوں پر قبضہ کر لیا، جو دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے اور شمالی ہندوستان میں داخلہ کا راستہ ہے۔ بابر کا یہ پہلا جارحانہ حملہ تھا۔ حالانکہ دولت خان نے بابر کے گورنر کو بھیرا سے نکال کر دوبارہ اپنا قبضہ بحال کر دیا، لیکن 21-1520ء میں بابر ایک بار پھر آیا اور بھیرا کو واپس حاصل کر لیا۔ اگلے دو سالوں میں دولت خان اور ابراہیم لودی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور افغان وزیر نے بابر کو حملہ کرنے کا پیغام بھی بھیج دیا تھا۔ چانچہ اب حالات بابر کے لیے مشکل نہیں تھے۔ 1524ء میں بابر لاہور آیا اور شاہی افواج کو شکست دی۔ پنجاب کے علاقے میں بابر کے جمتے ہوئے قدم سے ابراہیم لودی پریشان تھا اور اس طرح مستقبل قریب میں ان دونوں کے درمیان ایک مقابلہ طے تھا۔ پنجاب ابراہیم لودی کے ئے اہم تھا، کیوں کہ اس پر کسی دوسری طاقت کے قبضہ سے شمالی ہندوستان بالخصوص گنگا میدان کے علاقوں پر حملے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف یہ علاقہ بابر کے لیے بھی اہم تھا کیوں کہ معاشی طور پر خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ تیموری حکومت کے قیام اور توسیع کے لیے بھی یہ صوبہ انتہائی اہم تھا۔

دسمبر 1525ء میں بابر اپنی بارہ ہزار افواج کے ساتھ کابل سے ہندوستان کے لیے نکلا اور دریائے سندھ پار کر کے پنجاب ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ بالآخر بابر اور ابراہیم لودی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہوئیں۔ بابر کی چھوٹی فوج کے مقابلے میں ابراہیم لودی کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی، جیسا کہ خود بابر نے اپنی سوانح میں اس کی تفصیل دی ہے، ممکن ہے بابر نے اپنی فتح کو بڑھا چڑھا کر بتانے کے لیے لودی فوج کی تعداد کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ بابر کی فوجیں ابراہیم لودی کی فوجوں سے بہت کم تھیں۔ خود افغان مآخذ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لودی فوجیں کسی بھی حال میں پچاس ہزار سے کم نہیں تھیں۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہ دونوں فوجیں میدان میں ڈٹی رہیں اور چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئی رہیں۔ البتہ جنگ کے دن صرف چند گھنٹوں میں ہی بابر نے ابراہیم لودی کو شکست فاش دی۔ ابراہیم لودی میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اپنے کئی کمانڈروں کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوا۔ گوالیار کے راجہ وکرماجیت بھی جنگ میں مارا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق پندرہ ہزار افغان قتل ہوئے۔ اس جنگ کی سیاسی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کیوں کہ اس نے شمال ہندوستان میں ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی، جس نے دھیرے دھیرے تقریباً پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی۔

2.6 پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب

(Causes for Babur's Victory in the Battle of Panipat)

آخر وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے بابر نے ایک مختصر سی فوج کی مدد سے ابراہیم لودی کی ایک بڑی فوج کو دہرا دیا تھا۔ بابر نے ابراہیم لودی کے خلاف دو طرح کی جنگی حکمت عملی اور تکنیک کا استعمال کیا تھا، جو اس نے وسط ایشیا میں دیکھا تھا۔ ایک جنگی حکمت عملی وہ تھی جسے بابر رومی (عثمانی) تدبیر کہتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک دفاعی تدبیر تھی جس کا استعمال عثمانی ترکوں نے ایرانیوں کے خلاف 1514ء میں چلدایران کی جنگ میں کیا تھا اور ایرانی بادشاہ کو بری شکست دی تھی۔ اس رومی جنگی تکنیک کے مطابق بابر نے اپنی فوج کے آگے لکڑی کی

گاڑیوں کی قطاریں لگادیں اوران گاڑیوں کو آپس میں رسی سے باندھ دیا تاکہ وہ زور پڑنے پر بکھر نہ جائیں۔اس طرح بابر نے اپنی فوج کو ان لکڑی کی گاڑیوں کے پیچھے چھپادیا۔البتہ ان گاڑیوں کے درمیان تھوڑا فاصلہ کیا گیا جس میں سے بندوقچی گولی چلا سکیں اور گھوڑ سوار سپاہی تیر برسا سکیں۔ بابر نے اس حکمت عملی کا استعمال کرکے ایک طرف اپنی فوجیوں کو دشمنی کے حملے سے محفوظ رکھا اور وہیں دوسری طرف بارود کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا کہ پوری فوجیں سنبھل نہیں سکیں۔

رومی جنگی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ بابر نے ایک اور جنگی تدبیر اپنائی تھی جسے تلوغمہ کہتے ہیں۔ یہ جنگی تدبیر وسط ایشیا میں ازبکوں کے ذریعہ اپنائی گئی تھی جس کا مشاہدہ خود بابر نے کیا تھا۔ یہ جارحانہ تدبیر تھی جس کے مطابق بابر نے اپنی فوج کو متعدد چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا۔ان فوجی ٹکڑیوں نے مخالف فوج کو دائرہ بنا کر دھیرے دھیرے دائیں، بائیں اور پیچھے سے گھیر لیا۔اس طرح مخالف فوج کا دستہ سمٹتے سمٹتے فوج کے مرکز میں پہنچ گیا جس کے نتیجہ میں فوج کے قلب پر دباؤ بڑھتا گیا اور بھگدڑ و بدانتظامی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔اس کا فائدہ بابر کو ہوا اور اس کی فوجیں بارود اور تیروں کے ذریعہ لودی فوجوں پر حملہ کرتی رہیں۔آخر میں محفوظ فوجی دستہ (Reserved) جو پہلے سے تازہ دم ہے، مخالف فوج پر حملہ کرکے اس کو بے دم کر دیتا ہے۔اس طرح ازبکوں کی تلغمہ تکنیک کا استعمال کرکے بابر نے ابراہیم لودی کی فوجوں میدان جنگ میں مات دے دی۔

بابر نے بارود کا استعمال بڑی خوبصورتی اور موثر انداز میں کیا۔ چھوٹی چھوٹی توپوں کے ذریعہ، جو فوج کے قلب میں رکھی گئی تھیں، مخالف فوجوں پر بارود کے گولے برسائے اور ساتھ میں گاڑیوں کے پیچھے پیچھے بندوقچیوں نے بندوق کی گولیوں سے وار کیا۔ بابر کے ذریعہ بارود کے استعمال کی وجہ سے بعض مؤرخین مغل سلطنت کو 'بارود والی ریاست' ('Gunpowder Empire') کہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بابر نے پہلی بار شمالی ہندوستان میں جنگ میں بارود کا استعمال کیا، لیکن اس سے پہلے بھی دکن کی ریاستوں میں بارود کا استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ ممکن ہے ابراہیم لودی کو اس کی خبر نہ ہو، یا اس نے اس کے استعمال میں حکمت نہ سمجھی ہو۔ بہر حال بابر نے اپنے بندوقچیوں اور ہلکی توپوں کا بڑا عمدہ استعمال کیا جس سے دشمن کی فوجوں کو بہت نقصان پہونچا۔

بعض جدید مؤرخین جیسے اسٹیفن ایف ڈیل(Stephen F. Dale)اور ستیش چندر وغیرہ نے بارود کے استعمال کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یقیناً بارود کے گولے اور بندوقیں بابر کی فتح کا سبب بنیں، لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ بابر کی جیت کا اصل سبب اس کی فوج تھی۔ ترک و منگول گھوڑ سوار سپاہیوں پر مشتمل بابر کی فوج تیزی سے حرکت کرنے کے اصول اور فن سے واقف تھی۔ بابر کے فوجی تیزی سے گھوڑوں سے دوڑتے ہوئے تیر سے نشانہ لگا سکتے تھے۔اس کے علاوہ چستی سے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی تدبیر سے بھی واقف تھے، جو فوجی حکمت عملی کا اہم حصہ تھا۔ چنانچہ مغل فوجوں نے اپنی رفتار، حکمت عملی اور تیر اندازوں کے ذریعہ افغان فوجوں پر سبقت حاصل کی اور انہیں میدان جنگ میں چونکا دیا۔ بہر حال پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح سے ہندوستان میں مغل سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ فتح کے بعد پانی پت کے میدان میں بابر نے دو مسجدوں کی تعمیر کروائی۔ ظاہر ہے مسجدوں کی تعمیر ایک علامتی پیغام تھا جس کے ذریعہ بابر اپنی جیت کی

یادگاراور نئی حکومت کے قیام کانشان چھوڑ ناچاہتاتھا۔چند دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد بابرآگرہ روانہ ہوااور لودی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

2.7 کھانواکی جنگ (Battle of Khanwa)

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر کے سامنے دو بڑے چیلنج تھے،ایک رانا سانگااور دوسرے افغان۔ جیساکہ معلوم ہے کہ ابراہیم لودی کے خلاف بابراور رانا سانگا کے درمیان ایک دوسرے کا تعاون کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔لیکن بابر کے مطابق رانا سانگا نے وعدہ خلافی کی اور بابر کا ساتھ نہیں دیا۔ایسا کیوں ہوااس محض قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔البتہ یہ ممکن ہے کہ رانا سانگا نے خیال کیاہو کہ بابر بھی امیر تیمور کی طرح دہلی اورآگرہ کا خزانہ لوٹنے سے واضح کر دیا کہ اس کا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔حالانکہ بابر کے امراءوبیگ اور فوجی واپس وسط ایشیاجاناچاہتے تھے،کیوں کہ نہ تو ہندوستان کا موسم اور نہ ہی یہاں کے پھل ومیواجات،نہ تو یہاں کی زبان اور نہ ہی یہاں کے رسم ورواج،کچھ بھی ان کے مزاج اور طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ لیکن بار نے واپس جانے کا اظہار نہیں کیا باوجود اس کے کہ وہ بھی ہندوستان کے مقابلہ میں کابل وبدخشان کی خوب تعریف کرتاہے۔

بابر کے ارادے نے رانا سانگا کے سامنے ایک چیلنج کھڑا کر دیا۔ہندوستان میں بابر کی موجودگی اور مغلیہ حکومت کا استحکام رانا کے لیے ابراہیم لودی کی حکومت سے زیادہ خطرناک تھا۔وہیں دوسری طرف رانا سانگا کا بڑھتاہوااقتدار مغل سلطنت کے وجود کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان جنگ ہونا قطعی تھا۔1527ء میں رانا سانگا نے راجپوت اور شکست خوردہ افغان سرداروں کا ایک بڑا متحدہ فوجی محاذ بنایا، جس میں راجپوتانہ کے تقریباتمام راجپوت راجا شامل تھے۔افغان سرداروں میں سکندر لودی کا چھوٹابیٹا محمود خان لودی بھی رانا کے ساتھ تھا۔اس کے علاوہ میوات کا افغان حکمراں حسن خان بھی محاذ کا حصہ تھا۔ فی الحقیقت راجپوت اور افغان سرداروں کا متحدہ محاذ کھڑا کرنے میں اس کا رول سب سے اہم تھا۔1527ء تک یہ تیاریاں مکمل ہوگئیں اور رانا سانگا یہ متحدہ فوج لیکر آگرہ کی طرف بڑھا۔اس خبر کے سنتے ہی بابر نے اپنی فوج اکھٹا کی اورآگرہ کے قریب کھانوا کے مقام پر یہ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ مقابلہ سے پہلے بابر کی فوجوں میں ناکامی کا خوف چھایاہوا تھا۔اس وجہ رانا سانگا کی بہادری اور جانبازی کے قصے اور ایک بڑی فوج تھی،جو اس نے راجپوت اور افغانوں کی مدد سے جمع کی تھی۔ بابر کے مطابق رانا کی فوج کی تعداد دو لاکھ تھی۔ گرچہ بابر نے مبالغہ سے کام لیاہے لیکن ہر حال میں سانگا کی فوجیں بابر کی فوجوں سے زیادہ تھیں۔ فوج پر چھائے ہوئے اس خوف اور ناکامی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے بابر نے فوج کے سامنے ایک زبردست تقریر کی۔ اس تقریر کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں بابر نے ایک سیاسی کشمکش کو مذہبی رنگ دیاتاکہ فوجیوں میں جوش وجذبہ کو ابھاراجاسکے۔ بابر نے اعلان کیا کہ یہ جہاد ہے۔ بابر نے اپنے تئیں ایک نیک اور پاک باز مسلم حکمراں کی تصویر پیش کرنے کے لیے شراب ترک کر دیااور شراب کے گھڑے توڑنے کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیاکہ جنگ کے بعد جو شخص چاہے،واپس وسط ایشیالوٹ سکتاہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ بابر نے ان نعروں کا استعمال صرف اور صرف اپنی فوج کے حوصلہ وجذبہ کو بھڑکانے کے لیے کیا تھا،نہ کہ واقعی مذہبی جنگ کے لیے،کیوں کہ اس جنگ میں فتح کرنااس کے لیے ہر حال میں ضروری تھا۔

17 مارچ 1527ء کو دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ شروعاتی حملوں میں رانا سانگا کی فوج غالب رہی، لیکن جلد ہی مغل فوجوں نے خود کو سمیٹا اور اپنا دفاع کیا۔ اس جنگ میں بھی بابر نے روحی (عثمانی) اور تلغمہ جنگی تدبیروں کا استعمال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانا نے پانی پت کی جنگ سے کوئی سبق نہیں لیا تھا۔ اس کی فوج ہاتھیوں اور تلوار باز سپاہیوں کی طاقت پر منحصر تھی۔ چنانچہ اس بار بابر نے رانا سانگا کو اپنی تیز رفتار گھوڑ سوار فوج اور تیر اندازوں کے مدد سے شکست دی۔ رانا زخمی ہوا اور چتور کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس کے ساتھیوں میں محمود خاں لودی تو بچ کر بھاگ گیا، لیکن حسن خان میواتی قتل ہوا۔ راجپوتوں کو بڑی ہار ملی، یہاں تک کہ کسی بھی فوجی دستہ کا کمانڈر زندہ نہیں بچا۔ کھانوا کی جیت نے بابر کا اقتدار اور مضبوط کر دیا اور اس کے لیے شمالی ہند میں کوئی بڑا خطرہ موجود نہیں تھا، جو اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکتا۔ البتہ مالوہ کا راجپوت راجہ میدنی رائے ایک طاقتور حکمراں ضرور تھا۔ بابر کو یہ امکان تھا کہ رانا سانگا میدنی رائے کی مدد سے دوبارہ حملہ کی تیاریاں کر سکتا ہے۔ چنانچہ بابر نے 1528ء میں چندیری پر حملہ کر دیا۔ میدنی رائے نے بابر کا مقابلہ کیا لیکن اپنی بہادرانہ جنگی صلاحیت کے باوجود ہار گیا۔ اب بابر شمالی ہندوستان کا ناقابل تسخیر بادشاہ بن چکا تھا۔

بعض تاریخی کتابوں میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ بابر اور راجپوتوں کے درمیان لڑی گئی جنگ کی بنیاد اصل میں مذہب تھی۔ یعنی کہ کہ راجپوت اپنا مذہب اور قوم بچانے کے لیے مغلوں سے جنگ کر رہے تھے اور یہ کہ کھانوا کی جنگ دراصل ہندو اور مسلم قوم کے درمیان ایک جنگ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ کھانوا کی جنگ میں راجپوت اور افغان متحدہ محاذ بنا کر بابر کے خلاف لڑے تھے۔ اس متحدہ محاذ میں رانا سانگا کے ساتھ ابراہیم لودی کے چھوٹے بھائی محمود خان لودی اور میوات کے افغان سردار حسن خان میواتی بھی تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جنگ ہندو مسلم کے درمیان مذہب کے سوال پر نہیں لڑی گئی تھی۔ قابل غور ہے کہ بابر اپنی سوانح میں حسن خان کو کافر و ملحد کہتا ہے۔ ظاہر ہے بابر کی تعداد میں رانا سانگا اور حسن خان دونوں ہی کافر اس لیے لڑے لڑے کیوں کہ انہوں نے بابر کے خلاف ایک محاذ بنایا تھا۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بابر کو ہندوستان سے نکالنے اور اپنی اپنی ریاست کو بچانے کے مقصد کے تحت ہیں، دور کی طاقتیں، خواہ ہندو ہوں یا مسلم، ساتھ آئیں تھیں۔ دوسرا یہ کہ بابر نے مذہبی نعروں اور مذہبی علامات کا استعمال صرف اپنی طاقت و اقتدار کو محفوظ کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف اپنے فوجیوں اور امراء کو اکٹھا کرنے کے لیے کیا تھا۔

2.8 ہمایوں (Humayun)

1530ء میں بابر کی وفات کے بعد ہمایوں 23 سال کی عمر میں مغل شہنشاہ بنا۔ ہمایوں کے لیے حالات سازگار نہیں تھے کیوں کہ اسے ان تمام مسائل سے دوچار ہونا تھا، جو بابر نے نامکمل چھوڑ دیے تھے۔ ہمایوں کے سامنے داخلی اور خارجی دو طرح کی مشکلات تھیں

داخلی مشکلات (Internal Problems)

بابر کے انتقال سے پہلے ہی وسط ایشیائی امراء ہمایوں اور اس کے بھائیوں کو درکنار کر کے مہدی خواجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے، جو بابر کی بہن خانزادہ بیگم کا شوہر تھا۔ سازش کامیاب نہیں ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کیوں کہ مہدی خواجہ تیموری نہیں تھا، جبکہ تخت پر

تیموری نسل کا ہی کوئی وارث بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن اس سازش سے چغتائی امراء کی آزاد اور باغیانہ روش کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح بابر کے انتقال کے بعد بعض چغتائی بیگ مستقل اپنے لیے ایک آزاد دائرہ اقتدار قائم کرنے کے فراق میں رہتے تھے، جیسے محمد زمان مرزا اور محمد سلطان مرزا، جو سلطان حسین بیقرہ کے پوتے تھے اور جن کے ساتھ بابر نے اپنی بیٹیوں کی شادی کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باقی امراء کے درمیان بھی ہمایوں کے خلاف ایک مخالفانہ ماحول پیدا ہو رہا تھا۔ ہمایوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج وہ تیموری روایت تھی جس کے تحت ریاست کو جانشینوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس روایت کے مطابق ہمایوں کو بھی چھوٹی سی مغل سلطنت کے صوبوں کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ چنانچہ کابل وقندھار، جن پر پہلے ہی سے کامران مرزا کا کنٹرول تھا، ان کے حوالہ کر دیا گیا، جبکہ ہندال کو میوات اور عسکری مرزا کو سنبھل کا علاقہ سونپا گیا۔ ہمایوں کے حصہ میں آگرہ اور پنجاب کا علاقہ آیا۔ ظاہر ہے اس سیاسی غیر مرکزیت سے ہمایوں کی طاقت کمزور ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ کامران مرزا نے جلد ہی لاہور پر حملہ کر کے پنجاب پر اپنا قبضہ کر لیا۔ بھلے ہی کامران نے بدلے میں ہمایوں کی بالادستی قبول کر لی، لیکن اس سے ہمایوں کو بہت نقصان پہونچا کیوں کہ ایک زرخیز خطہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب ہمایوں شمال مغربی علاقے سے بے فکر ہو کر شمال اور مشرقی ہند کے معاملات کو سنجیدگی سے حل کر سکتا تھا۔ ہمایوں کے بھائیوں نے بھی اہم اور نازک موقعوں پر اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بعض نے تو خود بادشاہ ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ اس امر کی تفصیل اور شیر شاہ کے درمیان جنگ کے ضمن میں آئے گی۔

خارجی مشکلات (External Problems)

ہمایوں کے دو بڑے سیاسی اور فوجی دشمن تھے۔ 1 پہلا مغرب میں گجراتی سلطان بہادر شاہ اور دوسرے مشرق میں افغان امرا۔ تخت نشینی کے بعد ابتدائی دو سالوں تک ہمایوں اپنا اقتدار مستحکم کرنے اور خاص طور سے مشرقی اتر پردیش اور بہار کے افغانوں کا زور توڑنے میں مصروف رہا۔ سب سے پہلے اس نے بندیلکھنڈ کے کالنجر قلعہ کا محاصرہ کیا جو آگرہ کے جنوب میں ایک اہم قلعہ تھا اور آگرہ کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد بندیلا راجا نے ہمایوں کی بالادستی قبول کر لی۔ ادھر مشرق میں افغان سردار شیر خان (بعد میں شیر شاہ) نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہمایوں لودی حکومت کا جانشین ہونے کی حیثیت سے چنار کے قلعہ کو اپنی حکومت کا حصہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ 1532ء میں ہمایوں نے چنار کا محاصرہ کر لیا۔ چھ مہینوں تک چلے اس محاصرہ میں آخر ہمایوں کو کامیابی ہوئی اور شیر خان نے قلعہ کے عوض ہمایوں کی بادشاہت قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ مغل سلطنت کا وفادار رہے گا اور فوجی مہمات میں اپنی فوج کے ذریعہ ہمایوں کا تعاون کرے گا۔ اپنی طاقت مضبوط کرنے کے بعد اب ہمایوں کے پاس موقع تھا کہ وہ بہادر شاہ کی چنوتی کا سامنا کرے۔

2.9 ہمایوں اور بہادر شاہ (Humayun and Bahadur Shah)

گجرات کے حکمراں بہادر شاہ نے بظاہر کوئی مخالفانہ قدم نہیں اٹھایا بلکہ ابتدائی چند سالوں (1531 تا 1533) میں اس کے اور ہمایوں کے تعلقات دوستانہ رہے۔ تاہم وہ آہستہ آہستہ اپنی طاقت اور اقتدار وسیع کر رہا تھا۔ 1531 میں اس نے مالوہ کے علاقہ پر قبضہ کر لیا جو گجرات اور آگرہ دونوں حکومتوں کے لیے کئی معنوں میں اہم تھا۔ ایک تو یہ کہ مالوہ ان دونوں ریاستوں کے درمیان ایک حائل ریاست

(Buffer State)کادرجہ رکھتا تھا، ساتھ ہی مالوہ تجارتی اعتبار سے ایک اہم خطہ تھا کیوں کہ گجرات کی بندرگاہوں سے ہونے والی تجارت مالوہ کے راستے ہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ مالوہ کا خطہ کاشتکاری پیداوار کے لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے۔ حتی کہ گجرات اپنی غذائی اجناس کے لیے بڑی حد تک مالوہ پر منحصر تھا۔ان تمام پہلوؤں کے چلتے بہادر شاہ اور ہمایوں دونوں اس پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتے تھے۔مالوہ پر حملہ کے بعد ہی1532 میں بہادر شاہ نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔اس حملہ سے ہمایوں چوکنا ہو گیا کیوں کہ مشرقی راجستھان پر بہادر شاہ کا قبضہ ہونے سے آگرہ اور دہلی پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ ہمایوں تیزی سے گوالیار کی طرف بڑھا جس کے نتیجہ میں بہادر شاہ درمیان ہی میں رانا سے معاہدہ کر کے واپس لوٹ گیا۔ان دونوں کے درمیان تعلقات ابھی بھی کشیدہ نہیں ہوئے۔ ہمایوں واپس دہلی آیا اور ایک سال تک یہاں مقیم رہا جس دوران اس نے یہاں 'دین پناہ' کے نام سے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔

لیکن اس کے بعد بعض ایسی تبدیلیاں ہوئیں جن کے سبب ان دونوں کے درمیان سیاسی مڈبھیڑ ہوئی۔1534 میں بہادر شاہ نے چتوڑ پر دوبارہ حملہ کر دیا۔دوسری طرف وہ مشرق میں افغان حکمرانوں سے ہمدردانہ تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔خاص طور سے بہار میں شیر شاہ اور بنگال میں نصرت شاہ سے، جو ہندوستان سے مغل سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ بہادر شاہ کا دربار افغان سرداروں اور تیموری خاندان کے باغی امراء کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ حالانکہ بابر نے اپنے ایک سفارتی خط میں بہادر شاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ افغان سرداروں اور باغی چغتائی امراء کو پناہ نہ دیں لیکن اس کے باوجود اس نے سکندر لودی کے بھائی عالم خان لودی اور تیموری شاہزادہ محمد زمان مرزا کو پناہ دی تاکہ وہ اندرونی طور پر ہمایوں کو کمزور کر سکے۔ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے ہمایوں کے لیے بہادر شاہ کے خلاف ایک سنجیدہ اقدامی پالیسی بنانا ضروری تھا۔

جب بہادر شاہ چتوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ہمایوں نے 1535 میں بڑی چالاکی سے مالوہ پہنچ کر مانڈو کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔اس طرح ہمایوں نے بہادر شاہ کا راستہ روک لیا، کیوں کہ چتوڑ سے گجرات جانے کے لیے صرف مانڈو ہی ایک راستہ تھا۔ حالانکہ بہادر شاہ نے چتوڑ کا قلعہ جیت لیا لیکن واپسی میں ہمایوں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ چونکہ ہمایوں نے بہادر شاہ کی فوج تک پہونچنے والی خوراک کے تمام راستے کاٹ دیے تھے ،اس لیے بہادر شاہ کی فوج میں افراتفری مچ گئی، گھوڑے مرنے لگے اور سپاہیوں کو بھی سخت پریشانی ہوئی۔ نتیجہ میں بہادر شاہ کی فوج فرار ہو گئی اور جاتے جاتے خود انہوں نے اپنی توپیں اور ہتھیار تباہ کر دیے تاکہ ہمایوں انہیں ان کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔مانڈو میں شکست کھانے کے بعد بہادر شاہ چمپانیر، احمد آباد، اور پھر کھمبایت کی طرف بھاگا۔ ہمایوں نے اس کا تعاقب کیا۔آخر کار بہادر شاہ نے اپنا خاندان اور سارا خزانہ 'دیو(Diu)' بھجوا دیا اور خود بھی وہاں پناہ لی۔ ہمایوں نے 1535 میں چمپانیر کے قلعہ کو فتح کر لیا اور اس طرح بہادر شاہ کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ صرف 10 مہینوں میں ہمایوں نے مالوہ اور گجرات جیسے اہم صوبوں پر قبضہ حاصل کر لیا اور بہادر شاہ جیسے ماہر حکمراں کے چیلنج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

لیکن ہمایوں کی مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔اس فتح کے بعد ہمایوں گجرات، مرزا عسکری کی نگرانی میں چھوڑ کر دوبارہ مانڈو واپس آگیا۔ مرزا عسکری صحیح طرز پر گجرات کا انتظام نہیں چلا سکا، کیوں کہ اس کے اور باقی دوسرے امراء کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے

تھے۔ دوسرے یہ کہ مقامی طور پر بدانتظامی کے نتیجے میں مقامی عوام وطاقتور جماعتیں بھی مغل سلطنت کے مخالف ہو گئیں۔ مزید یہ کہ مرزا عسکری کے اندر بذات خود ایک آزاد وخود مختار حکمراں بننے کا جذبہ پنپ رہا تھا۔ چنانچہ ان اسباب کی وجہ سے بہادر شاہ نے دوبارہ احمد آباد پر حملہ کر دیا لیکن پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں اس کی موت سے یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔ البتہ اس سیاسی بحران میں 1532 تک مالوہ اور گجرات بہت جلد ہی ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اگرچہ گجرات پر ہمایوں کا قبضہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا، لیکن بہادر شاہ کی شکست اور اس کی موت سے مغربی جانب سے لاحق خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب ہمایوں اطمینان کے ساتھ مشرق کے حالات کا سامنا کر سکتا تھا۔

2.10 ہمایوں اور شیر شاہ (Humayun and Sher Shah)

جس وقت مغرب میں ہمایوں بہادر شاہ کے خلاف اپنی فوجی مہم میں مشغول تھا، مشرق میں شیر خان اپنی طاقت مضبوط کرتا رہا شیر شاہ کے سیاسی عروج اور اس کے نظم ونسق سے متعلق علاحدہ اکائی میں بحث کی گئی ہے۔ اس دوران 1532 تا 1537ء اس نے بہار میں اپنا اقتدار قائم کیا اور دو موقعوں پر بنگالی حکمراں کی فوجوں کو بھی (1532 اور 1534) شکست دی۔ اس طرح بنگالی حکمراں کی فوجی کمزوری بھی واضح ہو گئی اور مغل بادشاہ ہمایوں سے براہ راست مڈبھیڑ کیے بغیر وہ ایک آزاد اور خود مختار حکمراں کے طور پر ابھرنے لگا۔ شیر خان کی طاقت کا سبب ایک طرف تو وہ فوج تھی جو اس نے بنگال کے حکمراں کے تاوان اور بہادر شاہ کی مالی امداد کے ذریعہ کھڑی تھی اور دوسری طرف بہادر شاہ کے زوال کے بعد افغان امراء اور فوجیوں کی ایک بڑی تعداد تمام شمالی ہند سے شیر شاہ کے پاس جمع ہو گئی تھی، جو ان کی نظر مغل اقتدار سے چھٹکارہ پانے کا واحد ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر 1532 میں بنگال پر حملہ کر دیا۔ ان تمام حالات کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے ہمایوں نے اپنے امراء کے مشورہ کے مطابق 1537 میں بارش کے موسم میں چنار کی طرف رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ، جو شیر خان کے قبضہ میں تھا، انتہائی اہم قلعہ مانا جاتا تھا کیونکہ یہ بنگال اور بہار میں داخلہ کا راستہ تھا اور بنگال اور آگرہ کے درمیان آمد ورفت کا اہم ذریعہ بھی تھا۔ البتہ اس دوران شیر خان نے بنگال کی راجدھانی گوڑ پر قبضہ کر لیا، جبکہ ہمایوں کو چنار کا قلعہ فتح کرنے میں چھ مہینے لگ گئے۔ اس فتح کے بعد ہمایوں نے شیر خان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ ہمایوں کے سامنے جھک جائے اور بنگال واپس کر دے، تو چنار، جونپور یا کہیں اور اسے اچھی جاگیر دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے شیر خان نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ دراصل ہمایوں اور شیر خاں دونوں کی مہم کا اصل مقصد بنگال پر قبضہ کرنا تھا، کیونکہ بنگال انتہائی زرخیز اور مالدار صوبہ اور سمندری تجارت کا اہم مرکز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کو اب بھی شیر خان کی طاقت کے سلسلے میں غلط فہمی تھی۔ اس کا وہم تھا کہ شیر خان کوئی جنگجو افغان سردار ہے جو صرف جاگیروں سے خوش ہو جائے گا۔ بہر حال چنار کی فتح کے بعد ہمایوں گوڑ کی طرف بڑھا، جبکہ اس دوران شیر خان بنگال کے خزانہ کا ایک بڑا حصہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتاس کے قلعہ میں منتقل کر چکا تھا۔ شیر خان نے ہمایوں کے لیے بنگال کا راستہ خالی چھوڑ دیا اور پلٹ کر بہار اور یوپی کے علاقے میں اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے مونگیر اور بنارس پر قبضہ کر لیا، چنار اور جونپور کا محاصرہ کیا اور سنبھل سے قنوج تک مغل علاقوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس طرح اس نے بنگال میں موجود ہمایوں اور آگرہ کے درمیان رابطہ کی ہر کڑی کو توڑ دیا تھا۔ بنگال میں ہمایوں ایک لمبی مدت یعنی 1539 تک مقیم رہا اور اس دوران اس کی مشکلیں بڑھتی رہیں۔ بنگال کے موسم کی وجہ سے اس کی فوج کے گھوڑے مرنے لگے۔ اس کے

علاوہ اس کے بھائی ہندال نے، جس کو اس نے مزید افواج اور اناج لانے کے لیے بھیجا تھا، آگرہ پہنچ کر خود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا۔ حالانکہ یہ خبر سننے کے بعد لاہور سے کامران آگرہ پہنچا اور ہندال کو بغاوت سے باز رکھا۔ ہمایوں بڑی مشکلوں سے افغان حملوں سے بچتے ہوئے چوسا پہونچا جہاں 26 جون 1539 کو شیر خان سے آمنا سامنا ہوا۔ تین مہینے کی ناکام بات چیت کے بعد شیر خان نے بہتر جنگی تدبیر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمایوں کی فوجوں کو اچانک جالیا، جس سے مغل فوجوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ ہمایوں کی شکست ہوئی اور وہ کسی طرح کرم ناساندی پار کر کے آگرہ پہنچا۔ اس کی جان بچانے میں اس کے خاص ملازم جوہر آفتابچی نے اس کی مدد کی، جو بعد میں ایک اہم مغل امیر کی حیثیت سے آخر دم تک ہمایوں کے ساتھ رہا۔

ہمایوں آگرہ پہنچا اور شیر خان سے مقابلہ کے لیے تیاریاں شروع کر دیں لیکن کامران مرزا نے اپنی جنگجو فوج جو دس ہزار سواروں پر مشتمل تھی ہمایوں کی قیادت میں دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ اسے اب ہمایوں کی جنگی صلاحیت پر بھروسہ نہیں تھا۔ چوسا کی جنگ میں بھی کامران نے اپنی پوری فوجوں سے ہمایوں کی مدد اس ڈر سے نہیں کی تھی کہ کہیں افغان طاقت کو کچلنے کے بعد ہمایوں اسے بھی لاہور سے نہ نکال باہر کرے۔ بہر حال کامران اپنی فوج کے ساتھ واپس لاہور لوٹ گیا۔ 17 مئی 1540 کو قنوج میں ہمایوں اور شیر خان کا آمنا سامنا ہوا، جس میں اگرچہ ہندال اور عسکری نے ہمایوں کا ساتھ دیا، لیکن ہمایوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ ادھر شیر خان نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی گدی سنبھالی۔ شیر خان کی اس جیت نے شمالی ہندوستان میں ایک نئی افغان ریاست کی بنیاد رکھی۔

شکست خوردہ ہمایوں آگرہ سے بھاگ کر لاہور پہنچا لیکن اس کے اور بھائیوں کے درمیان کسی جنگی منصوبہ پر اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد شیر شاہ نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ کامران نے ہمایوں کو کابل میں پناہ لینے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں اگلے ڈھائی سال ہمایوں سندھ سے راجستھان اور پھر راجستھان سے سندھ مختلف مقامی حکمرانوں کے پاس تعاون کے لیے بھٹکتا رہا۔ اسی دوران سندھ میں امر کوٹ کے راجپوت راجہ نے ہمایوں کو پناہ دی۔ یہیں 1541 میں ہمایوں نے حمید بانو بیگم سے نکاح کیا اور یہیں 1542 میں ہندوستان کے عظیم مغل بادشاہ اکبر کی پیدائش ہوئی۔ آخر کار جب ہمایوں کو کامیابی نہیں ملی تو وہ غزنی کے راستہ 1544 میں ایران پہنچا جہاں ایران کے فرمانروا طہماسپ نے اسے پناہ دی۔ ایرانی دربار میں بادشاہ کے دباؤ کے تحت ہمایوں نے بظاہر شیعہ مسلک اختیار کر لیا کیوں کہ وہ کسی طرح اپنی حکومت واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ طہماسپ نے مال و فوج سے ہمایوں کی امداد کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ فتح کے بعد قندھار، ایران کے سپرد کر دیا جائے۔ ہمایوں نے یہ شرط مانتے ہوئے 1545 میں قندھار، جو اس وقت عسکری مرزا کی ماتحتی میں تھا، فتح کر کے ایران کے حوالہ کر دیا۔ قندھار پر ہمایوں کی فتح سے متعدد چغتائی امراء بشمول مرزا ہندال، ہمایوں کے گرد جمع ہو گئے۔ کامران گھبرا کر کابل سے غزنی اور غزنی سے سندھ بھاگا اور اس طرح ہمایوں کے لیے 1545 میں کابل اور غزنی میں داخلہ آسان ہو گیا۔ اگلے آٹھ سالوں تک ہمایوں اور کامران کے درمیان افغانستان میں غلبہ کو لیکر کشمکش جاری رہی۔ آخر کار 1553 میں کامران مرزا قید ہوا اور ہمایوں کابل کا تنہا حکمراں بن گیا۔

ادھر شمالی ہند میں 1545 میں شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین بیٹا اسلام شاہ اپنے والد کی انتظامی اصلاحات اور مرکزی اقتدار کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ چنانچہ 1553 میں اس کے انتقال کے بعد سور حکومت پنجاب، آگرہ اور دہلی، بہار اور مشرقی علاقے اور بنگال میں منقسم

ہو گئی جس پر اس کا بیٹا اور خاندان کے دوسرے افراد حکومت کرنے لگے۔ ہمایوں اس غیر مرکزیت اور معاشی بدحالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1555 میں کابل سے لاہور پہنچ گیا اور بڑی آسانی سے آگے بڑھتا گیا۔ آخر کار پنجاب کے حکمراں سکندر شاہ سور سے سرہند کے مقام پر مقابلہ ہوا جس میں ہمایوں کو فتح نصیب ہوئی اور سکندر شاہ بھاگ کر شوالک چلا گیا اس طرح دہلی کا راستہ صاف ہو گیا۔ جون 1555 کو ہمایوں دہلی میں داخل ہوا اور دوبارہ اس نے اپنی کھوئی حکومت حاصل کی اور مغل سلطنت کا اقتدار بحال کیا۔

2.11 ہمایوں کی شکست کے اسباب (Causes of Humayun's Defeat)

یہ غور کرنا ضروری ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہمایوں کو مالوہ اور گجرات کے صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ شیر شاہ سے بھی شکست اٹھانی پڑی۔ مغل امراء کی ایک بڑی جماعت بابر کے دور میں وسط ایشیا سے شمالی ہند میں آکر آباد ہوئی تھی۔ ان کے لیے آگرہ اور دہلی کے علاقے چھوڑ کر گجرات، بنگال یا کسی بھی دور دراز کے علاقے میں مقیم ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ بنگال کی فتح کے بعد جب ہمایوں نے زاہد بیگ کو بنگال کا گورنر بنانا چاہا تو اس نے طنزاً کہا 'کیا اس کے علاوہ میرے قتل کا کوئی اور بہتر راستہ نہیں تھا'۔ امراء کے اس عدم تعاون کے سبب ہمایوں کو کئی موقعوں پر مشکلیں اٹھانی پڑیں۔ شیر شاہ، ہمایوں کے مقابلے میں ایک بہتر کمانڈر اور سیاست دان تھا۔ ہمایوں نے کئی موقعوں پر سست رفتاری سے کام لیا جبکہ اسے تیزی سے مارچ کرنے کی ضرورت تھی جیسے چنار کا محاصرہ اور بنگال پر حملہ وغیرہ۔ اسی سست رفتاری نے شیر شاہ کو اپنی طاقت مضبوط کرنے کا پورا موقع دیا۔ غالباً ہمایوں کو شیر شاہ کی جنگجوئی اور ارادوں کے سلسلے میں غلط فہمی تھی۔ وہ اس کو صرف ایک افغان کمانڈر سمجھتا تھا جس کو کبھی بھی دبایا جا سکتا تھا۔ جب تک شیر شاہ کے عزائم اس پر واضح ہوئے، شیر شاہ ایک مضبوط فوج کے ساتھ مشرق کا حکمراں بن چکا تھا۔ بابر کے جلد انتقال اور حال ہی میں مغل سلطنت کے قائم ہونے کے سبب حکومت کی جڑیں مقامی طور پر ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ مقامی سرداروں کی بغاوت کی وجہ سے ہمایوں کو گجرات اور مالوہ کے صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ہمایوں کے لیے ایک اہم مسئلہ اسکے بھائیوں کا باغیانہ رویہ بھی تھا۔ ہندال نے چوسا کی جنگ سے پہلے خود کی بادشاہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ کامران مرزا نے چوسا اور قنوج کی جنگوں کے موقعوں پر اپنی فوجوں سے شیر شاہ کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ حتی کہ جلاوطنی کے دور میں بھی کئی موقعوں پر ہمایوں کے قتل کی سازشیں ہوئیں۔ اگر ہمایوں کو اس کے بھائیوں کا تعاون ملتا تو شاید شیر شاہ کے حملہ کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

2.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر کا ہندوستان پر حملہ اور 1526ء میں مغل ریاست کی بنیاد دراصل وسط ایشیائی سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ اسکے علاوہ شمالی ہند میں ابراہیم لودی اور افغان امراء کے درمیان اقتدار کی کشمکش اور افغان سرداروں کی بغاوت نے بھی بابر کے لیے راہ ہموار کی۔ 1504ء میں کابل کو اپنا سیاسی اور فوجی مرکز بنانے کے بعد بابر نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر متعدد حملے کے اور بالآخر 1526ء میں پانی پت کے میدان میں لودی افواج کو شکست دی۔ 1527ء میں کھانوا کی جنگ میں بابر نے رانا سانگا کو ہرا کر شمالی ہند کی دوسری شرعی قوت کو بھی پسپا کر دیا اور اس طرح مغل ریاست کے قیام کو یقینی بنایا۔ ان جنگوں میں بابر ک فتح کا سبب رومی جنگی تدبیر

بالخصوص تلغمہ تکینک تھی۔ جس کی مدد سے بابر نے مخالف فوجوں کو چاروں طرف سے گھر کران پر حملہ کر دیا۔اس کے ساتھ ساتھ بابر نے بارود سے بھری بندوقوں اور ہلکی توپوں کا بھی خوب استعمال کیا جبکہ افغان اور راجوت فوجیں بارود کے استعمال سے ناواقف تھیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ بابر اور رانا سانگا کے درمیان جنگ مذہبی نہیں تھی، بلکہ یہ دو سیاسی قوتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ تھی۔1530ء میں بابر کی موت کے بعد ہمایوں حکمراں بنا جس کو شروع سے ہی بعض داخلی اور خارجی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمایوں کے دو بڑے سیاسی دشمن تھے۔ 1۔ مغرب میں بہادر شاہ گجراتی 2۔ مشرق میں افغان جماعتیں۔ سب سے پہلے ہمایوں نے بہادر شاہ کے خلاف مہم کا آغاز کیا اور متعدد کوششوں کے بعد بالآخر 1535ء میں مالوا اور گجرات جیسے اہم صوبوں پر قبضہ قائم کر لیا۔ گرچہ گجرات پر ہمایوں کا قبضہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا، لیکن بہادر شاہ کی شکست اور اس کو موت سے مغربی جانت سے لاحق خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ ہمایوں کے لیے سب سے بڑا چیلینج شیر خان کی بڑھتی ہوئی قوت تھی۔ شیر شاہ کے خلاف بنگال کی فوجی مہم ہمایوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔1539ء میں چوسا کے مقام پر شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی اور ان کے اور ان دونوں کے درمیان آخری مقابلہ 1540ء میں قنوج کے مقام پر ہوا جس میں ایک بار پھر ہمایوں کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہمایوں نے راہ فرار اختیار کی اور صفوی حکمران شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ شاہ کی فوجی مدد سے ہمایوں نے پہلے قندھار پھر کابل اور بالآخر 1555ء میں دوبارہ ہندوستان میں مغل ریاست کا اقتدار بحال کیا۔

2.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

رومی جنگی تدبیر : یہ بنیادی طور پر ایک دفاعی جنگی حکمت عملی تھی جس کا استعمال ترکوں نے ایرانیوں کے خلاف کیا تھا۔اس جنگی حکمت عملی میں فوج کے آگے لکڑی کی گاڑیوں کی قطاریں لگادی جاتی تھیں تاکہ مقابل فوج کے حملے سے بچا جاسکے اور اپنی فوج کے تیر انداز، یا توپچی محفوظ انداز سے دشمن کا نقصان کرتے رہیں۔

تزک بابری : یہ بابر بادشاہ کی سوانح عمری ہے جو اس نے خود ترکی زبان میں لکھی تھی۔اس کتاب میں بابر نے جنگی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مشاہدات اور وسط ایشیا اور ہندوستان کے مختلف پہلوؤں پر اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

شاہ طہماسپ : ایران کے صفوی خاندان کا حکمراں جس نے 1544ء میں ہمایوں کو پناہ دی اور بالآخر اسی کی مدد اور فوجی تعاون سے ہمایوں مغل سلطنت کا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو پایا۔

بارودی حکومتیں : ('Gunpowder Empire') مغل ریاست کے حوالے سے بعض مورخین کا یہ نظریہ ہے کہ اس کے قیام اور ہندوستانیوں اور راجپوتوں کے مقابلے اس کی فتح کے پیچھے اصل سبب اور محرک بارود کا بہتر استعمال تھا جس کی وجہ سے مغل ریاست کی فوجی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔اسی طرح کے خیال کا اظہار سلطنت عثمانیہ اور صفوی سلطنت کے بارے میں کیا گیا۔ان تینوں سلطنتوں کو مائکل ہاجسن (Michael Hodgson) نے مجموعی طور پر بارودی سلطنتیں کہا۔

2.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بابر نے کابل پر کس سال قبضہ کیا تھا؟

(الف) 1496 (ب) 1501 (ج) 1504 (د) 1526

2. کھانوا کی جنگ (1527) کن کے درمیان لڑی گئی تھی؟

(الف) بابر اور ابراہیم لودی (ب) بابر اور رانا سانگا (ج) ہمایوں اور شیر شاہ (د) بابر اور محمود لودی

3. چوسا کی جنگ (1539) میں ہمایوں کو کس نے شکست دی؟

(الف) بہادر شاہ گجراتی (ب) رانا سانگا (ج) شیر خان (شیر شاہ) (د) محمود خلجی

4. بابر نے اپنی سوانح حیات 'تزک بابری' کس زبان میں لکھی تھی؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) ترکی (د) اردو

5. جلاوطنی کے دوران ہمایوں کو کس ایرانی حکمران نے پناہ دی تھی؟

(الف) شاہ اسماعیل (ب) شاہ طہماسپ (ج) نادر شاہ (د) احمد شاہ

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بابر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
2. بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں کو درپیش داخلی اور خارجی مشکلات کا جائزہ لیجیے۔
3. پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب پر ایک مضمون لکھیے۔

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سیاسی کشمکش کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیجیے۔
2. ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کا ایک تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(ج), 4-(ج), 5-(ب)

اکائی 3۔سور خاندان: شیر شاہ اور اس کا نظم ونسق

(Sur Dynasty: Shershah and His Administration)

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		فرید خان/شیر شاہ
	3.2.1	ابتدائی حالات زندگی اور فتوحات
	3.2.2	شیر شاہ بطور حکمراں
	3.2.3	سلطنت کی وسعت
3.3		سور انتظامیہ
	3.3.1	مرکزی حکومت
	3.3.2	صوبائی نظم ونسق
	3.3.3	زمینی مالگزاری انتظامیہ
	3.3.4	عدل وانصاف
	3.3.5	دیگر انتظامی اصلاحات
3.4		شیر شاہ کے جانشیں
3.5		اکتسابی نتائج
3.6		کلیدی الفاظ
3.7		نمونہ امتحانی سوالات

3.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سور خاندان کے مقام کا تعین، رشبروک ولیمس (Rushbrooke Williams) نے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا ہے۔ 'یہ تیموری خاندان کی غیر معمولی خوش قسمتی تھی کہ آخر کار وہ اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، ایسی وراثت جسے افغان شیر شاہ نے مضبوط کیا تھا۔ شیر شاہ ایسا منتظم تھا جس میں تخلیقی صلاحیت تھی اور جس نے انجانے میں ہی مغلوں کے لیے نظم و نسق کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کر دیا جسے مغل خود بنانے کی استعداد نہیں رکھتے تھے، بھلے ہی انہوں نے بادشاہت کے ایک نئے معیار کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔'

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- فرید خان کے شیر شاہ بننے تک کے سفر کو جان سکیں گے۔
- ایک حکمراں کے طور پر شیر شاہ کی شخصیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سور انتظامیہ میں مرکزی حکومت اور صوبائی نظم و نسق کے بارے میں جان سکیں گے۔
- سور مالگزاری انتظامیہ اور مالگزاری کے ادائیگی کے طریقوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- شیر شاہ کے عدل و انصاف اور دیگر انتظامی اصلاحات کے بارے میں جان سکیں گے۔

3.2 فرید خان/شیر شاہ (Farid Khan/Sher Shah)

تقریباً 500 سال پہلے 1528 کا واقعہ ہے۔ ہندوستان کی راجدھانی آگرہ میں ہر طرف گہما گہمی کا ماحول ہے۔ مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر چندیری فتح کر کے راجدھانی لوٹ آئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کو ہندوستان میں مستحکم بنا چکے ہیں۔ جشن فتح کے ساتھ شاہی ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ضیافت میں مرغ، مچھلی، ہرن کا گوشت، کباب، پلاؤ، نان کے علاوہ دستر خوان پر دیگر پھلوں کے ساتھ ماہیچے (ایک قسم کا پھل) بھی دستر خوان پر رکھے گئے ہیں۔ بابر بھی اپنے امیروں اور وزیروں کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ اچانک ان کی نگاہ ایک افغان نوجوان پر پڑتی ہے جو ماہیچے کو اپنے انداز میں چھری کانٹے کے بجائے خنجر نکال کر اس کے ٹکڑے کر کے آرام سے کھا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بابر کے دل میں ایک طرح کی تشویش پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے پاس موجود اپنے وزیر اعظم میر خلیفہ سے کہتے ہیں کہ اس شخص کے آثار سے ایسا لگتا ہے کہ یہ بدامنی کا سبب بنے گا، 'اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔' میر خلیفہ بادشاہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کی گرفتاری مصلحت کے خلاف ثابت ہو گی اور افغان سرداروں میں یہ تاثر جائے گا کہ مغل، افغانوں سے دلی بغض و عناد رکھتے ہیں۔ اس افغان نوجوان کی گرفتاری تو نہیں ہوتی لیکن بابر بے چین ہو جاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ اس پر کڑی نظر رکھی جائے اور اس کے احوال سے شہنشاہ کو باخبر رکھا جائے کیونکہ 'وہ بہت چالاک آدمی ہے اور اس کی پیشانی پر حکومت کے آثار نمایاں ہیں'۔۔۔ 'میں نے کتنے ہی افغان سور مادیکھے ہیں

لیکن کسی نے بھی مجھے پہلی ملاقات میں اتنا متاثر نہیں کیا جتنا اس شخص نے کیا ہے۔ اس کے جاہ و جلال کے آثار ہمارے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔' ادھر یہ افغان نوجوان بادشاہ اور وزیر کو اس طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور باہم بات چیت کرتے دیکھتا ہے۔ وہ دوری کے سبب ان کی باتیں تو نہیں سن پاتا لیکن اپنی ذہانت سے سمجھ لیتا ہے کہ اسی کا تذکرہ چل رہا ہے اور بادشاہ کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ تیزی سے کھانا کھا کر وہ مغل شاہی کیمپ سے اور پھر راجدھانی آگرہ سے ہی نکل جاتا ہے۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ مغلوں کا سب سے بڑا دشمن اور ہندوستان میں دوسرے مغل بادشاہ ہمایوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اسے در بدر بھٹکنے پر مجبور کر دینے والا، شیر شاہ سوری تھا جس نے سلطنت سور کی بنیاد ڈالی۔ بابر کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور دس سال بعد تو وہ حقیقت میں بدل گیا جب شیر شاہ سوری نے بابر کے جانشین اور مغل حکمران ہمایوں کو ہندوستان سے باہر جانے پر مجبور کر دیا۔ شیر شاہ سوری نے شمالی ہندوستان پر صرف پانچ سال (17 مئی 1540 سے 22 مئی 1545 تک) حکومت کی لیکن اس نے تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا جس میں اس کا حسن انتظام ایک ایسا روشن مینارہ ثابت ہوا جس سے بعد کے حکمرانوں بطور خاص مغل بادشاہ اکبر نے بیحد استفادہ کیا اور انتظام مملکت میں اس کے نمونے پر عمل کیا۔ اس کا چلایا ہوا روپیہ جدید دور میں بھی ایک معیاری سکہ ثابت ہوا جس کا وزن 178 گرین تھا۔ روپیہ تو پہلے بھی رائج تھا لیکن اس کی مقدار طے نہ تھی۔

3.2.1 ابتدائی حالات زندگی اور فتوحات (Early Life and Conquests)

شیر شاہ کی پیدائش کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مانتے ہیں کہ وہ 1486 میں ہریانہ کے حصار میں پیدا ہوا۔ اس کا حقیقی نام فرید خان تھا اور وہ سہسرام، حاجی پور اور خواص پور کے جاگیر دار حسن خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ حسن خان کا باپ ابراہیم خان، بہلول لودھی کے دور میں ہندوستان آیا تھا اور یہ جاگیر حاصل کی تھی۔ فرید خان کے والد حسن خان نے کالکاپور کے مسند اعلیٰ اور بہلول لودھی کے منظور نظر وزیر عمر خان سروانی کے یہاں ملازمت اختیار کی جس نے شاہ آباد پرگنے میں کئی گاؤں حسن خان کو جاگیر کے طور پر حوالے کیے۔ سکندر لودھی کے دور میں جب جمال خان کو عظمت حاصل ہوئی تو اس نے حسن خان کو اس کے والد ابراہیم خان کی جاگیر کے علاوہ 500 گھڑ سواروں کا افسر مقرر کیا اور بنارس کے پاس سہسرام، حاجی پور اور ٹانڈہ کی جاگیریں اس کی ملکیت میں دیں۔ فرید کو اس کے والد حسن خان نے اپنی جاگیر کا انتظام سونپا۔ فرید کے حسن انتظام کی جب شہرت ہوئی تو باپ تو خوش ہو لیکن سوتیلی ماں حسد میں جل بھن گئی۔ فرید خان نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فرائض سے سبکدوشی اختیار کی اور وہاں سے نکل گیا۔ کچھ دن جونپور رہ کر تعلیم حاصل کی اور اسی درمیان آگرہ جا کر لودھی سلطان سے اپنے باپ سے اپنا حصہ دلوانے کی عرضداشت پیش کی جسے اس نے نہایت برہمی کے ساتھ ٹھکرا دیا اور کہا کہ کیسا فریادی ہے کہ اپنے باپ کے خلاف شکایت کرتا ہے۔ حالانکہ باپ کی موت کے بعد اپنے بھائی نظام شاہ کی مدد سے باپ کی وراثت اسے حاصل ہو گئی اور لودی سلطان نے بھی اس کی توثیق کر دی۔

اس وقت ہندوستان میں ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔ ابراہیم لودھی کے مرکزیت پسند اور سخت رویے کی وجہ سے متعدد علاقوں کے امرا باغی ہو گئے۔ بہار میں دریا خان لوحانی نے اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔ دریا خان لوحانی کے انتقال کے بعد امراء نے اس کے بیٹے بہار خان لوحانی کو حکمراں مقرر کیا گیا۔ فرید خان کے پرگنے بہار خان کی سلطنت سے متصل تھے اس لیے اس نے بہار خان کا ساتھی بننے میں اپنی

حفاظت سمجھی کیونکہ چونڈ کا جاگیر دار سردار محمد خان اس کے سوتیلے بھائی سلیمان کی حمایت کر رہا تھا۔ جلد ہی بہار خان کو فرید خان کی لیاقت، محنت، وفاداری اور جانثاری کی وجہ سے اس پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوتے چلے گئے۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودھی کی بڑی فوج کی بدترین شکست کا سن کر بہار خان نے سلطان محمد کا لقب اختیار کر کے بہار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا سکہ جاری کیا۔ انہیں دنوں ایک بار بہار خان، فرید خان کے ساتھ شکار پر گیا۔ جنگل میں گھومنے کے دوران اچانک ایک شیر نے اس پر حملہ کر دیا۔ فرید لپک کر شیر اور بہار خان کے درمیان آگیا۔ یہ دیکھ کر شیر نے فرید پر حملہ کر دیا۔ فرید نے شیر کا وار بچا کر اپنی تلوار سے ایسا نپا تلا وار کیا کہ ایک ہی ضرب میں شیر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سب لوگ فرید خان کی بہادری سے دنگ رہ گئے۔ بہار خان فرید خان کی اس بہادری اور جاں نثاری سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے شیر خان کا خطاب دے کر اپنے بیٹے کا استاد اور نگراں مقرر کر دیا۔ اس دن سے فرید خان کو شیر خان کے نام سے ہی جانا جانے لگا۔

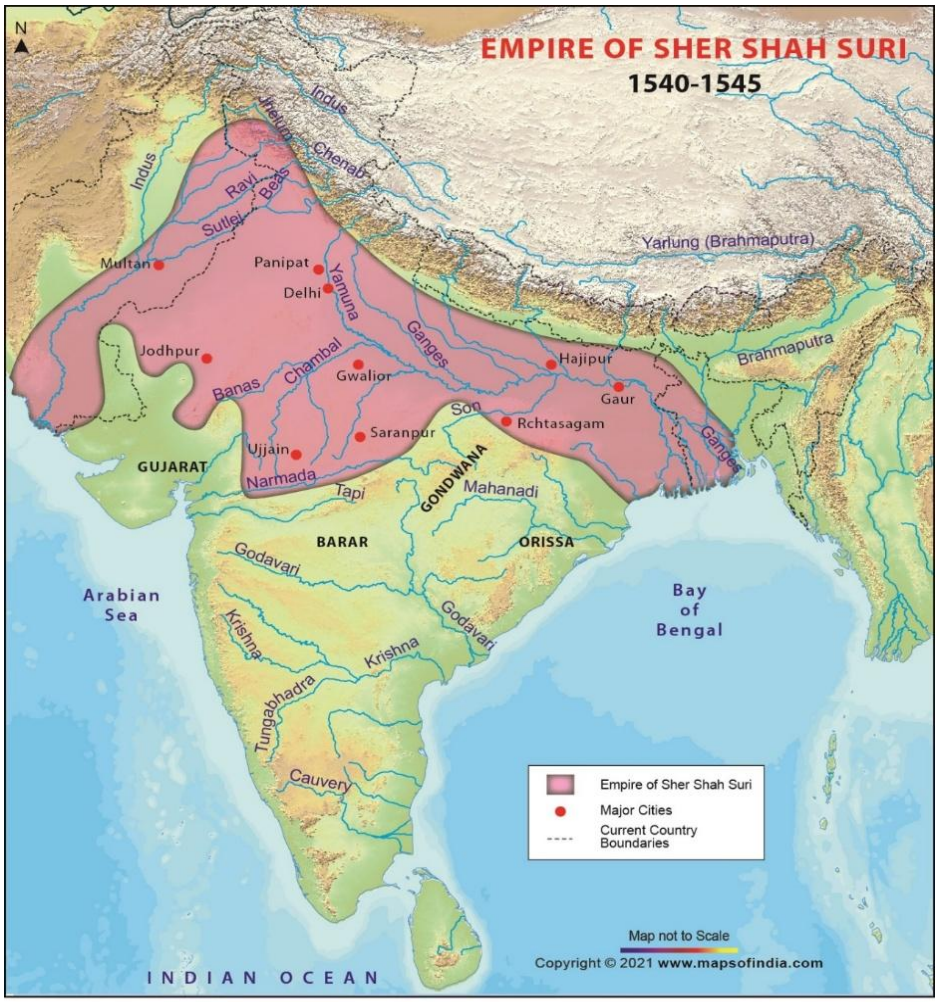
بہار خان کی بادشاہت کے اعلان اور شکست خوردہ افغانوں کے اس کے ارد گرد اکٹھا ہو جانے کا سن کر بابر نے اس کی سرکوبی کے لیے مشرقی مہم کا ارادہ کیا تو ہمایوں نے اس مہم کے لیے اپنا نام پیش کر دیا۔ بابر نے بھی ہمایوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ ہمایوں نے باغی افغانوں کی اچھی طرح گوشمالی کی۔ ادھر شیر خان کے تعلقات بہار خان سے بگڑ گئے کیونکہ وہ حاسد امرا کے بہکاوے میں آکر شیر خان سے بدظن ہو گیا۔ اس نے اپنی جاگیر اپنے سوتیلے بھائیوں کے حوالے کر کے مغل گورنر جنید برلاس کی امان کی یقین دہانی کے بعد اس کے پاس جونپور چلا گیا۔ اس نے تقریباً سوا سال تک مغل فوج میں خدمات انجام دیں۔ 16 مارچ سنہ 1527 میں خانوا (کنوا) کی جنگ کے بعد جنید برلاس کے ساتھ ہی شیر خان بابر کے دربار میں پہنچا جہاں جنید اور وزیر اعظم کے کہنے پر بابر بادشاہ نے شیر خان کو سہسرام میں اس کی جاگیر عطا کی۔ لیکن بابر کے دسترخوان پر شیر خان کی مذکورہ واقعے نے بابر کے دل میں شک پیدا کر دیا۔

اکبر کے درباری مورخ عباس خان سروانی کی شیر شاہ سے رشتہ داری تھی۔ اکبر نے اسے افغانوں کی تاریخ نویسی کا کام سونپا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ شیر شاہ شروع سے ہی عالی ہمت اور بلند حوصلے والا تھا اور مغلوں سے حکومت چھیننے کا خواب دیکھتا تھا جبکہ دوسرے افغان اسے سر پھرا اور شیخی باز سمجھتے تھے۔ شروانی، شیر شاہ کو سکندر ثانی کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ 'چندیری کی مہم میں سکندر ثانی (شیر شاہ)، ظل سبحانی بابر بادشاہ کے لشکر کے ساتھ تھا۔ شیخ ابراہیم سروانی نے مجھ سے آکر کہا آؤ شیر خان سور کے پاس چلیں۔ وہ اپنے مرتبے سے بڑھ کر ایسی باتیں زیادہ کرتا ہے کہ لوگ ہنستے ہیں۔ ہم سوار ہو کر اس کے ڈیرے میں گئے۔ باتوں باتوں میں شیخ ابراہیم نے کہا مشکل ہے کہ ملک ہندوستان، پھر افغانوں کے ہاتھ آئے اور مغل ہندوستان سے خارج ہوں۔ شیر خان نے شیخ محمد کو کہا، گواہ رہیو کہ میرے اور شیخ ابراہیم کے درمیان جو بات ہوتی ہے، اگر میرے طالع نے یاوری کی تو تھوڑے دنوں میں مغلوں کو ہند سے نکال دوں گا۔ اس لیے کہ مغل تلوار کی لڑائی میں افغانوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپس کی مخالفت کے سبب افغانوں نے ہند کا ملک اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ جب سے میں مغلوں میں آیا اور ان کی لڑائی کا معلوم کیا تو پایا کہ ان کے پاؤں لڑائی میں نہیں ٹھہرتے اور بادشاہ ان کا اعلیٰ نسبی اور بلند مرتبے کے باعث اپنی ذات سے تدبیر ملک میں متوجہ نہیں ہوتا اور امور مملکت کی مہمات کو اپنے امرا اور ارکان دولت کو سونپ دیتا ہے اور ان کے قول و فعل پر اعتماد کرتا ہے اور دیہی رعیت، سپاہی اور زمیندار جو حرام

خور ہیں ان کے برآمد کار کے لیے دام رشوت میں گرفتار ہیں۔ بھلا برا سب پیسے کے زور سے اپنے کام نکالتا ہے۔ زر کی طمع کے سبب سے دوست ودشمن میں آپ فرق نہیں کرتے۔ اگر اقبال نے یاوری کی تو شیخ جی دیکھو گے یا سنو گے کہ افغانوں کو اس طرح قابو میں کروں گا کہ متفرق نہ ہونے دوں۔' شیر خان کی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ اس سے قبل جب پہلی بار اسے اپنے پرگنے کا انتظام سونپا گیا تھا تو اس نے دوٹوک ریاعا کی خاطر زمین دار اور پٹواریوں پر لگام ڈالی تھی۔ ادھر بادشاہ بابر کے انتقال کے بعد شیر خان افغانوں کو یکجا کرنے اور اپنی طاقت کو بڑھانے میں لگ گیا۔ اس نے پہلی اہم جنگ بنگال کے سلطان محمود کے خلاف لڑی اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ میں شیر شاہ نے منفرد جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ بنگال پر شیر شاہ کے قبضے نے ہمایوں کو خواب غفلت سے جگایا جو کہ بابر کے بعد ہندوستان کا حکمراں بنا۔ شیر شاہ نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کی حکمراں لاڈ ملکہ سے شادی کر لی۔ اس طرح چنار کا قلعہ اور اس میں موجود لودیوں کا خزانہ شیر شاہ کے ہاتھ میں آگیا جس سے اسے اپنی فوج کو بڑھانے اور مزید منظم کرنے کا موقع ملا۔

ہمایوں کو گجرات کے بہادر شاہ کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ شیر شاہ پر آغاز میں پوری توجہ نہ دے سکا۔ اسے اپنے بھائیوں سے بھی کسی طرح کی مدد حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے پہلی بار جب چنار کے گرد گھیرا ڈالا تو خبر ملی کہ گجرات کا بہادر شاہ مغلوں پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ مجبوراً اسے شیر خان سے صلح کرنی پڑی۔ بہادر شاہ کا معاملہ نپٹانے کے بعد وہ دوبارہ شیر خان کی طرف بڑھا لیکن شیر خان نے مقابلہ کرنے کے بجائے اسے بنگال کے دارالحکومت گوڑ جانے دیا۔ اس مہم میں ہمایوں کا بہت سرمایہ، سپاہی اور وقت ضائع ہو گیا اور وہ برسات کی وجہ سے کئی مہینے بنگال میں پھنسا رہا۔ اس نے آگرہ سے کمک منگوائی جو کہ اسے نہیں ملی۔ 1539 میں واپسی کے سفر میں کرمناسا ندی کے کنارے چوسہ کے مقام پر اس کا تازہ دم افغان فوجوں سے سامنا ہوا۔ یہاں اسے زندگی کی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ندی عبور کرتے ہوئے اس کی جان ایک بھشتی نے بچائی۔ 1540 میں قنوج کے مقام پر وہ تیاری کے ساتھ شیر خان کے مقابلے پر آیا۔ یہ فیصلہ کن معرکہ بلگرام کی جنگ تھا جس میں شیر خان کامیاب ہوا اور ہمایوں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

اس کے بعد شیر خان نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا اور شیر شاہ کے لقب سے ہندوستان میں سور سلطنت کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ مزید وسیع کیا اور پنجاب، مالوہ، ملتان اور سندھ کے علاقوں کو کامیابی سے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس کی سب سے سخت اور مشہور عسکری مہم راجپوتانہ کی تھی، جہاں 1544ء میں جنگ سمیل میں راجا مالدیو کے خلاف اسے اس قدر کڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ فتح کے بعد اس کی زبان سے یہ تاریخی جملہ ادا ہوا کہ ''میں نے مٹھی بھر باجرے کے لیے ہندوستان کی پوری سلطنت خطرے میں ڈال دی تھی''۔ راجپوتانہ کو مسخر کرنے کے بعد شیر شاہ نے 1545ء میں بندیل کھنڈ کے مضبوط قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا۔ اسی محاصرے کے دوران جب قلعے کی فصیل کو گولہ باری سے اڑانے کی کوشش کی جارہی تھی، تو ایک گولہ دیوار سے ٹکرا کر واپس اس بارود کے ذخیرے پر آگرا جہاں شیر شاہ کھڑا تھا۔ اس خوفناک دھماکے میں وہ شدید جھلس گیا، تاہم اپنی جان لیوا تکلیف کے باوجود اس نے محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔ بالآخر 22 مئی 1545ء کو قلعہ کالنجر کے فتح ہونے کی خوشخبری سننے کے چند لمحوں بعد ہی یہ عظیم فاتح اور منتظم اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا، جس کے بعد اسے سہسرام (بہار) میں اس کے اپنے تعمیر کردہ شاندار مقبرے میں دفن کیا گیا۔



تصویر 4.1۔ شیر شاہ کی سلطنت (1540-1545ء)

(Source: https://www.mapsofindia.com/history/sher-shah-suri-empire.html)

3.2.2 شیر شاہ بطور حکمراں (Sher Shah as a Ruler)

کسی مستند معاصر تاریخی کام کی عدم موجودگی میں، اکبر کے دور میں عباس خان سروانی کی تحریر کردہ تاریخ شیر شاہی کو ریاستی تاریخ سمجھا جانا چاہیے۔ ابتدا میں اس نے غالباً تحفہ اکبر شاہی لکھنے کے لیے منصوبہ بنایا جس کے تین ابواب تھے لیکن شیر شاہ اور اسلام شاہ سے متعلق صرف پہلے دو ابواب ملے ہیں۔ شیر شاہ کی جو عوامی شبیہ اب تک بنی ہے اس کا سہرا صرف عباس خان کے سر ہے۔ جدید دور کے مورخین جیسے کے۔ آر۔ قانون گو (K. R. Kanungo) نے بھی اسی شبیہ کو اپنے مطالعہ میں 'شیر شاہ اور اس کا دور' کے عنوان سے قبول کیا ہے۔ پرماتما سرن (P. Saran) اور کچھ دوسرے دانشوروں نے مؤثر طریقے سے قانون گو کے خیالات پر سوال اٹھائے ہیں۔ شیر شاہ کا معروضی جائزہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم یہاں عباس خان اور ان کی تخلیق کا مختصر مگر تنقیدی جائزہ لیں گے۔

عباس خان کے کام کی اصل بنیاد یہ تھی کہ افغانوں کو میدان جنگ میں مغلوں سے زیادہ فوقیت حاصل تھی اور افغانوں میں اتحاد کا فقدان ہی پہلی افغان سلطنت کے خاتمے کا سبب بنا۔ اس لیے افغانوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور شیر شاہ کی طرف سے

دوسری افغان سلطنت کا قیام ایک بڑی کامیابی تھی۔ افغانوں کی ابتدائی ناکامیوں، شیر شاہ کی کامیابی اور شیر شاہ کے جانشینوں کی ناکامیوں سے متاثر ہو کر عباس خان نے شیر شاہ کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی۔ شیر شاہ کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظامی ڈھانچے کی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے ایک مثالی نظام قرار دیا ہے۔ اس نے نہ صرف اصل تفصیلات کو اپنے متعصبانہ نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ شاید افغان دولت مشترکہ اور اس میں سلطان کے کردار کو بھی اپنے مثالی اور خیالی خاکے میں چسپاں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے عباس خان نے اپنی لمبی لمبی تقریروں اور الفاظ کو اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ وہ سلطان کو بہت سے کرداروں والی ایک جامع شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے: افغانوں کے سرپرست کے طور پر، اتحاد، احیاء نو اور امید کی علامت کے طور پر، ایک غیر معمولی قائد کے طور پر، ایک ہوشیار اور سخت جرنیل کے طور پر اور ایک تجربہ کار عوامی حکمران کے طور پر۔

اس کے نزدیک حکمران کی رہنمائی کے لیے درج ذیل چیزیں ضروری ہیں۔

- عدل وانصاف: 'حکومت ظالموں سے عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا ذریعہ ہے اور سرکاری ملازمین کے ظلم سے تحفظ کی بنیاد ہے۔'
- اس کی فکر کا سب سے بڑا موضوع اس کی رعایا یا عوام تھے۔ عوام ہی معاشی نظام کی بنیاد تھے، اس لیے اسے امیر طبقے اور سرکاری عاملوں دونوں کی لوٹ مار سے بچانا ضروری تھا۔
- افغانوں کے رہنما ہونے کے ناطے سلطان کا فرض تھا کہ وہ افغانوں کو تحفظ فراہم کرے، ان کی خدمات ریاست کے انتظام کے لیے استعمال کرے۔ لیکن اقتدار اعلیٰ خدا کا تحفہ ہے، اس لیے انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اسے سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے۔
- منصب اور مقام کی بلندی اور وقار، حکمران کا وقت اور توانائی خرچ کرتی ہے۔ 'اعلیٰ ترین کو ہمیشہ متحرک رہنا چاہیے۔'

واضح رہے کہ عباس خان کے یہ تمام بیانات اس کے اپنے دور کے ہیں اور یہ زمانہ شہری ہویں صدی کا آخری دور تھا۔ شیر شاہ کے بارے میں قانون گو کے خیالات، عباس خان کے تعصبات سے بہت زیادہ متاثر رہے، اور عباس خان کے تعصبات شیر شاہ اور افغان ریاستی وفاق کے حق میں تھے۔ تاریخ میں شیر شاہ کے مقام کے بارے میں، قانو نگو لکھتے ہیں، 'تاریخی دستاویزات کی کمی کے باوجود، جو بھی مواد دستیاب ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی سلطنت جن نظریات پر مبنی تھی، ان کا ماخذ شیر شاہ کے نظریات میں پایا جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے حکمرانوں میں، شیر شاہ واحد حکمراں تھا جو ایک نئے ہندوستان کے لیے نمونہ عمل بن سکتا تھا- ایک ایسا ہندوستان جو ہندو اور مسلمان دونوں کا ہو اور جس میں دونوں کے درمیان دلی اتحاد قائم رہے۔' وہ ایک قومیت کے معمار کے طور پر شیر شاہ کی شبیہہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں: 'شیر شاہ اور اکبر کے درمیان یہ تنازعہ ہو سکتا ہے کہ متضاد عقائد کے لوگوں کے درمیان میل ملاپ کروا کر ایک طاقتور ہندوستانی قوم کی تعمیر کی کوشش کرنے والا پہلا شخص کون تھا۔ شیر شاہ نے ملک کو ایک مضبوط، منصفانہ اور دانشمندانہ حکومت دی، ہندوؤں کی سیاسی بحالی اور معاشی خوشحالی کے لیے کام کیا اور دونوں برادریوں کو مل کر کام کرنے اور بیرونی اتحاد کی حفاظت پر مجبور کیا۔ اس نے نوزائیدہ قومیت کی ترقی کے بنیادی تقاضے پورے کیے، یعنی اس نے زمین کو ہموار کیا اور بیج بویا۔'

شیر شاہ کو اس کے صحیح تاریخی تناظر میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ درج بالا بیانات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شیر شاہ جب اڑسٹھ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا تو وہ ایک تجربہ کار اور ماہر منتظم تھا۔اس میں فرض منصبی سے گہرا لگاؤ موجود تھا۔ وہ غیر معمولی توانائی سے بھرا ہوا تھا اور اپنے روزمرہ کے معمولات کا بیشتر حصہ انتظامی امور کی دیکھ بھال میں صرف کرتا تھا۔ وہ بابر اور ہمایوں کے رائج کردہ نظاموں کا بہت بڑے ناقد تھا اور جب بھی اسے موقع ملا وہ پوری تندہی سے اس کی اصلاح کرنے میں لگ جاتا۔ شیر شاہ کو نہ صرف اکبر کے پیش رو ایک سلطنت قائم کرنے والے اور منتظم کے طور پر جانا جاتا ہے بلکہ اسے اکبر سے زیادہ تخلیقی ذہانت کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے۔ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اگر اس کے پاس زیادہ وقت ہوتا تو شاید اس نے اپنا شاہی خاندان قائم کر دیا ہوتا اور تب عظیم مغلوں کو ہندوستانی تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔

شیر شاہ ایک تجربہ کار اور ماہر منتظم تھا۔اس میں فرض کا احساس اور غیر معمولی توانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوی تھی۔اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ ماننا کہ وہ ایسے انتظامی اصولوں کے پیش رو تھے جو نہ صرف مغلیہ نظم و نسق کی بنیاد بنے بلکہ جنہیں انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنایا، اس کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے۔ تفصیلی بیانات کی عدم موجودگی میں بھی یہ اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے کہ شیر شاہ کا مرکزی نظم و نسق پہلے کے نمونوں پر مبنی تھا۔اس کا ذاتی مطلق العنان نظام اور مرکزی ریاست کی تشکیل- یہ دونوں تنظیمی امور اس عمل کا حصہ تھے جسے سکندر لودی اور ابراہیم لودی نے شروع کیا تھا۔ یہی نہیں، لودیوں کا نظام بھی بلبن اور علاؤالدین خلجی کے بنائے ہوئے اداروں کی پیداوار تھا۔

اقتدار حسین صدیقی (Iqtidar Hussain Siddiqui) کے مطابق بہلول لودی پہلا مطلق العنان افغان حکمران تھا۔ شیر شاہ نے وکیل جیسا کوئی نیا ادارہ قائم نہیں کیا۔ایسا نیا ادارہ اکبر کے دور میں قائم ہوا۔ بنگال کو چھوڑ کر، دیگر جگہوں پر شیر شاہ کے ذریعے عمل میں لائی گئی انتظامی تقسیم اس کے پیشروؤں کے نمونوں پر مبنی تھی۔ کوئی نیا صوبہ نہیں بنایا گیا تھا۔ مقامی ذیلی صوبوں کا قیام، شہری انتظامیہ اور زمینی مالگزاری انتظامیہ وغیرہ تمام نظام اپنے سابقہ موجودہ نظاموں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ گھوڑوں کو داغنے (داغ) اور فوجیوں کی جسمانی تفصیلات (چہرہ) رکھنے کے طریقے بھی رائج تھے۔ لیکن شیر شاہ ایک عظیم مصلح تھا، اس لیے اس نے موجودہ اداروں میں بہت سی اصلاحات کیں اور انہیں مزید موثر بنایا۔ انہی کاموں سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

3.2.3 سلطنت کی وسعت (Extent of Empire)

شیر شاہ نے مغل بادشاہوں بابر اور ہمایوں سے بھی بڑے علاقے پر حکومت کی۔اس کی سلطنت مشرق میں سنار گاؤں سے شمال مغرب میں گکھڑ کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مغربی سرحدی خط شمال میں جہلم کے کنارے بالناتھ جوگی اور جنوب مغرب میں 100 میل دور واقع خوشاب کو جوڑتا تھا اور پھر جہلم کے پار سندھ کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے بھکر تک چلا جاتا تھا۔افغان سرداروں نے سندھ کو شیر شاہ کے حوالے کر دیا تھا لیکن جیسلمیر کا صحرائی علاقہ اور بیکانیر اور جودھ پور کے کچھ حصے سور حکمرانی کے دائرہ اختیار سے باہر ہی

رہے۔ جنوب میں اس کی سلطنت وندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ پورا راجپوتانہ، مالوااور کالنجر اس کے زیر تسلط تھے۔اس کے جانشین، سلطنت کی حدود کواس سے زیادہ نہیں بڑھاسکے۔ شیر شاہ کی سلطنت کی وسعت، شیر شاہ کے جاری کردہ سکوں اور عباس شروانی کی پیش کردہ تفصیلات سے ثابت ہوتی ہے۔



تصویر4.2۔ شیر شاہ سوری کے زمانے کی سرائے غازیہ آباد میں گرانڈ ٹرنک روڈ کے پاس دریافت ہوئی ہے۔ بشکریہ جنزن
(https://www.bbc.com/urdu/regional-57205295)

اتنے وسیع و عریض علاقے کو منظم کرنا کسی بھی حکمراں کے لیے ایک انتھک کام تھا۔ عباس سروانی نے شیر شاہ کے روزمرہ کے معمولات کے بارے میں لکھاہے: 'عزت وو قاراور مقام و مرتبہ کے ساتھ جڑی ہوئی اس کی عظمت کی وجہ سے، اپنی ریاست کے کسی کام کو کبھی چھوٹا یا غیر اہم نہیں سمجھتااور اسے اپنے وزیروں کے غیر ضروری اعتماد پر نہیں چھوڑتا۔' سروانی سے ہمیں معلوم ہوا کہ شیر شاہ نے رات اور دن دونوں کو مختلف کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا۔اپنے محکموں کے سربراہوں سے ملنے کے کام سے آغاز کرکے اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں سے آنے والی عرضیوں اور خبروں کو سننے، فوجوں کا معائنہ کرنے، گھوڑوں کو داغنے، لوگوں کی وضاحتی فہرستیں بنوانے، حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے اور مالگزاری افسران سے رپورٹیں وصول کرنے جیسے امور کے لیے الگ الگ اوقات مقرر کیے تھے۔

3.3 سورانتظامیہ (Sur Administration)

3.3.1 مرکزی حکومت (Central Government)

شیر شاہ کی سلطنت ایک مرکزی مطلق العنان ریاست تھی، جو بظاہر افغانی روایات پر عمل پیرا تھی، لیکن حقیقت میں یہ ترک خصوصیات کی حامل تھی۔اس نے افغان سلطنت کے احیاء کے لیے سخت محنت کی۔ وہ افغانوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا تھااور انہیں ہندوستان میں مستقل طور پر آباد کرنا چاہتا تھا۔اس نے افغانوں کو متعدد اہم شاہی اور ریاستی خدمات پر فائز کیا تھا۔اس کے ساتھ ہی مقامی لوگوں ہندوؤں

اور مسلمانوں کو بھی انتظامیہ میں شامل کیا گیا۔ حکومتی عہدوں کے دروازے ہر اس شخص پر کھلے تھے جو اس کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد افغانوں کو اس طرح منظم کرنا تھا کہ ان کی قبائلی سیاست کے نقائص دور ہو جائیں اور ایک نو زائیدہ افغان خود مختار سلطنت کو استحکام حاصل ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کے دور میں کبھی وزیر کا عہدہ تھا یا نہیں۔ اس عہدے کی عدم موجودگی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ شیر شاہ اپنی حکومت کی ہر شاخ اور روزمرہ کی انتظامیہ کی دیکھ بھال خود کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کے اعلیٰ عہدے کے قیام سے افغان سرداروں کے درمیان مزید دشمنی پیدا ہو۔ شاید ان وجوہات کی بناء پر ہمیں مرکزی حکومت جیسی کسی بھی تنظیم اور وزراء یا محکموں کے سربراہوں کی تقرری کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریاست کی پوری مشینری کی کایا پلٹ کرنے کے لیے پانچ سال کا وقت بہت کم رہا ہو۔ ایک نوجوان فرید کے طور پر، اس نے اپنے والد کی جاگیر کے منتظم کے طور پر گاؤں اور پرگنہ انتظامیہ میں کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے چھوٹے درجے کے انتظامی ڈھانچے کی اصلاح کے کام سے شروع کیا۔

3.3.2 صوبائی نظم ونسق (Provincial Administration)

صوبہ یا سرکار؟

قانون گو شاید چاہتے ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ شیر شاہ کے دور میں 'سرکار' سے بڑی کوئی انتظامی اکائی نہیں تھی اور یہ بھی کہ اکبر نے ہی صوبوں کو بنایا اور صوبیدار مقرر کیے۔ قانونگو کے مطابق، شیر شاہ کے صوبائی نظم ونسق کی مثال بنگال تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ شیر شاہ نے بنگال میں ایک بالکل نیا نظام رائج کیا تھا، جو سلطنت کے باقی حصوں کے نظم ونسق کی بنیاد بن گیا۔ اس سے پہلے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کرنے کی جو روایت تھی اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کی شروعات بنگال سے ہوئی۔ اس نے بنگال کو انیس ذیلی اکائیوں میں تقسیم کیا۔ شاید یہ ذیلی تقسیم اکبر کے زمانے کے بنگال کی انیس 'سرکاروں' سے مماثلت رکھتی ہیں جن کا شمار ابوالفضل نے کیا تھا۔ اس طرح قانون گو یہ مانتے ہیں کہ شیر شاہ کی سلطنت کی سب سے بڑی انتظامی اکائی 'سرکار' تھی۔ تاریخی دستاویزوں میں صوبوں اور صوبیداروں کے وجود کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ وہ تو پورے صوبے کے انتظامی اتحاد کو محفوظ رکھنے اور گورنروں کو باہمی جھگڑوں سے بچانے کے لیے وضع کیے گئے تھے (جیسا کہ پنجاب کے معاملے میں)، یا فوجی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے تھے (جیسے پنجاب، مالوہ، اجمیر، جودھ پور اور ناگور)۔ پرماتما سرن واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ایسے واضح ثبوت موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیر شاہ کی سلطنت باقاعدہ صوبوں میں تقسیم تھی۔ اس طرح قانون گو کے خیالات تاریخی حقائق پر مبنی نہ ہو کر یکطرفہ ہیں۔ بنگال کی تقسیم کو بیان کرتے ہوئے عباس سروانی نے اس کی انتظامی اکائیوں کی تعداد کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نہ تو کسی ہمعصر نے اور نہ ہی بعد کے کسی مورخ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بنگال کے علاوہ کوئی دوسرا صوبہ مرکز کو سیدھے طور پر جوابدہ اتنی چھوٹی اکائیوں میں بنٹا ہوا تھا۔ شیر شاہ نے بنگال کی اس طرح کی تقسیم دو وجوہات کی بنا پر کی تھی:

- بنگال مرکز سے بہت دور تھا اور صوبیدار، اس کے بے پناہ وسائل کے لالچ میں اکثر سلطان کے خلاف بغاوت پر اتر آتے تھے۔
- دوسری وجہ یہ تھی کہ جب سے شیر شاہ تخت نشین ہوا تھا، بہت سے افغان سردار انعامات نہ ملنے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔

لہٰذا، ان کو مطمئن کرنے کے لیے، شیر شاہ نے یہ طریقہ تلاش کیا کہ سرکاروں کی از سر نو تنظیم کر کے ہر ایک سرکار کو ایک مختلف افغان سردار کے حوالے کر دیا جائے۔ ہر سرکار اپنے اندرونی روزمرہ کے انتظام کے معاملے میں دوسری سے آزاد تھی۔ اس کا متوقع نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاریں چھوٹی ہونے کی وجہ سے بغاوت نہیں کر سکتی تھیں ساتھ ہی سردار بھی مطمئن ہو گئے۔ تاہم، شیر شاہ کبھی بھی صوبے کو چھوٹا کرنا یا ختم کرنا نہیں چاہتا تھا، اس کے برعکس، وہ اس کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے قاضی فضیلت کو، جسے قاضی فضیحت (بدنام قاضی) کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے، بنگال کا گورنر یا 'امین بنگال' مقرر کیا۔ امین پورے صوبے کے دفاع کا ذمے دار تھا۔ عباس سروانی اور بدایونی دونوں نے قاضی فضیلت کو بنگال کا امین بنائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بنگال کی ذیلی تقسیم کے بعد (انتشار کے خطرے سے اور افغان سرداروں کو جگہ دینے کی غرض سے) اس صوبے کے تمام محکمے اور ان سے متعلق معاملات قاضی فضیلت کی ماتحتی میں دے دیے گئے۔ افغان سرداروں کے ماتحت آنے والی بعض سرکاروں میں، سرداروں کی جاگیر کے علاقے بھی شامل تھے۔ انتظامیہ کی علاقائی اکائی کے طور پر 'سرکار' شیر شاہ سے پہلے ہی موجود تھی۔

'سرکار' کو انتظامیہ کی اعلیٰ ترین اکائی مان کر پوری سلطنت کے لیے اس نظام کو اپنانے کے بارے میں، پرماتما سرن کہتے ہیں کہ یہ نظریہ پنجاب کے بارے میں عباس سروانی کے درج ذیل بیان کی غلط تشریح پر مبنی ہے: 'وہ (شیر شاہ) اعظم ہمایوں (ہیبت خان) کو پنجاب کے صوبیدار کے عہدے سے ہٹانا چاہتا تھا، لیکن شہید ہونے سے پہلے اسے وقت ہی نہیں ملا۔' اگر اس واقعے کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شیر شاہ، ہیبت خان کو اس کی بدتمیزی کی وجہ سے ہٹانا چاہتا تھا نہ کہ اس کی صوبے داری کے منصب کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں حقیقی صورت حال کے بارے میں جو معلومات ملی ہیں وہ یہ ہے کہ روہیل کھنڈ تک کے سارے علاقوں والا پورا صوبہ احمد خان سروانی کو ملا اور صوبہ روہیل کھنڈ سے اودھ تک عیسیٰ خان کو سونپا گیا۔ صوبہ دہلی تو عام طور پر ایک امین کے ماتحت رہتا تھا اور امینوں کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ ایسا کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ سلطان وقتاً فوقتاً غیر حاضر رہتا تھا۔ قاضی فضیلت بھی کبھی دہلی کے امین تھے۔ شیر شاہ نے احمد خان سروانی کو 5000 گھوڑوں کی باقاعدہ فوج رکھنے اور سنبھل کو چوکی بنانے کا حکم دیا کیونکہ اس علاقے میں باغیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ یہ اس کے علاوہ اس بات کا یقینی ذکر ملتا ہے کہ اجمیر، مالوا اور بہار بشمول لاہور، ملتان، سنگھ، جودھ پور اور ناگور صوبے تھے۔ ان صوبوں کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یا نہیں اس بات کے شواہد نہیں ملتے۔

صوبوں کے اعلیٰ حکام کو کبھی حکیم، کہیں امین یا فوجدار کہا جاتا تھا۔ ان کے اختیارات میں بھی برابری نہیں تھی۔ پنجاب کے ہیبت خان کو ایک لاکھ کی فوج رکھنے اور جاگیریں بانٹنے کا حق حاصل تھا۔ اجمیر کے صوبیدار خواص خان کے پاس 26,000 جبکہ مالوہ کے صوبیدار شجاعت خان کے پاس 12,000 کی فوج تھی۔ کچھ دوسرے صوبیداروں کے پاس صرف 5000 کی فوج تھی۔ بہرصورت شیر شاہ ان تمام صوبیداروں پر سخت کنٹرول رکھتا تھا۔ وہ کبھی بھی بدنظمی، دھوکہ دہی یا مرکز کی ہدایات کی نافرمانی جیسی چیزوں کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ شیر شاہ کے جانشینوں کے دور میں بھی صوبیداروں اور ان کی تقرریوں کے بارے میں ذکر ملتا ہے۔ اکبر جب تخت پر بیٹھا تب بھی صوبے باقی تھے۔ اکبر اور اس کی پالیسیوں کی تعریف کرتے نہیں تھکنے والے ابوالفضل نے کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ اکبر نے ہی سب سے پہلے

صوبوں کی بنیاد رکھی یا صوبوں کی تعمیر کا تصور اکبر کا تھا۔اس لیے صوبوں کے خاتمے کو لے کر قانون گو کا مذکورہ بالا بیان درست نہیں ہے۔

اقطاع یا سرکار:

ذیلی تقسیم کو اقطاع کہا جاتا تھا اور یہ مغل دور کے صوبوں سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن ان کی تشکیل یا ان کا نظم و نسق کسی اچھی طرح سے متعین اصولوں یا کسی ایک قسم کی ساخت پر مبنی نہیں تھا۔اقطاع بھی سرکاروں اور پرگنوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کی سب سے چھوٹی انتظامی اکائی گاؤں تھا۔اقطاع کی تقسیم اور ان کی انتظامی ساخت کو ترک حکمرانوں کے دور کے طرز حکمرانی کا تسلسل سمجھا جا سکتا ہے۔ نظام حکومت دوہری طرز کا تھا۔ سرکار کی سطح پر شقدار شقداران اور منصف مصنفان ہوتے تھے۔شقدار شقداران یا صدر شقدار عموماً فوجی قابلیت والا افسر ہوتا تھا۔اس کے پاس فوجی ٹکڑیاں ہوتی تھی اور وہ امن وامان نافذ کرتا تھا۔وہ شہری انتظامیہ کا ذمے دار تھا اور اسے فوجداری معاملات سے نمٹنا پڑتا تھا۔ مجرم کا پتہ لگانے اور اسے سزا دینے کے معاملے میں مقامی ذمہ داری کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔اس لیے اگر مجرم کو پیش نہ کیا جاتا تو اس کی ساری ذمہ داری مقدم یا گاؤں کے سربراہ پر عائد ہوتی تھی۔ منصف مصنفان یا صدر منصف مالگزاری کے معاملات دیکھتا تھا جس میں مالگزاری کی وصولی اور حساب کتاب شامل تھا۔ وہ دیوانی مقدمات بھی نمٹاتا تھا اور غالباً ان کی سماعت کے لیے دورہ بھی کرتا تھا۔

پرگنہ:

پرگنہ کی سطح پر بھی ایسی ہی تنظیم تھی۔شقداروں اور منصفوں کے کام بالکل وہی تھے جو 'سرکار' کی سطح پر شقدار شقداران اور منصف مصنفان کے ہوتے تھے۔البتہ ان کی مدد کے لیے ایک ماتحت عملہ موجود تھا۔ آر پی ترپاٹھی نے واقعات مشتاقی کے دو عبارتوں کے درمیان فرق کی طرف دھیان کھینچا ہے۔ایک کا جزوی ترجمہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن نے کیا ہے، جس میں ایک خزانہ دار، ایک منصف خزانہ، اور ایک فارسی اور ایک ہندو کاتب کی تقرریوں کا ذکر ہے۔ دوسری عبارت میں ان ملازمین کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہر پرگنہ میں شقدار اور منصف کے ساتھ ایک کارکن ہوا کرتا تھا۔عباس خان نے منصف کے بجائے امین کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن لگتا ہے کہ وہ بھی اسی ملازم کا حوالہ دے رہا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر پرگنہ میں ایک قانونگو ہوتا تھا جو حکومت کو پرگنہ کی حالت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ایسا لگتا ہے کہ شقدار کی مدد کے لیے کارکن نامی مالگزاری کاتب موجود تھا۔ جو مال جمع ہوتا اسے خزانہ دار کے پاس جمع کرایا جاتا تھا، جسے فوتہ دار بھی کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی حدود اور زرعی زمینوں کی پیائش کے لیے حکومت کی طرف سے امین مقرر کیے گئے تھے۔ یہ امین پیائش کر کے جوت سے متعلق جھگڑوں کو بھی نمٹاتے تھے۔ آر پی ترپاٹھی کا ماننا ہے کہ قانون گوؤں کی تقرری حکومت نے نہیں کی تھی، وہ مقدموں کی طرح تھے، یعنی موروثی پیشہ ور نیم سرکاری ملازمین تھے جو زراعت اور کسانوں کے موجودہ اور ماضی کے حالات کا حساب رکھتے تھے۔

گاؤں:

انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تھا، جس میں ایک پٹواری اور ایک مقدم ہوتے تھے۔ پٹواری کا کام کسانوں اور ان کی ملکیت کے بارے میں حساب کتاب رکھنا تھا، جبکہ مقدم اپنے دائرہ اختیار میں رہنے والے لوگوں سے مالگزاری اکٹھا کر کے حکومت کے حوالے

کرتے تھے۔پرگنوں اور سرکاروں کے عملے کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔افسران کی تقرری کا کام شیر شاہ خود دیکھتا تھا،اس لیے سب صرف اس کے سامنے جوابدہ تھے۔انتظامیہ کے دوہرے نظام کی وجہ سے انتظامی امور اور ملازمین دونوں کی ہی صحیح طریقے سے جانچ پڑتال ہو جاتی تھی۔

3.3.3 زمینی مالگزاری انتظامیہ (Land Revenue Administration)

شیر شاہ نے زمینی مالگزاری انتظامیہ کی ابتدائی تربیت اس وقت حاصل کی تھی جب وہ نوجوان فرید تھا اور اپنے والد کی جاگیروں کا منتظم تھا۔عباس خان، جاگیروں کے بارے میں فرید کی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں:

1. رعیت یعنی رعایا کی فلاح و بہبود کی فکر۔اسی لیے مقررہ زمینی مالگزاری کی مقدار عام سی ہوتی تھی، لیکن تشخیص کے بعد اس کی مکمل وصولی کی جاتی تھی۔
2. وصولی کی فیس کی صورت میں اور زمینداروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کا واجب الادا حصہ انہیں ضرور دیا جاتا تھا۔

فرید نے کسان کو پیمائش اور شراکت (بٹائی) کے درمیان کسی ایک کو چننے کی آزادی دی۔دونوں میں سے کس کا انتخاب کریں اور کس کو چھوڑیں، کسان اس بات پر ہم خیال نہیں تھے، اس لیے دونوں طریقے جاری رہے۔یہ واضح ہے کہ اس انتخاب میں نفع اور نقصان کا فرق نہ ہونے کے برابر تھا۔اس نے کسانوں کو یہ آزادی بھی دی تھی کہ وہ زمینی محصول نقد یا جنس کے طور پر ادا کر سکتے ہیں۔فرید کسانوں سے تحریری قبول نامہ (قبولیت یا پٹہ) لیتا تھا اور اس نے پیمائش کی فیس (جریبانہ) اور ٹیکس وصولی کی فیس (محاصلانہ) بھی طے کر رکھی تھی۔اس نے دلالوں اور اپنے ملازمین کو خبردار کیا تھا کہ اگر انہوں نے وصولیابی کے معاملے میں کوئی غیر قانونی کام کیا اور وہ قصوروار پائے گئے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

جب وہ (فرید) خود حکمران (شیر شاہ) بنا تو اس نے ان میں سے کچھ اصولوں کو لاگو کیا جن کا تجربہ اس نے اپنے باپ کی جاگیر کا منتظم رہتے کیا تھا۔لیکن اس بیان کا جائزہ لینا اور جانچنا ضروری ہے۔چونکہ مالگزاری ریاست کے لیے آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ تھا، اس لیے شیر شاہ کی آمدنی کے استحکام اور زرعی مصنوعات میں اضافے کے ذریعے مالگزاری میں اضافے کے بارے میں تشویش فطری تھی، اسے قبول کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔چونکہ زرعی معاشرہ، ریاست کی بنیاد تھا، اس لیے وہ کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے فکر مند تھا۔شیر شاہ کے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے ضابطوں میں سے ایک کے بارے میں عباس خان کہتے ہیں: 'اس کی فاتح فوج کہیں لوگوں کی زراعت کو تباہ نہ کر دے اس لیے جب وہ فوج کے ساتھ سفر کرتا تھا تو خود کھیتی باڑی کی حالت دیکھتا جاتا تھا اور گھڑ سواروں کو چاروں طرف یہ دیکھنے کے لیے پھیلا دیتا تھا کہ فوج کے سپاہی کسانوں کے کھیتوں میں نہ گھس سکیں .....۔جو شخص حکم عدولی کرتا اور فصلوں کو نقصان پہنچاتا اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔سپاہیوں پر ان باتوں کا حیرت انگیز اثر ہوا۔'

تاہم، قانونگو کا یہ نظریہ کہ شیر شاہ نے دیگر تمام طریقوں کو چھوڑ کر صرف پیمائش کے عمل پر انحصار کیا اور اسے اپنی پوری سلطنت پر لاگو کیا، قابل قبول نہیں ہے۔مورلینڈ کا کہنا ہے کہ 'شمالی ہندوستان میں رائج زمینی مالگزاری کی روایت اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب ہندو

مذہب کے مقدس قانون کی تخلیق ہوئی تھی، اور انیسویں صدی میں اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اس میں کچھ تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ یہی روایت سور دور حکومت میں بھی ایک اٹوٹ شکل میں جاری رہی۔ اگرچہ کہ شیر شاہ نے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں، لیکن اس نے بھی بنیادی چیزوں جیسے محصولات کے تعین کا طریقہ، ادائیگی کی قسم، زرعی پیداوار میں ریاست کے حصہ وغیرہ کو تبدیل نہیں کیا۔ ایس سی مسرا (S.C. Misra) نے 'Revenue System of Sher Shah' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالے میں بتایا ہے کہ دستاویزات میں استعمال ہونے والا لفظ 'جریبے' اور جدید مصنفین کے ذریعہ بطور ترجمہ استعمال کیے ہوئے لفظ 'measurement' یا 'پیائش' وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے پہلے تمام زرعی اراضی کے رقبے کی حد بندی (پیائش) کروائی اور پھر اس کی بنیاد پر زمین کی آمدنی کا تعین کیا، تو اس قول کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر 'جریب' سے مراد یہ ہے کہ تمام قدیم طریقوں کو ہٹا کر محاصل کا پورا نظام بالکل بدل دیا گیا تو یہ بیان قابل قبول نہیں ہے۔

شیر شاہ نے مالگزاری انتظامیہ کے قدیم نظام کو کبھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں کیا۔ قلب سلطنت (Core) کے علاوہ دیگر دور دراز علاقوں میں وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ پیائش کے بارے میں جو اس کے خیالات تھے ان کو بہت سے علاقوں میں لاگو نہیں کیا جا سکتا تھا، اور نہ ہی ایسا کیا گیا۔ مثال کے طور پر ملتان میں مالگزاری کی تشخیص اور وصولی کے لیے بٹائی (حصہ داری) کا رواج پہلے سے جاری تھا، شیر شاہ نے اسے چلتے رہنے دیا۔ مالوہ، راجپوتانہ اور مغربی پنجاب کے علاقے اس وقت مکمل طور پر پرامن نہیں تھے، اس لیے اگر شیر شاہ پیائش کا بندوبست کرنا بھی چاہتا تو شاید ہی کامیابی حاصل کر پاتا۔ دولت شیر شاہی کے مصنف حسن خان نے ملک میں رائج مالگزاری انتظامیہ کے تین طریقوں کا ذکر کیا ہے: 'پہلا یہ ہے کہ ہم گاؤں کے کسی فرد کو سرکاری واجبات کی ادائیگی کی ذمہ داری سونپ دیں۔ ایسی صورت حال میں اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کھیتوں سے واجبات وصول کرے اور حکومت کے پاس ایک مقررہ رقم جمع کرائے۔ لیکن ایسی حالت میں (بعض معاملوں میں) جبر یا طاقت کے استعمال کو کم کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ سرکاری ملازمین کو عوام کی جان و مال کی حفاظت کا خیال رکھنے کی ہدایات دی جائیں تاکہ کہیں بھی کوئی مالگذار رعایا پر ظلم کرنے کے لیے اپنے پنجے نہ پھیلا سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ان احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔'

اے سی مشرا بتاتے ہیں کہ ایک ایسے نظام میں جس میں ایک خاص شخص کو اس کے مختص کردہ علاقے سے محصول جمع کرنے اور ریاست کے پاس ایک مقررہ حصہ جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو، اس جریب طریقہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نقد رقم ادائیگی کا طریقہ کار آمد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دو طریقے جنہیں غلہ بخشی (اشتراک) اور جریب (پیائش) کہا جاتا ہے، پرانے رواج تھے اور چلے آرہے تھے۔ شیر شاہ نے ان میں مداخلت نہیں کی۔ البتہ، اس نے ان کے طریقہ کار کو منظم کیا۔ اس نے زمین کے نقشے بنائے، کاشتکاری اور ملکیت کی درجہ بندی کروائی۔ دولتِ شیر شاہی کے فرمان نمبر 10 سے معلوم ہوتا ہے کہ زرعی (پولج) اور ناقابل کاشت (پرتی)، دونوں قسم کی زمینوں کی پیائش کا کام احمد خان کو سونپا گیا تھا۔ اس نے یہ کام برہمنوں کی مدد سے مکمل کیا۔ اس تخمینے کی بنیاد پر ایک رجسٹر (خسرہ کھتونی) تیار کیا گیا جس میں مالک کے حقوق اور تمام زرعی زمینوں کی پیائش اور ان کی اقسام درج کی گئیں۔ پیائشی کام کے لیے 32 عددی سکندری گز اور سن کی

چھڑکا استعمال کیا گیا۔

شیر شاہ کا جھکاؤ پیمائش کے طریقے کی طرف تھا اور علاؤالدین خلجی کی طرح وہ بھی اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاہتا تھا۔ زمینوں کا عام سا تجزیہ کروانا نئی 'جمع' کے تعین کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا، لیکن اس کا دور حکومت اتنا مختصر تھا کہ سروے زیادہ اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود اس کا سب سے اہم کارنامہ 'ریع' (rai) یا تشخیص کے لیے فصل کی شرحوں (rates) یا درووں کی ایک فہرست کالا گو کیا جانا تھا۔ فصل کا شرح یادر تیار کرنے کا طریقہ بہت آسان تھا۔ پیداوار کی قسم کی بنیاد پر، دونوں موسموں کی تمام اقسام کی اہم اہم فصلوں کی ایک، ایک بیگھہ اچھی، درمیانی اور خراب زمین کی پیداوار کے آنکڑوں کو فی بیگھہ کی اوسط پیداوار کا حساب لگانے کے لیے اکٹھا کیا جاتا اور حاصل شدہ اوسط کے تین حصے کر دیے جاتے۔ اس میں سے ایک حصہ یعنی کل کا 3/1، مقرر کردہ مالگزاری، یا حکومت کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

مورخین کے درمیان اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ پیداوار کا کتنا حصہ محصول کے طور پر ریاست کو ادا کیا جاتا تھا۔ قانون گو اور آئی ایچ قریشی (I.H. Qureshi) کا خیال ہے کہ شیر شاہ پیداوار کا ¼ حصہ لیتا تھا۔ قانو نگو کی رائے 'مخزن افاغنہ' میں دی گئی معلومات پر مبنی ہے، جہاں شیر شاہ نے ہیبت خان کو لکھا کہ ملتان سے پیداوار کا چوتھائی حصہ لینا ہے۔ وہ ابوالفضل کے اس بیان پر بھی یقین رکھتا ہے کہ شیر شاہ کی شرح مالگزاری یا زمینی محصول سب سے کم تھا اور اکبر نے اسے بڑھا کر 3/1 کر دیا۔ مورلینڈ (W.H. Moreland) نے قانون گو کے ان دلائل کی تردید کی ہے، جو اس نے 'مخزن افاغنہ' اور ابوالفضل کے بیانات کی بنیاد پر قائم کیے ہیں۔ مورلینڈ کا خیال ہے کہ شیر شاہ نے ملتان کے بارے میں ہمیشہ جانبدارانہ رویہ اپنایا تھا۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ شیر شاہ کا پوری سلطنت کے ساتھ ایک جیسا رویہ تھا۔ پرماتما سرن، مورلینڈ سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیر شاہ کے 'ریع' کو اکبر نے بھی اپنایا تھا، اس لیے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں جو بھی شرحیں رائج تھیں اور جنہیں شہنشاہ نے منظور کیا تھا، وہ اکبر کو شیر شاہ سے وراثت میں ملی تھیں۔ سرن، لفظ ریع کی وضاحت کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ریاست کا مطالبہ 3/1 تھا۔

ادائیگی کے طریقہ کار (mode of payment) کے بارے میں پورا نظام، کٹائی کے بعد کی پیداوار پر مبنی تھا اور محصول کی تشخیص کی بنیاد اناج یا کوئی دیگر پیداوار تھی۔ مالگزاری صرف اناج کی شکل میں لی جاتی تھی، لیکن اسے بازار بھاؤ پر بیچ کر نقدی میں بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ کسان بھی اناج کے بجائے نقد رقم میں بھی محصول ادا کر سکتا تھا۔ ریاست بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ کاشت کار کو 'جریبانہ' یا تخمینہ فیس اور 'محاصلانہ' یا ٹیکس جمع کرنے کی فیس بھی ادا کرنی پڑتی تھی، جن کی شرحیں زمینی مالگزاری کی بالترتیب 2½ اور 5 فیصد تھیں۔ حسن خان کہتے ہیں کہ شیر شاہ نے اس طرح انتظام کیا تھا کہ ہر زمیندار اور مالگزاری دینے والا اپنے محصول کا ڈھائی فیصد سرکاری خزانے میں جمع کراتا تھا، تاکہ یہ رقم حادثات یا بھاری سزاؤں پر خرچ ہو سکے۔ یقیناً یہ ٹیکس اناج کی شکل میں جمع کیا جاتا تھا، جسے مقامی غلہ خانوں میں ذخیرہ کیا جاتا تھا اور قحط کے وقت تکلیف کو دور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کسانوں میں پٹے بانٹتا تھا جس میں زمین کی قسم اور مختلف فصلوں کی شرحیں یا نرخ دیے گئے ہوتے تھے۔ کسان 'قبولیت'

لکھتا تھا جس میں ریاست کی آمدنی کی مانگ کے مطابق مالگزاری ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔اس نے زمینی اصلاحات کی حوصلہ افزائی کی، خشک سالی یا قحط کی صورت میں محصول میں چھوٹ یا معافی دی، مصیبت کے وقت اور کنویں کھدوانے کے لیے کسانوں کو قرض دیا اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے نہری آبپاشی کا نظام نافذ کیا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیر شاہ کے زمانے کا مالگزاری انتظامیہ کا نظام پیشرو ترکوں سے ملتا جلتا تھا اور لودیوں کے دور میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ جس کام کا سہرا اسے دیا جاتا ہے وہ اس نے والد کی جاگیر کا انتظام سنبھالتے ہی اسی جاگیر میں شروع کر دیا تھا۔اس کا واحد مقصد تھا کہ وہ حکومت میں جان پھونک کر اسے طاقت دے اور اس کے کام کاج میں بہتری لائے۔اس مقصد کو پورا کرنے میں اسے کافی حد تک کامیابی بھی ملی لیکن وہ اہل کار طبقے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا یا اسے اس کا وقت نہ مل سکا۔

3.3.4 عدل وانصاف (Administration of Law and Justice)

شیر شاہ عدل وانصاف کو مضبوطی سے نافذ کرتا تھا۔اس نے سلطان العدل کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔ قانونگو کہتے ہیں کہ ساڑھے پانچ سال کے مختصر دور حکومت میں شاید ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جب شیر شاہ نے اس اصول سے انحراف کیا ہو۔اس کے انصاف کے بارے میں عباس خان کا یہ بیان قابل غور ہے کہ 'وہ ہمیشہ پہلے اس بات کی تحقیق کرتا تھا کہ مظلوم اور انصاف مانگنے والے مدعی کی اصل حقیقت کیا ہے،اس نے کبھی ستانے والوں یا ظالموں کا ساتھ نہیں دیا، چاہے وہ اس کے قریبی رشتہ دار ہوں یا اس کے پسندیدہ بیٹے، چاہے وہ معزز امیر ہوں یا اس کے قبیلے کے لوگ،اس نے ظالم کو سزا دینے میں نہ تو تاخیر کی اور نہ ہی نرمی کا مظاہرہ کیا۔انصاف کے لیے ایسی فکر کا اثر تو ہونا ہی تھا جس کے بارے میں عباس خان نے مبالغہ آرائی سے کہا ہے کہ 'ایک بزرگ، قریب المرگ بوڑھی عورت اپنے سر پر سونے کے زیورات سے بھری ٹوکری لے کر سفر پر نکلی، تب بھی کسی چور یا ڈاکو کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس بوڑھی عورت کے پاس پھٹک بھی جائے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شیر شاہ اسے اس بات کی کتنی سخت سزا دے سکتا ہے۔'

3.3.5 دیگر انتظامی اصلاحات (Other Administrative Reforms)

اس کی فوجی انتظامیہ اور بھی زیادہ موثر تھی۔ گھوڑوں کو داغنے کی روایت 12ویں صدی میں سلجوقیوں نے کی تھی۔ لیکن شیر شاہ سے پہلے اگر کسی ہندوستانی حکمران نے اسے نافذ کیا تو وہ علاؤالدین خلجی تھا۔شیر شاہ نے اسے سختی سے جاری رکھا۔شیر شاہ عمارتیں اور سڑکیں بنوانے والا ایک عظیم حکمراں تھا۔اس کے ذریعے بنائی گئی چار بڑی سڑکیں (شاہراہیں) مشہور ہیں۔بنگال کے سونار گاؤں سے شروع ہو کر ایک راستہ آگرہ، دہلی اور لاہور ہوتا ہوا دریائے سندھ تک گیا تھا۔دوسرا آگرہ سے مانڈو پہنچتا تھا۔ تیسرا آگرہ سے جودھ پور ہوتا ہوا چتور تک اور چوتھا لاہور سے ملتان تک جاتا تھا۔اس نے سڑکوں کے دونوں طرف پھل دار اور سایہ دار درخت لگوائے۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر سرائے بنوائیں، جن کی کل تعداد 1700 تھی اور جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ کھانے پینے اور ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ گھوڑوں اور دودھ دار جانوروں کے لیے اناج اور گھاس بھی ملتا تھا۔ قیام امن کے لیے پولیس والے بھی ان سرایوں میں رکھے جاتے تھے۔ہر سرائے میں ڈاک لانے اور لے

جانے کے لیے دو گھوڑے رکھے جاتے تھے، جنہیں شاہی گھوڑ سوار ڈاکیے استعمال کرتے تھے۔

ان اقدامات سے تجارتی سرگرمیوں کی بھی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ سفر کے دوران، آرام اور سہولیات سے تاجروں اور سوداگروں کو بہت فائدہ ہوا۔ شیر شاہ نے داخلے اور فروخت کی جگہ پر دو ٹیکسوں کے علاوہ باقی تمام قسم کی چنگیوں کو ہٹا دیا، اس سے بھی تجارت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے سکوں کی ڈھلائی کو بھی بہتر کیا۔ اس کے دو قسم کے سکے اہم تھے۔ چاندی کا روپیہ 178 گرین اور تانبے کا دام 380 گرین کا تھا۔ اس نے ٹکسالوں کی تعداد بڑھا کر 23 تک پہنچا دی۔ ان میں سے کچھ جن مقامات پر تھیں، ان کے نام آگرہ، گوالیار، اجین، لکھنؤ، شیر گڑھ (ساسارام)، آبو، سکر، بکر (سندھ) ہیں۔ یہ ٹکسال والی جگہوں کے نام اس کی سلطنت کی وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔



تصویر 4.3۔ شیر شاہ سوری کے سکے (چہلا روپیہ) 1538-1545ء
(Source: https://en.wikipedia.org/wiki/Sher_Shah_Suri#/media/File:Sher_shah's_rupee.jpg(Online))

3.4 شیر شاہ کے جانشیں (Successors of Sher Shah)

شیر شاہ سوری کی اچانک موت کے بعد 1545ء میں افغان امرا نے اس کے چھوٹے بیٹے جلال خان کو تخت پر بٹھایا، جس نے اسلام شاہ سوری کا لقب اختیار کیا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ایک انتہائی قابل، جابر اور مضبوط حکمران تھا۔ اپنے نو سالہ دورِ حکومت میں اس نے شیر شاہ کے فلاحی کاموں اور نظامِ مواصلات کو مزید بہتر کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ شیر شاہ کے قوانین کو باقاعدہ تحریری شکل دے کر پوری سلطنت میں یکساں نافذ کرنا تھا، جس سے عدالتی نظام میں نمایاں بہتری آئی۔ اس نے اپنی قبائلی آزادی کے عادی افغان امرا پر سخت کنٹرول رکھا اور نیازیوں جیسی طاقتور بغاوتوں کو بے دردی سے کچل کر سلطنت کو متحد اور مستحکم رکھا۔

1554ء میں اسلام شاہ کی وفات کے بعد اس کا بارہ سالہ کمسن بیٹا فیروز شاہ تخت نشین ہوا، لیکن اس کی حکومت محض چند دن ہی چل سکی۔ اسے اس کے سگے ماموں مبارز خان نے تخت کے لالچ میں نہایت بے دردی سے قتل کر دیا اور محمد عادل شاہ کے نام سے آگرہ کے تخت پر قابض ہو گیا۔ تاہم، عادل شاہ ایک عیش و عشرت کا دلدادہ، کمزور اور انتہائی نااہل حکمران ثابت ہوا۔ اس نے سلطنت کی تمام تر انتظامی اور عسکری ذمہ داریاں اپنے ایک نہایت ذہین ہندو وزیر اور سپہ سالار 'ہیمو بقال' (ہیم چندر وکرمادتیہ) کے سپرد کر دی تھیں۔ ہیمو نے اگرچہ افغانوں کی کئی بغاوتیں کچلیں اور اپنے آقا کے لیے کئی جنگیں جیتیں، لیکن بادشاہ کی نااہلی اور امرا کی ناراضگی کے باعث سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔

عادل شاہ کی اس کمزوری کے نتیجے میں سوری خاندان کے دیگر افراد نے بغاوت کر دی اور یہ عظیم سلطنت آپسی خانہ جنگی کا شکار ہو کر تین حصوں میں بٹ گئی۔ پنجاب پر سکندر شاہ سوری نے قبضہ کر لیا، آگرہ اور دہلی پر کچھ عرصے کے لیے ابراہیم شاہ سوری قابض رہا، جبکہ محمد عادل شاہ صرف چنار اور بہار کے مشرقی علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ افغانوں کے اس باہمی انتشار نے سلطنت کو اندر سے مکمل طور پر کھوکھلا کر دیا۔ جلاوطن مغل بادشاہ ہمایوں نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور 1555ء میں سرہند کے مقام پر سکندر شاہ سوری کو فیصلہ کن شکست دے کر دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ رہی سہی کسر 1556ء میں پانی پت کی دوسری جنگ نے پوری کر دی، جب ہیمو بقال اکبر کی مغل فوج کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا اور یوں سوری سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ وہ 1486ء میں پیدا ہوا اور پشتون کی مشہور شاخ سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جونپور میں تعلیم حاصل کی۔ 21 سال تک اپنے والد کی جاگیر کا انتظام بحسن و خوبی چلایا۔ بعد میں بہار کے حکمراں بہار خان کی ملازمت کی۔ کچھ عرصہ شہنشاہ بابر کی ملازمت میں بھی رہا۔ بابر کے مرنے کے بعد بنگال بہار اور قنوج پر قبضہ کیا۔ مغل شہنشاہ ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ اس نے اپنی مملکت میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اپنے تعمیری کاموں کی وجہ سے اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے سنار گاؤں سے دریائے سندھ تک ایک ہزار پانچ سو کوس لمبی شاہراہ تعمیر کروائی جو آج تک جی ٹی روڈ کے نام سے موجود ہے۔ شہنشاہ اکبر مملکت کا انتظام چلانے میں شیر شاہ سے بڑا متاثر تھا۔ 22 مئی 1545ء میں کالنجر کی فتح کے وقت بارود خانہ کے اچانک پھٹ جانے سے وفات پائی۔ تاریخ دان شیر شاہ سوری کو برصغیر کی تاریخ کا عظیم رہنما، فاتح اور مصلح مانتے ہیں۔ اردو ادب میں شیر شاہ سوری سے متعلق کئی مثالی قصے ملتے ہیں۔ شیر شاہ سوری (1476ء تا 1545ء) ایسا فرماں روا تھا جس کی ستائش نامور مؤرخین اور عالمی مبصرین کرتے رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کا پہلا حکمران تھا جس نے عوامی فلاح کی جانب اپنی بھرپور توجہ دی اور کئی کارنامے انجام دیے۔ ساڑھے پانچ سو سال قبل اس نے زرعی اصلاحات کا کام شروع کروادیا تھا، جس کی پیروی بعد کے حکمرانوں نے کی۔ شیر شاہ نے سہسرام سے پشاور تک جو شاہراہ کی تعمیر کروائی تھی اور اس کے کنارے کنارے سایہ دار اور پھل دار پیڑ لگوائے، سرائیں تعمیر کروائیں اور سب سے پہلا ڈاک کا نظام نافذ کیا تھا۔ اپنی محنت اور مسلسل کوششوں سے شیر شاہ نے ایک عظیم سلطنت قائم کی تھی لیکن اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر اس نے سہسرام کا انتخاب کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی میں ہی کیمور کی پہاڑی پر ایک مقبرہ تعمیر کروایا تھا جس کے چاروں جانب جھیل کا پانی پھیلا ہوا ہے۔

3.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

جریب : پیمائش

بٹائی/غلہ بخشی : اشتراک یا فصل کا برابر بٹوارہ

خزانہ دار/فوتہ دار : سرکاری خزانے کا نگراں

کارکن	:	مالگزاری کاتب یا کلرک
امین	:	صوبے کا گورنر یا اعلیٰ حکمراں / زمین کی پیائش کا ذمہ دار
سرکار	:	صوبہ یا صوبے کی تقسیم کی ایک اکائی
منصف مصنفان	:	سرکار کی سطح پر مالگزاری معاملات اور دیوانی مقدمات کا نگراں
سکندری گز	:	سکندر لودی کے ذریعے چلایا گیا ایک گز جس کی پیائش 32 نکتوں والی سن کی ڈنڈی سے کی جاتی تھی۔
رجسٹر	:	خسرہ کھتونی، زمینوں اور ان کی آمدنیوں کا لیکھا جوکھا
پرتی	:	ناقابل کاشت یا بنجر زمین
پولج	:	زرعی یا زرخیز زمین
جمع	:	تخمینے کے بعد متعین کی ہوئی مالگزاری
حاصل	:	حقیقت میں حاصل ہونے والی مالگزاری
جریبانہ	:	پیائش کی فیس، مالگزاری کی تقریباً 2½ فیصد
محاصلانہ	:	ٹیکس وصولی کی فیس، مالگزاری کی تقریباً 5 فیصد
ریع	:	'ریع' (rai) یا تشخیص کے لیے فصل کی اگلی پچھلی شرحوں (rates) یا نرخوں کی فہرست۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. شیر شاہ سوری کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) بہار خان (ب) فرید خان (ج) جلال خان (د) نظام خان

2. شیر شاہ کا مشہور چاندی کا سکہ کیا کہلاتا تھا؟

(الف) روپیہ (ب) ٹنکہ (ج) دینار (د) دام

3. شیر شاہ کی موت کس قلعے کے محاصرے کے دوران ہوئی تھی؟

(الف) چتوڑ (ب) رنتھمبور (ج) کالنجر (د) چنار

4. شیر شاہ سوری کا مقبرہ کہاں واقع ہے؟

(الف) دہلی (ب) آگرہ (ج) سہسرام (د) لاہور

5. شیر شاہ کے صوبائی نظم ونسق میں سب سے چھوٹی انتظامی اکائی کیا تھی؟

(الف) سرکار (ب) پرگنہ (ج) صوبہ (د) گاؤں

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سورانتظامیہ میں مرکزی حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. صوبہ یا سرکار کی بحث کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. شیر شاہ کے جانشینوں پر نوٹ لکھیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. فرید خان کے ابتدائی حالات زندگی اور فتوحات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. شیر شاہ کے دور میں زمینی مالگزاری انتظامیہ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

جوابات:1-(ب),2-(الف),3-(ج),4-(ج),5-(ب)

1.

اکائی 4۔اکبراوراس کے کارنامے

(Akbar and His Achievements)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 اکبر کی تاجپوشی

4.3 اکبر کی ابتدائی فتوحات

4.3.1 پانی پت کی دوسری جنگ

4.3.2 مالوہ کی فتح

4.3.3 غدار امرااور بغاوتوں کا قلع قمع

4.4 اکبراور مغلیہ سلطنت کی توسیع

4.4.1 اکبراور راجپوت سلطنتیں

4.4.2 اکبراور گونڈوانا کی رانی درگاوتی

4.4.3 میواڑپر قبضہ

4.4.4 اکبراور راناپرتاپ

4.4.5 رنتھمبور کی فتح

4.4.6 کالنجر، جودھ پور، بیکانیراور جیسلمیر کی خودسپردگی

4.4.7 گجرات کی فتح

4.4.8 بہاراور بنگال کی فتح

4.4.9 کشمیر کی فتح

4.4.10 سندھ کی فتح

4.4.11 اڑیسہ کاالحاق

4.4.12 بلوچستان کی فتح
4.5 دکنی فتوحات
4.5.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح
4.5.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی
4.6 اکبر کے مذہبی افکار و اعمال
4.6.1 اکبر اور عبادت خانہ
4.6.2 اکبر کا دین الٰہی
4.7 اکبر کی شخصیت اور اس کے اثرات
4.8 اکتسابی نتائج
4.9 کلیدی الفاظ
4.10 نمونہ امتحانی سوالات

4.0 تمہید(Introduction)

جلال الدین محمد اکبر، جسے اکبر یا اکبرِ اعظم کے نام سے جانا جاتا ہے، ہندوستان کے مشہور ترین بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ اپنے حیران کن سیاسی اور مذہبی کارناموں کی بنا پر اس نے ہندو اور مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کے دلوں اور دماغوں میں ایک غیر معمولی مقام حاصل کیا ہے- وہ اتنا مشہور ہے کہ اس کے نام کے آگے 'عظیم' کی صفت خود بخود جڑ جاتی ہے۔ 'عظیم' کی صفت کے علاوہ اس کے ذاتی نام 'اکبر' کا مطلب بھی 'عظیم' ہے۔ اکبر کو آج اس کی وسیع النظری، دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کرنے (شمولیت)، دیگر عقائد کا احترام اور رواداری اور سب سے بڑھ کر اس کے ناقابل یقین عقلی رویہ کے لیے جانا جاتا ہے۔ اکبر، عہد وسطیٰ کا ایک حکمران جو کہ آج بھی جدید ہندوستان کے بہت سے لوگوں کو متاثر کر رہا ہے۔ جب بھی ہندوستانی معاشرہ اور سیاست کو فرقہ وارانہ افراتفری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب ایک مذہبی طبقہ دوسرے مذہبی طبقہ کی نفرت سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت اکبر کو خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، منی مگدھا شرما (Manimugdha S. Sharma) اپنی کتاب بعنوان *'Allahu Akbar: Understanding the Great Mughal in Today's India'* میں لکھتے ہیں کہ '1941 میں، آدی کے۔ منشی (Adi K. Munshi) نامی ایک باشعور ہندوستانی شہری نے 'ایک ایسے لیڈر کا خواب دیکھا تھا' جو 'ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر سکے۔' ہندوستان میں 1940 کی دہائی بہت ہنگامہ خیز تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست فرقہ وارانہ تناؤ تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت میں، مسلمانوں کا ایک طبقہ، مسلمانوں کے لیے

ایک الگ ملک یعنی مستقبل کا پاکستان چاہتا تھا۔

آخر وہ رہنما کون تھا جس کے بارے میں آدی۔ کے۔ منشی کہہ رہے تھے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرے گا؟ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ یہ نہ تو مہاتما گاندھی تھے، نہ جواہر لعل نہرو تھے اور یہاں تک کہ سبھاش چندر بوس بھی نہیں تھے۔ یہ اکبر ہی تھا، جو آدی کے منشی کی جانب سے 10 اکتوبر 1941 کو ٹائمز آف انڈیا میں خط لکھنے سے 400 سال پہلے بستا تھا۔ (یہ خط 15 اکتوبر 1941 کو شائع ہوا)۔ اس خط میں انہوں نے اس بات کی شدید خواہش کا اظہار کیا کہ 1940 کے دہے کے ہندوستان کو اکبر جیسے حکمران کی ضرورت ہے۔ اکبر کو انہوں نے ایک 'عظیم ہندوستانی سپاہی'، ایک 'مدبر'، اور 'اب تک کا سب سے بڑا ہندوستانی قوم پرست' قرار دیا۔ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے منشی صاحب نے کرنل جی بی میلسن (Colonel J.B. Malleson) کا حوالہ دیا جس نے اپنی کتاب *Akbar and the Rise of the Mughal Empire* (طبع شدہ 1896) میں اکبر کی عظمت کے بارے میں درج ذیل اقتباس کہا: 'جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس نے کیا کیا، تو جس زمانے میں اس نے یہ سب کچھ کیا، اس کے حصول کے لیے اس نے جو طریقہ اختیار کیا، تو ہم اکبر کو ایک ایسا نامور آدمی ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنہیں پروردگار کسی قوم کی مصیبت کی گھڑی میں اسے دوبارہ امن و رواداری کے راستہ پر گامزن کرنے کے لیے بھیجتا ہے جو اکیلا ہی لاکھوں کی خوشیوں کا ضامن ہوتا ہے۔' اپنے خط میں، آدی کے۔ منشی نے مزید لکھتے ہیں: 'ہندوستان کے اندرونی اختلافات، فرقہ وارانہ انتشار اور خاص طور پر ہندو مسلمانوں کے درمیان خلیج کے ان ایام میں ہندوستان، پہلے سے کہیں زیادہ، متحدہ ہندوستان کے پیغامبر، اکبر کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔'

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- اکبر کے دور حکومت میں مغل سلطنت کے پھیلاؤ کو سمجھ سکیں گے
- اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ راجپوتوں اور اکبر کے درمیان تنازعات محض سیاسی تھے اور ان کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔
- اکبر کے مذہبی نظریات کی وضاحت کے ساتھ یہ جان سکیں گے اکبر کی عقلیت پسندی، اس کی مذہبیت میں گہرائی تک پیوست تھی۔
- اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ مذہبی افکار کے لحاظ سے اکبر نہ صرف اپنے زمانے سے بلکہ ہمارے زمانے سے بھی آگے تھا۔
- اکبر کی شخصیت کے ذریعہ یہ سمجھ سکیں گے کہ عقلیت پسند ہونے کے لیے کسی بھی شخص کو غیر مذہبی ہونا ضروری نہیں۔

4.2 اکبر کی تاجپوشی (Akbar's Coronation – 14 February 1556)

اکبر ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کے ہاں پیدا ہوا۔ ہمایوں، جس نے قسمت کے نشیب و فراز کا بخوبی مشاہدہ کیا، 26 جنوری 1556 کو اڑتالیس سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ یہ کوئی جنگ نہیں بلکہ اس کی لائبریری تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ وہ اپنی لائبریری کی سیڑھیوں

سے حادثاتی طور پر گر گیا تھا۔ اس کی زندگی ایک واضح پیغام دیتی ہے 'کبھی بھی ہمت نہ ہاریں، چاہے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں'۔ اور اس نے استقامت کی ایک دلکش پذیر کہانی ترتیب دی۔ اپنے والد کی اچانک موت نے کم عمر اکبر پر کئی ذمہ داریاں عائد کر دیں جو اس کے باپ کے ایک دانشمندانہ فیصلے کی وجہ سے اس کے کاندھے پر آئیں۔ ہمایوں نے بیرم خان کو اکبر کا سرپرست مقرر کرنے کا فیصلہ اپنی موت سے صرف دو ماہ قبل لیا۔ بیرم خاں ایک سچا نمک خوار تھا۔ اس کی کوشش سے، اکبر صرف تیرہ سال کی عمر میں بادشاہ بن گیا۔ جب ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر، بیرم خان کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ مغلوں کا تخت جو اکبر کو وراثت میں ملا تھا، کانٹوں سے بھرا ہوا تھا اور حالات کافی نازک تھے۔ لیکن بیرم خان کے نزدیک اس کا نظم اکبر کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ بیرم خان ہی تھا جس نے اکبر کے لیے ہندوستان کو محفوظ و مامون بنایا جیسا کہ اس نے اس کے والد ہمایوں کے لیے بھی یہی کیا تھا۔ بیرم خان بابر کے زمانے سے مغلوں کا پرانا وفادار تھا۔ وہ ہمایوں کے زمانے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوا، اور اسے اکبر کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ بیرم خان کو مغل سلطنت میں اکبر کے اتالیق کی حیثیت سے مکمل اختیار حاصل تھا، اس نے کبھی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وفادار بن کر رہا۔ ورنہ اس کے پاس ایسا کرنے کے تمام مواقع موجود تھے۔ ہمایوں کی موت کی خبر ملتے ہی، بیرم خان نے اکبر کی تاجپوشی کے انتظامات کا فوری مگر محتاط فیصلہ کیا جو 14 فروری 1556ء کو منعقد ہوئی۔ یہ تقریب پنجاب میں گرداسپور کے مغرب میں دریائے راوی کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قصبے کلانَور میں انجام پائی۔

4.3 اکبر کی ابتدائی فتوحات (Akbar's Initial Victories)

چاروں طرف سے دشمنوں اور حریفوں سے گھرے ہونے کی بنا پر اکبر کی حیثیت بہت ہی نازک تھی۔ اسے کئی مضبوط دشمنوں سے نمٹنا تھا۔ پنجاب میں یہ سکندر شاہ سوری تھا جو ایک سنگین خطرہ تھا۔ اسے منکوٹ کے قلعے میں گھیر لیا گیا، اور اس نے مئی 1557 میں ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے رحم کی بھیک اور اپنی جان کی امان مانگی اور بطور عطیہ کچھ زمین حاصل کر لی۔ اسی سال یعنی 1557 میں مغل تخت کا ایک اور مضبوط دعویدار محمد عادل شاہ بنگال کی طرف پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا، جہاں وہ بنگال کے حکمران کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن سب سے سنگین چیلنج ہیم چندر کی طرف سے آیا، جسے ہیمو کے نام سے جانا جاتا تھا، اور اس سے نمٹنا ایک بے حد مشکل کام تھا۔

4.3.1 پانی پت کی دوسری جنگ (Second Battle of Panipat, 5 November 1556)

ہیمو کا آغاز بڑی نچلی سطح سے ہوا لیکن اس نے تیزی سے ترقی پائی۔ اس کا تعلق دہلی کے قریب اَلوَر سے تھا اور وہ ہیم چندر کے نام سے معروف تھا۔ ابوالفضل کے مطابق وہ نمک (saltpeter) فروخت کرتا تھا۔ اسلام شاہ نے اس کی قابلیت کو پہچانتے ہوئے اسے دہلی بازار کا نگران مقرر کیا۔ عادل شاہ نے جب اسلام شاہ کے بیٹے کا تخت الٹ دیا تو یہ ہیمو ہی تھا جس نے حکومت چلائی کیونکہ عادل شاہ عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ اگرچہ ابوالفضل نے ہیمو کا یہ کہتے ہوئے مذاق اڑایا کہ اس کے پاس 'نہ رتبہ ہے، نہ نسل، نہ خوبصورتی اور نہ ہی عمدہ خصوصیات'، ہیمو نے ایک ماہر مدبر اور عظیم جرنیل کے طور پر اپنی قابلیت ثابت کی۔ اس نے اپنے آقا عادل شاہ کے لیے بائیس فتوحات حاصل کیں۔ ہیمو

کے پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی: وہ کسی بڑے گھرانے سے نہیں آیا تھااور بنیاذات سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمایوں کی موت سے حوصلہ پاکر ہیمواپنے آقا عادل شاہ کے صدر مقام چنار سے نکل گیا۔ اکتوبر 1556 میں اس نے آگرہ پر حملہ کر دیااور مغل فوج کو شکست دی اور اس کے بعد دہلی پر حملہ آور ہوا۔ جان کے خوف سے مغل کمانڈر تردی بیگ خان فرار ہو گیا۔ ہیمو دہلی میں داخل ہوااور اس نے وکرمادتیہ کالقب اختیار کیا۔ اگرچہ مغل افواج کے حوصلے پست ہو چکے تھےاور وہ کابل کی جانب پسپائی اختیار کر رہے تھے، اکبر اور بیرم خان نے ان کا اعتماد بڑھادیا۔ انہوں نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیااور ہیمو سے لڑنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ بددل مغل افسران کو سنگین نتائج سے آگاہ کرتے کرنے کے لیے، بیرم خان نے تردی بیگ کو بزدلی اور فرض سے غفلت کے الزام میں پھانسی دے دی کیونکہ وہ ہیمو کے خلاف لڑے بغیر دہلی سے بھاگ گیا تھا۔ اس سے مغل افسر دہشت زدہ ہو گئے اور وہ بلا چوں چرا احکام کی تعمیل کرنے لگے۔

5 نومبر 1556 کو مغل فوج، پانی پت کے تاریخی میدان جنگ میں ہیمو کی فوج کے دوبدو آئی۔ ہیمو جنگ جیتنے ہی والا تھا، لیکن قسمت اس کے حق میں نہیں تھی۔ ایک حادثے نے ہیمواور اکبر دونوں کی تقدیر بدل دی۔ ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں لگااور اس کی کھوپڑی کے پار گزر گیا جس سے وہ بے حس و حرکت ہو کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی اس کی فوج کے حوصلے پست ہو گئےاور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ نیم مردہ ہیمو کو اکبر اور بیرم خان کے سامنے لایا گیا۔ بیرم خان نے ہیمو کے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکبر سے کہا: 'یہ تمہاری پہلی جنگ ہے۔ اس بے دین پر اپنی تلوار چلاؤ، کیونکہ یہ ایک نیک عمل ہو گا۔' لیکن اکبر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: 'اب وہ ایک مردہ آدمی سے زیادہ کچھ نہیں، میں اسے کیسے مار سکتا ہوں؟ اگر اس میں عقل اور طاقت ہوتی تو میں اپنی تلوار آزماتا۔' اس کے بعد بدایونی کے مطابق بیرم خان نے خود ہیمو کا سر قلم کر دیا۔ اس کا سر انعام کے طور پر کابل بھیجا گیااور دھڑ دہلی میں بھیج دیا گیا جہاں اسے بطور عبرت ایک کھمبے پر لٹکا دیا گیا۔

ہیمواور اکبر کا جھگڑا ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہیں تھا۔ یاد رہے کہ ہیمو نے افغان سلطانوں کی خدمت کی جو مسلمان بھی تھے۔ مورخ جے ایل مہتا نے لکھا ہے کہ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھا، جس میں سینکڑوں افغان رئیس اور ان کے ذاتی دستے شامل تھے۔ پانی پت کی دوسری جنگ نے جہاں دہلی میں مغلوں کو دوبارہ استحکام بخشا وہیں اس کے دور رس نتائج نکلے جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اس طرح، تخت پر فائز ہونے کے اٹھارہ مہینوں کے اندر، اکبر کے عہدہ کے لیے تین سنگین ترین خطرات، سکندر شاہ، عادل شاہ اور ہیمو کو راستے سے ہٹادیا گیا۔ اس نے اکبر اور بیرم خان کو مزید آگے بڑھنے کی ترغیب دی اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اجمیر کا قلعہ مغلوں نے 1558 میں بغیر کسی لڑائی کے جیت لیا۔ گوالیار کا قلعہ 1559ء میں فتح ہوا، 1560ء میں جونپور بھی قبضہ میں آچکا تھا۔ یاد رہے کہ اکبر نے یہ سب کچھ بیرم خان کی سرپرستی میں حاصل کیا تھا۔

4.3.2 مالوہ کی فتح (Conquest of Malwa)

مالوہ، سوری سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ مالوہ کا گورنر شجاعت خان، محمد عادل شاہ سوری کے دور میں دہلی سے تقریباً آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے سارنگ پور سے حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد، اس کا بیٹا باز بہادر 1556 کے اوائل میں مالوہ کا حکمران بنا۔ اس نے شیر خوار بیٹے کی

طرف سے حکومت کرنے والی رانی درگاوتی کے زیر اقتدار گونڈوانا پر حملہ کیا لیکن وہ یہ لڑائی ہار گیا۔ اس نے عورت کے ہاتھوں شکست کھانے کو انتہائی ذلت آمیز سلوک سمجھا، پدرانہ نظام اس کے دماغ پر چھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بنا پر اس نے ریاست کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر گیا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ اکبر نے مالوہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ 1560 میں، اس نے شاہی فوجیں آدھم خان کی کمان میں اور ملا پیر محمد خان کو نائب کماندار بنا کر بھیجیں۔ مغل فوجوں نے باز بہادر کو شکست دی اور مالوہ فتح کیا۔ باز بہادر خاندیش کی جانب فرار ہو گیا۔ مالوہ کی دولت، باز بہادر کے حرم کی مشہور خواتین سمیت آدھم خان کے ہاتھ لگ گئی۔ حرم کی سب سے زیادہ خوبصورت اور اسی لیے مشہور خاتون روپ متی نے اپنی عزت بچانے کے لیے خودکشی کر لی۔ آدھم خان کے مال غنیمت کے غلط استعمال اور اس کی خودسری نے اکبر کو اتنا مشتعل کیا کہ وہ سرپٹ مالوہ کی طرف دوڑا۔ اکبر کے اچانک سامنے آنے پر آدھم خان حیران رہ گیا۔ ماہم انگا، جو آدھم خان کی ماں اور اکبر کی دائی تھی، نے اکبر کے غضب کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے درحقیقت اپنے بیٹے کے پاس قاصد بھیجے تھے، لیکن اس سے پہلے کہ ماہم کے قاصد اس کا پیغام اس کے بیٹے تک پہنچا سکیں، اکبر سارنگ پور پہنچ گیا۔ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے، وہ خود وہاں پہنچی اور اپنے بیٹے کی جانب سے رحم کی درخواست کی، اکبر، جیسا کہ اس نے شاہی خاندان سے وابستہ بہت سے دیگر لوگوں کے ساتھ کیا تھا، نے آدھم خان کو بھی معاف کر دیا۔ آدھم خان کو مالوہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور ملا پیر محمد، جس نے مالوا کی فتح میں آدھم خان کے نائب کے طور پر کام کیا، کو اس کی جگہ پر رکھا گیا۔ اپنی اس ذلت پر آدھم خان نے مشتعل ہو کر شمش الدین اٹکا خان کو قتل کر دیا جسے حال ہی میں اکبر نے ترقی دی تھی۔ اس نے اکبر کی بھی جان لینے کی کوشش کی تاہم اکبر خوش قسمتی سے بچ گیا اور اس نے آدھم خان کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں 40 روز بعد ماہم انگا بھی فوت ہو گئیں ۔ باز بہادر دوبارہ منظر عام پر نمودار ہوا اور پیر محمد جسے آدھم خان کی جگہ مالوہ کا گورنر بنایا تھا، باز بہادر کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اکبر نے عبداللہ خان ازبک کی کمان میں ایک تازہ فوج بھیجی اور اس نے باز بہادر سے مالوہ دوبارہ واپس حاصل کر لیا۔ باز بہادر بھاگ کر میواڑ چلا گیا اور رانا اُدے سنگھ کے دربار میں پناہ لی۔ عبداللہ خان ازبک، جس نے اکبر کے لیے مالوہ کو دوبارہ حاصل کیا تھا، کو مالوا کا گورنر مقرر کیا گیا۔

4.3.3 باغی امرا اور بغاوتوں کا قلع قمع (Suppression of Disaffected Nobles, and Revolts)

ازبک، جن کی حکمران بابر کے خاندان سے روایتی دشمنی تھی، بار بار افراتفری پیدا کر رہے تھے اور ناقابل اعتماد ثابت ہو رہے تھے۔ پانی پت کی دوسری جنگ جیتنے میں اکبر کی مدد کرنے والے خان زمان ازبک کو جونپور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ خان زمان نے مشرقی ہندوستان سے افغان باغیوں کے حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور بہت بڑا مال غنیمت حاصل کیا، لیکن اکبر کو اس کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کیں اور اس کا بیشتر حصہ غلط استعمال کیا۔ اکبر حرکت میں آیا اور ذاتی طور پر جونپور کی طرف مارچ کیا۔ جب خان زمان نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی خطاؤں کے لیے معافی مانگی تو اکبر نے اسے معاف کر دیا۔ عبداللہ خان ازبک، جس نے اکبر کے لیے مالوہ پر دوبارہ قبضہ کیا اور بعد میں اس کا گورنر مقرر ہوا، نے بغاوت کے اشارے دکھائے۔ اکبر ذاتی طور پر مالوہ پہنچا اور عبداللہ خان پر اچانک حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ مؤخر الذکر نے گجرات کے حکمران کے پاس پناہ لی۔ اکبر نے کارا بہادر خان کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا اور آگرہ واپس آ گیا۔ دیگر بہت سے امرا نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تاہم وہ دبا دیے گئے۔

4.4 اکبر اور مغل سلطنت کی توسیع (Akbar and the Expansion of Mughal Empire)

اکبر نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ فوجی مہمات میں گزارا۔ اسے جنگ میں اتنا ہی مزہ آتا تھا جتنا کہ جانوروں کے شکار میں۔ مغل بادشاہوں کے برعکس، وہ اکثر ذاتی طور پر اپنے دشمنوں کے خلاف جنگوں کی قیادت کرتا تھا۔ عہد وسطیٰ کا ایک بے رحم بادشاہ، جو زمین کا بھوکا تھا۔ اس کے مطابق، 'بادشاہ کو ہمیشہ فتح کا ارادہ رکھنا چاہیے، ورنہ اس کے دشمن اس کے خلاف ہتھیار اٹھالیں گے۔ فوج کو جنگ میں استعمال کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ وہ تربیت کی کمی سے کند نہ بن جائیں۔' لہٰذا، اکبر میدان جنگ میں علاقوں کو فتح کرنے اور سلطنت کو پھیلانا چاہتا تھا۔ اکبر کے دور میں مغلوں کا علاقہ بہت تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ اس کی شروعات درحقیقت بیرم خان کے دور حکومت میں ہی ہوئی تھی۔

4.4.1 اکبر اور راجپوت سلطنتیں (Akbar and the Rajput Kingdoms)

راجپوتانہ کے علاقوں کو فتح کرنا اور راجستھان کے راناؤں کے دل و دماغ پر فتح حاصل کرنا اکبر کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ چند راجپوت سلطنتوں کے معاملے میں، شادی نے جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ حیرت انگیز کردار ادا کیا۔ اکبر صوفی خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے اجمیر کی جانب روانہ ہوا۔ یہ جنوری 1562 کی بات تھی۔ راستے میں امبر (موجودہ جے پور) کی راجپوت ریاست پڑتی تھی۔ امبر کے حکمران راجہ بہاری مل کچھواہا نے اکبر کے آگے خود سپردگی اختیار کی۔ وہ وہیں تک نہیں رکا۔ اس نے اکبر کو اپنی بیٹی سے شادی کی پیشکش کی۔ یہ دانشمندانہ اقدام امبر اور مغلوں دونوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ ایک بیوی کے علاوہ، اکبر کو راجہ مان سنگھ کی شکل میں ایک مضبوط فوجی جنرل ملا جو اس کی راجپوت بیوی کا بھتیجا، بھگوان داس کا بیٹا اور راجا بہاری مل کا پوتا تھا۔ اکبر نے ان کے ساتھ غیر معمولی طور پر اچھا سلوک کیا۔ ہندوستان کا مستقبل کا بادشاہ سلیم یعنی جہانگیر اسی شادی کا ثمر تھا۔ حرم میں راجپوت خواتین کی موجودگی نے اکبر پر خاص طور پر اس کے مذہبی نقطہ نظر کو وسیع کرنے میں بے حد اثر ڈالا۔ مغل فوجوں نے 1562 میں میرٹا کا قلعہ فتح کیا۔ میرٹا، جودھ پور کے راؤ مالدیو کے ایک نائب جئے مل راٹھور کے پاس تھا۔ شدید لڑائی ہوئی جس میں دونوں طرف سے بھاری جانی نقصان ہوا۔ جئے مل فرار ہو کر میواڑ چلا گیا جہاں اس نے رانا اُدے سنگھ کی ماتحتی اختیار کی جیسا کہ آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے، یہ جئے مل ہی تھا جس نے چتور کا بہادری سے دفاع کیا اور اسے اکبر نے خود گولی مار کر ہلاک کیا۔

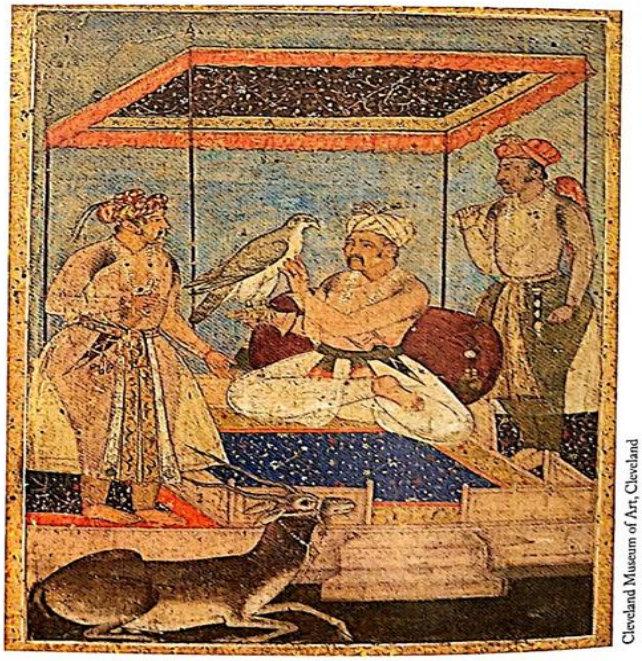
4.4.2 اکبر اور گونڈوانا کی رانی درگاوتی (Akbar and Rani Durgavati of Gondwana)

گونڈوانا پر مہوبا کی چندیل شہزادی رانی درگاوتی کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے نابالغ بیٹے ویر نارائن کی جانب سے حکومت کی۔ گونڈوانا جدید مدھیہ پردیش کے شمالی حصے میں تھا۔ چوراگڑھ اس کا دارالحکومت تھا۔ 1564 میں اکبر نے اپنی فوج کو گونڈوانا کی جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ حملہ آور مغل فوج 50,000 گھڑ سواروں پر مشتمل تھی اور اس کی کمان آصف خان کے ہاتھوں میں تھی۔ دو دن تک بہادری سے لڑنے کے باوجود، رانی درگاوتی مغلوں کو زیر نہ کر سکی۔ وہ شدید زخمی ہو گئی اور اپنی عزت بچانے کے لیے خود کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر لیا۔ اس کا بیٹا بھی چوراگڑھ کا دفاع کرتے ہوئے شکست کھا گیا، جس پر مغل فوج نے حملہ کیا تھا۔



Alamy

A sketch of Akbar, c. 1600. Akbar did not want to die and was told that he would live several times the span of a normal life. But as he neared his sixties, the tireless emperor was ageing, whether he liked it or not. Artist unknown.



Cleveland Museum of Art, Cleveland

Akbar, Salim and Khusro, c. 1602–04. Salim has brought his father a trained falcon, but Akbar is no longer the young boy who derived such joy from his hunts. Instead, he looks a bit hunted himself, trapped between the ambitions of his lone remaining son, Salim, and his favourite grandson, Khusro (standing behind). Artist unknown.

Source: Parvati Sharma, *Akbar of Hindustan*, Juggernaut, New Delhi, 2022.

4.4.3 میواڑ پر قبضہ (Capture of Mewar)

اکبر چاہتا تھا کہ میواڑ کا رانا، اودے سنگھ (رانا سانگا کا بیٹا) اس کی حکمرانیت کو قبول کرلے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ رانا، اکبر کی حکمرانیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن اس نے خصوصی مراعات پر اصرار کیا جیسے بادشاہ کے سامنے ذاتی حاضری سے استثنیٰ اور مغل بادشاہ کو میواڑ کی شہزادی کی پیشکش نہ کرنا۔ ابوالفضل کے مطابق ایک غلط فہمی جنگ کا باعث بنی۔ صورت حال کچھ بھی ہو، میواڑ کی

راجدھانی چتور کو فتح کرنا اکبر کے لیے بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ رانا میں اکبر کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ لہٰذا، جیسے ہی مغل فوج نے میواڑ کی جانب پیش قدمی کی، وہ اپنے دو قابل جرنیلوں، جئے مل اور پٹہ کی کمان میں قلعہ کے دفاع کو چھوڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ ان دونوں نے قلعہ کا بھرپور دفاع کیا۔ لیکن اکبر نے سنگرام نامی اپنی بندوق سے 23 فروری 1568 کو جئے مل کو گولی مار دی۔ راجپوت آخری جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور جوہر کی آگ جلائی گئی۔ جوہر کا مطلب یہ تھا کہ راجپوت ہار مان رہے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑنا چھوڑ رہے ہیں۔ ہر راجپوت دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے اپنے خون کے آخری قطرہ تک بہادری سے لڑتا رہا۔ راجپوتوں نے جو مزاحمت کی اس نے اکبر کو مشتعل کر دیا اور اس نے قلعہ میں لوگوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ابوالفضل کے مطابق، تقریباً 30,000 لوگ، جو زیادہ تر کسان تھے، جنہوں نے قلعہ میں پناہ لی تھی، قتل کر دیے گئے۔ چاہے تعداد میں مبالغہ آمیزی کی گئی ہو لیکن قتل عام کا حکم اکبر کے بے رحم پہلو کو صاف طور پر واضح کرتا ہے۔ مورخ ابراہم ایرالی (Abraham Eraly) کہتا ہے کہ 'یہ قتل عام محض انتقام نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بھی ایک پالیسی تھی۔ جتنی زیادہ مزاحمت، اتنی ہی بڑی انتقامی کارروائی، یہ مغلوں کا اصول تھا تاکہ ممکنہ مخالفین کے دلوں میں دہشت بٹھا دی جائے اور ان کے لڑنے کے ارادے کو کمزور کر دیا جائے۔'

4.4.4 اکبر اور رانا پرتاپ (Akbar and Rana Pratap)

1572 میں ادے سنگھ فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے رانا پرتاپ نے، جو اس کا جانشین بنا، مغلوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ تاہم، شروع میں، وہ اکبر کا تابعدار بننے کی جانب مائل ہوا اور یہاں تک کہ اس نے اپنے بیٹے امر سنگھ کو مغل دربار میں بھی بھیجا لیکن اس نے ذاتی طور پر خود وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ متکبر اور سامراجی اکبر کا اصرار تھا کہ رانا پرتاپ کو ذاتی طور پر خود سپردگی کرنا چاہیے۔ رانا بھی اتنا ہی ضدی تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی تھیں جنہوں نے پہلے سے خراب ماحول کو مزید خراب کر دیا۔ چونکہ اکبر چاہتا تھا کہ رانا پرتاپ اس کا حلیف یا تابعدار بنے، اس نے امن کا معاہدہ کیا اور مان سنگھ کو رانا پرتاپ کی راجدھانی ادے پور بھیج دیا۔ اس نے رانا کو خلعت یا شاہی لباس بھی بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رانا نے مان سنگھ کا خیر مقدم کیا اور اس کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا۔ کرنل جیمز ٹوڈ (جس نے Annals and Antiquities of Rajasthan نامی کتاب لکھی) کے مطابق رانا پرتاپ خود جان بوجھ کر دعوت میں شامل نہیں ہوا۔ مان سنگھ نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ جب اس نے پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ سے پوچھا کہ اس کے والد کیوں موجود نہیں ہیں، تو اس نے جھوٹ بولا کہ اس کے والد کے سر میں درد ہے۔ مان سنگھ سمجھ گیا کہ یہ اس کے ساتھ کھانے سے بچنے کا محض ایک بہانہ ہے۔ اس نے اشارے سے رانا سے اتنے برے سلوک کی وجہ پوچھی جس پر رانا نے جواب دیا کہ وہ ایک ایسے راجپوت کے ساتھ نہیں کھا سکتا 'جس نے اپنی بہن کو ایک ترک کو (شادی کے لیے) دے دیا ہو اور جس نے شاید اس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہو'۔ آگ میں ایندھن ڈالتے ہوئے، میزبانوں میں سے کسی نے مان سنگھ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اگلی بار جب وہ وہاں جائے تو اپنا پھوپھا لے کر آئے۔ مان سنگھ کو بہت غصہ آیا اور اس نے جنگ میں رانا کے غرور کو کچلنے کا عہد کیا۔ مورخین کے مطابق ایک اور وجہ بھی تھی۔ اکبر کو جنون کی حد تک ہاتھی جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے رام پرساد نامی ایک عظیم ہاتھی کے بارے میں سنا تھا جس کا مالک رانا پرتاپ تھا۔ اکبر وہ ہاتھی لینا چاہتا تھا لیکن رانا نے اسے اکبر کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا۔

اصل وجوہات جو بھی ہوں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اکبر کسی بھی قیمت پر رانا پرتاپ کی خود سپردگی چاہتا تھا۔ جیسا کہ مان سنگھ کا امن مشن ناکام ہوا، اکبر نے فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ ہلدی گھاٹی کی مشہور جنگ تھی جو 18 جون 1576 کو لڑی گئی۔ مغل جیت گئے اور ادے پور پر قبضہ کر لیا۔ رانا پرتاپ جان بچانے کے لیے گھنے جنگلوں میں چلا گیا۔ لیکن اس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور مغل اسے کچل نہ سکے۔ میواڑ کی مسلسل مزاحمت اس وقت ہی ختم ہوئی جب رانا پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ نے اکبر کے بیٹے جہانگیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ رانا پرتاپ کو اکثر ایک بہادر ہندو ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس نے غیر ملکی مسلمانوں یعنی مغلوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اسے منظم طریقے سے راجپوتوں کا محافظ اور اس لحاظ سے غالب مسلمانوں کے مقابلے ہندوؤں کے سپوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صرف خام خیالی ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے۔ پرتاپ اور اکبر کے درمیان کا جھگڑا بالکل بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کا تنازعہ نہیں تھا جیسا کہ زیادہ تر گمراہ ذہن سمجھتے ہیں اور اسے لٹریچر، لوک گیتوں، عام کتابوں اور عوامی تقریروں کے ذریعے تقویت پہنچاتے ہیں اور دروغ گوئی کرتے ہیں۔ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ رانا پرتاپ کی فوج کی ساخت ملی جلی تھی: اس میں راجپوت/ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ اس کی ایک بہترین مثال حکیم خان سور ہے، جو ایک مثالی افغان جنرل تھا جس نے رانا پرتاپ کے شانہ بشانہ جنگ لڑی۔ اسی طرح کئی راجپوت/ہندو (امبر، بیکانیر اور بنڈی سے) اکبر کے ساتھ تھے اور رانا پرتاپ کے خلاف لڑے۔ لہٰذا، پرتاپ اور اکبر کے درمیان لڑائی بالکل بھی مذہبی جنگ نہیں تھی جیسا کہ بہت سے لوگ اسے باور کروانا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ ابراہم ایرالی (Abraham Eraly) کا کہنا ہے کہ 'مغل اور میواڑ کا جھگڑا بنیادی طور پر اقتدار کی لڑائی تھی، جیسا کہ کسی بھی دو بادشاہوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں وقار (Honour) ضرور شامل تھا، لیکن یہ پرتاپ سنگھ کا ذاتی وقار تھا، راجپوت یا ہندو کا وقار نہیں۔'

4.4.5 رنتھمبور کی فتح (Conquest of Ranatambhor)

اپریل 1568 میں اکبر نے اپنی فوج کو راجپوتوں کے مضبوط گڑھ رنتھمبھور کو فتح کرنے کا حکم دیا۔ میواڑ کا ایک جاگیردار سُرجَن رائے ہرا اس کا حکمران تھا۔ تاہم، مالوا میں مرزاؤں کی بغاوت کی بنا پر، اکبر نے حملہ آور فوج کو واپس بلا لیا۔ اس نے فروری 1569 میں رنتھمبور کے خلاف دوبارہ حملہ شروع کیا اور ذاتی طور پر فوج کی قیادت کی۔ چھ ہفتے تک سخت لڑائی ہوئی۔ سرجن رائے نے امن کی خواہش ظاہر کی اور 18 مارچ 1569 کو قلعہ حوالے کر دیا اور شاہی سرپرستی میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول اکبر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

4.4.6 کالنجر، جودھ پور، بیکانیر اور جیسلمیر کی اطاعت

(Submission of Kalinjar, Jodhpur, Bikaner, and Jaisalmer)

چتوڑ اور رنتھمبور کے زوال نے دوسرے راجپوت حکمرانوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اکبر نے بندیل کھنڈ میں کالنجر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس پر ریوا کے راجہ رام چندر کی حکومت تھی۔ اگست 1569 میں، مجنون خان کی قیادت میں، مغل فوجوں نے کالنجر کا محاصرہ کیا۔ راجہ رام چندر سخت مزاحمت نہ کر سکا اور مغل سلطنت کے سامنے پیش ہو گیا۔ کالنجر کو مغل سلطنت کا حصہ بنا لیا گیا اور راجہ کو باعزت طور پر الہ آباد کے

قریب ایک جاگیر عطا کر دی گئی۔ کالنجر کے سقوط نے دوسرے راجپوت راجاؤں کی خود سپردگی کو تیز کر دیا۔ نومبر 1570 میں دو راجپوت حکمرانوں نے اکبر کے اقتدار کو قبول کیا۔ ایک جودھ پور کے راجہ مالدیو کا بیٹا راجہ چندر سین تھا۔ دوسرے بیکانیر کا راجہ کلیان مل تھا۔ اکبر کو ان کے تابع کرنے میں امبر کے راجہ بھگوان داس نے سہولت فراہم کی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، بھگوان داس اکبر کا برادر نسبتی اور مستقبل کے مغل بادشاہ جہانگیر کا ماموں تھا۔ اکبر نے بیکانیر کے حکمران خاندان کی شہزادی سے شادی کی اور کلیان مل کے بیٹے رائے سنگھ کو مغلوں کی سرپرستی میں لے لیا۔ دسمبر 1570 میں، جیسلمیر کے حکمران راول ہر رائے نے اکبر کی حکمرانیت کو تسلیم کیا اور اپنی بیٹی کی اکبر سے شادی کی پیشکش بھی کی۔ اس طرح، 1570 کے آخر تک، میواڑ اور اس کی نمک خوار ریاستوں دنگار پور، بانسواڑہ اور پرتاپ گڑھ کو چھوڑ کر پورا راجپوتانہ مغل سلطنت کے تسلط میں آ گیا۔

4.4.7 گجرات کی فتح (Conquest of Gujarat)

1537 میں بہادر شاہ کی موت کے بعد گجرات کے سیاسی حالات افراتفری کا شکار ہو گئے۔ یہ حالات باغی مرزاؤں کے وہاں پناہ لینے کے لیے سازگار ثابت ہوئے۔ 1572 میں، گجرات میں کوئی مضبوط حکومت نہیں تھی اور اس کا حکمران، مظفر شاہ سوم، کافی غیر مقبول تھا۔ تقریباً نصف درجن جاگیر دار سرداروں نے اس کے اقتدار کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جولائی 1572 میں،، مظفر شاہ سوم کے سیاسی مخالفین میں سے ایک، اعتماد خان نے اکبر سے مدد کی اپیل کی۔ اکبر نے نہ صرف مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور خان کلاں (یعنی مرزا محمد خان اٹکا) کی سربراہی میں فوج بھیجی بلکہ ساتھ ہی ذاتی طور پر بھی گجرات کے دارالحکومت احمد آباد کی طرف کوچ کیا۔ احمد آباد کا قلعہ بغیر کسی لڑائی کے ہاتھ آ گیا۔ مظفر شاہ کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اکبر اس سے نرمی سے پیش آیا۔ اعتماد خان مغلوں کا حلیف بن گیا۔ جیسے ہی مظفر شاہ اور اعتماد خان دونوں نے بغاوت کے آثار ظاہر کیے، اکبر نے انہیں قید کر دیا اور مرزا عزیز کوکا کو گجرات کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد اکبر نے گجرات کے کئی دوسرے علاقوں کو فتح کیا۔ گجرات میں ایک مناسب شہری انتظامیہ کا بندوبست کرنے کے بعد، اکبر مارچ 1573 میں سیکری واپس آیا اور شاندار طریقے سے فتح کا جشن منایا۔ تاہم، اکبر کی گجرات کی پریشانیاں ختم نہیں ہوئیں۔ اکبر کی واپسی کے چھ ماہ کے اندر اندر، محمد حسین کی قیادت میں، گجرات میں سرکش لوگوں نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے نہ صرف گجرات کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا بلکہ احمد آباد کے قلعے میں مغل گورنر کا محاصرہ بھی کر لیا۔ اس خبر نے اکبر کو مشتعل کر دیا اور اس نے دوسری بار گجرات کی طرف کوچ کیا۔ وہ اس تیزی سے گجرات پہنچا کہ سیکری سے نکلنے کے 11 دنوں کے اندر اندر وہ 450 میل کا فاصلہ طے کر کے سابرمتی کے کنارے پر موجود تھا۔ (اس نے 23 اگست 1573 کو اپنے سفر کا آغاز کیا اور 2 ستمبر 1573 کو وہاں پہنچا۔ عہد وسطیٰ کے لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی تیز رفتاری تھی) غضبناک اکبر نے ایک طوفانی حملہ کیا اور باغیوں کو کاٹ اور کچل دیا۔ امن و امان کی بحالی کے بعد وہ سیکری واپس آ گیا۔

4.4.8 بہار اور بنگال کی فتح (Conquest of Bihar and Bengal)

بہار اور بنگال شیر شاہ کے دور میں سوری سلطنت کے گڑھ تھے۔ اس کی موت کے بعد، بہار کے افغان گورنر سلیمان کرّانی نے اپنی

آزادی کا اعلان کر دیا اور بنگال اور اڑیسہ کے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کا صدر مقام ٹانڈہ تھا۔ 1568 میں اس نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ سلیمان کی موت کے بعد افغان امرا نے اس کے بڑے بیٹے اور جانشین بایزید کو قتل کر کے سلیمان کے دوسرے بیٹے داؤد کو تخت پر بٹھایا۔ اکبر داؤد کے باغی رویے سے ناخوش تھا کیونکہ اس نے اکبر کو اپنی تخت نشینی سے مطلع نہیں کیا نہ ہی اس نے مغل سلطنت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ اکبر نے جونپور کے مغل گورنر منیم خان کو داؤد پر حملہ کرنے اور بہار فتح کرنے کا حکم دیا۔ شروع میں داؤد نے ہار مان لی لیکن جلد ہی اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور غازی پور میں مغل چوکی پر حملہ کر دیا۔ داؤد کے پاس ایک بڑی فوج تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ مغلوں کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اکبر نے ذاتی طور پر مغل فوج کی قیادت کی، داؤد کو اگست 1574 میں پٹنہ میں شکست ہوئی، اور بہار کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ شکست خوردہ داؤد، بنگال بھاگ گیا۔ جب منیم خان نے داؤد کا پیچھا کیا تو اس نے اڑیسہ میں پناہ لی۔ منیم خان کی خراب صحت کی وجہ سے وہ داؤد کے خلاف اپنی مہم جاری نہیں رکھ سکا۔ منیم خان کی موت کے بعد، داؤد نے ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے، وہ اگست 1576 میں مغلوں کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کا کٹا ہوا سر اکبر کو بطور یادگار بھیج دیا گیا۔ اس طرح بنگال مغلوں کے مضبوط تسلط میں آ گیا۔

4.4.9 کشمیر کی فتح (Conquest of Kashmir)

اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کے ایک حصے کے طور پر، اکبر چاہتا تھا کہ کشمیر مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں ہو۔ اکبر نے مطالبہ کیا کہ کشمیر کا سلطان اس کی اطاعت قبول کر لے۔ اس پر مثبت رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کشمیر کے سلطان یوسف خان نے 1581 میں اپنے ایک بیٹے کے ذریعے اکبر کو ٹالنے کی کوشش کی۔ 1585 میں اکبر شمال مغربی سرحد پر تھا۔ اس نے راجہ بھگوان داس، شاہ قلی محرم اور کئی دیگر امرا کو کشمیر فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مغل فوج دسمبر 1585 میں اٹّوک سے نکلی، یہ کشمیر کے سلطان کے لیے ایک مشکل صورتحال تھی اور اس کے پاس امن کی پیشکش کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ مغل کچھ شرائط پر امن کے لیے راضی ہوئے۔ مذکورہ شرائط کے مطابق، کشمیری سلطان کو سکوں کو اکبر کے نام پر ڈھالنا اور اس کے نام پر خطبہ دینا تھا۔ مزید برآں، مغل افسروں کو کشمیری ٹکسال، زعفران کی کاشت اور شالوں کی تیاری وغیرہ کو اپنے ماتحتی میں لینے کی اجازت دی گئی۔ اپنے بڑے بیٹے، یعقوب کے ساتھ، کشمیر کا سلطان مغل ایلچی کے ساتھ اکبر کو ذاتی طور پر خراج پیش کرنے کے لیے گیا لیکن توسیع پسند اکبر کا خیال مختلف تھا، وہ کسی بھی قیمت پر کشمیر کا الحاق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے متکبرانہ انداز میں برتاؤ کیا اور یوسف خان کو گرفتار کر لیا۔ تاہم سلطان کا بیٹا یعقوب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یعقوب نے مزاحمت کی اور چند لڑائیاں لڑیں۔ اکبر کو وادی کو زیر کرنے کے لیے تازہ فوج بھیجنی پڑی۔ مغلوں نے یعقوب کو پکڑ لیا اور باپ بیٹے دونوں کو قیدی بنا کر بہار بھیج دیا۔ وہ دونوں اسیری میں ہی مر گئے۔ کشمیر کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اسے کابل کے صوبہ کی سرکار بنا دیا گیا۔

4.4.10 سندھ کی فتح (Conquest of Sind)

1574 کے اوائل میں، اکبر نے بالائی سندھ کو فتح کر لیا تھا، جن میں بھکر کا جزیرہ قلعہ بھی شامل تھا۔ 1590 میں اکبر نے

عبدالرحیم خانخاناں کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔اس نے اسے سندھ کی فتح کو دریائے سندھ تک مکمل کرنے کی ہدایت کی۔ ترکمان سردار مرزا جانی بیگ، نچلی وادی سندھ پر حکومت کر رہا تھا۔ مغل فوج نے ٹھٹھا کا محاصرہ کر لیا اور سہوان پر بھی حملہ کیا۔ جانی بیگ نے چند ماہ تک سخت مزاحمت کی لیکن اسے شکست ہوئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔اس کے علاقے مغل سلطنت میں ملا لیے گئے۔ تاہم اکبر نے جانی بیگ کی شخصیت اور کردار کی تعریف کی۔ لہذا، اس نے اسے مغل سلطنت میں تین ہزاری کا منصب پیش کیا۔ جانی بیگ نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جانی بیگ، اکبر کے دین الٰہی کا رکن بنا اور اکبر کی محبت اور شفقت حاصل کی۔

4.4.11 اڑیسہ کاالحاق (Annexation of Orissa)

1580 کی دہائی کے آخر میں اکبر نے مان سنگھ کو حکم دیا کہ مغل سلطنت کو اس کی مشرقی سرحدوں کی جانب وسعت دی جائے۔ اڑیسہ پر لوہانی قبیلے کے ایک افغان خاندان کی حکومت تھی۔1590 میں اکبر نے اڑیسہ پر حملہ کیا۔اس کے حکمران نثار خان نے ہتھیار ڈال دیے۔پوری کے علاقے بشمول بھگوان جگن ناتھ کے مشہور مندر کو فتح کر لیے گئے۔جب 1592 میں نثار خان دوبارہ اپنا سر اٹھاتا ہوا نظر آیا تو مان سنگھ نے دوسری مہم کی قیادت کی، نثار خان کو شکست دی اور اڑیسہ کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔اسے بنگال کی ایک سرکار بنا دیا گیا۔

4.4.12 بلوچستان کی فتح (Conquest of Baluchistan)

بلوچستان کی فتح اکبر کی شمال مغرب میں توسیع پسندانہ پالیسی کا حصہ تھی۔ درحقیقت، مارچ 1586 کے اوائل میں، اکبر تقریباً 6 بلوچ سرداروں کو مغل دربار میں حاضری دینے اور اپنے اقتدار کو تسلیم کرانے میں کامیاب رہا۔اس نے میر معصوم کو بلوچستان فتح کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ 'تاریخ سندھ' نامی کتاب کا مصنف میر معصوم ایک مشہور مورخ تھا جس نے 'تلوار اور قلم یکساں خوش اسلوبی سے چلائے۔' بلوچستان پر، پنی (Pani) افغانوں کا قبضہ تھا۔ میر معصوم نے سبی (سیوی) نامی بلوچ قلعے پر حملہ کیا، جو کوئٹہ کے شمال مشرق میں واقع تھا۔اس جنگ میں معصوم نے انہیں شکست دی اور ساتھ ہی اس نے تدبیر سے کام لیا۔ وہ انہیں شاہی سرپرستی کو قبول کرنے کے فوائد کے بارے میں قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ معصوم کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس کے نتیجے میں ساحلی علاقے مکران سمیت پورا بلوچستان، قندھار کی سرحدوں تک مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔

4.5 دکنی فتوحات (Deccan Conquests)

4.5.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح (Conquest of Berar, Ahmednagar, and Khandesh)

شمالی ہندوستان میں اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے بعد مغلوں نے جنوب کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جغرافیائی نقطہ نظر سے شمال اور جنوب ایک دوسرے سے الگ تھے۔ دونوں کے درمیان ایک جغرافیائی حد فاصل تھی جو اور کہیں نہیں ملتی۔ لیکن یہ ایسی سرحد نہیں تھی جس کے پار افراد اور خیالات کا آنا جانا نہ ہو سکے تاکہ کسی حد تک دونوں کے درمیان ثقافتی اور جغرافیائی اتحاد قائم رہے۔ لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان ایک دوسرے سے الگ تھے کیونکہ دونوں میں اقتدار کی نوعیت مختلف تھی اور جغرافیای رکاوٹ

تھی۔ مورخ بنی پرساد مغلوں کی جنوب کے لیے اپنائی جانے والی پالیسی کیلیے جغرافیائی حقائق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ نظریہ تھا کہ پورے ملک میں ہمالیہ سے کنیا کماری تک ایک ہی طرح کا سیاسی نظام ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہاں علاقائیت اور جارحیت ہمیشہ بنی رہتی تھی۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا ہے کہ شمال ہی اکثر جارحیت پسند ہوتا تھا۔ جنوب میں فطرت نے ایک ایسا سیاسی نظام فروغ دیا جہاں اقتدار ایک ہی اکائی میں مرکوز نہیں ہو سکتا تھا جبکہ شمال میں ایک طاقت کے عروج کے ذریعے پورے شمال کو ایک ہی سیاسی نظام میں لانا ممکن ہو گیا لیکن زندہ رہنے کے لیے اسے اپنی توسیع کرنا ضروری تھا اور توسیع کے لیے سب سے بہترین علاقہ جنوب تھا۔ جب جنوبی ہندوستان کمزور اور بٹا ہوا تھا اس وقت شمالی ہندوستان میں ایک بڑی طاقتور ریاست کا عروج ہو رہا تھا۔ ایسی صورتحال میں اس بات کا پورا امکان تھا کہ شمال کی طرف سے جنوب پر حملہ ہو۔ جب جنوب کم دباؤ والا علاقہ ہو گیا تو وہاں باہری طاقت کا آنا فطری امر تھا۔ بنی پرساد کے مطابق 'یکسانیت (homogeneity) کے عناصر نے ہمیشہ شمال اور جنوب کو ایک دوسرے کے اوپر قبضہ کرنے کی تحریک دی ہے اور غیر جنسیت (heterogeneity) کے عناصر نے انہیں ایسا کرنے سے روکا ہے۔' اس لیے مالوہ اور گجرات کی فتح کے بعد اکبر جنوب کی سیاست میں مداخلت نہ کرتا، یہ ناممکن تھا۔ 1576 میں ایک مغل فوج نے خاندیش پر حملہ کیا اور اس کے حکمراں کو اطاعت قبول کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اسی درمیان جنوب کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ جنوبی ریاستوں میں باہمی لڑائیوں سے جنوب کی سیاست میں ابال آ رہا تھا۔

اکبر کو پورے ملک پر فرمانروائی کا دعوی تھا اس لیے وہ یہ چاہتا تھا کہ راجپوت راجاؤں کی طرح دکنی ریاستوں کے حکمران بھی اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس سے پہلے اس نے اپنا ایک ایلچی بھیج کر دکنی ریاستوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کے اقتدار کو قبول کر کے اس سے دوستی کر لیں۔ لیکن اس کے مشورے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ جب تک مغل سلطنت فوجی دباؤ نہیں ڈالے گی دکنی ریاستیں مغلوں کی اطاعت قبول نہیں کریں گی۔ 1591 میں اکبر نے ایک سفارتی مہم شروع کی۔ اس نے تمام دکنی ریاستوں کو مغلوں کی ماتحتی قبول کرنے کی دعوت دی۔ حسب توقع کسی بھی ریاست نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا البتہ خاندیش نے یہ دعوت قبول کر لی کیونکہ دوسری دکنی ریاستوں کی بنسبت خاندیش مغلوں کے قریب تھا اور اسے مغلوں کی طرف سے برابر خطرہ تھا۔ احمد نگر کے حکمران برہان نظام شاہ نے مغل ایلچی کے ساتھ بہت سخت سلوک کیا جبکہ دوسری دکنی ریاستیں دوستی کا وعدہ کر کے معاملے کو ٹال گئیں۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اکبر نے دکن کے سلسلے میں کسی خاص اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ 1595 میں برہان نظام شاہ کی موت کے بعد نظام شاہی امراء میں آپس کی لڑائی پھوٹ پڑی جس سے اکبر کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ ہوا یہ تھا کہ برہان نظام شاہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین متعین کیا تھا، لیکن بیجاپور احمد نگر کے بیچ ہوئی ایک جنگ میں اس کی موت ہو گئی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی تخت شاہی کے چار دعوے دار پیدا ہو گئے جنہیں چار مختلف گروہوں کی تائید حاصل تھی۔ سب سے مضبوط دعوی بہادر نظام شاہ کا تھا جو کہ مرحوم حکمراں کا بیٹا تھا۔ بیجاپور کا حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی بہادر کے دعوے کی تائید میں تھا جس کی حمایت عادل شاہ اول کی بیوہ چاند بی بی بھی کر رہی تھی جو کہ برہان نظام شاہ کی بہن تھی۔ وہ ایک ممتاز خاتون تھی جو ابراہیم عادل شاہ کی کم سنی کے زمانے میں دس سال تک بیجاپور کی اصل حکمراں رہ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی برہان کی تعزیت کے لیے آئی تھی لیکن وہاں اپنے بھتیجے بہادر کی تائید کے لیے اسے رکنا پڑا۔ دوسرا دعوی اخلاص خان کے گروہ کا تھا۔ اس نے موتی نامی ایک لڑکے کو لا کر

اسے سلطان منتخب کر دیا تھا۔ تیسرے گروہ کی قیادت ایک حبشی سردار ابھنگ خان نے کی اور برہان نظام شاہ اول کے بیٹے شاہ علی کی حمایت کی۔ چوتھا فریق احمد کی حمایت کر رہا تھا جس کی قیادت میاں منجھو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بہادر کو پکڑ کر اسیر بنالیا تھا، لیکن یہ جلد ہی پتہ چل گیا کہ احمد سچا وارث نہیں تھا اور اخلاص خان کی کڑی مخالفت کی وجہ سے میاں منجھو کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس نے احمد نگر شہر میں پناہ لی اور اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد سے مدد مانگی جو اس وقت گجرات کا صوبے دار تھا۔ اکبر نے احمد نگر پر حملہ کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ میاں منجھو کے ذریعے مدد مانگنے پر اکبر کو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے مناسب موقع مل گیا اور شہزادے نے خاندیش کے حکمراں رضا علی خان اور عبدالرحیم خانخاناں کو ساتھ لے کر 1595 میں احمد نگر کی طرف کوچ کیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں حریف پارٹی کے لیڈروں نے مغلوں کو مداخلت کی دعوت دے دی۔ اس طرح اب جو جد وجہد شروع ہوئی وہ دراصل احمد نگر پر غلبہ کے لیے مغلوں اور بیجاپور کے مابین جد وجہد تھی۔ احمد نگر کے امراء چونکہ آپس میں ہی الجھے ہوئے تھے اس لیے مغل فوج کو بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس طرح مغل فوجیں راجدھانی احمد نگر تک پہنچ گئیں۔ چاندبی بی اپنے بھتیجے اور کمسن بادشاہ بہادر کے ساتھ قلعہ میں محصور ہو گئی۔ چار ماہ تک قلعہ کا محاصرہ رہا جس کے دوران چاندبی بی نے عظیم حوصلے اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ چار ماہ بعد ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ مغل بہادر کے دعوے کو تسلیم کر لیں گے اور اس کے بدلے میں برار کا علاقہ مغلوں کو مل جائے گا۔ اس طرح 1596 میں مغلوں کا اقتدار بھی قبول کر لیا گیا۔

چاندبی بی کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مغلوں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مغلوں نے احمد نگر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جن میں پتھری بھی شامل تھا۔ اسے احمد نگر کو ابھی واپس نہیں کیا گیا تھا۔ جبکہ برار کے دو قلعے غالب گڑھ اور نرنالہ، احمد نگر کے افسروں کے قبضے میں تھے۔ اس لیے لڑائی پھر سے شروع ہونے کے اسباب تو پہلے سے ہی موجود تھے۔ محمد خان کے ذریعے مغلوں سے مدد کی درخواست کرنے پر حملے کا دوسرا بہانہ بھی مل گیا۔ مغل سلطنت میں برار کے انضمام سے دکنی ریاستیں ہوشیار ہو گئیں۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برار حاصل ہو جانے کے نتیجے میں دکن میں مغلوں کے قدم جم جائیں گے اور وہ کسی بھی وقت پیش قدمی کی حیثیت میں آجائیں گے۔ یہ خدشہ بے وجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ احمد نگر کی حامی ہو گئیں اور مغلوں کے ذریعے برار کے الحاق کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں۔ جلد ہی بیجاپور کے ایک کمان دار جمال خان کی قیادت میں بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر کی ایک بڑی اور مشترکہ فوج نے برار پر حملہ کر دیا۔ 1597 کی زبردست جنگ میں مغل فوج نے اپنے سے تین گنی دکنی فوج کو شکست دے دی۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں اور چاندبی بی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل اکیلی رہ گئی۔ حالانکہ چاندبی بی 1596 کے معاہدے کی پابندی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنے ان امیروں کو قابو میں نہیں رکھ سکی جو مغلوں کو پریشان کرنے کے لیے ان پر برار میں برابر حملے کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمد نگر کے قلعے کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔ کسی جگہ سے بھی کمک نہ ملنے کی وجہ سے چاندبی بی نے مغلوں کے ساتھ سمجھوتے کی بات شروع کی۔ لیکن مخالف گٹوں نے اس پر غداری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیا۔ اس طرح دکن کی سیاست کے ایک بہت ہی رومانوی کردار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد مغلوں نے احمد نگر قلعے پر حملہ کر کے 1600 میں اس پر فتح حاصل کر لی۔ نوعمر سلطان بہادر کو گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ بالا گھاٹ کو بھی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ احمد نگر میں مغل چھاونی قائم کر دی گئی۔

احمد نگر کی شکست اور بہادر نظام شاہ کو قیدی بنالینے سے دکن میں اکبر کے مسائل کا خاتمہ نہیں ہو گیا کیونکہ وہاں اب کوئی ایسا نظام شاہی شہزادہ یا امیر باقی نہیں بچا تھا جسے کافی تائید اور حمایت حاصل ہوتی اور جو اکبر کے ساتھ صلح کی بات چیت کر سکتا۔اس کے علاوہ مغل، احمد نگر سے آگے بڑھنے یا ریاست کے باقی ماندہ علاقوں کو زیر تسلط لانے کے بھی خواہش مند نہیں تھے۔ مغل امیروں کی آپسی تکرار سے صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔اکبر صورت حال کا بچشم خود جائزہ لینے کے لیے پہلے مالوہ اور پھر خاندیش کی طرف بڑھا۔ وہاں اسے یہ معلوم ہوا کہ خاندیش کے نئے سلطان نے شہزادہ دانیال کا مناسب طریقے پر احترام نہیں کیا تھا جبکہ وہ خاندیش کے علاقے سے گذر کر احمد نگر جارہا تھا۔اکبر خاندیش میں واقع اسیر گڑھ کے قلعے کو بھی اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ قلعہ دکن کا مضبوط ترین قلعہ مانا جاتا تھا۔ قلعے کے مضبوط محاصرے اور اندرو با پھوٹ پڑنے کی وجہ سے 1601 میں خاندیش کے سلطان کو قلعے سے باہر آنا پڑا اور ہتھیار ڈال دینے پڑے۔اس طرح خاندیش کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔اس دوران شہزادہ دانیال نے جو کہ اکبر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور جس کے ہاتھوں میں دکن میں موجود تمام فوجوں کی کمان تھی، مرتضی نظام شاہ دوم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ مرتضی نظام شاہ کو احمد نگر کے زوال کے بعد نظام شاہی امیروں کے ایک گروہ نے سلطان قرار دے دیا تھا۔ معاہدے کے مطابق 1601 میں بالا گھاٹ اور تلنگانہ کے کچھ علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے گئے اور ریاست کے باقی حصے کو اس شرط کے ساتھ مرتضی نظام شاہ کے قبضے میں رہنے دیا گیا کہ وہ کبھی سرکشی نہیں کرے گا۔اسیر گڑھ پر قبضے کے بعد اکبر شہزادہ سلیم کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے شمال کی طرف واپس لوٹ آیا۔ اگرچہ خاندیش، برار اور بالا گھاٹ کی فتح اور احمد نگر کے قلعے پر مغلوں کا قبضہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن مغلوں کو دکن میں ابھی اپنی حیثیت کو اور بھی مضبوط کرنا باقی تھا۔اکبر کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ بیجاپور کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیے بغیر دشمن کے مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو یقین دہانی کرانے کے لیے اس کے پاس پیغامات بھیجے۔ سلطان عادل شاہ نے شہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی تجویز رکھی جو قبول کر لی گئی۔ لیکن شادی کے فوراہی بعد 1602 میں زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے شہزادہ دانیال کی موت ہو گئی۔اس طرح دکن کی صورت حال غیر واضح اور پیچیدہ ہی رہی جس سے بعد میں اکبر کے جانشین جہانگیر کو نمٹنا پڑا۔

1.5.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی

(The Rise of Malik Ambar and the Failure of Mughals to Stabilize the Empire)

احمد نگر کے زوال نیز ضابطوں (نظام شاہی افسروں) کے ہاتھوں بہادر نظام شاہ کے قیدی بنالیے جانے کے بعد غالب امکان یہی تھا کہ احمد نگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور اس کے مختلف حصوں پر آس پاس کی ریاستیں قبضہ کر لیتیں۔ لیکن ملک عنبر کی شکل میں ایک قابل شخص کے عروج کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ملک عنبر ایک حبشی تھا جس کی پیدائش ایتھوپیا میں ہوئی تھی۔اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے نادار والدین نے اسے بغداد کے غلام بازار میں فروخت کر دیا تھا جسے بعد میں ایک تاجر خواجہ بغدادی نے خرید لیا اور اپنے ساتھ دکن لے آیا جہاں کی خوش حالی اس وقت میں چاروں طرف کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بغدادی نے اسے احمد نگر میں چنگیز خان کے ہاتھوں بیچ دیا، جو کہ مرتضی نظام شاہ اول کا وزیر تھا۔ ملک عنبر نے امیر چنگیز خان کے یہاں ملازمت کے

دوران کافی ترقی کی۔ جب مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا تو ملک عنبر اپنی قسمت آزمانے کے لیے بیجاپور چلا گیا۔ لیکن وہ جلد ہی واپس آ گیا اور چاند بی بی کے مخالف حبشی گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد نگر کی شکست کے بعد ملک عنبر نے ایک نظام شاہی شہزادہ کو ڈھونڈ نکالا جسے اس نے بیجاپور کے حکمران کی درپردہ تائید اور مدد سے مرتضیٰ شاہ دوم کے نام سے گدی پر بٹھا دیا، اور خود اس کا پیشوا بن گیا۔ پیشوا کا خطاب احمد نگر میں پہلے ہی سے رائج تھا۔ ملک عنبر نے کافی بڑی تعداد میں مراٹھا فوج (بارگی) اکٹھی کر لی۔ مراٹھا کافی تیز رفتاری سے حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دشمن کی فوجوں کی رسد کی لوٹ مار اور کمک کا راستہ کاٹ دینے میں کافی ماہر تھے۔ اگرچہ دکن میں یہ چھاپہ مار طریقہ جنگ مراٹھوں کے لیے ایک روایت بن چکی تھی، لیکن مغل اس سے قطعی ناآشنا تھے۔ ملک عنبر نے مراٹھوں کی مدد سے مغلوں کے لیے برار، احمد نگر اور بالا گھاٹ میں اپنی حیثیت مضبوط بنانا مشکل کر دیا۔ اس وقت دکن میں مغلوں کا کمانڈر عبدالرحیم خانخاناں تھا جو کہ ایک بہت ہی دور اندیش اور زیرک سیاست داں نیز قابل فوجی تھا۔ اس نے 1601 میں موجودہ مہاراشٹر کے مقام نانڈیر میں ملک عنبر کو شکست فاش دی لیکن اس نے ملک عنبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ نظام شاہی کے باقی علاقے میں استحکام برقرار رہنا ہی مناسب ہو گا۔ دوسری طرف ملک عنبر نے بھی خانخاناں کے ساتھ دوستی میں بہتری سمجھی کیونکہ اس طرح اسے اپنے اندرونی مخالفوں سے نپٹنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ یہ معاہدہ 1605 میں اکبر کی موت تک قائم رہا۔ اس کے بعد ملک عنبر نے مغلوں پر برابر حملے کیے۔

4.6 اکبر کے مذہبی افکار و اعمال (Religious Ideas and Practices of Akbar)

4.6.1 اکبر اور عبادت خانہ (Akbar and the Ibadat Khana)

اکبر ایک متجسس اور عقلی ذہن کا حامل تھا تاہم وہ مذہبی تصوف کی جانب مائل تھا۔ وہ زیادہ تر مذہبی تعصبات سے پاک تھا اور مذہبی امتیاز سے اسے نفرت تھی۔ ایک تجرباتی ذہن، اکبر نے مذہب کے ساتھ تجربات کیے اور اکثر اسے مذہبی شدت پسندوں کی جانب سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بہت زیادہ مراقبہ میں ڈوبنے والا اور روحانیت پسند تھا۔ تاہم اس کی روحانیت اور مذہبیت، تعقل و استدلال سے عاری نہیں تھی۔ اگرچہ وہ معجزاتی اور مسیحائی قوتوں پر یقین رکھتا تھا لیکن یہ اس کا عقیدہ تھا کہ 'معجزات پر سطحی لوگ یقین رکھتے ہیں لیکن دانشمند آدمی کسی بھی چیز کو بنا ثبوت کے نہیں مانتا۔' اکبر نے 1575 میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ قائم کیا۔ اس وقت اس کی عمر تینتیس سال تھی۔ 'عبادت خانہ'، مذہب اور فلسفہ پر تحقیقات کا ایک مرکز تھا۔ 'منتخب التواریخ' کے مصنف عبدالقادر بدایونی کے مطابق، اکبر نے بنگال کے سلطان سلیمان کرّانی سے متاثر ہو کر عبادت خانہ شروع کیا تھا، جو 'ہر رات تقریباً 150 افراد کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا جن میں نامور شیخ اور علمائے کرام شامل ہوتے تھے اور صبح تک ان کے مواعظات و تفاسیر سنتا رہتا تھا'۔ تاہم، اس عبادت خانہ کے قیام کی فوری وجہ بظاہر اس کے کزن سلیمان مرزا کی مغل دارالحکومت کو متوقع آمد تھی، جو بدخشاں کا حکمران تھا اور جس کے ساتھ اکبر طویل گھنٹوں تک گفتگو کرتا رہتا۔

بدایونی کے مطابق عبادت خانہ میں 'تصوف سے متعلق عقلی مباحث، فلسفہ اور قانون کے بارے میں تحقیق' پر گفتگو چلتی رہتی تھی۔ نظام الدین احمد کے مطابق، عبادت خانہ میں سائنس، مذاہب، لوگوں اور فرقوں کی قدیم اور جدید تاریخ، اور دنیا سے متعلق دیگر معاملات جیسے

موضوعات پر بحث ہوتی تھی۔ یہ بحثیں ہر جمعرات کی رات شروع ہوتی تھیں اور اکثر جمعہ کی دوپہر تک چلتی تھیں۔ابتدا میں، عبادت خانہ صرف مسلمان علما کے لیے کھلا تھا کیونکہ اکبر مختلف متحارب اسلامی فرقوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کا مقصد 'سچائی کا تعین کرنا' اور 'حقیقی مذہب کے اصولوں کو تلاش کرنااور انہیں منکشف کرنا،اور پھر اس کی الوہی اصل تک پہنچنا' تھا۔ مختلف فرقوں کے علماء کی متضاد آرا اکبر کو حقیقی مذہب کی تلاش میں مدد نہیں کر سکیں۔ وہ نہ صرف مایوس تھا بلکہ پریشان بھی تھا۔عبادت خانہ جیسا تجربہ داخلی نہیں ہو سکتا،اس میں ہندوستان میں موجود دوسرے مذاہب کے خوشگوار افکار کی بھی شمولیت ضروری تھی۔ 1578 میں اکبر نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مدعو کیا۔ مختلف مسلم فرقوں کے علاوہ، عبادت خانہ اب ہندوؤں، جینیوں، یہودیوں، زرتشتیوں اور عیسائیوں کے لیے کھل گیا۔ نہ صرف یہ بڑے مذہبی گروہ بلکہ غیر واضح سامی فرقہ جسے صابی (ستارہ پرست) کہا جاتا ہے،اور چارواک (ایک قدیم ہندوستانی مادیت پرست فرقہ) بھی وہاں موجود تھے۔ اسپین کے فلپ دوم کو لکھے گئے اپنے خط میں اکبر نے کہا: 'ہم تمام مذاہب کے علماء کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور اس طرح ان کے پر مغز بیانات اور اعلیٰ خیالات سے مستفید ہوتے ہیں۔' اکبر کا نظریہ تھا کہ 'کسی بھی مذہب کی توہین خدا کی توہین ہے'۔ اکبر کے تلخ ناقد بدایونی کے مطابق، اکبر نے مسلمانوں کے بہت سے مذہبی طریقوں کو فضول توہمات کے طور پر مسترد کیا،اور 'انسانی روایت نہیں بلکہ اس کے عقلیت پسندی کو مذہب کی واحد بنیاد کے طور پر تسلیم کیا۔'



Akbar holds a religious assembly at Fatehpur Sikri; the two men dressed in black are the Jesuit missionaries Rudolf Acquaviva and Francisco Henriques— Akbarnama, *miniature painting by Nar Singh, 1605.*

Source: Ira Mukhoty, *Akbar: The Great Mughal*, Aleph, 2020.

4.6.2 اکبر کا دین الٰہی (Akbar's Din i Ilahi)

دین الٰہی، یا ربانی عقیدہ، اکبر کے سب سے شاندار مذہبی تجربات میں سے ایک تھا۔ اس کا مقصد موجودہ مذاہب کو عدم استحکام سے دوچار کرنا نہیں تھا، بلکہ ان سب میں موجود اچھی باتوں کو یکجا کرنا تھا۔ اس نے اس دین کو 1582 کے اوائل میں رائج کیا۔ مورخین کی رائے ہے کہ یہ حقیقی معنوں میں کوئی نیا مذہب نہیں تھا اور نہ ہی اکبر نے کوئی نیا مذہب قائم کرنے اور پیغمبر بننے کی خواہش کی تھی۔ تاہم، یہ ایک

انتہائی متنازعہ مذہبی تجربہ ضرور بن گیا۔اس کے ذریعے اکبر تمام مذہبی برادریوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک مشترکہ بنیاد فراہم کرنا چاہتا تھا۔نہ عوام اس کی جانب مائل تھے اور نہ ہی اکبر اسے عام لوگوں میں پھیلانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔یہ ہم خیال دانشوروں کی ایک سماجی اور مذہبی انجمن تھی جس نے سخت گیر مذہبی عقائد کی تنگ رکاوٹوں کو عبور کیا۔فطری طور پر دین الٰہی کی رکنیت محدود تھی۔صرف اٹھارہ سرکردہ ارکان تھے جن میں سے صرف ایک ہندو تھا اور وہ راجہ بیربل تھا۔مورخ ابراہم ایرالی کہتے ہیں کہ ان اٹھارہ سرکردہ ارکان کے علاوہ، بلاشبہ، نچلی سطح پر کئی لوگ اس عقیدے کے پیروکار تھے۔تاہم ایرالی کا کہنا ہے کہ ،ان کی تعداد کبھی بھی بہت زیادہ نہیں رہی۔

دین الٰہی کا رکن بننے کا طریقہ کیا تھا؟اگر کوئی دین الٰہی کا رکن بننا چاہتا تو وہ ہاتھ میں پگڑی لے کر اکبر کے پاس آتا اور بادشاہ کے قدموں میں سجدہ کرتا تھا۔اکبر پھر اسے اٹھا کر اس کے سر پر پگڑی رکھ دیتا۔دین الٰہی قبول کرنے والے کو اپنے پرانے عقیدے کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔کوئی ہندو یا مسلمان ہوتے ہوئے بھی دین الٰہی کا رکن رہ سکتا تھا۔اکبر کے بیٹے جہانگیر کے مطابق، 'دین الٰہی کے دائرے میں داخل ہونے والے کو، فرقہ وارانہ جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ مذاہب کے عالمگیر امن کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔اسے اپنے ہاتھ سے کسی جاندار کو نہیں مارنا چاہیے اور نہ ہی کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لینا چاہیے۔البتہ جنگ اور تعاقب میں ان چیزوں سے استثنیٰ حاصل رہے گا۔ روشن اجسام (سورج، چاند وغیرہ) کی تعظیم کرنی ہے جو اپنے اپنے درجے کے مطابق خدا کے نور کے مظہر ہیں، اور ہر وقت اور ہر موسم میں خدا کی قدرت اور وجود کو تسلیم کرنا ہے۔اس بات (خدا کے وجود) سے ہمیشہ آگاہ رہیں، چاہے خلوت میں ہو یا جلوت میں، اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولیں۔' دین الٰہی کے اراکین ایک دوسرے کو 'اللہ اکبر' کہہ کر سلام کرتے اور اس کا جواب 'جل جلالہ' کہہ کر دیتے۔تاہم دین الٰہی برقرار نہ رہ سکا۔یہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی مر گیا۔پھر بھی، یہ ان اعلیٰ ترین مذہبی نظریات کی نمائندگی کرتا ہے جن کے لیے اکبر کھڑا تھا۔ لیکن بدایونی جیسے اس کے ہم عصروں نے مذہبی اور اور ثقافتی لحاظ سے اس مختصر مدتی تاہم عظیم منصوبہ کے لیے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔

4.7 اکبر کی شخصیت اور اس کے اثرات (Akbar's Personality and Its Effects)

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اکبر کئی معنوں میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔ہم جگہ کی کمی وجہ سے ان سب کو یہاں قلم بند نہیں کر سکتے، چند مثالیں نہ صرف فکری لحاظ سے بلکہ عملی طور پر بھی اسے عظیم ثابت کرتی ہیں۔کوئی بھی اچھا حکمران اپنی رعایا کے حقیقی حالات جاننا چاہتا ہے۔یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں حقیقی دلچسپی نہ لے۔1561 کے اوائل میں اکبر، اپنا بھیس بدل کر، آگرہ کی گلیوں میں گھومتا رہا تاکہ اپنی رعایا کے مسائل کو راست جان سکے۔آج جمہوری ہندوستان میں شاید ہی کوئی عوامی نمائندہ یہ نیک کام کرتا ہو۔جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ عام طور پر ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔1562 میں اکبر نے جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم کر دیا۔زائرین کو مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔1563 میں اکبر نے اس غیر معقول زیارت ٹیکس کو ختم کر دیا۔1564 میں اس نے جزیہ ٹیکس کو بھی ختم کر دیا۔ایک اسلامی ریاست میں، فوجی حفاظت کے بدلے قابل استطاعت غیر مسلموں پر جزیہ عائد کیا جاتا تھا۔1565 میں، اس نے متعدد مندروں کو غیر محصولی زمینی عطیات دیے۔

مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ راجپوت شہزادیوں سے شادیوں نے اکبر کی شخصیت کو بہت متاثر کیا۔ ابوالفضل کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ اکبر گھر اور سفر کے دوران گنگا کا پانی پیتا تھا۔ آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندو گنگا کے پانی کو مقدس مانتے ہیں۔ نسرین لکھتی ہیں کہ 'یہ پانی اس کے لیے مہر بند برتنوں میں لایا جاتا تھا۔ بارش کے پانی یا جمنا یا چناب کے پانی میں کھانا پکایا جا سکتا تھا لیکن اس میں گنگا کا تھوڑا سا پانی ضرور ملایا جاتا'۔ بدایونی نے اپنی کتاب 'منتخب التواریخ' میں اکبر کے بارے میں درج ذیل اقتباس لکھا:

> ابتدائی جوانی سے ہی، اپنی بیویوں، ہندوستان کے راجاؤں کی بیٹیوں کے احترام کے طور پر، اس نے زنان خانہ کے اندر 'ہوم' کی رسم کی انجام دہی جاری رکھی۔ یہ رسم سورج کی پوجا کی ایک شکل ہے۔ سورج کے کنیا (Virgo) میں داخل ہونے کے آٹھویں دن ایک تہوار منعقد ہوتا۔ اس دن وہ اپنے ماتھے تِلک لگا کر، اپنی کلائی پر بطور برکت برہمنوں کے ہاتھوں سجاوٹ بھرا دھاگہ بندھوا کر، دیوانِ عام میں آتا۔ کلائی پر راکھی پہننا بھی اس دور کا رواج بن گیا۔ ہر وہ اصول جس پر دوسرے مذاہب کے علما عمل پیرا تھے اسے اس نے ہمارے اس مذہب (اسلام) کے خلاف واضح اور فیصلہ کن سمجھا۔

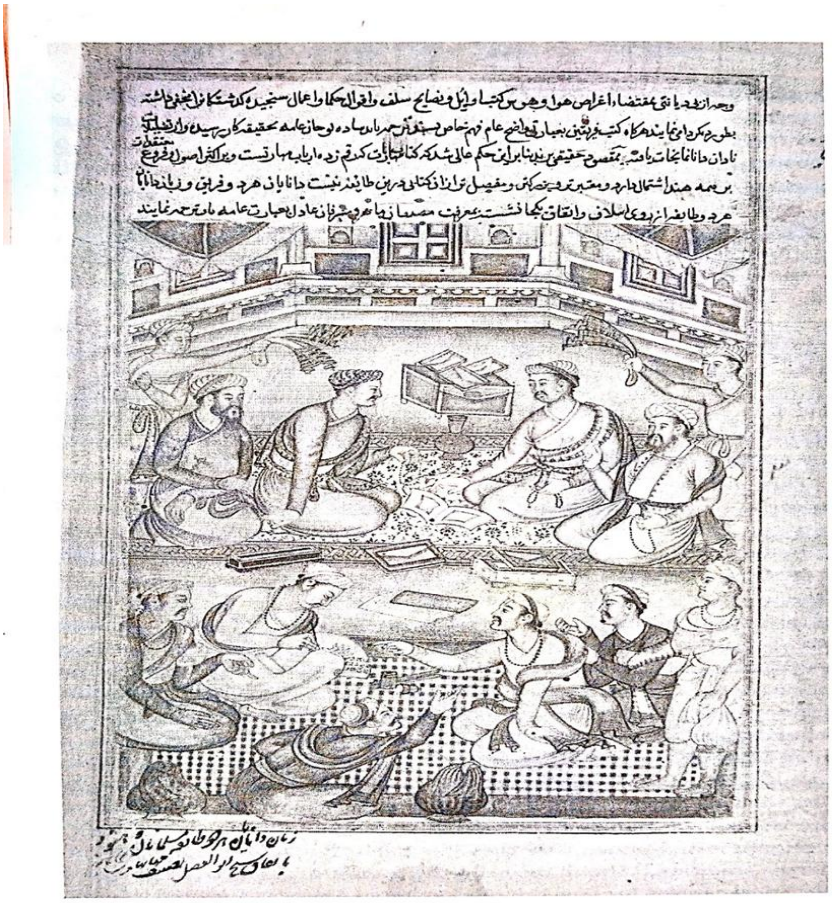


FIGURE Akbar's translation bureau with Sanskrit and Mughal translators collaborating, preface to the *Razmnāmah*, 1598–1599.

FREE LIBRARY OF PHILADELPHIA, LEWIS M18

Source: Audrey Truschke, *Culture of Encounters: Sanskrit at the Mughal Court*, Allen Lane/Penguin, New Delhi, 2016, p.106.

بلا شبہ، اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کو بہتر طور پر سمجھنے اور فارسی بولنے والی دنیا میں اس کی تفہیم کو مقبول بنانے کے لیے، اکبر نے 1573 میں 'مکتب خانہ' (ترجمہ بیورو) قائم کیا۔ اس کے زمانے میں بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنگھاسن بتیسی (نامہ خرد افزا)، اتھرو وید (اتھربن)، مہابھارت (رزم نامہ)، رامائن، ہری وَنش پران (ہری بَن)، لیلاوتی (بھاسکراچاریہ کی 1150 میں لکھی گئی ریاضی کی تصنیف)، تاجک انیل کنٹھی (تاجک؛ فلکیات پر ایک تصنیف)، راج ترنگنی (کلہن کی تصنیف کردہ کشمیر کی تاریخ)، پنچ تنتر (جانوروں کی کہانیوں کے

توسط سے حکمت کے اسباق) وغیرہ ان میں سے چند تصنیفات تھیں جن کا ترجمہ کیا گیا۔ ابوالفضل کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستانی ثقافت کا مطالعہ نہیں کیا کیونکہ انہیں وراثت میں ملی روایت نے آزادی سے چھان بین کی اجازت نہیں دی۔ 'کیوں' اور 'کس طرح' یہ پوچھنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں تعقل واستدلال کے دروازے دوبارہ کھل گئے اور در حقیقت یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اکبر بہت انسان دوست تھا اور وہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے ذاتی غلاموں کو آزاد کیا۔ اسے مجرموں پر تشدد سے نفرت تھی اور اس نے مشورہ دیا تھا کہ صرف سنگین ترین جرائم میں ہی جسمانی ایذا دی جائے۔ خواتین کی فلاح و بہبود کے معاملے میں اکبر کی فکر مندی کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اکبر بچپن کی شادی کے خلاف تھا اور اس کا کہنا تھا کہ بچپن کی شادیوں سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ اس نے کثیر زوجیت پر یک زوجیت کو ترجیح دی۔ البتہ کہا کہ اگر ایک بیوی بچے پیدا نہ کر سکے تو مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔ وہ جوان بیواؤں کی دوبارہ شادی کے حق میں تھا۔ اس نے ستی کے ہولناک عمل کی مذمت کی (جس میں ایک عورت کو اس کے شوہر کی چتا پر زندہ جلا دیا جاتا تھا)۔ 1583 میں اس نے ایک عورت کو ستی ہونے سے بچایا۔ اس نے جائیداد کی اسلامی تقسیم میں خواتین کو دیے گئے کم حصہ پر سوال اٹھایا۔ اس نے دارالحکومت میں طوائفوں کی رہائش کے لیے ایک علاقہ مختص کیا اور اس علاقے کا نام 'شیطان پورہ' رکھا گیا۔ اس نے ذاتی طور پر معروف طوائفوں سے بات کی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا اس کے کسی وزیر نے ان کا استحصال کیا یا ایسا کرنے کی کوشش کی۔ خواتین کے ساتھ بدسلوکی اکبر کو مشتعل کر دیتی تھی۔ اکبر کے ماموں خواجہ معظم نے غصے میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ اکبر نے اسے لاتوں اور لاٹھیوں سے بری طرح پٹوایا۔ اتنا ہی نہیں اسے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ 1594 میں اس نے غلاموں کی تجارت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کے اپنے محل کی حفاظت کا سربراہ ایک دلت ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اکبر نے اسے خدمت رائے کے لقب سے نوازا۔

4.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اکبر کی قیادت میں مغل سلطنت کس طرح دور دور تک پھیل گئی تھی۔ توسیع کی سامراجی پالیسی نے اکبر کو ہندوستان کے بہت سے حکمرانوں اور خاص طور پر راجپوتوں کے ساتھ ٹکراؤ کی راہ پر ڈال دیا۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ راجپوتوں اور اکبروں کے درمیان لڑائیاں ہندو مسلم تنازعات نہیں تھے۔ وہ خالصتاً سیاسی نوعیت کے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مذہب کے معاملے میں کس طرح اکبر نے تمام مذاہب کے بہترین اعمال کو قبول کرنے کی کوشش کی۔ وہ اندھی تقلید اور شدت پسندی کے خلاف تھا۔ جیسا کہ آپ نے سمجھا کہ خوفناک اکبر کا ایک انسان دوست پہلو بھی تھا۔ اس نے پریشان حال لوگوں کی فکر کی اور ان کے لیے کام کیا۔ مجموعی طور پر، اکبر ایک شاندار، عظیم الشان اور عظیم حکمراں کے طور پر سامنے آیا۔

4.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

عبادت خانہ : اکبر کے دور میں ایک ایسی جگہ جہاں مختلف مذاہب اور فرقوں کے دانشور مذہبی مباحث میں حصہ لیا کرتے تھے۔

دین الٰہی : اکبر کے ذریعے شروع کی گئی ایک ہمہ مذہبی تنظیم۔

شیطان پورہ : اکبر کے دور میں طوائفوں کا محلہ

جل جلالہُ : دین الٰہی تنظیم کا کوئی فرد اگر دوسرے فرد سے بطور آداب و تسلیم، اللہ اکبر کہتا تو جواب میں دوسرا جل جلالہ بولتا تھا۔

منتخب التواریخ : عہد وسطیٰ کے، مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی کی مایہ ناز تصنیف

مکتب خانہ : اکبر کے ذریعے 1573 میں قائم کردہ دارالترجمہ جہاں متعدد سنسکرت تصنیفات کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

4.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پانی پت کی دوسری جنگ (1556) میں مغل فوج نے کسے شکست دی؟

(الف) ہیمو (ب) سکندر سور (ج) عادل شاہ (د) رانا پرتاپ

2. اکبر کی تاج پوشی کس مقام پر ہوئی؟

(الف) دہلی (ب) آگرہ (ج) کلانور (د) لاہور

3. اکبر نے عبادت خانہ کس مقام پر قائم کیا تھا؟

(الف) آگرہ (ب) دہلی (ج) فتح پور سیکری (د) اجمیر

4. ہلدی گھاٹی کی جنگ کس سال لڑی گئی؟

(الف) 1556 (ب) 1576 (ج) 1582 (د) 1605

5. اکبر نے کون سا نیا مذہبی نظریہ متعارف کرایا؟

(الف) دین الٰہی (ب) صلح کل (ج) توحید (د) بھکتی

4.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 'دین الٰہی' کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. اکبر کی کشمیر کی فتح پر ایک نوٹ لکھیں۔
3. بیرم خان پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. عبادت خانہ پر ایک نوٹ لکھیں۔

5. اکبر کے زمانے میں فارسی میں ترجمہ شدہ مختلف تصنیفات پر ایک نوٹ لکھیں۔

4.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اکبر کے دور میں مغل سلطنت کی توسیع پر ایک مضمون تحریر کریں۔
2. کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ رانا پرتاپ اور اکبر کے درمیان تنازعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تنازع تھا؟ اگر نہیں/ہاں، تو کیوں؟
3. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اکبر کے مذہبی ہم آہنگی اور شمولیت کے نظریات کی عصری ہندوستان کے لیے اشد ضرورت ہے؟ اگر ہاں/نہیں، تو کیوں؟

جوابات: 1-(الف),2-(ج),3-(ج),4-(ب),5-(الف)

اکائی 5۔ جہانگیر اور شاہ جہاں

(Jahangir and Shahjahan)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر

5.2.1 جہانگیر کی پیدائش

5.2.2 دستورالعمل

5.2.3 قدیم امراء سے تعلقات

5.2.4 شہزادہ خسرو کی بغاوت

5.2.5 گروارجن دیو اور بادشاہ جہانگیر

5.2.6 جہانگیر اور شاہ عباس

5.2.7 میواڑ کے ساتھ صلح اور احمد نگر سے جنگ

5.3 شاہ جہاں

5.3.1 شاہ جہاں کی تاج پوشی

5.3.2 نور جہاں اور شاہ جہاں

5.3.3 جھجھار سنگھ بندیلہ کی بغاوت

5.3.4 شاہ جہاں اور گروہر گوبند

5.3.5 احمد نگر کا الحاق

5.3.6 گولکنڈہ کی مہم

5.3.7 بیجاپور کی مہم

5.3.8 شاہ جہاں کی بلخ مہم

5.4 اکتسابی نتائج
5.5 کلیدی الفاظ
5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.0 تمہید (Introduction)

اکبر کے بعد اس کا لڑکا سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جہانگیر اپنے سیاسی معاملات میں نہایت ہی ہوشیار تھا۔ اکبر کے تمام لڑکے غیر مذہبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے شراب کے عادی تھے۔ جہانگیر اگرچہ عیش پسند تھا لیکن سلطنت کے انتظام میں اس نے کبھی غفلت نہیں کی۔ راجپوتانہ اور بنگال میں دہلی کا اقتدار جہانگیر کے زمانے ہی میں مستحکم ہوا اور ہر قسم کی مخالفت کچل دی گئی۔ جہانگیر کے زمانے میں دکن میں نظام شاہی حکومت سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن تیموری امراء کی غفلت اور نااہلی اور نظام شاہی امیر ملک عنبر حبشی کی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دکن میں مغل سلطنت کی حدود آگے نہیں بڑھ سکیں۔ شمال میں البتہ ہمالیہ کے دامن میں کانگڑہ فتح ہوا (1620) لیکن اس کے دو سال بعد ایرانیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا 1622 جہانگیر کے زمانے میں دو انگریز سفیر ولیم ہاکنس اور ٹامس مورے ہندوستان آئے اور انگیریزوں کو پہلی مرتبہ تجارتی مراعات دی گئیں۔ بنگال میں ڈھالہ کا شہر اسی زمانے میں آباد کیا گیا اور صوبہ کا صدر مقام لکھنوتی سی ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ جہانگیر فن مصوری کا بہت شوقین تھا۔ اس کے زمانہ میں مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے اس کے عہد حکومت میں نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ استاد ابوالحسن نادرالزمان، استاد منصور، بشن داس اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔ کشمیر میں اس نے کئی باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ ان میں شالیمار باغ اور نشاط باغ آج بھی موجود ہیں۔ اور سری نگر کے قابل دید مقامات میں ہیں۔ آگرہ کے قریب سکندرہ میں اکبر کا شاندار مقبرہ بھی جہانگیر کے عہد کی تعمیر ہے۔ لاہور اور آگرہ کے قلعے میں بھی اس نے کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ بابر کی طرح جہانگیر نے بھی فارسی میں اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ یہ کتاب تزک جہانگیر کہلاتی ہے۔ تزک بابری کی طرح ی بھی ایک دلکش کتاب ہے۔ اس کی تحریر میں بناوٹ کی بجائے سادگی اور صاف گوئی پائی جاتی ہے، جہانگیر کشمیر کی سیر سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں بیمار پڑا اور لاہور پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ لاہور پہنچ کر اس کو دفن کیا گیا اور اس کے بیٹے شاہ جہاں نے بعد میں اس کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرا دیا، جو آج لاہور کی شاندار تاریخی یادگاروں میں سے ایک ہے۔

شاہجہاں کی پیدائش لاہور میں سولہویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ یہ ایک راجپوت شہزادی کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے موقع پر درباری شاعروں نے اسے دنیا کا فاتح کہا تھا۔ اس اکائی میں ہم شاہجہاں کی تاج پوشی کے تفصیلی واقعات کو بیان کریں گے۔ کس طرح نور جہاں بادشاہی منصب کے لیے شہریار کی دعویداری کرنے لگی، اور کس طرح خرم اس کو شکست دے کر تخت پر رونق افروز ہوا اور یادگار کے طور پر کئی اہم احکام جاری کیے جو اس دور کے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ جہاں شاہ جہاں نے سیاسی پیچ و خم پر فتوحات کا جھنڈا لہرایا یا وہیں ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر بڑی گہری دلچسپی کا بھی مظاہرہ کیا تھا جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس اکائی میں ہم اس کے پورے

دور میں ہونے والے والے اہم واقعات کا جائزہ لیں گے۔ مختلف بغاوتیں کس طرح معرض وجود میں آئیں اور ان بغاوتوں کے سرغنہ کون لوگ تھے؟ سماج میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ سیاسی سرگرمیوں میں نور جہاں کا کیا کردار تھا اور اس کو خرم نے کس طرح شکست دی؟ ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے ذریعے جاننے کی کوشش کریں گے۔ ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔ شاہجہاں کی فتوحات سے سے سماج کس طرح متاثر ہوا؟ اور ملکی و غیر ملکی واقعات کی وجہ سے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس کا اندازہ لگا سکیں گے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جہانگیر کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جہانگیر کے اصل کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- جہانگیر کی دکن پالیسی کا تجزیہ کر سکیں گے
- نور جہاں اور جہانگیر کے کردار کی وضاحت کر سکیں گے
- اس دور میں ابھرنے والی بغاوتوں کو بیان کر سکیں گے۔
- جہانگیر کے دور کی سیاسی حالات بخوبی بیان کر سکیں گے۔
- شاہجہاں کے دور کو سمجھ سکیں گے۔
- تاج پوشی کے اہم واقعات سے روشناس ہو سکیں گے۔
- سماج میں بادشاہ کی حیثیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- شاہ جہاں کے دور کی اہم بغاوتوں کا خلاصہ کر سکیں گے۔
- ہندوستان کی سرحدوں میں تبدیلی میں شاہ جہاں کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔

5.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر (Emperor Nuruddin Jahangir)

5.2.1 جہانگیر کی پیدائش (Birth of Jahangir)

جہانگیر کی پیدائش 30 اگست، 1569ء کو فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی کے قریب ایک حویلی میں ہوئی تھی۔ اکبر سلیم کو پیار سے شیخو بابا کہتا تھا۔ جہانگیر کی ماں ہر کھا بائی (مریم الزمانی) آمیر کے راجہ بھرمل کی لڑکی تھی۔ جہانگیر کی پہلی شادی 1585ء میں مان بائی سے ہوا جو آمیر کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی اور مان سنگھ کی بہن تھی۔ مان بائی سے خسرو کا جنم ہوا، جسے بعد میں جہانگیر نے اندھا کروا دیا تھا۔ مان بائی کو شاہ بیگم کا منصب حاصل تھا، لیکن بعد میں اس نے سلیم کی عادتوں سے مایوس ہو کر افیم کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ جہانگیر کی دوسری شادی مارواڑ کے راجہ اودے سنگھ کی لڑکی جگت گوسائی سے ہوئی۔ خرم جگت گوسائی کا بیٹا تھا۔ جودھا بائی کو ملکہ جہاں کا لقب حاصل تھا۔ جہانگیر کے

تیسرے بیٹے پرویز کی پیدائش صاحب جمال سے اور چوتھے بیٹے شہریار کا جنم ایک رکھیل سے ہوا تھا۔ کرمسی جہانگیر کی راجپوت بیوی تھی۔ سلیم 24 اکتوبر 1605ء کو قانونی طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اتفاق سے بحساب جمل کلمہ جہانگیر کے حروف کے اعداد اتنے ہی نکلتے ہیں جتنا کہ اللہ اکبر کے۔ جشن تاجپوشی بڑے تزک واحتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں قیدیوں کو رہا کیا گیا، نئے سکے نئے ناموں کے ساتھ چلائے گئے اور ایک فرمان کے ذریعے ان لوگوں کو جنھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کی مخالفت کرنے کی جرئات کی تھی عام معافی دے دی گئی۔ بیشتر ملازمین اپنی جگہوں پر مستقل کر دیے گئے اور نئے قوانین نافذ ہوئے۔

5.2.2 دستورالعمل (Dasturul Amal)

حکمراں بنتے ہی جہانگیر نے بارہ اعلانات کرائے جن کو واقعات جہانگیری میں دستورالعمل کہا گیا ہے۔

1. زکوہ، تمغہ اور میر بحری معاف کر دیا گیا۔
2. سڑکوں پر چوری ڈکیتی کے بارے میں قانون بنایا گیا۔
3. مرے ہوئے آدمی کی جائداد پر وراثت کے قانون بنایا گیا۔
4. شراب پر روک لگادی گئی۔
5. مجرمین کے ناک کان کاٹنے کی سزائیں موقوف کر دی گئیں۔
6. جائداد پر زبردستی قبضہ کرنے سے روک دیا گیا۔
7. اسپتالوں کی سہولتوں کو بڑھادیا گیا۔
8. جمعرات اور اتوار کو جانور کی قربانی کو روک دیا گیا۔
9. جاگیرداروں اور زمینداروں کو اپنے علاقے میں بنا اجازت اپنی رعایا کے ساتھ شادی بیاہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔
10. اتوار کا احترام ضروری قرار دیا گیا۔
11. مدد معاش اور ائمہ زمینوں کی تصدیق کرائی گئی۔
12. قیدیوں کو عام معافی دی گئی۔

سرکاری عہدے داروں سے کہا گیا کہ بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے تعمیر کرائیں اور حکومت ان کے پورے اخراجات برداشت کرے۔ کھانے کے لیے جانوروں کا ذبیحہ 12 ربیع الاول سے جو شہنشاہ کا یوم ولادت تھا بند کر دیا گیا۔ یہ پابندی اس طرح عائد کی گئی کہ ہر سال بادشاہ کی عمر کا جو سال ہوتا اتنے ہی دنوں کے لیے اس سال کے دوران ذبیحہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے جمعرات واتوار کو بھی ذبیحہ نہ ہوتا۔ یہ قوانین اکبر کے رائج کردہ اصلاحات پر مبنی تھے اور اس خیال سے نافذ کیے گئے کہ یہ اصلاحات جاری رہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قوانین پر عمل کس حد تک کیا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ رعایا کے مفاد کیلیے قائم کیے گئے تھے اور یہ بیکار ثابت نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین عام قسم کے تھے اور ان سے اسلام یا مسلمانوں کی طرفداری یا حمایت مقصود نہ تھی۔ یہ قوانین کسی حد تک اس لیے بھی نافذ کیے گئے کہ رعایا کے

دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے کہ نیا بادشاہ اپنے باپ کی عام سیاست میں نمایاں تبدیلی لانا نہیں چاہتا۔

5.2.3 قدیم امراء سے تعلقات (Relations with Old Nobility)

شہزادہ خسرو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں راجہ مان سنگھ کی بہن تھی۔ اس کی شادی عزیز کوکہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ باوجودیکہ جہانگیر نے مان سنگھ سے قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ وہ شہزادے کو کوئی نقصان نہ پہچائے گا پھر بھی جہانگیر نے اس کو نیم قید کی حالت میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کو اس وقت تک اطمینان حاصل نہ ہوا جب تک کہ اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ جوان شہزادہ نے آگرہ کا تخت حاصل کرنے کا ارادہ دل سے بالکل نکال دیا ہے اور اس کے طاقت ور حامیوں نے بھی اس کی حمایت ترک کر دی ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں کا رویہ بھی پوری طرح واضح نہ تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے یہی فیصلہ کیا کہ اکبر کے زمانے کے ان امراء کا اثر بالکل ختم کر دیا جائے جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ خسرو کی یا اس کے بھائیوں میں سے کسی کی اولاد کی حمایت کریں گے۔ چنانچہ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ اختیارات ایسے لوگوں کو منتقل کیے جائیں جن پر اس کو پورا پورا اعتماد حاصل ہو۔ اس پالیسی کے مطابق جہانگیر نے محمد شریف کو جو کہ مشہور و معروف خوشنویس اور مصور خواجہ عبدالصمد کا لڑکا تھا ملک کے سب سے بڑے عہدے پر ترقی دے کر امیر الامراء مقرر کر دیا۔ شریف نے سلیم اور اکبر کے درمیان اختلافات بڑھانے میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ وہ اکبر کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا اور سخت مصیبتوں جھیلتا تھا۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو وہ بھی اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ باوجودیکہ وہ کسی خاص خوبی کا مالک نہ تھا اور سلطنت کے امراء اسے ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح مرزا غیاث بیگ کو اعتمادالدولہ کا خطاب دیا گیا اور اس کو نائب وزیر مقرر کیا۔ حالانکہ وہ صرف ایک ہزاری منصب دار تھا۔ بعض مثالوں کو چھوڑ کر جہانگیر کا انتخاب عام طور پر اچھا نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے حامیوں اور خوشامدیوں کا حلقہ بہت معمولی لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ سلطنت کے قدیم اراکین کے دلوں میں نہ تو اعتماد پیدا کر سکا اور نہ ان پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ جہانگیر نے فوجیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی تنخواہ میں 400 فیصد تک اضافہ کر دیا اور اس کا بار سلطنت کے بھرپور خزانے پر پڑا۔

5.2.4 شہزادہ خسرو کی بغاوت (Rebellion of Prince Khusrau)

6 اپریل 1606ء کو شہزادہ خسرو تقریباً 350 سواروں کے ہمراہ آگرہ سے فرار ہو گیا۔ متھرا پہنچ کر اس نے حسین بیگ بدخشی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ دو تین سو ایماق سواروں کے ہمراہ اس سے مل جائے۔ پھر وہ دہلی ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں ایک لاکھ روپے کا خزانہ جسے عبدالرحیم دیوان لاہور سے آگرہ لے جا رہا تھا چھین لیا۔ لاہور پہنچنے تک شہزادے کے پاس بارہ ہزار سواروں کی فوج جمع ہو گئی تھی۔ لاہور کے صوبہ دار دلاور خاں نے شہزادے کو شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی۔ مشکل سے نو دن گزرنے پائے تھے کہ جہانگیر ایک بڑی فوج اور توپ خانہ لے کر آپہنچا۔ شہزادے نے اطاعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بھیروال کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں شہزادے کو شکست ہوئی اور جان بچا کر بھاگا۔ خسرو نے اپنے ہندی اور افغان ساتھیوں کے مشورے کو کہ آگرہ پر حملہ کر کے قبضہ کرتا ہوا اپنے ماموں مان سنگھ کے پاس بنگال چلا جائے ٹھکرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیشتر ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ فرار

ہونے کی کوشش کی۔ دریائے چناب کو پار کرتے ہوئے اس کی کشتی کیچڑ میں پھینس گئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ شہزادے کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر لاہور لے جایا گیا اور قید خانے میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کو یہ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی کہ راستے کے دونوں طرف پھانسی کے تختوں پر اپنے ساتھیوں کو لٹکتے ہوئے سخت عذاب کے ساتھ جان دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ وحشت ناک منظر کئی دنوں تک اس کی آنکھوں میں گھومتا رہا۔ وہ دن رات روتا رہتا۔ اس منظر کا اثر اتنا دردناک تھا کہ شہزادہ جب تک زندہ رہا کسی نے اس کو خوش نہ دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنے دوسرے بیٹے پرویز کو ولی عہد مقرر کیا۔ ان لوگوں میں جن پر یہ الزام تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح باغی شہزادے سے رابطہ رکھتے ہیں سب سے زیادہ اہم اعتماد الدولہ اور اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد شریف تھا۔ اعتماد الدولہ کو قید میں ڈال دیا گیا لیکن بعد میں دو لاکھ روپیہ جرمانہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ البتہ محمد شریف کو قتل کر دیا گیا۔

5.2.5 گروارجن دیو اور جہانگیر (Guru Arjundev and Jahangir)

باغی شہزادہ خسرو جب پنجاب سے فرار ہوتا ہوا گزرا تو اس نے گروارجن سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو نے شہزادے کو مبارک باد دی۔ اس کی پیشانی پر زعفران کا قشقہ کھینچا اور اپنی دعاؤں کے علاوہ کچھ مالی مدد بھی دی۔ خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کے مزاج میں تلخی پیدا کر دی تھی اور وہ سخت گیر بھی ہو گیا تھا۔ گروارجن نے اپنے سلوک کی وضاحت میں بیان کیا کہ انہوں نے خسرو کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ شہنشاہ اکبر کے پوتے سے جو پریشان حالی میں مبتلا تھا مہربانی اور ہمدردی کا اظہار کرتے لیکن جہانگیر اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے گرو پر دو یا ڈھائی لاکھ کا جرمانہ عائد کر دیا۔ گروارجن نے یہ کہ کر کہ ان کے پاس اتنی دولت نہیں اور جو کچھ ہے وہ غریبوں، لاچاروں اور مسافروں کے لیے ہے اور جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر شہنشاہ نے حکم صادر کیا کہ گرو کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کے بچے اور مکان فرید بخاری کو دے دیے جائیں جس کو اب مرتضی خاں کا خطاب مل چکا تھا۔ ان کی جائداد ضبط کر لی جائے اور گرو کو قتل کر دیا جائے۔ گرو کو جو سزا دی گئی وہ اس الزام کے مقابلے میں جو ان پر عائد کیا گیا بہت ہی زیادہ سخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔

5.2.6 جہانگیر اور شاہ عباس (Jahangir and Shah Abbas)

لاہور میں جہانگیر کو اس بات کا علم ہوا کہ فراۃ کے صوبے دار اور سیستان کے ملک نے ہرات کے گورنر حسین خان شاملو کی مدد سے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔ شہنشاہ کے لیے اکبر کی موت اور خسرو کی بغاوت کے بعد یہ واقعہ کچھ تعجب خیز نہ تھا۔ وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ برخاست شدہ مرزاؤں کے کچھ لوگ سرحد کے ایرانی افسروں کے ساتھ خط و کتابت کر رہے تھے تاکہ ان سے قندھار پر حملہ کروا سکیں۔ ادھر ایرانی جو قندھار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے اکبر کی موت کی اطلاع پانے کے بعد ایسی کوشش کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی لاہور ہی میں مقیم رہے تاکہ بوقت ضرورت کابل بھی جا سکے۔ جہانگیر نے یہ فیصلہ اپنے بعض مشیروں کے مشورے کے برخلاف کیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ شہنشاہ دارالسلطنت لوٹ جائے تاکہ وہاں سے گجرات، بنگال اور دکن کے حالات پر جو ابتر ہوتے جا رہے

تھے نگاہ رکھ سکے۔ ٹھٹہ کے مشہور حکمران جانی بیگ کے بیٹے مرزا غازی بیگ کو 1607ء میں قندھار کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط فوج دے کر روانہ کیا گیا۔

1607ء میں جب قندھار پر حملہ ہوا تو ایران کے بادشاہ شاہ عباس نے اس کی طرف سے چشم پوشی کی لیکن اس میں کوئی عملی حصہ شاید اس لیے نہیں لیا کہ اس وقت ترکوں کے ساتھ اس کی لڑائی تھی۔ چنانچہ ایرانی فوج اتنی آراستہ اور مستعد نہ تھی کہ قندھار کو جلد فتح کر سکتی۔ جہانگیر کی خوش قسمتی سے قندھار اس وقت شاہ بیگ خاں جیسے لائق، وفادار، بہادر اور تجربہ کار شخص کے زیر حکومت تھا۔ وہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے بالکل آمادہ تھا۔ اس نے قلعہ کو مستحکم کر لیا تھا اور اس کے سپاہی بھی مستعد تھے۔ محاصرے نے طول کھینچا یہاں تک کہ غازی بیگ قندھار کے نواح میں پہنچ گیا۔ ایرانی اس کا اندازہ نہیں لگا سکے کہ شہنشاہ ہند اس قدر تیز اقدام کر سکتا ہے، لہذا غازی خاں کی آمد نے ان کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ لوگ لڑنے کے لیے آمادہ نہ تھے چنانچہ انہوں نے تیزی سے سرحد پار کر کے راہ فرار اختیار کی۔ شاہ عباس نے اپنے صوبے داروں کے کوتاہ نظرانہ عمل سے تجاہل کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ حملہ اس کی اجازت کے بغیر کیا گیا اور جوں ہی اس کو حملے کا علم ہوا اس نے حملہ آوروں کو بذریعہ فرمان فوراً واپسی کا حکم صادر کیا۔ اس نے فروری یا مارچ 1607ء میں حسین بیگ کو اپنا ایلچی بنا کر روانہ کیا تاکہ خاندان تیموریہ سے اپنی دوستی و محبت کا اظہار کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ایران یہ توقع رکھتا تھا کہ جہانگیر کو اس کے لیے راضی کر لیا جائے گا کہ قندھار اس کو دے دے۔ شاہ نے اپنے سفیر یادگار علی سلطان تابش اور دوسرے کے ذریعے ایک سے زائد مرتبہ قندھار کی واپسی کے سوال کو چھیڑا لیکن جہانگیر نے ہر دفعہ اس بات کو ٹال دیا۔ جب شاہ اپنی سیاسی کوششوں میں ناکام ہو گیا تو اس نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کر لیا۔

5.2.7 میواڑ کے ساتھ صلح و احمد نگر سے جنگ (Truce with Mewar, and War with Ahmadnagar)

جہانگیر نے دکن کی ریاستوں کے بارے میں اپنے باپ کی سیاست کی پیروی کی۔ وہ سارے دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ مغلوں کی پیش رفت میں سب سے بڑی روکاوٹ خود ملک عنبر تھا جس کی تنظیمی لیاقت، استحکام اور اثر و رسوخ ناقابل انکار تھے۔ عنبر کو بغداد کے بازار سے قاسم خواجہ نامی شخص نے خریدا اور احمد نگر لا کر مرتضی نظام شاہ اول کے لائق و ممتاز وزیر میر ک دبیر چنگیز خاں کے ہاتھ فروخت کیا۔ جب برار اور خاندیش مغلوں کے قبضے میں آ گئے تو عنبر نے بیجاپور میں ملازمت کر لی لیکن اس کی قسمت میں احمد نگر ہی لکھا تھا لہذا وہ احمد نگر واپس آیا اور حبشی سردار ابھنگ خاں نے اس کو 150 گھوڑوں کا منصب دار بنا دیا۔ جب دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا تو عنبر اور ملک راجو کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مغل علاقے میں لوٹ مار اور غارت گری پھیلائیں۔ اس دوران اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عنبر کی کاروائیوں کا حلقہ تلنگانہ کی سرحدوں سے لے کر بیڑ اور چیول تک پھیل گیا۔ اس حلقے میں احمد نگر و احمد آباد کے بھی کچھ علاقے شامل تھے۔ احمد نگر کے زوال کے بعد بھی انہوں نے غارت گری کا کام جاری رکھا اور اس طرح مغلوں کو زبردست پریشانی لاحق ہو گئی۔

مغلوں اور ملک عنبر کے درمیان پہلی جھڑپ 02-1601ء میں ہوئی۔ مغل فوج کی کمان عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا مرزا ایرج کر رہا تھا۔ مندیر کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا لیکن اس کے وفادار ساتھی اس کو نکال لے گئے۔ ملک عنبر

کی کاروائیوں میں ملک راجو کی رقابت اور مخاصمانہ سرگرمیاں رکاوٹ بن گئیں۔ چونکہ ان دونوں میں صلح کا کوئی راستہ نہ نکل سکا لہذا ملک عنبر نے مغلوں سے صلح کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سرحد کا مسئلہ مغلوں کے ساتھ طے کر لیا اور خود خانخاناں کا منظور نظر بن گیا۔ اس کے بعض حامیوں نے اس تبدیلی سیاست کو پسند نہ کیا اور اس کی حمایت سے دست کشی اختیار کر کے مرتضی شاہ سے جا ملے۔ نظام شاہ نے ملک عنبر سے لڑنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن 1603ء میں اس کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عنبر نے پرندا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور یہ قلعہ اس کے خاندان کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ جس کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ جب دانیال نے دکن پر حملہ کیا تو اس وقت نظام شاہ نے عنبر کو اپنی طرف ملا لیا اور وہ مغلوں کو پریشان کرنے لگا۔ نظام شاہ عنبر کی ادھوری حمایت سے اکتا گیا اور اس نے راجو سے عنبر کو زیر کرنے کے لیے مدد طلب کی۔ جب عنبر نے یہ دیکھا کہ وہ راجو کا مقابلہ نہ کر سکے گا تو وہ پھر مغلوں سے مدد کا طالب ہوا۔ خانخاناں کی زیرکانہ سیاست یہ تھی کہ وہ ان دونوں رقیبوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھے تاکہ وہ اپنے معاملات میں منہمک رہیں۔ نظام شاہ نے 1607ء میں عادل شاہ کی مدد سے راجو کو گرفتار کر لیا اور اس طرح عنبر کا راستہ صاف ہو گیا۔

ملک عنبر نے اپنی عقل خداداد سے یہ سمجھ لیا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل اور مقابل کے ترقی یافتہ فن جنگ کے سبب مغلوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہو سکتا اور یہ بات پچھلے تجربوں سے خوب واضح تھی۔ اس نے گوریلا جنگ کے فوائد کا اندازہ لگایا جو میواڑ کے ہندو راجا اور بندیل کھنڈ اور افغانستان کے سرحدی قبائل نے مغلوں کے برخلاف جاری کر رکھی تھی اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔ ملک عنبر نے مراٹھوں کی پھرتیلی سوار فوج کی تعداد بڑھائی اور ان لوگوں کو گوریلا فن جنگ کی سخت تربیت دی۔ عنبر نے بحری فوج کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہ کیا جو اس کی ریاست اور ایران کے درمیان تجارتی تعلقات کی حفاظت کے لیے ضروری تھی۔ اس نے راج گڑھ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ جنجیرہ کو بحری چوکی بنانے کے لیے تجویز کیا اور فوجی کشتیوں پر عربی النسل حبشیوں کو ملازم رکھا۔ یہ لوگ سیدی کہلائے۔ ان کی قوت مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی قائم رہی اور وہ مراٹھوں اور یورپی طاقتوں کو عرصے تک پریشان کرتے رہے۔ ان تیاریوں کی تکمیل کے بعد اس نے احمد نگر کے ان علاقوں کی واپسی کی کوشش کی جن کو مغل فتح کر چکے تھے اس کی خوش قسمتی سے اس وقت دکن میں مغل سلطنت آپس کی رنجشوں اور نااتفاقی کے سبب کمزور ہو گئی تھی یہ رنجش اور نااتفاقی کچھ تو جنوبی ریاستوں کے زر و جواہر کے سبب پیدا ہوئی جو فساد کی جڑ ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ مغل افسر دکن کی طولانی پہاڑی جنگوں سے اکتا چکے تھے۔ حالانکہ جہانگیر دکن کی سیاست کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا پھر بھی اس نے اپنے بہترین افسروں کو جن پر اسے پورا اعتماد تھا دکن روانہ کیا۔ 1608ء میں اس سے عبدالرحیم خانخاناں نے یہ تحریری وعدہ کیا کہ اگر اس کو بارہ ہزار مزید فوج اور دس لاکھ روپیہ دے دیا جائے تو وہ اس خدمت کو سرانجام دے گا۔ جہانگیر نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور شاہی اصطبل سے بہترین گھوڑے، پانچ ہاتھی، مرصع تلوار اور خلعت عطا کیا۔ جب عبدالرحیم خانخاناں نے جنگ میں کافی جوش و خروش نہ دکھایا تو پھر شہزادہ پرویز اور شریف خاں وزیر اعظم کو 1610ء میں مزید فوج دے کر روانہ کیا گیا لیکن شہنشاہ کے ان سب اقدامات کے باجود کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ عنبر کے مقابلے میں مغلوں کی کچھ نہ چلی کیونکہ اس کے پرچم کے نیچے ایک بڑی فوج جمع ہو گئی تھی۔

ایک دفعہ جہانگیر نے بھی یہ ارادہ کیا کہ وہ خود دکن جا کر وہاں کے معاملات کو سلجھائے لیکن امراء نے اس کو باز رکھا اور خانخاناں نے وعدہ کیا کہ دکن کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت کم مغل افسروں کو جنوب کے سیاسی و فوجی حالات اور دشمن کے اثر و رسوخ اور وسائل کا صحیح علم تھا۔ تازہ فوجی کمک پہنچنے سے قبل خانخاناں کو دکن میں زبردست زک اٹھانی پڑی اس نے یہ کوشش کی کہ احمد نگر پر یکایک حملہ کر کے اس کو فتح کر لے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی دشمن باہر نکل کر لڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کے برخلاف انہوں نے گوریلا ترکیبیں اس کامیابی کے ساتھ انجام دیں کہ مغل فوج کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی رسد جو کہ پہلے ہی سے قحط کے سبب کم تھی بالکل ہی منقطع ہو گئی۔ خانخاناں کو زبردست نقصان ہوا اور اس نے صلح کر لی۔ وہ برہان پور واپس لوٹ گیا۔ اس ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ 1610ء میں احمد نگر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جہانگیر کو اس بات کا یقین دلا گیا کہ مغلوں کی شکست کی بنیادی وجہ خان خانان کی دورویہ پالیسی ہے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ خانخاناں ملک عنبر کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور عنبر نظام شاہ کی ریاست کی مالگزاری کا 1/2 حصہ خانخاناں کو ادا کرتا تھا۔ چنانچہ خانخاناں کو واپس بلا کر دکن کی مہم کی کمان خان جہان لودی کے سپرد کر دی گئی۔ خانخاناں کی طرح خان جہاں نے بھی شہنشاہ کو لکھا کہ اگر وہ اس مہم کو کامیابی سے سرانجام نہ دے سکے تو اس کو شہنشاہ کی خدمت میں حضوری کے شرف سے محروم کر دیا جائے اور پھر وہ غلامان دربار کو بھی اپنی صورت نہ دکھائے گا۔

شہنشاہ کا خیال خاں جہان کے بارے میں بہت تھا اور وہ اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ نے خان جہان کا مشورہ بخوشی مان لیا اور دو ہزار احدی، دس ہزار سوار اور ساڑھے تین لاکھ روپیہ دے کر روانہ کیا۔ شہنشاہ نے اپنی پگڑی بھی خان جہاں کے سر پر رکھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ کو میواڑ سے گجرات روانہ کیا اور یہ ہدایت دی کہ وہ خان جہاں سے میل جول قائم رکھے اور ناسک کے محاذ پر سرگرم عمل رہے۔ 1611ء میں خان جہاں اور ان کی اصل فوج برار اور خاندیش کے راستے روانہ ہوئی اور عبداللہ خاں براستہ ناسک روانہ ہوا۔ قرار یہ پایا کہ دونوں فوجیں دولت آباد کی طرف رخ کریں اور وہاں جا کر مل جائیں۔ عبداللہ نے اپنی لیاقت و استعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہا۔ وہ اصل فوج کو نظر انداز کر کے دشمنوں کی سرزمین میں گھستا ہوا دولت آباد تک پہنچ گیا۔ عبداللہ کو اس بے باکی و بے احتیاطی کا خمیازہ اٹھانا پڑا کیوں کہ احمد نگر کے سبک سوار دستے نے گوریلا طرز جنگ سے کام لے کر اس کو سخت پریشانی کیا، اس کی رسد منقطع کر دی اور اس کا ساز و سامان لوٹ لیا۔ آخر اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور لڑتا ہوا گجرات کی سرحد تک لوٹ آیا۔ اس لڑائی میں اسے اپنے چند قابل اور بہادر سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سپہ سالار خان جہان نے اس پسپائی کی وجہ یہ بیان کی کہ امراء کے درمیان اختلافات موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس نے خانخاناں پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ظفر نگر میں روکے رکھا اور اس طرح اس پر غداری کا الزام لگایا۔ شہنشاہ نے اس شکست کو پیشتر عبداللہ خاں کی جلد بازی پر محمول کیا۔ 1612ء میں خان جہاں سے کمان واپس لے کر ایک مرتبہ پھر عبدالرحیم خانخاناں کو سونپ دی گئی۔ اس وقت عارضی طور پر شہنشاہ کی توجہ میواڑ کی طرف مبذول ہو گئی۔

میواڑ کی مہم

راجا باسو جب کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ چونکہ وہ رانا کا بہی خواہ ہے اس لیے اس مہم کو دل و جان سے انجام

نہیں دے رہا ہے لہذا خان اعظم عزیز کو کہ کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا۔ عزیز کو کا دکن کی گندی سیاست سے علاحدہ رہنا چاہتا تھا اس لیے اس نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کو میواڑ بھیج دیا جائے۔ جب عزیز نے میواڑ کی فوج کی کمان سنبھالی تو اس نے شہنشاہ کو لکھا کہ جب تک شاہی پرچم ان علاقوں میں نہ لہرائے معاملات کا حل ہونا دشوار ہو گا۔ لہذا 1613ء میں جہانگیر باغی رانا کے معاملات کو ختم کر دینے کے لیے آگرہ سے روانہ ہوا اور اجمیر میں اپنا مرکز قائم کیا۔ خان اعظم کی درخواست پر اس نے شہزادہ خرم کو بھی جنگ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اولوالعزم اور تند مزاج شہزادہ کا خان اعظم جیسے عمر رسیدہ ایمان دار، صاف گو اور خود دار امیر کے ساتھ مل جل کر کام کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزادہ نے خان اعظم کے خلاف شہنشاہ سے شکایت کی۔ شہنشاہ نے فوراً ہی ایک مکتوب کے ذریعے خان اعظم سے سدھار کی درخواست کی اور اس کو تنبیہ بھی کر دی لیکن حالات میں سدھار نہ ہوا بلکہ وہ بگڑتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ شہزادے نے اس کی گرفتاری کا حکم سادر کیا۔ شہنشاہ نے خان اعظم کو قلعہ گوالیار بھیج دیا پھر کچھ عرصے بعد اس کو رہا کر دیا گیا۔

شہزادہ خرم نے زبردست وسائل کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے مہم کا آغاز کیا۔ کھیتوں اور باغوں کو آگ لگا دی گئی، گاؤں اور شہر لوٹ لیے گئے۔ مغلوں نے میدانی علاقوں کو پہلے ہی اجاڑ دیا تھا اور کھیتی باڑی کے آثار تک باقی نہ رہے تھے۔ بہت سے ایسے علاقوں میں جہاں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ فوجی چوکیاں قائم نہیں کی جا سکتیں، قائم کر دی گئیں۔ اور بادر رفتار فوجی دستے تیز دھوپ یا زبردست بارش کا خیال کیے بغیر راجپوتوں کا مسلسل تعاقب کرتے رہے۔ زبردست ناکہ بندی، مستقل جنگ، رسد کی کمی اور قحط و وبا نے مل کر راجپوتوں کی ہمت مقاومت کو توڑ دیا۔ لوگ رانا کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے یہاں تک کہ اس کے پاس مٹھی بھر ساتھی رہ گئے۔ ان حالات میں رانا امر سنگھ کا سلطنت مغلیہ کی قوت و طاقت سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا۔ امراء اور شہزادہ کرن نے رانا کو یہی مشورہ دیا کہ مصالحت کر لے۔ امر سنگھ نے وعدہ کر لیا کہ وہ شہزادہ خرم کے پاس خود حاضر ہو گا اور اپنے بیٹے کرن کو دربار میں بھیج دے گا۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ مغل فوج میں خدمت کے لیے روانہ کر دے گا لیکن اس نے یہ درخواست جرور کی کہ اس کو دربار میں حاضری سے معاف کیا جائے۔ شہزادہ خرم نے یہ تجاویز شہنشاہ کو بھیج دیں اور اس ننے بخوشی ان کو قبول کر لیا۔ ہمارے ذہن عالی میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قدیم خاندانوں کو برباد نہ کیا جائے۔ شہنشاہ محض یہ چاہتا تھا کہ وہ اطاعت تسلیم کر لیں۔ اس کے علاوہ دکن کے حالات بہت ہی غیر اطمینان بخش اور اس کے محتاج تھے کہ شہنشاہ ان پر پوری توجہ دے لیکن جب تک میواڑ کا مسئلہ حل نہ ہو جائے وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ شہنشاہ نے رانا پر صرف ایک پابندی لگائی اور وہ یہ کہ رانا چتوڑ کے قلعے کو مضبوط نہ کرے۔ رانا امر سنگھ شہزادہ خرم سے ملنے لگا۔ شہزادے نے بہت ہی عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ تحفے تحائف بہت ہی بڑے پیمانے پر ردو بدل کیے گئے۔ رانا۔ رانا نے شہزادہ کرن کو بھیجنے کا وعدہ کیا اور اس کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ جوں ہی کرن شہزادے کے کیمپ میں پہنچا خرم اجمیر کی طرف چل دیا۔

شہنشاہ نے خرم کو بے حد عنایات سے نوازا اور اس کو بیس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور صف اول میں دائرے کے دائیں طرف جگہ دی جو کہ مغل دربار میں کسی کو کم ہی حاصل ہوتی ہے۔ کرن وحشی مزاج تھا لہذا میں اس کا دل جیتنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی تازہ مہربانی کا سلوک کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہنشاہ اور نور جہاں بیگم نے کرن کو تحفوں سے لاد دیا۔ چند ماہ بعد اس کو پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار

کا منصب عنایت ہوا۔ جب صلح ہو گئی تو میواڑ کے وہ سارے علاقے معہ قلعہ چتوڑ کے جو اکبر و جہانگیر کے زمانے میں چھین لیے گئے تھے رانا کو واپس کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ خود شہزادے کو کافی جاگیر عنایت کی گئی۔ دو سال بعد رانا امر سنگھ اور کرن کے دو سنگ مرمر کے سب سوار مجسمے آگرہ میں جھروکے کے نیچے والے باغ میں نصب کرائے گئے لیکن رانا پر تاپ کے لڑکے کی زخم خوردہ خودداری کو شاہی نوازشات سے کوئی سکون حاصل نہ ہوا اور اس کی ذہنی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ اس نے راج کمار کرن کے حق میں تخت سے دست برداری حاصل کر لی اور اپنی زندگی کے آخری ایام نوچو کی جا کر خلوت و تنہائی میں بسر کرنے لگا۔ لیکن جہانگیر نے ازروئے عنایت رانا کی کنارہ کشی کو اس کی موت سے پہلے قانونی طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس طرح تیمور اور چتوڑ کے خاندانوں کی قدیم رقبت کا خاتمہ ہوا جو 1526ء میں شروع ہوئی لیکن 1567ء کے بعد سنجیدہ تر و طویل ہوتی گئی۔ اس پچاس سالہ جنگ کی تاریخ بہت سے ایسے جوشیلے واقعات سے پر ہے جن میں پر جوش دلاوری، تعجب خیز وفاداری، حیرت انگیز قربانی، غیر معمولی تحمل، کردار کی اعلیٰ طرفی اور حب الوطنی کے مظاہرے ہوئے۔

5.3 شاہ جہاں (Shah Jahan)

شاہ جہاں کے بچپن کا نام خرم تھا۔ خرم کی پیدائش 5 جنوری 1592ء کو لاہور میں ہوئی۔ اس کی ماں مارواڑ کے موٹا راجا اودے کی لڑکی جگت گوسائی (جودھا بائی) تھی۔ خرم کی پیدائش کے موقعہ پر درباری شاعروں نے اسے دنیا کا فاتح کہا تھا۔ شاہ جہاں پہلے نور جہاں گروہ کا اہم امیدوار تھا لیکن نور جہاں کی اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کرنے پر نور جہاں بادشاہت کے منصب کے لیے شہریار کی دعوی داری کرنے لگی، اس لیے شاہ جہاں نے 1623ء میں بغاوت کر دی۔ 1627ء میں جہانگیر کی موت کے وقت شاہ جہاں دکن میں تھا، اس لیے شاہ جہاں کے سسر آصف خاں نے خسرو کے بیٹے داور بخش کو تخت پر بیٹھا کر چال چلی اور بنارسی داس نامی تاجر کے ذریعہ پیغام بھیج کر شاہجہاں کو بلوایا۔ شاہ جہاں نے اپنے بھائیوں کا خاتمہ کر کے آخر میں داور بخش کو بھی قتل کر دیا۔ ہمعصر مؤرخین نے داور بخش کو بلی کا بکرا کہا ہے۔

5.3.1 شاہ جہاں کی تاج پوشی (Coronation of Shah Jahan)

4 فروری 1628ء کو مغلوں کی روایتی شان و شوکت کے ساتھ شہزادہ خرم آگرہ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہ جہاں پادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں سجدے کی رسم کو ختم کر دیا، اپنا نیا کلینڈر شروع کیا اور حکم دیا کہ نئے سکوں کے ایک طرف خلفائے راشدین کے نام اور دوسری طرف اس کا اپنا نام کندہ کیا جائے۔ خاندان کی بیگمات اور خونی رشتے کے شہزادون کو بیش بہا تحائف دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں نے اپنی تاج پوشی کے موقع پر ایک کروڑ ستر روپیہ خرچ کیا۔ اس رقم میں سے تیس لاکھ روپیہ امراء کو ملا اور بقیہ روپیہ تحفوں کی شکل میں شاہی خاندان والوں کے حصے میں آیا۔ شاہجہاں نے اپنے حامیوں کو ترقیاں دیں یا جن کو ترقی نہ ملی وہ اپنے عہدے و منصب پر مستقل کر دیے اور ہمیشہ کی طرح جن امراء کی وفاداری میں کسی قسم کا شبہ و شک تھا ان کی جگہ اپنے معتمدین کا تقرر کیا۔ شاہ جہاں نے ازراہ مہربانی نور جہاں کے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ یہ بات واضح نہیں کہ یہ رقم نور جہاں کی ان عنایات کے صلے میں تھیں جو اس نے شاہ جہاں سے اعتماد الدولہ کے زمانے میں

کی تھیں یا اپنے ضمیر کو تسلی دینے کے لیے مقرر کی تھی تاکہ اس نے جو سیاسی چالیں نور جہاں کے خلاف چلی تھیں اور اس سلسلے میں اس خاتون پر گستاخانہ الزامات لگائے تھے ان کا بدلہ چکایا جاسکے۔

5.3.2 نور جہاں اور شاہ جہاں (Noor Jahan and Shah Jahan)

نور جہاں عورت ہونے کی وجہ سے کسی ایسے ہمعصر وقائع نویس کو نہ پاسکی جو اس کے ساتھ انصاف کرتا۔اس کے شوہر نے آداب معاشرت یا نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں زیادہ نہ لکھا البتہ کہیں کہیں اس کی وفاداری اور شوہر پرستی ولیاقت اور فراخ دلی کی تعریف کی ہے۔نور جہاں کے دل ودماغ کی خوبیوں، استعداد، ہنر مندی۔ادبی لیاقت، ذکاوت، باوقار رویہ، شان وشوکت، جاذبیت، حوصلہ مندی، شکار اور دوسرے کھیلوں سے دل چسپی، تہذیب وشائستگی وملنساری کے سبب -1522 23ء میں اس کو بادشاہ بیگم کا قابل رشک خطاب ملا جس کی وہ پوری طرح مستحق تھی۔اس کا نام سکوں پر کندہ کرایا گیا۔یہ ایک ایسا غیر معمولی اعزاز تھا جو اسی قسم کی ایک اور خاتون ترکام خانم والدہ سلطان علاء الدین تکش خوارزم کو نصیب ہوا تھا۔بہت سے لوگوں کے نزدیک نور جہاں کو رسمی اور کھلے طور پر ملکہ کا رتبہ دیا جانا ایک بدعت سے کم نہ تھا اور اس کو بادشاہ کے عشق و فریفتگی کا مضمر سمجھا جاتا تھا۔بعض لوگوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔اس زمانے کے ایک عام ہندوستانی کے لیے یہ خیال کہ ملکہ کو اس قدر اعزاز واحترام دیا جائے ناقابل تصور تھا۔بہر حال یہ نہ تو کوئی غلط عمل تھا اور نہ ہی اس میں کوئی قابل ملامت بات تھی بلکہ اس کے برخلاف یہ ایک وسیع النظر اور روشن خیال بادشاہ کا ترقی پسندانہ اقدام تھا۔اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں



تصویر 7.1۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں 1592ء-1666ء۔
https://www.tajmahal.gov.in/about-shah-Jahan.aspx (Online Source)

کہ نور جہاں نے اس اعزاز واکرام کے لیے شہنشاہ سے درخوست کی ہو یا اس کے لیے ضد کی ہو اور شہنشاہ اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔نہ اس بات کی کوئی مثبت دلیل موجود ہے کہ نور جہاں نے شخصیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہو یا شاہی خاندان کی بیگمات یا مملکت کے ملازمین یا عام رعایا کو اپنے سے ناراض کیا ہو لیکن اگر کچھ لوگ رشک وحسد سے جلنے لگے ہوں تو اس میں اس کا کیا قصور۔شہریار کی خوشدامن ہونے کی وجہ سے اس پر ہر قسم کے الزامات عاید کیے جاتے ہیں اور اس پر انگشت نمائی کی جاتی ہے۔تاریخ کے مصدقہ واقعات ان الزامات کی تصدیق نہیں کرتے۔شاہ جہاں کے دور میں عملی زندگی سے کنارہ کش ہونے کے بعد اس نے اپنی زندگی کے 18 سال بڑی سختی کے ساتھ خاموش طریقے پر غم واندوہ میں گزارے۔نور جہاں 1645ء میں فوت ہوئی اور اپنے شوہر کے مقبرے کے قریب دفن کی گئی۔

5.3.3 جھجھار سنگھ بندیلہ کی بغاوت (Rebellion of Jhajhar Singh Bandela)

راجا بیر سنگھ بندیلا نے ابوالفضل کو قتل کر کے جو شہزادہ سلیم کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کی نظروں میں بڑی وقعت اور بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ جہانگیر نے اس کو خوب نوازا۔ شہنشاہ کی مہربانی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے دوسرے زمینداروں کی زمینوں پر بھی ہاتھ ڈالا اور اس کی غاصبانہ نگاہوں سے شاہی علاقہ جات بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ راجا بیر سنگھ 1627ء میں انتقال کر گیا اور اس کا سب سے بڑا بیٹا جھجھار سنگھ اس کا وارث بنا۔ شاہ جہاں کی تاج پوشی کے موقع پر جھجھار سنگھ اظہار اطاعت کے لیے خود آگرہ آیا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بیٹے وکرماجیت نے ریاست کا انتظام بڑی بددیانتی اور ظالمانہ طریقے سے انجام دیا۔ ریاست کے ایک قدیمی اور باعزت ملازم سیتارام نے جس کو وکرماجیت نے سخت اذیت پہنچائی تھی اور بہت ذلیل کیا تھا سخت شکایت کی چونکہ شاہ جہاں کو اور چھ کے راجاؤں سے کوئی انسیت نہ تھی اور وہ وہاں کے حکمرانوں کی سختیوں اور مظالم سے چشم پوشی کے لیے تیار نہ تھا لہذا اس نے اس شکایت کے پیش نظر حکم صادر کیا کہ ان واقعات کی اور راجا کے پاس غیر معمولی دولت جمع ہونے کی پوری پوری تفتیش کی جائے۔ شہنشاہ نے جھجھار سنگھ کے خلاف کوئی غیر دوستانہ رویہ اختیار نہ کیا۔ اس کے برخلاف شاہجہاں نے اس کو چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا لیکن جب ریاست کے معاملات کے بارے میں تحقیقات کا حکم صادر ہوا تو راجا کو پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے اسی میں خیریت سمجھی کہ بغیر اطلاع کیے دربار سے بھاگ کر اپنی ریاست کی پہاڑیوں اور گنجان جنگلوں میں پناہ لے۔

راجا کے اچانک دربار سے غائب ہو جانے کے سبب شہنشاہ آزردہ خاطر ہوا اور مخالفین نے اورچھ کے خاندان کے خلاف جو شکایات کیں تھیں ان میں اور نمک مرچ ملا کر پیش کیا۔ شاہجہاں نے جھجھار سنگھ کو اس کی بے ادبی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہجہاں نے اس کا درست اندازہ لگایا کہ اکبر کے زمانے میں بیر سنگھ کے خلاف جو فوجی مہم بھیجی گئی تھی وہ بندیلا ریاست کے جغرافیائی حالات کے سبب کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی تھی اور اب تو اس ریاست کے مالی وسائل اس چوتھائی صدی کے آخر میں اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ لہذا ضرورت تھی کہ جو فوجی مہم اس کے خلاف بھیجی جائے وہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو اور اس کی خاص توجہ کی جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ مہم شاہجہانی عہد کی پہلی فوجی مہم تھی اور وہ بھی راجاؤں کے ایک نئے خاندان کے خلاف اگر وہ کامیاب نہ ہوئی تو اس کے عہد کا آغاز ایک ناکام مہم سے ہو گا جس سے اس کے وقار کو صدمہ پہنچے گا اور اس کے عہد حکومت کو بڑی بدشگونی کا سامنا پڑے گا۔ مہابت خاں کو حکم ملا کہ وہ گوالیار سے دس ہزار سوار اور دو ہزار بندوقچی لے کر روانہ ہوا۔ ادھر سید اظفر خاں بارھہ و دیگر افسران کو حکم ملا کہ بندیلا ریاست میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں۔ دوسری طرف خان جہاں لودی صوبے دار مالوہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ آٹھ ہزار سواروں کے ہمراہ مہابت خاں کی مدد کو پہنچے۔ اسی طرح عبداللہ خاں فیروز جنگ کو کالپی سے روانہ ہونے کا فرمان ملا۔ یہ بڑی زبردست مہم تھی اور اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ ڈالا۔ شہنشاہ نے کامیابی کرنے کے لیے خود بھی شکار کے بہانے گوالیار میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس ہمہ گیر مہم جس کی نگرانی ایک لائق ترین مغل بادشاہ کر رہا تھا بے نتیجہ ختم ہونے والی نہ تھی۔ ایرج کے قلعے پر شدید حملہ کیا گیا اور وہاں پر مقیم تین ہزار فوج تہہ تیغ کر دی گئی۔ جھجھار سنگھ نے اپنی نازک حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ وہ کامیابی سے شہنشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ادھر جھجھار سنگھ اپنی ریاست کے معاملات کو سنبھال نہ پایا تھا۔ ادھر شاہی

کیمپ میں اس کا مد مقابل حریف بھرت سنگھ بندیلا جو کہ خود کو ریاست کا وارث سمجھتا تھا للکار رہا تھا۔ان حالات میں جھجھار سنگھ نے اطاعت قبول کرلی۔ایک ہزار اشرفی، پندرہ لاکھ روپیہ، چالیس ہاتھی بطور جرمانہ اور وہ علاقے جن پر اس کے باپ نے قبضہ کر لیا تھا واپس کر دیا۔ جھجھار سنگھ کو اس کے اصلی عہدے پر مستقل کر دیا گیا اور حکم ملا کہ دوہزار سوار اور دوہزار پیادہ لے کر دکن میں خدمت کیلیے پہنچ جائے۔دوسری بغاوت 1628ء میں افغان سردار خان جہاں لودی (پیر خان) نے کیا۔ 1631ء میں خان جہاں کو مادھو سنگھ نے قتل کر دیا۔

5.3.4 شاہ جہاں اور گروہر گوبند (Shah Jahan and Guru Hargobind)

شاہ جہاں کے عہد کے آغاز میں سکھوں کے چھٹے گرو کا بادشاہ سے جھگڑا ہو گیا اس جھگڑے کا سبب بہت معمولی تھا۔ بادشاہ امرت سر کے قریب شکار کھیل رہا تھا اس کا ایک دل پسند باز اُڑ کر گرو کے کیمپ میں پہنچ گیا جو وہاں سے بہت دور تھا۔ سکھوں نے پرندے کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مخلص خان کی سرکردگی میں سکھوں کو بیدار کیلیے مہم روانہ کی گئی۔ کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جن میں سکھوں کے قائد بھانو اور سنگھا دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔1628ء میں سردار پائندہ خاں نے سکھوں کی فوج کو روکے رکھا اور آخری حملے میں جن کی سرداری خود گرو کر رہے تھے مغل فوج کو شکست ہوئی۔ یہ مغلوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی تھی۔ شاہی دربار میں سکھوں کے بہی خواہ وزیر خاں وغیرہ نے بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لیکن گرو کے دشمن بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔انہوں نے عبداللہ خاں کو جو کہ جالندحر میں مغل افسر تھا بھڑکایا کہ وہ گرو کے خلاف دوسری مہم شروع کر دے اس وقت گرو دریائے بیاس کے کنارے ماجھا اور دوآب کے علاقوں کے درمیان پنجاب میں ایک نیا شہر تعمیر کرنے میں مصروف تھے جو کہ بعد میں ہرگوبند پور کے نام سے مشہور ہوا۔ جنگجو کسانوں کے ملک کے بیچ میں ایک نئے شہر کے آباد ہونے سے مغلوں کو امرت سر کی ویرانی سے جو فائدے حاصل ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے۔اس کے علاوہ صوبے دار کچھ اس وجہ سے بھی گرو کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ گرو کے ساتھیوں نے ایک جھگڑے میں علاقے کے چودھری گھیرار کو جو نئے شہر کی بنیاد ڈالنے اور گرو کی تبلیغ کا مخالف تھا مار ڈالا چنانچہ گرو کے پاس یہ پیغام بھیجا گیا کہ وہ نئے شہر کے بسانے کے ارادے کو ترک کر دے لیکن گرو نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی کاروائی جاری رکھی۔ سکھوں پر حملہ کیا گیا لیکن گرو کو ہی غلبہ حاصل رہا۔

تیسری دفعہ بیدھی چند کی چوری کرنے پر جھگڑا ہوا۔ بیدھی کسی زمانے میں ایک مشہور ڈاکو تھا لیکن گرو کا ایک معتقد تھا۔اس نے شاہی اصطبل سے دو بہترین گھوڑے چرا کر گرو کو پیش کر دیے اور گرو نے بھی بدقسمتی سے ان کو قبول کر لیا۔ 1631ء میں ایک قوی مغل فوج گرو کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی لیکن اس کو شکست ہوئی۔ فوراہی دوسری فوج کالے خاں کی ماتحتی میں روانہ کی گئی۔اس دفعہ مغل فوج پہلے کی نسبت زیادہ قوی تھی۔ادھر گرو کا ایک بہترین افسر پائندہ خان گرو سے جھگڑ کر مغلوں سے جاملا تھا لیکن گرو نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کرتارپور کے مقام پر خوف ناک جنگ ہوئی جس میں پائندہ خاں مارا گیا، سکھوں کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن آخر میں فتح ان ہی کو نصیب ہوئی اس لڑائی میں تیغ بہادر نے جو کہ بعد میں گرو ہوئے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ مغلوں کے مستقل دباؤ کی وجہ سے سکھوں کی ابھرتی ہوئی قوت کو صدمہ پہنچا انھیں نہ صرف یہ کہ مذہبی تبلیغی کام کو روکنا پڑا بلکہ مغلوں کی مخالفت کے سبب سکھوں کو بہت تکالیف اٹھانی

پڑیں۔ جس کی وجہ سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ سکھ برادری جو اپنے ہی پیروں پر کھڑی تھی اور پنجاب کی ہندو آبادی سے اسے بہت کم مدد ملی تھی کہیں برباد نہ ہو جائے۔ گرو نے اپنی سمجھ سے اس بات کا اندازہ لگالیا کہ وہ اپنے محدود وسائل کے ذریعے مغل خاندان کے ایک سب سے زیادہ بااثر شہنشاہ کے لامحدود دباؤ کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہ کر سکیں گے چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ برادری کو کچھ مہلت دی جائے اور گرو اپنا وقت گیان ودھیان اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانے میں صرف کریں۔ لہٰذا وہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر کرت پور کے مقام پر رہنے لگے اور انہوں نے اپنے آخری ایام خاموشی سے گیان دھیان اور تبلیغی کاموں میں گزار کر ہر گوبند کے سب سے بڑے لڑکے بھٹ ہر رائے کو اپنا جانشین بنا کر 1645ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد سکھوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو ہر بند نے سکھوں کو گوشت کھانے کی اجازت دے دی۔ مہوبا کے چمپت رائے نے بھی بغاوت کی لیکن آخر میں اس سے صلح ہو گئی۔ مالوہ کے کھاتا کھیڑی کے بھاگیر تھ بھیل، چھوٹا ناگپور کے راجا پرتاپ اور نور پور کے زمیندار جگت سنگھ نے بھی شاہ جہاں کے دور میں بغاوت کی تھی۔

5.3.5 احمد نگر کا الحاق (Annexation of Ahmednagar)

1633ء میں احمد نگر کو مغل سلطنت میں ملا لیا گیا اور آخری نظام شاہی سلطان حسین شاہ کو قید کر کے گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔ فتح خاں احمد نگر مہم میں مغلوں کا ایک سیناناپک تھا۔ احمد نگر کے زوال کے بعد شاہ جی بھونسلے احمد نگر کو چھوڑ کر بیجاپور کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ اسی وقت شاہ جہاں نے مراد کے کہنے پر شاہ جی کو پانچ ہزار کا منصب اور پونا کی جاگیر دی تھی۔ 1636ء کے بعد شاہ جہاں کی دکن پالیسی کافی حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس نے کافی وقت جنوب میں لگا دیا اسے جنوب کا تجربہ اور علم حاصل ہو گیا تھا۔

5.3.6 گولکنڈہ کی مہم (Campaign against Golconda)

1636ء میں گولکنڈہ کے حکمراں عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر کے معاہدہ کر لیا۔ گولکنڈہ میں ایران کے شاہ کی جگہ پر شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر بھی شاہ جہاں کا نام شامل کر لیا گیا۔ گولکنڈہ جو چار لاکھ ہنوں کا ٹکس بیجاپور کو دیتا تھا، وہ معاف کر دیا گیا۔ اسی وقت گولکنڈہ کا وزیر میر جملہ گولکنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی خدمت میں آگیا۔ میر جملہ پہلے فارسی بیوپاری تھا۔ میر جملہ نے شاہ جہاں کو کوہ نور ہیرا نذر کیا تھا۔

5.3.7 بیجاپور کی مہم (Campaign against Bijapur)

1631ء میں شاہ جہاں نے آصف کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن آصف خاں کا حملہ ناکام رہا۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے مہابت خاں کو جنوب کا صوبہ دار متعین کیا۔ 1636ء میں ہی بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ نے بھی مغلوں سے معاہدہ کر کے مغل ماتحتی قبول کر لی۔ شاہ جہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبے داروں کی راجدھانی برہان پور تھی۔

5.3.8 شاہجہاں کی بلخ مہم (Shah Jahan's Campaign against Balkh)

شاہ جہاں کے لیے قندھار کی فتح ایک بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے محض ایک وسیلہ تھی۔اسے دراصل زیادہ تشویش کابل پر ازبکوں کے حملوں کے امکانات نیز بلوچیوں اور افغان قبائل کے ساتھ ان کی سازشوں کے بارے میں تھی۔یہی وہ وقت تھاجب بلخ اور بخارا دونوں پر ہی نظر محمد کا قبضہ ہو گیا تھا۔ نظر محمد اور اس کا بیٹا عبدالعزیز دونوں ہی کافی خواہش مند واقع ہوئے تھے اور کابل نیز غزنی پر بھی قبضے کے لیے افغان قبائل کی مدد سے حملے کرتے رہے تھے۔ لیکن عبدالعزیز نے بہت جلد ہی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا،اور صرف بلخ ہی نظر محمد کے قبضے میں رہ پایا۔اس نے شاہ جہاں سے مدد کی درخواست کی۔ شاہ جہاں اس وقت ایران کی طرف سے مطمئن تھا ہی،اس لیے مدد کی اس درخواست کو شاہ جہاں نے فوراً منظور کر لیا۔ شاہ جہاں لاہور سے چل کر کابل پہونچ گیا اور شہزادہ مراد کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج نظر محمد کی مدد کے لیے روانہ کی۔اس فوج میں پچاس ہزار گھوڑے اور دس ہزار پیادے تھے، پیادوں میں توپچی بھی تھے۔اس کے علاوہ راجپوتوں کا ایک دستہ بھی اس فوج میں شامل تھا۔ یہ فوج 1646ء کے وسط میں کابل سے روانہ ہوئی تھی۔ شاہ جہاں نے شہزادہ مراد کو خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ وہ نظر محمد کے ساتھ انتہائی نرمی اور شرافت سے پیش آئے اور اگر وہ انکساری اور تابعداری کا مظاہرہ کرے تو بلخ اسے دے دیا جائے۔مزید یہ کے اگر نظر محمد سمرقند اور بخارا کو بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ظاہر کرے تو شاہزادہ اس کی ہر طرح سے مدد کرے گا۔ ظاہر ہے کہ شاہ جہاں یہ چاہتا تھا کہ بخارا میں ایک ایسا حکمراں ہو جو اس کا دوست ہو اور مغلوں کی مدد اور تائید کا متمنی ہو۔ لیکن مراد کی بے صبری کی وجہ سے شاہ جہاں کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ مراد نے نظر محمد کے ساتھ کسی صلاح مشورے کے بغیر ہی بلخ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی،اور اپنے فوجیوں کو بلخ کے قلعے میں داخل ہو جانے کا حکم بھی دے دیا، جہاں پر نظر محمد قیام پذیر تھا اور مراد نے اسے اپنے سامنے حاضر ہونے کا سختی سے حکم بھی دیا۔ نظر محمد، شہزادہ مراد کے اصل ارادوں سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔اور ایسے حالات میں مغلوں کو بلخ پر قبضہ کرنا پڑا اور وہاں کی مغموم اور برہم آبادی کی مخالفت کے باوجود بھی اپنا تسلط قائم رکھنا پڑا۔دوسری طرف نظر محمد کے سامنے کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں تھا۔اس کے لڑکے عبدالعزیز نے ماوراءالنہر کے علاقے کے ازبکوں کو مغلوں کے خلاف بھڑکا دیا اور ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر دریائے آمو تک پہنچ گیا۔اس اثناء میں شہزادہ مراد کی جگہ پر جو کہ وطن واپس لوٹ جانے کا خواہش مند تھا اورنگ زیب کو بھیج دیا گیا۔ مغلوں نے دریائے آمو کے دفاع کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے کافی آسانی سے پار کیا جاسکتا تھا۔البتہ انہوں نے جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے اہم مقامات پر اپنے دستے تعینات کیے اور فوج کے مرکزی حصے کو ایک ساتھ رکھا تاکہ وہ کسی بھی مقام پر حملے کی صورت میں آسانی سے وہاں بھیجی جاسکے۔اس طرح مغلوں کی مورچہ بندی بہت اچھی تھی۔ عبدالعزیز دریائے آمو تو پار کر گیا لیکن اپنے سامنے ایک بڑی مغل فوج کو موجود پایا۔ مغلوں نے واپس بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کر کے ازبکوں کو بلخ کے دروازہ پر پسپا کر دیا(1647ء)

بلخ پر مغلوں کی فتح کے لیے نتیجے میں ازبکوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ عبدالعزیز کے ازبیک حمایتی منتشر ہو کر رہ گئے اور خود اس نے بھی مغلوں کے ساتھ صلح صفائی کی خواہش کے اشارے دیے۔ نظر محمد نے جو کہ اس وقت تک ایران میں پناہ لے چکا تھا اپنی سلطنت کی بحالی کے لیے مغلوں سے درخواست کی۔ شاہ جہاں نے کافی غور و فکر کے بعد نظر محمد کے حق میں فیصلہ دے دیا لیکن

سب سے پہلے اورنگ زیب سے معافی مانگنے کی شرط بھی لگادی۔ شاہ جہاں کی یہ غلطی تھی کیونکہ غیور ازبیک حکمران اس حد تک ہر گز نہیں جھک سکتا تھا خاص طور پر جب وہ یہ بھی جانتا ہو کہ مغل زیادہ عرصے تک بلخ میں نہیں ٹک پائیں گے۔ مغل نظر محمد کی ذاتی حاضری کا فضول انتظار کرنے کے بعد آخر کار اکتوبر 1647ء میں بلخ سے روانہ ہو گئے کیونکہ سردی کا موسم تیزی سے آرہا تھا اور بلخ میں رسدات کی قلت ہوتی جارہی تھی۔ مغلوں کے لیے یہ واپسی کافی مہنگی ثابت ہوئی کیونکہ باغی ازبکوں نے چھاپہ مار حملے شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ مغلوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن اورنگ زیب کی مستقل مزاجی کام آئی اور حالات قابو سے باہر نہیں ہونے پائے۔ شاہ جہاں کی بلخ مہم کے معاملے پر جدید مؤرخین میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ سابقہ تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں دریائے آمو کو مغل سلطنت کی سائنٹفک سرحد بنانے کے لیے کوشش نہیں کر رہا تھا۔ دریائے آمو ایک محفوظ سرحد ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ جہاں کو سمرقند اور فرغنہ پر قبضے کی بھی کوئی تمنا نہیں تھی جو کہ مغلوں کے اصل وطن تھے۔ اگرچہ مغل حکمراں ان کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کی شاہجہاں کا مقصد یہ تھا کہ بلخ اور بدخشاں میں ایک ایسا حکمراں ہو، جو ان کا دوست ہو، کیونکہ یہ دونوں علاقے کابل کی سرحد سے ملے ہوئے تھے اور 1585ء تک تیموری حکمرانوں کے تسلط میں رہ چکے تھے۔ شاہ جہاں کا خیال تھا کہ اس طرح غزنی اور دَرّہ خیبر کے علاقے میں آباد باغی افغانوں کو بھی قابو میں رکھا جاسکے گا۔ جنگ حکمت عملی کے اعتبار سے مغلوں کی یہ مہم کامیاب ہی رہی، کیونکہ مغلوں نے بلخ کو فتح کر لیا تھا اور بے دخل کر دینے کی ازبکوں کی تمام کوششوں کو بھی ناکام بھی بنا دیا تھا۔ اس علاقے میں ہندوستانی فوجوں کی یہ پہلی اہم کامیابی تھی اور شاہ جہاں کا اس پر خوشی منانا بالکل فطری بات تھی۔ لیکن بلخ پر اپنے اقتدار کو لمبے عرصے تک قائم رکھنا مغلوں کے مقدور سے باہر کی بات تھی۔ ایران کی شدید مخالفت اور دشمنی نیز مقامی آبادی کے مخالفانہ روئے کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے بھی ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہ حیثیت مجموعی بلخ کی فتح سے مغل فوج کے وقار میں اضافہ تو ہوا لیکن اس سے کوئی خاص سیاسی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اگر شاہ جہاں ،اکبر کے ذریعے کافی جان فشانی سے قائم کی گئی کابل، غزنی، قندھار خطہ سرحد پر قائم رہا ہوتا تو یہ مغلوں کے لیے کافی سودمند ثابت ہوا ہوتا اور جان ومال کا بھی اتنا نقصان نہ اٹھانا پڑا ہوتا۔ بہر حال نظر محمد جب تک زندہ رہا اس نے مغلوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور دونوں کے درمیان سفیروں اور ایلچیوں کا تبادلہ بھی جاری رہا۔

فن تعمیر (Architecture)

شاہ جہاں نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کی گئی عمارتوں کا ایک عظیم ورثہ چھوڑا۔ وہ مغل فن تعمیر کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک تھا۔ اس کے دور حکومت نے مغل فن تعمیر کے سنہری دور کا آغاز کیا۔ اس دور کی سب سے مشہور عمارت تاج محل تھی، جسے اس نے اپنی بیوی، ملکہ ممتاز محل کے لیے محبت کی یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ ممتاز محل کے ساتھ اس کے تعلقات کو ہندوستانی فن، ادب اور سنیما میں خصوصاً ظاہر کیا گیا ہے۔ شاہ جہاں کے پاس ذاتی طور پر شاہی خزانے اور کئی قیمتی پتھر جیسے کوہ نور تھا۔ تاج محل کا ڈھانچہ بڑی احتیاط سے تیار کیا گیا اور اس مقصد کے لیے ماہرین تعمیرات کو بلایا گیا۔ اس عمارت کو مکمل ہونے میں بیس سال لگے تھے اور اسے سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس کی بیوی ممتاز محل کو دفن کیا گیا تھا۔ شاہجہاں کی موت کے بعد، ان کے بیٹے اورنگزیب نے انہیں ممتاز محل کے پاس دفن

کیا۔ان کی دیگر تعمیرات میں لال قلعہ، آگرہ قلعہ کے بڑے حصے، جامع مسجد، وزیر خان مسجد، موتی مسجد، شالیمار باغ، قلعہ لاہور کے حصے، پشاور میں خان مسجد، ہستسال میں چھوٹا قطب مینار، جہانگیر کا مقبرہ ان کے والد کا مقبرہ، جس کی تعمیر کی نگرانی ان کی سوتیلی ماں نور جہاں اور شاہجہاں نے خود کی۔اس کے پاس ایک عظیم تخت طاؤس بھی تھا، جو اپنی حکومت کا جشن منانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اپنے فن تعمیر کے شاہکار پر قرآن کی کئی آیات بھی کندہ کروائی تھیں۔پاکستان کے صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں واقع شاہ جہاں مسجد (کراچی سے 100 کلو میٹر) شاہ جہاں کے دور حکومت میں 1647 میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسجد سرخ اینٹوں سے بنی ہے جس میں نیلے رنگ کی چمکدار ٹائلیں ہیں جو شاید سندھ کے کسی اور قصبے سے درآمد کی گئی ہیں۔ ہالا مسجد میں مجموعی طور پر 93 گنبد ہیں اور یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے جس میں اتنے گنبد ہیں۔اسے صوتیات کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔ گنبد کے ایک سرے کے اندر بولنے والے شخص کو دوسرے سرے پر سنا جا سکتا ہے۔ یہ 1993 سے یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل ہے۔

جانشینی کی جنگ اور شاہجہاں کی موت (War of Succession and the Death of Shah Jahan)

جب شاہ جہاں 1658 میں بیمار ہوا تو اس کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے اپنے والد کی جگہ نائب کی ذمے داری نبھائی، جس کی وجہ سے اس کے بھائیوں کے درمیان رقابت میں اضافہ ہو گیا۔اس کی ولی عہدی کے بارے میں جاننے کے بعد، اس کے چھوٹے بھائیوں، بنگال کے گورنر شجاع اور گجرات کے گورنر مراد بخش نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور تخت پر قبضہ کرنے کے لیے آگرہ پر چڑھائی کی۔ تیسرے بیٹے اورنگزیب نے ایک اچھی تربیت یافتہ فوج جمع کی اور اس کی کمان سنبھالی۔اس نے آگرہ کے قریب دارا کی فوج کا سامنا کیا اور ساموگڑھ کی لڑائی کے دوران اسے شکست دی۔ دارا کی حمایت کے جرم میں فاتح شہزادے اورنگزیب نے اپنے باپ شاہجہاں کو حکومت کرنے کے لیے نااہل قرار دیا اور اسے آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ ممتاز محل کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم رضاکارانہ طور پر 8 سال اپنے والد کے ساتھ نظر بندی میں رہنا منظور کیا اور باپ کی دیکھ بھال کی۔ جنوری 1666 میں شاہ جہاں بیمار ہو گیا اور بستر سے لگ گیا۔ اس کی کمزوری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ 30 جنوری کو، اس نے شاہی دربار کی خواتین، خاص طور پر اکبرآبادی محل کی اپنی ساتھی، جہاں آرا کی دیکھ بھال کی تعریف کی۔ کلمہ اور قرآن کی آیات کی تلاوت کے بعد، شاہ جہاں 74 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ شاہ جہاں کے مصاحب سید محمد قنوجی اور آگرہ کے قاضی قربان قلعہ میں آئے اور شاہجہاں کی لاش کو قریبی ہال میں لے گئے۔اسے غسل دیا، کفن دیا اور



تصویر 7.2۔تاج محل، آگرہ، (پبلک ڈومین)

چندن کے تابوت میں ڈال دیا۔ میت کو تاج محل لے جایا گیا اور وہاں ان کی پیاری بیوی ممتاز محل کی قبر کے پاس سپرد خاک کیا گیا۔

5.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ شاہجہاں کا بچپن کا نام خرم تھا۔ خرم کی پیدائش 5 جنوری 1592 میں لاہور میں ہوئی۔اس کی ماں مارواڑ کے موٹا راجا ادودیے کی لڑکی کی جگت گوسائی (جودھا بائی) تھی۔ شاہ جہاں پہلے نور جہاں گروپ کا اہم دعویدار تھا لیکن نور جہاں کی اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی پرویز سے کرنے سے نور جہاں بادشاہی منصب کے لیے شہریار کے لیے کوشش کرنے لگی۔اس لیے شاہ جہاں نے نے 1623ء میں بغاوت کر دی۔ 1627 میں میں جہانگیر کی موت کے وقت شاہجہاں دکن میں تھا۔اس لیے شاہ جہاں کے خسر آصف خان نے خسرو کے بیٹے داور بخش کو تخت پر بیٹھا کر چال چلی۔اور بنارسی داس نامی پیامبر کے ذریعے سے پیغام بھیج کر شاہجہاں کو بلوایا۔ شاہجہاں نے اپنے بھائیوں کا خاتمہ کر کے آخر میں داور بخش کو بھی قتل کر دیا۔ ہمعصر مورخین نے داور بخش کو بلی کا بکرا کہا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ 1636 میں گلکنڈہ کے حکمراں عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر کے معاہدہ کر لیا۔ گولکنڈا میں ایران کے شاہ کی جگہ پر شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر بھی شاہ جہاں کا نام شامل کر لیا گیا۔ گولکنڈا جو چار لاکھ ہنوں کا ٹیکس بیجاپور کو دیتا تھا تھا وہ معاف کر دیا گیا۔اسی دوران گولکنڈہ کا وزیر میر جملہ گول کنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی خدمت میں آ گیا۔ میر جملہ پہلے تاجر تھا۔اس نے شاہجہاں کو کوہ نور ہیرا پیش کیا۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ کہ 1631 میں شاہ جہاں نے آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن آصف خان کا حملہ ناکام رہا۔اس کے بعد شاہ جہاں نے مہابت خان کو جنوب کا صوبیدار متعین کیا۔1636 میں بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ نے مغلوں سے معاہدہ کر کے مغل ماتحتی قبول کر لی۔ شاہجہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبہ دار کی راجدھانی برہانپور تھی۔1658 کی جانشینی کی جنگ میں داراشکوہ کا ساتھ دینے کے جرم میں شاہجہاں کو اس کے بیٹے اورنگزیب نے نظر بند کر دیا جہاں 8 سال بعد بستر علالت پر اس کا انتقال ہو گیا۔ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے ان آٹھ سالوں میں باپ کی بہت خدمت کی اور اس کے ساتھ ہی نظر بندی میں گزارنا منظور کیا۔اس کی تدفین اس کی محبوب بیوی ارجمند بانو یعنی ممتاز محل کے پہلو میں تاج محل میں کی گئی۔

5.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

بارگی : مراٹھا تیز رفتار گھوڑ سوار جو اجرت پر دکنی ریاستوں میں کام کرتے تھے۔

نور جہاں : جہانگیر کی محبوب بیوی جس نے سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

گوریلا طرز جنگ: یہ طریقہ جنگ ضرب لگاؤ اور بھاگو کے اصول پر کام کرتا تھا۔

شاہ عباس : ایران کا صفوی خاندان کا حکمراں

5.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جہانگیر کے دور میں کس سکھ گرو کو پھانسی دی گئی؟

(الف) گرو نانک (ب) گرو تیغ بہادر (ج) گرو ارجن دیو (د) گرو ہر گوبند

2. نور جہاں کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) ارجمند بانو (ب) مہرالنساء (ج) جگت گوسائیں (د) لاڈلی بیگم

3. شاہجہاں کے بچپن کا نام کیا تھا؟

(الف) سلیم (ب) خرم (ج) خسرو (د) شہریار

4. اعتمادالدولہ کا مقبرہ کس نے تعمیر کرایا؟

(الف) جہانگیر (ب) شاہجہاں (ج) نور جہاں (د) اکبر

5. شاہجہاں نے کس سال احمد نگر کو مغل سلطنت میں شامل کیا؟

(الف) 1633 (ب) 1636 (ج) 1648 (د) 1658

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تزک جہانگیری کی اہمیت بیان کیجئے۔
2. نور جہاں کا کیا رول تھا بیان کیجئے۔
3. شاہ عباس کے جہانگیر سے کیسے تعلقات تھے بیان کیجئے۔

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. قندھار کی مہم پر خاص تبصرہ کیجئے۔
2. عہد جہانگیری میں ہونے والی بغاوتوں پر ایک نوٹ لکھئے۔

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(ب), 4-(ج), 5-(ب)

اکائی 6۔اورنگزیب

(Aurangzeb)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 جانشینی کی جنگ

6.3 اورنگزیب کی حکومت کا آغاز

6.3.1 شمالی ہندوستان

6.3.2 شمال مشرقی اور مشرقی ہندوستان

6.4 عوامی بغاوتیں اور تحریکیں

6.4.1 جاٹ اور ست نامی

6.4.2 افغان

6.4.3 سکھ

6.5 اورنگزیب کی راجپوت پالیسی

6.6 اورنگ زیب کی دکن پالیسی

6.6.1 پہلا مرحلہ

6.6.2 دوسرا مرحلہ

6.6.3 تیسرا مرحلہ

6.6.4 اورنگ زیب اور مراٹھا

6.7 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

6.8 اکتسابی نتائج

6.9 کلیدی الفاظ

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.0 تمہید (Introduction)

اورنگزیب ہندوستانی تاریخ میں یقیناً نہایت ہی متنازعہ شخصیت ہے جس پر حال میں بھی متعدد بحثیں اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مغل سلطنت کا نہایت طاقتور بادشاہ تھا اور اس کے دور میں مغل سلطنت وسعت کی بلندیوں کو پہنچ گئی تھی، مگر ساتھ ہی اس کے کارنامے اور پالیسیاں خصوصاً مذہبی پالیسی ہمیشہ تنقید کے نشانے پر رہی ہے۔ اورنگ زیب پر متعدد الزامات عائد کیے جاتے ہیں جیسے اس نے مندر توڑے، برہمنوں کو اذیتیں دیں، جبراً مذہب تبدیل کرایا، غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور سب سے اہم مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کیا۔ ایس آر شرما اور جادوناتھ سرکار جیسے قوم پرست مورخ اسے مذہبی تعصب پسند مانتے ہیں تو دوسری طرف شبلی نعمانی، ظہیر الدین فاروقی اور پاکستانی مورخ اشتیاق حسین قریشی بتاتے ہیں کہ وہ مذہبی طور پر روادار تھا اور اس کے کچھ کاموں کی توجیہ پیش کرتے ہیں۔ مشہور مورخ عزیز الدین حسین کے مطابق 'دونوں گروپ کے مورخین ایک نکتے کو بھول گئے کہ اورنگزیب نے ورنداون اور بہار کے کچھ مندروں کو زمینی عطیات بھی دیے'۔۔۔ 'ممکن ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اس حقیقت کو بیان نہیں کیا جو ان کے اس نظریہ کے خلاف جاتی کہ اورنگزیب ہندوؤں کے خلاف تھا یا وہ اسلام کا سورما تھا۔' یہ حقیقت ہے کہ اورنگزیب کے دور حکومت میں بہت سے ایسے کام کیے گئے جو مذہبی رواداری کے خلاف تھے اور روایت پسندی پر مبنی تھے، مگر اگر ہم اس کی پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب اس کے لیے کبھی اولین فوقیت نہیں تھا بلکہ اس کی سیاست ہی اس کی پالیسی طے کرتی تھی۔ داراشکوہ کے قتل اور شاہجہاں کی اسیری سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی کہ اس کی تخت نشینی باپ کی موجودگی میں غیر اسلامی تھی اس لیے اسے دارا کو اسلام مخالف قرار دینا پڑا، ساتھ ہی دارا کے مقدمے میں جس طرح کاروائی کی گئی وہ اسلامی عدالتی قانون کے خلاف تھی۔ یہی بات مندروں کو توڑنے پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ اسلام میں کسی بھی دوسرے مذہب کی پہلے سے موجود عبادت گاہ کے توڑے جانے کی ممانعت ہے۔ جادوناتھ سرکار بتاتے ہیں کہ اورنگزیب کی ہندو مخالف پالیسیوں کی وجہ سے جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے ہتھیار اٹھائے تھے، مگر جاٹ بغاوت میں ہندو کسانوں کے خلاف مقامی ہندو راجاؤں اور زمین داروں نے مغلوں کی طرفداری کیوں کی، یا سکھ بغاوت کو کچلنے میں راجپوت مغلوں کے شانہ بشانہ کیوں تھے، یا پھر راجپوتوں کا دوسرا گروہ راجپوت بغاوت کے دوران مغلوں کی حمایت کیوں کر رہا تھا۔ شیواجی کی مغلوں سے ان بن کی وجہ بھی ان کی مغل دربار میں ذاتی بے عزتی تھی جہاں انہیں اول درجے کے امرا کے بجائے دوئم درجے کی امرا کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ یہ سب معاملات ہمیں اورنگزیب کی شخصیت کے ایک دوسرے پہلو سے روشناس کراتے ہیں جو عملیت پسند ہے، تجربہ کار ہے اور مذہب کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا جانتا ہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جانشینی کی جنگ میں اورنگزیب کی کامیابی کے اسباب جان سکیں گے۔
- اورنگزیب کی فتوحات کا جائزہ لے سکیں گے،
- اورنگزیب کے دور کی اہم بغاوتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔

- اورنگزیب کی راجپوت پالیسی، دکن پالیسی اور مذہبی پالیسی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- یہ سمجھ سکیں گے کہ اورنگزیب کیا واقعی مذہبی طور پر متعصب تھا؟ یا نہیں۔

6.2 جانشینی کی جنگ (War of Succession)

شاہجہاں کے عہد حکومت کا آخری دور، اس کے بیٹوں کے درمیان جانشینی کے لیے جنگ سے متاثر رہا۔ تیموری حکمرانوں میں جانشینی کے سلسلے میں کوئی طے شدہ روایت نہیں تھی۔ کچھ مسلم سیاسی مفکرین نے بادشاہ کے ذریعے اپنے جانشین کی نامزدگی کے حق کو تسلیم کیا تھا لیکن عہد سلطنت میں ہندوستان میں اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس طرح سلطنت کو شہزادوں میں تقسیم کر دینے کی تیموری روایت بھی زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی اور ہندوستان میں یہ طریقہ اختیار بھی نہیں کیا گیا۔ جانشینی کے سلسلے میں ہندو روایت بھی کوئی خاص واضح نہیں تھی۔ اکبر کے ہمعصر شاعر تلسی داس کے مطابق اپنے کسی بھی بیٹے کو ٹیکہ لگانے (ولی عہد بنانے) کا ہر حکمران کو حق حاصل تھا لیکن خود راجپوت حکمران خاندانوں میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ راجا کے اس طرح کے انتخاب کو دوسرے بھائیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح گدی پر بیٹھنے سے پہلے سانگا کو اپنے بھائیوں کے ساتھ شدید جنگ کرنی پڑی تھی۔ 1657 کے آخر میں شاہجہاں دلی میں شدید طور پر علیل ہو گیا اور ایک موقع پر تو لوگوں کو اس کے زندہ رہنے کی امید بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ دارا شکوہ کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں اس کی صحت پھر سے بحال ہو گئی اور وہ تندرست ہو گیا۔ اس اثناء میں طرح طرح کی افواہیں پھیل چکی تھیں۔ یہ افواہ تک اڑا دی گئی کہ درحقیقت شاہجہاں کا انتقال ہو چکا ہے اور دارا نے اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے اس کی موت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ کچھ عرصے بعد شاہجہاں دھیرے۔ دھیرے آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس اثناء میں بنگال میں شہزادہ شجاع گجرات میں شہزادہ مراد اور دکن میں شہزاد اورنگ زیب کو یا تو باور کرایا گیا تھا کہ یہ افواہ صحیح ہے یا پھر یہ کہ اپنے مفاد کے لیے انہیں ایک بہانا مل گیا اور اس طرح جانشینی کے لیے خوں ریز جنگ کی تیاریاں زور شور کے ساتھ شروع کر دی گئیں۔ اپنے آخری وقت کو قریب دیکھ کر اور یہ خطرہ محسوس کر کے کہ جانشینی کے لیے اس کے بیٹوں کا ٹکراؤ سلطنت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے شاہجہاں نے دارا شکوہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دارا کے منصب کو 40000 ذات سے بڑھا کر 60000 ذات تک کر دیا اور اسے اپنے تخت کے پہلو میں بیٹھنے کی جگہ دی اور تمام امراء اور منصب داروں کو یہ حکم بھی دے دیا کہ وہ دارا کے ساتھ اگلے بادشاہ جیسا سلوک کریں۔ لیکن شاہجہاں جانشینی کے مسئلے کو اپنی امید کے مطابق اس طرح آسانی سے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا اور اس کے باقی تینوں بیٹوں کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ دارا کی جانب داری کر رہا ہے۔ اس طرح تخت کے لیے اپنا دعوئی پیش کرنے کے لیے ان شہزادوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔

ہمیں ان واقعات کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں جن کے نتیجے میں آخر میں اورنگ زیب کو ہی کامیابی حاصل ہوئی۔ اور نگ زیب کی کامیابی کے کئی اسباب تھے۔ دارا کی شکست کے دو اہم اسباب یہ تھے کہ اسے ایسے صلاح مشورے دیے گئے ڈر ایک دوسرے سے متضاد ہوتے تھے اور دوسرے یہ کہ اسے اپنے مخالفوں (حریفوں) کی طاقت کا صحیح انداز بھی نہیں تھا۔ شہزادوں کی جنگی تیاریوں اور راجدھانی پر

حملے کے فیصلے کا علم ہونے پر شاہجہاں نے شجاع کی سرکوبی کے لیے، جس نے خود کو بادشاہ قرار دے لیا تھا دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج مشرق کے لیے روانہ کی اور اس کی مدد کے لیے مرزا راجہ جے سنگھ کو بھی اس کے ساتھ بھیجا۔ ایک دوسری فوج جودھ پور کے حکمران راجہ جسونت سنگھ کی سرکردگی میں مالوا کی طرف بڑھی۔ مالا پہونچنے پر جسونت سنگھ نے یہ دیکھا کہ وہاں اورنگ زیب اور مراد کی متحدہ فوجیں اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دونوں شہزادے جنگ کے لیے آمادہ تھے۔ انہوں نے راجہ جسونت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ اس لڑائی میں حصہ نہ لے۔ جسونت سنگھ اگرچہ وہاں سے جنگ کے بغیر ہی واپس ہو سکتا تھا لیکن اسے اپنے وقار کے منافی سمجھ کر اس نے جنگ کا ہی فیصلہ کیا حالانکہ حالات اس کے لیے قطعی ناسازگار تھے۔ 15 اپریل 1658 میں دھرمات کی جنگ میں اورنگ زیب کی فتح سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی اور اس کے حامیوں کے وقار میں اضافہ ہو گیا جبکہ دارا شکوہ کی صف حوصلہ شکنی کا شکار ہو گئی۔ اس اثناء میں دارا ایک اور بڑی غلطی کر بیٹھا۔ اسے اپنی طاقت پر زیادہ بھروسہ تھا جس کی وجہ سے اس نے مشرقی مہم پر اپنے عمدہ اور چنیدہ فوجیوں کو بھیج دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجدھانی آگرہ اس کے، اپنے لوگوں سے تقریباً خالی ہو گئی۔ جو فوج سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں مشرق کے لیے بھیجی گئی تھی اس نے اہم کارنامے کر دکھائے۔ اس نے شجاع کے خلاف اچانک چڑھائی کر کے بنارس کے قریب فروری 1658 میں اسے شکست دے دی۔ اس کے بعد اس فوج نے بہار تک شجاع کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا، گویا کہ آگرہ میں مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا ہو۔ دھرمات کی شکست کے بعد مشرق سے فوجوں کو فوراً آگرہ واپس لوٹ آنے کا پیغام بھیجا گیا۔ چنانچہ 17 مئی 1659 کو جلد بازی میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کے بعد سلیمان شکوہ مشرقی بہار کے مقام منگیر سے آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا لیکن اورنگ زیب سے لوہا لینے کے لیے اس کا وقت پر آگرہ پہونچ پانا مشکل ہی تھا۔ دھرمات کے بعد دارا شکوہ نے اپنے حامیوں اور مددگاروں کو اکٹھا کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے جسونت سنگھ کے پاس بھی کئی پیغامات بھیجے جو کہ اس وقت تک جودھ پور واپس پہونچ چکا تھا۔ اودے پور کے رانا سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔ اس اثناء میں جسونت سنگھ، اجمیر کے قریب پشکر تک پہونچ چکا تھا۔ وہاں اس نے دارا کی فراہم کردہ رقم سے ایک بڑی فوج تیار کی اور رانا کی شرکت کا منتظر رہا۔ لیکن اس وقت تک اورنگ زیب، رانا کو سات ہزاری منصب اور 1651 میں شاہجہاں اور دارا کے ذریعے فتح کیے گئے اس کے پرگنے اسے واپس کر دینے کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ اورنگ زیب نے رانا کو نہ صرف آزادی کی ہی یقین دہانی کرائی بلکہ یہ بھی کہا کہ اسے ایسی مراعات دی جائیں گی جیسی کہ رانا سانگا کو حاصل تھیں۔ اس طرح دارا شکوہ اہم راجپوت راجاؤں کو بھی اپنا ہم نوا بنانے میں ناکام رہا۔

ساموگڑھ کی جنگ 29 مئی 1658 کو ہوئی۔ یہ دراصل پر سالاروں کی جنگی مہارت کی جنگ تھی کیونکہ دونوں طرف تعداد کے لحاظ سے پچاس تا ساٹھ ہزار کی برابر برابر فوجیں تھیں۔ اس میدان میں دارا کا اور اورنگ زیب سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا، سادات بارہ اور باڑہ راجپوت جن پر دارا کو پورا بھروسہ تھا دارا کی طرف ہی تھے لیکن جلدی میں تیار کی گئی فوج کی کمزوریوں کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ دوسری طرف اورنگ زیب کے سپاہی تجربہ کار تھے اور ان کی قیادت بھی مضبوط اور تجربہ کار ہاتھوں میں تھی۔ اورنگ زیب نے مسلسل یہی تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بیمار باپ کو دیکھنے اور لامذہب دارا شکوہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے آگرہ پہونچنا چاہتا ہے۔ لیکن اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی جنگ کو مذہبی کٹرپن اور مذہبی رواداری کے درمیان جنگ قرار دینا درست نہیں ہے۔ دونوں ہی طرف ہندو اور مسلمان سردار تقریباً

برابر کی تعداد میں تھے۔ ہم اہم راجپوت راجاؤں کے رویے کا جائزہ پہلے ہی لے چکے ہیں۔ دوسری کئی جنگوں کی طرح ہی اس جنگ میں بھی امراء نے ذاتی اغراض اور مفاد کی بنیاد پر ہی اورنگ زیب یا دارا شکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ دارا کی شکست اور اس کے راہ فرار اختیار کر جانے کے بعد آگرہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں شاہجہاں موجود تھا۔ اورنگ زیب نے قلعے کے لیے پانی کی سپلائی روک کر شاہجہاں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ شاہجہاں کو قلعے کے حرم والے حصے میں رکھا گیا۔ اگرچہ اسے کئی کڑے پہرے کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ کسی طرح کا غلط برتاؤ ہر گز نہیں کیا گیا۔ یہاں شاہجہاں آٹھ سال تک رہا اور اس کی دلعزیز بیٹی جہاں آرا نے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ جہاں آرا نے اپنی مرضی سے قلعے میں اپنے باپ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا۔ شاہجہاں کی موت کے بعد وہ پھر عوامی زندگی میں لوٹ آئی۔ اورنگ زیب نے اسے پوری عزت دی اور سلطنت کی خاتون اول کا خطاب بھی بحال کر دیا۔ اس نے اس کا سالانہ وظیفہ بھی 12 لاکھ روپے سے بڑھا کر 17 لاکھ روپے کر دیا۔

مراد کے ساتھ اورنگ زیب کے سمجھوتے کی شرطوں کے مطابق، سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کیا جانا تھا لیکن اورنگ زیب کی یہ نیت ہر گز نہیں تھی۔ اس نے دھوکے سے مراد کو قید کر دیا اور گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا۔ دو سال بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ سامو گڑھ کی لڑائی میں شکست کھا جانے کے بعد دارا بھاگ کر لاہور چلا گیا تھا جہاں وہ آس پاس کے علاقوں پر اپنی عمل داری قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن جلد ہی اورنگ زیب ایک بڑی فوج کے ساتھ لاہور کے پڑوس میں پہونچ گیا۔ دارا ہمت ہار بیٹھا۔ وہ جنگ کے بغیر ہی لاہور چھوڑ گیا اور سندھ چلا گیا۔ اس طرح اس نے اپنی تقدیر پر خود ہی آخری مہر لگا دی۔ اگرچہ خانہ جنگی مسلسل دو سال تک اور جاری رہی لیکن اس کے انجام کے بارے میں اب کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا۔ مارواڑ کے حکمران راجہ جسونت سنگھ کی دعوت پر دارا کا سندھ سے گجرات اور پھر اجمیر آنا اور پھر جسونت سنگھ کا اس کے ساتھ غداری کرنا ایسی باتیں ہیں جن سے سبھی واقف ہیں۔ مارچ 1659 میں اجمیر کے قریب دیورائی کی جنگ، اورنگ زیب کے ساتھ دارا کی آخری جنگ تھی۔ دارا بھاگ کر ایران جا سکتا تھا لیکن اس نے افغانستان میں ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ لیکن راستے میں بولان درہ میں ایک غدار افغان سردار نے اسے قیدی بنا کر اسے اس کے جانی دشمن کے حوالے کر دیا۔ قاضیوں اور مفتیوں کی جماعت نے یہ فیصلہ سنایا کہ مذہبی قانون (شریعت) اور مذہبی اعتقادات کے مفاد کے پیش نظر اور امن عامہ کو نقصان پہونچانے کی پاداش میں دارا کو زندہ نہیں رہنے دیا جا سکتا۔ اورنگ زیب نے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے کس طرح مذہب کو استعمال کیا، یہ فیصلہ اس کی ایک بین مثال ہے۔ دارا کے قتل کے دو سال بعد گڑھوال کے حکمران نے جس کے پاس دارا کے لڑکے سلیمان شکوہ نے پناہ لی ہوئی تھی اورنگ زیب کے حملے کے خوف سے اسے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ سلیمان شکوہ کا بھی وہی انجام ہوا جو کہ اس کے باپ دارا شکوہ کا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اورنگ زیب، الہ آباد کے قریب کھجوا میں شجاع کو دسمبر 1658 میں شکست دے چکا تھا۔ اس کے خلاف مزید کارروائی کی کمان میر جملہ کو سونپی گئی۔ اس نے شجاع کا اس وقت تک تعاقب کیا جب تک کہ وہ ہندوستان سے بھاگ کر اراکان نہیں پہونچ گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی بغاوت بھڑکانے کے جرم میں اراکانیوں نے اسے اور اس کے کنبے کے دوسرے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دو سال سے زائد تک جاری رہنے والی اس خانہ جنگی سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ تخت شاہی کے امیدوار نہ تو بادشاہ کے ذریعے ولی عہد کی نامزدگی کو ماننے کے لیے

تیار تھے اور نہ ہی سلطنت کی تقسیم کے لیے۔ اقتدار حاصل کرنے کا واحد وسیلہ اب فوجی طاقت تھی اور خانہ جنگیاں زیادہ تباہ کن شکلیں اختیار کرتی چلی گئیں۔

زمام سلطنت پر پکڑ مضبوط ہو جانے کے بعد اورنگ زیب نے بھائیوں کے ساتھ تادم مرگ جنگ کی مغل روایت کے سنگین نتائج کو ہلکا کرنے کی کسی حد تک کوشش کی۔ چنانچہ جہاں آراء کے کہنے پر دارا شکوہ کے لڑکے سپہر شکوہ کو 1673 میں قید سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اسے منصب بھی دیا گیا اور اورنگ زیب کی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ مراد کے بیٹے عزت بخش کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اسے بھی منصب دیا گیا اور اورنگ زیب کی ایک دوسری لڑکی کے ساتھ اس کی بھی شادی کر دی گئی۔ اس سے پہلے یعنی 1669 میں، دارا کی بیٹی جانی بیگم کی شادی اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے محمد اعظم کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ جانی بیگم کو جہان آرا نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس کے علاوہ بھی، اورنگ زیب کے کنبے اور اس کے ہاتھوں شکست خوردہ بھائیوں کے لڑکوں اور پوتے پوتیوں کے درمیان بھی کئی شادیاں ہوئیں۔ اس طرح تیسری پشت میں اورنگ زیب اور اس کے شکست خوردہ بھائیوں کے کنبے پھر سے ایک ہو گئے۔

6.3 اورنگزیب کی حکومت کا آغاز (Beginning of Aurangzeb's Reign)

6.3.1 شمالی ہندوستان (North India)

جانشینی کی جنگ کے دوران متعدد مقامی زمینداروں اور راجاؤں نے لگان کی ادائیگی روک لی تھی۔ یا مغل علاقوں اور شاہی راستوں کے بشمول اپنے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اورنگ زیب نے باقاعدہ طریقے پر تخت نشینی اختیار کرنے کے بعد ایک سخت حکومت کے دور کی ابتداء کی۔ شمال مشرق اور دکن جیسے کچھ علاقوں میں سلطنت کے علاقوں میں توسیع ہوئی لیکن اورنگ زیب نے توسیع پسندانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ بادشاہ بن جانے کے فوراً بعد اس کا سب سے پہلا کام، بادشاہ کے وقار اور اختیارات کو بحال کرانا تھا۔ اس میں ان علاقوں کی بازیابی بھی شامل تھی جو جانشینی کی جنگ کے دوران ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ مگر مغل انہیں اب بھی اپنا ہی علاقہ سمجھتے تھے۔ اورنگ زیب نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ دوسرے علاقوں کو فتح کرنے یا انہیں اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے زیر اقتدار علاقوں میں حکومت کو مستحکم کیا۔ اس نے مغل سلطنت کی اطاعت قبول کرنے کے لیے بیکانیر اپنی فوج تو بھیجی لیکن بیکانیر کو مغل سلطنت میں ضم کر لینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن بہار میں واقع بالا مؤ جیسے کچھ دوسرے مقامات کے سلسلے میں اس نے یہ کیا کہ جس حکمراں پر غداری کا الزام لگایا اسے معزول کر دیا گیا اور اس کے زیر اقتدار بڑے علاقوں کو سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ باغی بندیلا سردار چمپت رائے کا بے تحاشہ تعاقب کیا گیا۔ چمپت رائے نے پہلے اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا مگر بعد میں باغی ہو کر اس نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ لیکن بندیلیوں کے علاقوں کو سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا۔

6.3.2 شمال مشرقی اور مشرقی ہندوستان (North-East and Eastern India)

آسام کی وادی میں اہوم طاقت کے عروج، اور ایک طرف کمتا (کامروپ) کے حکمرانوں کے ساتھ اور دوسری طرف بنگال کے

افغان حکمرانوں کے ساتھ مغلوں کے ٹکراؤ کا ذکر ایک سابقہ اکائی میں کیا جا چکا ہے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں کمتا ریاست ایک طرف سے ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ پر کوچ (کوچ بہار) کی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ کوچ حکمرانوں نے شمالی بنگال اور مغربی آسام پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور اہوم حکمرانوں کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ بہر حال سترہویں صدی کے اوائل میں اندرونی جھگڑوں کے نتیجے میں یہ سلطنت بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور کوچ حکمرانوں کے اشارے پر مغل بھی آسام تک آپ پہونچے تھے۔ مغلوں نے سلطنت سے الگ ہوئے حصہ کو جیت لیا اور 1612 میں کوچ سلطنت کی فوجوں کی مدد سے مغربی آسام کی وادی میں باڑندی تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ کوچ حکمران کی حیثیت اب مغل بادشاہ کے ایک باج گزار کی ہو کر رہ گئی۔ اس طرح مغلوں کا اہوم حکمرانوں سے رابطہ قائم ہوا جن کی عملداری مشرقی آسام میں باڑندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اہوم حکمرانوں کے ساتھ ایک طویل جنگ کے بعد جو کہ شکست خوردہ خاندان کے ایک راج کمار کو اپنے یہاں پناہ بھی دے چکے تھے، مغلوں اور اہوم حکمرانوں کے درمیان 1638 میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے باڑندی کو اہوم سلطنت اور مغل سلطنت کے درمیانی سرحد مان لیا گیا۔ اس طرح گوہاٹی بھی مغلوں کے زیر تسلط آ گیا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں مغلوں اور اہوموں کے درمیان ایک طویل جنگ ہوئی۔ لڑائی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب اہوموں نے گوہاٹی اور آس پاس کے علاقوں سے مغلوں کو بے دخل کر کے اور اس طرح سارے آسام پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب نے میر جملہ کو بنگال کا حکمراں مقرر کیا تھا اور وہ کوچ بہار اور سارے آسام کو مغل سلطنت میں شامل کر کے اپنے اثرات کو بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کوچ بہار پر حملہ کیا جو اب تک مغل تابعداری ماننے سے انکار کرتا آیا تھا اور اس طرح ساری سلطنت کو مغل عملداری میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اہوم سلطنت پر حملہ کیا اور ہوم سلطنت کی راجدھانی گڑھ گاؤں پر تسلط کر لیا اور چھ ماہ تک اپنے ہی قبضے میں رکھا۔ اس کے بعد وہ اہوم سلطنت کے کافی اندر تک گھستا چلا گیا اور آخر کار اہوم بادشاہ کو 1663 میں اہانت آمیز سمجھوتے کے لیے مجبور کر دیا۔ راجا کو بھاری تاوان جنگ ادا کرنا پڑا اور سالانہ 20 ہاتھی بطور خراج دینا قبول کرنا پڑا۔ اب مغل سلطنت کی سرحدیں باڑندی سے بڑھ کر بھرایں ندی تک پھیل گئیں۔ اس شاندار فتح کے فوراً بعد ہی میر جملہ کا انتقال ہو گیا۔ آسام میں مغلوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کی افادیت مشکوک ہی رہی کیونکہ یہ خوش حال علاقہ نہیں تھا اور پہاڑوں میں رہنے والے ناگاؤں جیسے لڑاکو قبائل سے بھی گھرا ہوا تھا۔ اور یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ اہوم حکمرانوں کی طاقت کا پوری طرح سے قلع قمع نہیں ہو سکا ہے اور معاہدہ پر مکمل عمل درآمد کرانا مغلوں کی طاقت سے باہر تھا۔ 1667 میں اہوموں نے پھر لڑائی شروع کر دی۔ انہوں نے نہ صرف ہارے ہوئے تمام علاقے مغلوں سے واپس چھین لیے بلکہ گوہاٹی پر بھی قبضہ کر لیا۔ مغلوں کو کوچ بہار سے پہلے ہی بے دخل کیا جا چکا تھا۔ اس طرح میر جملہ نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا وہ سب مغلوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا تھا۔ اس کے بعد اہوموں کے ساتھ جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً 15 برسوں تک جاری رہا۔ مغل فوج کی کمان ایک طویل عرصے تک آمیر کے راجہ راجہ رام سنگھ کے ہاتھ میں رہی تھی مگر اس طویل جنگ کے لیے اس کے پاس کافی وسائل نہیں تھے۔ آخر کار مغلوں کو گوہاٹی سے ہاتھ دھونا پڑا اور اب ان کی سرحد گوہاٹی کے مغرب تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

آسام کے واقعات کے نتیجے میں وہ مشکلات ظاہر ہو گئیں جو مغلوں کو دور دراز کے علاقوں کو اپنے زیر تسلط برقرار رکھنے میں پیش

آرہی تھیں۔اس کے علاوہ اہوموں کی ثابت قدمی اور جنگی مہارت کا بھی احساس ہو گیا۔اہوم میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کے بجائے چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔دوسرے علاقوں میں بھی مغلوں کے مخالفوں نے اسی طریقہ جنگ کے ذریعے کامیابیاں حاصل کیں۔بہر حال مغل حملوں اور بعد کی طویل جنگوں کے نتیجے میں اہم بادشاہت کی طاقت کافی گھٹ گئی۔اور نیتا اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔مشرق میں دوسرے علاقوں میں مغلوں کو نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔شیواجی سے شکست کھا جانے کے بعد شائستہ خان کو میر جملہ کی جگہ پر بنگال کا حکمراں مقرر کیا گیا جو ایک بہترین منتظم اور حوصلہ مند جنرل ثابت ہوا۔اس نے میر جملہ کی توسیع پسندانہ پالیسی میں اصلاح و ترمیم کی۔سب سے پہلے اس نے کوچ بہار کے حکمران سے صلح کی۔اس کے بعد وہ جنوبی بنگال کی طرف متوجہ ہوا۔جہاں ماگھ (اراکانی) قزاقوں نے اپنے مرکز چٹاگانگ سے ڈھاکہ تک کے سارے علاقے کو تاراج کر رکھا تھا۔ڈھاکہ تک سارا علاقہ ویران ہو گیا تھا اور تجارت وصنعت کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔شائستہ خان نے اراکانی قزاقوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑا تیار کیا اور چٹاگانگ کے خلاف فوجی کارروائی کا مرکز بنانے کے لیے سون دیپ جزیرے پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد اس نے مال دولت اور دوسری باتوں کا لالچ دے کر فرنگیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔اراکانی بحری فوج کو چٹا گانگ کے پاس تباہ کر دیا گیا اور کئی جہازوں پر قبضہ کر لیا گیا۔شائستہ خان نے اس کے بعد چٹاگانگ پر حملہ کیا اور 1666 کے اوائل میں اس پر بھی قبضہ کر لیا۔اراکانی بحریہ کی تباہی کے نتیجے میں سمندری راستے سے کھلی تجارت پھر شروع ہو گئی۔اس عہد میں بنگال کی غیر ملکی تجارت میں بھاری اضافے اور مشرقی بنگال میں زراعت کی ترقی اور فروغ میں اس واقعے نے کافی اہم رول ادا کیا۔اڑیسہ میں پٹھانوں کی بغاوت کچل دی گئی اور اس طرح بالاسور بھی تجارت وکاروبار کے لیے پھر سے کھل گیا۔

6.4 بغاوتیں اور تحریکیں (Rebellions and Movements)

اندرون سلطنت بھی اورنگ زیب کو متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ان میں دکن میں مراٹھوں شمالی ہندوستان میں جاٹوں اور راجپوتوں اور شمال مغرب میں افغانوں اور سکھوں کی بغاوتیں بھی شامل تھیں۔ان میں سے چند مسائل آیسے تھے جو نئے نہیں تھے اور اورنگ زیب کے متقدمین حکمرانوں کو بھی ان کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔لیکن اورنگ زیب کے عہد میں ان مسائل کی نوعیت بدل گئی تھی۔پھر مسائل ایک دوسرے سے قطعی مختلف بھی تھے۔راجپوتوں کے سلسلے میں اصل مسئلہ جانشینی کو پیدا کردہ تھا جبکہ مراٹھوں کا معاملہ، مقامی یا علاقائی آزادی سے تعلق رکھتا تھا۔جاؤں کی بغاوت کے پس پشت کسانوں اور زمین سے متعلق معاملات کارفرما تھے۔وہ واحد ٹکراؤ جس میں مذہبی عنصر شامل تھا، سکھوں کے ساتھ تھا۔سکھوں اور جاٹوں کی تحریکوں نے آخر کار آزاد علاقائی ریاستوں کے قیام کی کوشش کی شکل اختیار کر لی۔افغانوں کی بغاوت ویسے تو قبائلی نوعیت کی تھی لیکن یہاں بھی ایک آزاد ریاست کے قیام کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔اس طرح ان تحریکوں اور مزاحمتوں میں معاشی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ علاقائی آزادی کے جذبات نے اہم رول ادا کیا۔بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ افغانوں کی بغاوت کے سوا باقی تمام تحریکیں دراصل اورنگ زیب کی مذہبی تنگ نظری کے خلاف ردعمل تھیں۔کسی ایسے ملک میں جہاں کی اکثریتی آبادی ہندو تھی، وہاں اگر کوئی ایسی تحریک اٹھے جو مسلم غلبے والی مرکزی حکومت کے خلاف ہو آسانی سے اسلام کے خلاف چیلینج کا نام دیا جا سکتا تھا۔اس طرح ان باغیانہ تحریکوں کے رہنما بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا حامی بنانے کے لیے مذہبی نعرے لگا سکتے تھے۔اس لیے ان تحریکوں کا صحیح جائزہ

لینے کے لیے کافی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

6.4.1 جاٹ اور ست نامی بغاوتیں (Jat and Satnami Rebellions)

مغل سلطنت کے خلاف سب سے پہلے دریائے جمنا کے دونوں طرف کے دلی سے آگرہ تک کے علاقے میں آباد جاٹوں نے بغاوت کی۔ان میں بیشتر کسان تھے اور معدودے چند زمیندار بھی تھے۔آپسی بھائی چارے کے جذبے اور برابری کی مضبوط بنیاد پر یہ جاٹ پہلے بھی کئی بار بغاوت کر چکے تھے اور اپنے دشوار گذار علاقوں کا فائدہ اٹھا کر حکومت سے ٹکراتے رہے تھے۔چنانچہ زمین کے لگان کی ادائیگی کے معاملے پر جاٹوں نے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد حکومت میں بھی بغاوت کی تھی۔چونکہ ڈھاکہ اور مغربی بندرگاہوں تک کا شاہی راستہ اسی علاقے سے گذرتا تھا اس لیے مغل سلطنت وں نے ان تحریکوں پر کافی سنجیدگی سے توجہ دی تھی اور سخت تدار کی اقدامات بھی کیے تھے۔1669 میں متھرا کے علاقے کے جاٹوں نے ایک مقامی زمیندار کوکلا کے جھنڈے تلے بغاوت کر دی۔بغاوت کی آگ اس علاقے کے کسانوں میں تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور آخر میں اورنگ زیب نے اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے خود دلی سے کوچ کیا۔اگرچہ باغی جاٹوں کی تعداد بڑھ کر 20 ہزار تک پہونچ گئی تھی لیکن اورنگ زیب کی منظم فوج کے آگے ان کا کوئی بس نہیں چلا خوفناک جنگ ہوئی جس میں جاٹوں کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کا سرغنہ قیدی بنا کر مار ڈالا گیا۔اس شکست کے باوجود جاٹوں کی سرکشی کو مکمل طور پر کچلا نہیں جاسکا اور ان کی بے چینی برقرار رہی۔

اس درمیان 1672 میں کسانوں اور مغل سلطنت کے درمیان نارنول میں ایک اور جنگ ہوئی۔اس مرتبہ مغلوں کے خلاف ایک مذہبی تنظیم نے جھنڈا بلند کیا۔اس تنظیم کے لوگ خود کو ست نامی کہتے تھے۔یہ ست نامی، زیادہ تر کسان دست کار اور نچلے طبقے کے لوگ تھے جنہیں اس وقت کے ایک مورخ نے سنار، بڑھئی، خاکروب، چرم ساز اور دیگر پنچ ذات والوں کا نام دیا تھا۔یہ لوگ نہ تو ذات پات کو مانتے تھے اور نہ ہی ہندو۔مسلمان کی تفریق کرتے تھے، لیکن اپنے طور و طریقہ پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ان کی بغاوت ایک مقامی افسر کے ساتھ جھگڑے کی شکل میں شروع ہوئی اور جلد ہی باقاعدہ اور کھلی بغاوت میں تبدیل ہو گئی۔ایک بار پھر بادشاہ کو بذات خود آکر اس بغاوت کو دبانا پڑا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جنگ میں مقامی ہندو زمینداروں نے جن میں بیشتر راجپوت تھے مغلوں کا ہی ساتھ دیا۔1685 میں راجہ رام کی قیادت میں جاٹوں نے دوبارہ بغاوت کر دی۔اس مرتبہ جاٹ زیادہ منظم تھے۔انہوں نے چھاپہ مار حملے کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کا طریقہ بھی اختیار کیا۔اس سرکشی کو کچلنے کے لیے اورنگ زیب نے کچھواہہ حکمران راجہ بشن سنگھ سے درخواست کی۔بشن سنگھ کو متھرا کا فوجدار مقرر کیا گیا اور سارا علاقہ زمینداری کی شکل میں اسے دے دیا گیا۔زمینداری کے حقوق کے سوال پر جاٹوں اور راجپوتوں کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ سے معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا کیونکہ بیشتر ابتدائی زمیندار یعنی اصل کاشت کار جو کہ زمین کے مالک تھے، جاٹ تھے، جبکہ لگان وصول کرنے والے درمیانی زمیندار بیشتر راجپوت تھے۔ جاٹوں نے کافی بہادری سے مزاحمت کی لیکن 1691 تک راجہ رام اور پھر اس کے جانشین چوڑا من کو ہار مان لینی پڑی۔تاہم جاٹ کسانوں میں بے چینی برقرار رہی اور ان کی لوٹ مار کی وجہ سے دلی-آگرہ شاہراہ مسافروں کے لیے غیر محفوظ ہو گئی۔بعد میں یعنی اٹھارہویں صدی میں مغلوں کی آپسی خانہ جنگی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر چوڑا من اس علاقے میں ایک علیحدہ جاٹ ریاست قائم کرنے اور راجپوت زمینداروں کی طاقت کو ختم کر دینے میں آخر کار کامیاب ہو ہی گیا۔اس طرح جو تحریک کسانوں کی

شورش کی شکل میں شروع ہوئی تھی اس کی نوعیت بالکل ہی تبدیل ہوتی چلی گئی اور ایک ایسی ریاست کی تشکیل کا باعث ثابت ہوئی جس میں جاٹوں کو حکمران طبقے کی حیثیت حاصل تھی۔

6.4.2 افغان بغاوت (Afghan Rebellion)

اورنگ زیب کو افغانوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ پنجاب اور کابل کے درمیانی علاقے میں آباد جفاکش افغان قبائل کے ساتھ ٹکراؤ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان افغانوں سے اکبر کو بھی جنگ کرنی پڑی تھی اور اس میں اسے اپنے عزیز ترین دوست اور معتمد راجہ بیربل سے محروم ہونا پڑا تھا۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں بھی ان افغانوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا۔ ان تصادموں کے اسباب کچھ تو سیاسی، معاشی اور کچھ مذہبی بھی تھے۔ ان سنگلاخ اور بنجر پہاڑی علاقوں میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے یہ افغان یا تو کاروانوں کو لوٹ لیا کرتے تھے یا پھر مغل فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ لیکن انہیں آزادی سے بھی شدید پیار تھا جس کی وجہ سے مغل فوج میں برقرار رہنا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ مغل انہیں تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات اور امداد دے کر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن آبادی میں اضافے یا کسی جاہ پسند لیڈر کے ابھرنے کی صورت میں اس بندوبست کے ختم ہو جانے کا خدشہ برابر قائم رہتا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہمیں پٹھانوں کی بغاوت میں ایک بالکل نئی شدت کا پتہ چلتا ہے۔ 1667 میں یوسف زئی قبیلے کے سردار بھاگو نے ایک شخص محمد شاہ کو بادشاہ قرار دے دیا، جس کا دعوی تھا۔ کہ وہ ایک قدیم حکمراں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور خود اس کا وزیر بن بیٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاٹوں کی طرح ہی افغانوں میں بھی اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کی خواہش پروان چڑھ رہی تھی۔ اس جدوجہد کو ایک احیاء پسند مذہبی تحریک روشنائی سے اخلاقی اور ذہنی مدد ملی۔ روشنائی تحریک میں ایک مخصوص پیر کے تئیں عقیدت اور سخت اخلاقی زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ بھاگو کی تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑتی گئی یہاں تک کہ اس کے پیروکاروں نے ہزارہ اٹک اور پیشاور جیسے اضلاع میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار شروع کر دی اور درہ خیبر سے آمدورفت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ خیبر کے راستے کو محفوظ بنانے اور اس سرکشی کو کچلنے کے لیے اورنگ زیب نے اپنے صدر بخشی امیر خان کو مامور کیا اور اس کے ساتھ راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ بھی بھیجا گیا۔ متعدد خونریز جنگوں کے بعد افغانوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا اور ان پر نظر رکھنے کے لیے مارواڑ کے حکمران مہاراجہ جسونت سنگھ کو زمرد کا فوجدار مقرر کر دیا گیا۔

1672 میں افغانوں نے پھر بغاوت کر دی۔ اس مرتبہ بغاوت کا جھنڈا آفریدی سردار اکمن خان نے بلند کیا تھا جس نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور خطبے میں اپنا نام شامل کرا کر اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اس نے مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کر کے تمام افغانوں کو اپنے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس عہد کے ایک مورخ کے مطابق اس کے پیروکاروں نے جو کہ تعداد میں چاکائی یوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ تھے درہ خیبر کے راستے کو بند کر دیا تھا۔ راستے کو صاف کرنے کے لیے امیر خان آگے بڑھا اور کافی آگے تک نکل گیا۔ لیکن ایک تنگ وادی میں اسے کراری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر خان تو جان بچا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا مگر دس ہزار لوگ کام آ گئے۔ دو کروڑ روپے سے زائد کی مالیت کا سامان اور دولت افغانوں کے ہاتھ لگی۔ مغلوں کی اس شکست کے بعد دیگر افغان قبائل بھی باغیوں کے ساتھ مل گئے۔ ان میں خوش حال خان خٹک بھی تھا جو اورنگ زیب کا کٹر دشمن تھا اور کچھ عرصے کے لیے اس کا قیدی بھی رہ چکا تھا۔ 1674 میں ایک

دیگر مغل منصب دار شجاعت خان کو بھی خیبر میں بھاری ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جلد ہی جسونت سنگھ نے راٹھور جوانوں پر مشتمل ایک بھاری کمک بھیج دی جس سے اس کی جان بچ پائی۔ آخر کار 1674 کے وسط میں اورنگ زیب خود پشاور گیا۔ وہ 1675 کے آخر تک آس پاس کے علاقوں میں ہی رہا۔ طاقت کے استعمال اور سیاسی حکمت عملی کے ذریعے رفتہ رفتہ افغانوں کے اتحاد کو ختم کر دیا گیا اور پھر امن بھی قائم ہو گیا۔ افغانوں کی شورش سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغل اقتدار کے خلاف مزاحمت اور علاقائی آزادی اور خود مختاری کے جذبات صرف ہندو طبقہ جیسے جاٹ اور مراٹھے تک ہی محدود نہیں تھے۔ افغانوں کی شورش کی وجہ سے شیواجی کے خلاف مغل دباؤ میں کمی آگئی تھی جس کے نتیجے میں 1676 تک شیواجی خود تخت نشین ہو چکا تھا اور بیجاپور اور گول کنڈہ کی سلطنتوں کے ساتھ اس کی صلح بھی ہو چکی تھی۔ دکن میں مغلوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کو آگے بڑھانا ناممکن نہیں تو مشکل یقیناً ہو گیا تھا۔

6.4.3 سکھ بغاوت (Sikh Rebellion)

اورنگ زیب کے خلاف سب سے آخر میں فوجی بغاوت سکھوں نے کی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، سکھ گروؤں کے ساتھ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی ٹکراؤ ہو چکا تھا لیکن ان تصادموں کی وجہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور ذاتی تھی۔ اب گروؤں نے شان و شوکت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا اور اپنی ایک باقاعدہ مسلح فوج بھی تیار کر لی تھی اور خود کو 'سچا پادشاہ' کہلوانے لگے تھے۔ بہر حال 1675 تک سکھ گروؤں اور اورنگ زیب کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ 1675 میں گرو تیغ بہادر کو ان کے پانچ پیروکاروں کے ساتھ پکڑ لیا گیا اور دلی لا کر قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے کے اسباب ابھی تک واضح نہیں ہو سکے ہیں۔ چند فارسی تذکروں کے مطابق گرو تیغ بہادر نے ایک پٹھان حافظ آدم کے ساتھ مل کر پنجاب میں بدامنی پیدا کر دی تھی۔ سکھ روایات کے مطابق گرو تیغ بہادر کے اپنے ہی کنبے کے کچھ لوگوں نے ان کی جانشینی کو چنوتی دی اور دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس طرح گرو تیغ بہادر کے قتل کے پیچھے ان کے کنبے کے لوگوں کی ہی سازش تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب گرو تیغ بہادر سے ناراض تھا کیونکہ انہوں نے کچھ مسلمانوں کو سکھ بنا لیا تھا اور کشمیر میں افغان گورنر کی مذہبی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان میں کون سا الزام صحیح ہے اور کون سا غلط لیکن اتنا تو واضح ہے کہ کشمیر میں کسی افغان کو اورنگزیب نے کبھی گورنر نہیں بنایا۔ سکھ مت رفتہ رفتہ جات کسانوں اور نچلی ذات کے دوسرے دستکاروں اور کاریگروں میں پھیلتا چلا گیا تھا جو کہ اس فرقے کے سادے اور برابری کے اصولوں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ تیغ بہادر نے ان طبقوں کی معاشی بدحالی کے سلسلے میں آواز اٹھائی ہو۔ کشمیر کا سابقہ گورنر، سیف خان ایک انسان دوست اور وسیع النظر حکمراں تھا جس نے انتظامی امور کے سلسلے میں ایک ہندو کو اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ نئے گورنر کے ہاتھوں مذہب کے نام پر بڑے پیمانے پر زیادتیوں کی کہانی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ پندرہویں صدی سے کشمیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ بہر حال اسباب جو بھی رہے ہوں، اورنگ زیب کا یہ اقدام ہر لحاظ سے غلط تھا اور تنگ نظری کے مترادف تھا۔

گرو تیغ بہادر کے قتل نے سکھوں کو ایک بار پھر پنجاب کے پہاڑوں کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح سکھ تحریک رفتہ رفتہ فوجی جدوجہد کی شکل اختیار کرتی گئی۔ اس سلسلے میں گرو گوبند سنگھ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے زبردست تنظیمی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

انہوں نے 1699 میں ایک فوجی برادری یا خالصہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ اس سے پہلے، پنجاب کے پہاڑوں کی ترائی میں مکھووال یا آنند پور صاحب کو اپنا مرکز بنا چکے تھے۔ شروع میں تو پہاڑی ہندو راجاؤں نے گرداوران کے پیروکاروں کو آپسی جھگڑوں میں استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی گرو گوبند سنگھ خودی کافی طاقت ور ہو گئے اور پہاڑی ہندو راجاؤں اور گرد گوبند سنگھ کے درمیان کئی معرکے ہوئے جن میں گرد گوبند سنگھ ہی فتح یاب رہے تھے۔ان لڑائیوں میں فتح اور خالصہ کے استحکام سے گرو گوبند سنگھ کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو گئے۔ گرو گوبند سنگھ اوران راجاؤں کے درمیان دوبارہ جھگڑا 1704 میں ہی بڑھا جب کئی راجاؤں نے متحد ہو کر آنند پور صاحب میں گرو گوبند سنگھ پر حملہ کر دیا تھا۔ راجاؤں کو اس میں بھی پیچھے ہٹنا پڑا اور انہوں نے گرو گوبند سنگھ کے خلاف مغلوں سے مدد مانگی۔اس طرح اس کے بعد جو جدوجہد ہوئی وہ مذہبی جدوجہد نہیں تھی۔ یہ جنگ ایک طرف تو پہاڑی ہندو راجاؤں اور سکھوں کی مقامی رقابت کا نتیجہ تھی اور دوسری طرف سکھ مت کی تحریک بھی زور پکڑ چکی تھی۔اورنگ زیب سکھ گرو کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متفکر تھا۔اور گرد کو خبردار کرنے کے لیے وہ پہلے ہی مغل فوجدار سے کہہ چکا تھا۔اس نے اب لاہور کے گورنر اور سرہند کے فوجدار وزیر خان سے گرو گوبند کے خلاف ہندو راجاؤں کی مدد کے لیے کہا۔ مغل فوجوں نے آنند پور صاحب پر حملہ کیا مگر سکھوں نے کافی بہادری سے مقابلہ کیا اوران کے سارے حملوں کو ناکام کر دیا۔اس کے بعد مغلوں اور ان کے اتحادیوں نے سکھوں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جب قلعے میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو بظاہر وزیر خان کی اس یقین دہانی پر کہ انہیں بہ حفاظت نکل جانے دیا جائے گا گرو گوبند سنگھ کو قلعے کے دروازے کھول دینے پڑے۔ لیکن جب سکھوں کی فوج طغیانی پر آئے ہوئے ایک دریا کو پار کر رہی تھی تو وزیر خان کی فوج نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ گرو کے دو بیٹے قیدی بنا لیے گئے اور جب انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سرہند میں ان کو قتل کرا دیا گیا۔ گرو کے باقی دو بیٹے بھی ایک دوسری جنگ میں کام آ گئے۔اس کے بعد گرو گوبند سنگھ تلونڈی چلے گئے جہاں انہیں پھر پریشان نہیں کیا گیا۔

اس بات میں شبہ پایا جاتا ہے کہ وزیر خان نے اورنگ زیب کے کہنے پر گرو کے بیٹوں کو قتل کیا تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب، گرو گوبند سنگھ کو بالکل ہی نہیں مٹا دینا چاہتا تھا،اور اس نے لاہور کے حکمراں کو یہ بھی لکھا تھا کہ گرو سے صلح کر لی جائے۔جب گرو گوبند سنگھ نے دکن میں اورنگ زیب کو حالات سے مطلع کیا تھا تو اورنگ زیب نے انہیں ملاقات کی دعوت بھی دی تھی۔1706 کے آخر میں گرو گوبند سنگھ،اورنگ زیب سے ملاقات کی غرض سے دکن کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ وہ راستے میں ہی تھے کہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا۔ بعض مورخین کے مطابق گرو گوبند سنگھ کو امید تھی کہ وہ آنند پور صاحب کی واپسی کے لیے. اورنگ زیب کو رضامند کر لیں گے۔اگرچہ گرو گوبند سنگھ، مغل طاقت کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہیں کر سکے تھے اور نہ ہی ایک الگ سکھ ریاست قائم کر پائے تھے لیکن ایک روایت ضرور قائم کی اور ایک ایسا ہتھیار بھی تیار کیا جس سے بعد میں اس مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بعض مخصوص حالات میں ایک مساویانہ مذہبی تحریک کو ایک زبردست سیاسی تحریک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعے علاقائی آزادی کے حصول کی طرف آگے بڑھا جا سکتا ہے۔

6.5 اورنگزیب کی راجپوت پالیسی (Aurangzeb's Rajput Policy)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح 1614 میں جہانگیر نے میواڑ کے ساتھ ایک طویل لڑائی کو سلجھایا تھا۔ جہانگیر نے اہم راجپوت راجاؤں کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے اور ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے کی اکبر کی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ شاہجہاں نے بھی راجپوت راجاؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھا۔ اس کے عہد حکومت میں راجپوتوں نے دکن اور وسطی ایشیا میں بلخ اور قندھار جیسے دور دراز علاقوں میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ تاہم کسی بھی راجپوت راجہ کو کسی صوبے کا گورنر مقرر نہیں کیا گیا اور اہم راجپوت راجاؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم نہیں کیے گئے جبکہ خود شاہجہاں ایک راٹھور شہزادی کے بطن سے ہی پیدا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے ساتھ اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہو جانے کے بعد اس طرح کے ازدواجی تعلقات کی ضرورت ہی نہیں رہی ہو گی۔ بہر حال شاہجہاں نے دو سرکردہ راجپوت گھرانوں یعنی جودھ پور اور آمیر کے سرداروں کو کافی عزت دی۔ مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ پر شاہجہاں کی خاص نظر کرم تھی۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت راجہ جسونت سنگھ اور راجہ جے سنگھ سات ہزاری منصب پر فائز تھے۔

اورنگ زیب بھی راجپوتوں کے ساتھ اتحاد اور دوستی کو کافی اہمیت دیتا تھا۔ اس نے میواڑ کے مہارانا کی سرگرم تائید حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کا منصب 5000 سے بڑھا کر 6000 کر دیا۔ اگرچہ راجہ جسونت سنگھ خود دھرمات کے مقام پر اس سے جنگ کر چکا تھا اور شجاع کے خلاف مہم کے دوران اس کا ساتھ بھی چھوڑ دیا تھا اور دارا کو بھی اپنے یہاں آنے کی دعوت دے چکا تھا اورنگ زیب نے اسے معاف کر دیا تھا اور اس کا سابقہ منصب بھی بحال کر دیا تھا۔ اسے اہم فوجی خدمات پر بھی مامور کیا گیا اور گجرات کا گورنر بھی بنایا گیا۔ جے سنگھ اپنی موت 1667 تک اورنگ زیب کا دوست اور معتمد رہا۔ 1678 کے آخر میں راجہ جسونت سنگھ کا انتقال ہو گیا جسے شمال مغرب میں افغانوں کی سرگرمیوں اور معاملات کی دیکھ بھال کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ راجہ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے اس کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مغلوں کی یہ دیرینہ روایت تھی کہ جانشینی کا تنازعہ پیدا ہو جانے کی صورت میں امن و قانون کو برقرار رکھنے کی غرض سے ریاست کو مغل انتظام میں لے لیا جاتا تھا اور جانشینی کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد جانشین کو ریاست کی حکمرانی بحال کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ 1650 میں جب جیسلمیر میں جانشینی کا تنازعہ پیدا ہو گیا تھا تو شاہجہاں نے سب سے پہلے ریاست کو خالصہ تحویل میں لے لیا تھا اور پھر بادشاہ کے منتخب شدہ جانشین کو تخت نشین کرانے کے لیے جسونت سنگھ کی سرکردگی میں فوجی دستہ بھی بھیجا تھا۔

مارواڑ کو خالصہ کے زیر انتظام لانے کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ بیشتر مغل منصب داروں کی طرح ہی مہاراجہ پر بھی ریاست کا بھاری قرضہ تھا جسے وہ واپس ادا نہیں کر سکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے راجپوت جو جسونت سنگھ سے ناراض تھے یا جن کے علاقے جسونت سنگھ کو بطور جاگیر دے دیے گئے تھے وہ جودھ پور کی خالی گدی کا فائدہ اٹھا کر گڑبڑی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اورنگ زیب کو راٹھوروں کی طرف سے مزاحمت کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ اس نے جسونت سنگھ کے کنبے اور حامیوں کی گذراوقات کے لیے مارواڑ میں دو پرگنے دے دیے تھے۔ اس نے اپنے احکام کی تعمیل کے لیے ایک بھاری فوج جمع کی اور اجمیر پہونچ گیا۔ جسونت سنگھ کی پٹ رانی رانی ہاڑی، جودھ پور کو راٹھوروں کا وطن

سمجھتے ہوئے اسے مغلوں کے حوالے کرنے کے خلاف تھی لیکن مغل فوج کے سامنے اسے بھی ہار ماننی پڑی۔ اس کے بعد جسونت سنگھ کے خزانے کی تلاش شروع کر دی گئی۔ سارے مارواڑ میں مغل افسروں کا تقرر کر دیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ 'نئے' مندر یا تو گرا دیے جائیں یا بند کر دیے جائیں۔ مارواڑ کے ساتھ دشمن ملک جیسا سلوک کیا۔ اس طرز عمل کو درست قرار دینا بہت مشکل ہے۔ بعض جدید مورخین کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ اورنگ زیب مارواڑ کے علاقے پر اس لیے اپنا کنٹرول رکھنا چاہتا تھا کہ یہ علاقہ دلی کو گجرات کی بندرگاہوں سے جوڑنے کی وجہ سے جنگی اہمیت رکھتا تھا۔ جسونت سنگھ کی موت کے بعد لاہور میں اس کی دو رانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے جانشینی کے حق پر کافی زور دیا گیا لیکن اورنگ زیب نے دہلی لوٹنے سے پہلے ہی 36 لاکھ روپے جانشینی محصول کے بدلے میں جودھ پور کے ٹیکے کا حق جسونت سنگھ کے بڑے بھائی امر سنگھ کے پوتے اندر سنگھ کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غالباً اورنگ زیب کا خیال یہ رہا ہوگا کہ شاہجہاں نے امر سنگھ کے چھوٹے بھائی جسونت سنگھ کو ٹیکے کا حق دے کر اور امر سنگھ کے حق کو نظرانداز کر کے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اورنگ زیب مارواڑ میں کسی کم سن (نابالغ) کا انتظام نہ چاہتا ہو۔ بعض جدید تاریخ نویسوں کی رائے کے مطابق، اورنگ زیب نے مرحوم جسونت سنگھ کے بیٹے جیت سنگھ کو اس شرط پر جودھ پور دے دینے کی پیش کش کی تھی کہ اسے مسلمان ہونا پڑے گا لیکن اس عہد کے تاریخی شواہد سے اس طرح کی کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عہد کی ایک راجستھانی تصنیف 'حکومت ری بہی' کے مطابق اجیت سنگھ جب آگرہ کے دربار میں پہونچا تو اورنگ زیب اسے منصب دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مارواڑ کے دو پرگنوں سوجت اور جے تارن اس کی جاگیر کے بطور برقرار رہیں گے۔ گویا اس طرح اورنگ زیب مارواڑ کو دو خاندانوں کے درمیان تقسیم کر دینے پر غور و خوض کر رہا تھا۔

درگاداس کی قیادت میں راٹھور سرداروں نے اورنگ زیب کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات ریاست کے مفاد کے خلاف تھی۔ راٹھور سرداروں کے اس فیصلے سے اورنگ زیب برہم ہو گیا اور یہ حکم دیا کہ راج کماروں اور ان کی ماؤں کو نورگڑھ کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔ اس سے راٹھور سرداروں میں مزید بے چینی پھیل گئی اور وہ کافی بھاری لڑائی کے بعد اجیت سنگھ کے ساتھ آگرہ کے قلعے دھام سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے جودھپور میں بڑی دھوم دھام سے اجیت سنگھ کی تاجپوشی کی۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ اورنگ زیب اس حقیقت کو باوقار طریقے پر تسلیم کر لیتا کہ اندر سنگھ کو راٹھوروں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ اس نے اندر سنگھ کو نااہلیت کی بناء پر الگ تو کر دیا، لیکن اجیت سنگھ کی گدی نشینی کو غلط قرار دے کر اس کے تئیں بہت سخت رویہ اپنایا۔ سلطنت کے تمام علاقوں سے فوجوں کو بلا کر اورنگ زیب ایک بار پھر اجمیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راٹھور اورنگ زیب کی اس بھاری فوج کا مقابلہ نہیں کر سکے اور جودھ پور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ درگاداس، اجیت سنگھ کے ساتھ بھاگ کر میواڑ پہنچا جہاں سے رانا نے انہیں کسی خفیہ مقام پر پہنچا دیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب میواڑ نے اجیت سنگھ کا ساتھ دے کر جنگ میں حصہ لیا۔ رانا راج سنگھ پہلے اورنگ زیب کا حامی تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔ اس نے رانی ہاڑی کے دعوے کی حمایت و تائید کرنے کے لیے اپنے ایک معتمد خاص کی سرکردگی میں 5000 فوجیوں کا ایک دستہ بھی جودھ پور بھیجا۔ وہ راجپوتوں کے اندرونی معاملات، خاص طور پر جانشینی جیسے معاملات میں مغلوں کی دخل اندازی کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی ناراض تھا کہ مغلوں نے اس کی ریاست کی جنوب اور مغربی سرحدوں سے لگی ریاستیں جیسے ڈونگر پور اور بانسواڑہ کو میواڑ سے کاٹ کر الگ

اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت دینے کی کوشش کی تھی جو کبھی اس کی باج گزار رہ چکی تھیں۔ لیکن فوری وجہ یہی تھی کہ رانا مارواڑ پر مغلوں کے قبضے اور اورنگ زیب کے ذریعے اجیت سنگھ کے دعوے کے ٹھکرائے جانے سے برہم ہوا اٹھا تھا۔

پہلا حملہ اورنگ زیب نے کیا۔ نومبر 1679 میں اس نے میواڑ پر چڑھائی کی۔ مغلوں کا ایک طاقت ور دستہ ادے پور پہونچ گیا اور اس نے رانا کے پڑاؤ پر بھی حملہ کر دیا جو کہ پہاڑیوں میں مغلوں پر پریشان کن حملے کرنے کے لیے روپوش ہو چکا تھا۔ بہر حال جنگ میں جلد ہی تعطل پیدا ہو گیا۔ مغل نہ تو پہاڑی علاقوں میں گھس سکتے تھے اور نہ ہی راجپوتوں کے چھاپہ مار حملوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اسی اثناء میں اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ اکبر نے صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے باپ کے خلاف مہم چھیڑ دی۔ راٹھور سردار درگاداس کے ساتھ مل کر اس نے جنوری 1681 میں اجمیر پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت کچھ لاچار سا تھا کیونکہ اس وقت اس کے ساری جنگجو افواج کہیں اور مصروف پیکار تھی۔ اورنگ زیب کی اس کمزوری کے باوجود شہزادہ اکبر نے تاخیر کر دی اور اورنگ زیب جعلی خطوط بھیج کر اس کے سرداروں کے درمیان نفاق پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اکبر کو مہاراشٹر کی طرف بھاگنا پڑا اور اورنگ زیب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اورنگ زیب کے لیے میواڑ کی مہم پہلے جیسی اہم نہیں رہی تھی۔ اس نے اس اثناء میں رانا جگت سنگھ سے صلح کر لی۔ نئے رانا کو جزیہ کی جگہ پر اپنے کچھ پرگنہ دینے پڑے اور وفاداری بنائے رکھنے اور اجیت سنگھ کو کوئی مدد نہ دینے کی شرط پر اسے پانچ ہزاری منصب بھی دے دیا گیا۔ اجیت سنگھ کے سلسلے میں اورنگ زیب نے صرف یہ وعدہ کیا کہ اس کے بالغ ہو جانے پر اس کا منصب اور راج بحال کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ اور اجیت سنگھ کے سلسلہ میں کرائی گئی اس یقین دہانی سے کوئی بھی راجپوت مطمئن نہیں ہوا۔

مغلوں نے مارواڑ پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اور 1698 تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا جبکہ آخر کار اجیت سنگھ کو مارواڑ کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن مغلوں نے جودھپور پر اپنی گرفت کو ڈھیلا نہیں کیا۔ اپنے پرگنے مغلوں کے حوالے کیے جانے پر خود میواڑ کا گھرانہ بھی بھی غیر مطمئن تھا۔ 1707 میں اورنگ زیب کی موت تک اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مارواڑ اور میواڑ کے سلسلہ میں اورنگ زیب نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہیں تھی اور اس کی اس پالیسی سے مغلوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ان ریاستوں کے خلاف مغل مہم کی ناکامی سے مغلوں کے فوجی وقار کو بھی دھکا پہونچا۔ یہ درست ہے کہ 1681 کے بعد میواڑ کی جنگ میں مغلوں کی طرف سے چھوٹی فوجوں نے نہ ہی حصہ لیا اور ان کے کوئی فوجی نتائج بھی نہیں تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ پہاڑی کچھواہا اور دوسرے راجپوت فوجی دستے اور سردار مغلوں کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن اورنگ زیب کی مارواڑ پالیسی کے نتائج کا اندازہ صرف ان چند باتوں کی بنیاد پر ہی نہیں کیا جانا چاہیے۔ مارواڑ اور میواڑ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے ایک نازک زمانے میں راجپوتوں کے ساتھ مغلوں کے تعلقات کمزور پڑ گئے۔ خاص بات تو یہ ہوئی کہ اپنے خاص اور پرانے اتحادیوں کی تائید و مدد کے سلسلے میں مغلوں کا کردار ہی مشکوک ہو گیا۔ اگرچہ اورنگ زیب کی اس پالیسی سے اس کی سخت گیر فطرت اور ضد کا پتہ چلتا ہے لیکن اس سے یہ ہر گز ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہندو مذہب کو زیر کر دینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس پر الزام لگایا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ 1679 کے بعد کے زمانے میں مراٹھوں کو بڑی تعداد میں منصب دیے گئے۔ جہاں شمال مشرقی علاقوں کے حکمرانوں، جاٹوں، افغانوں اور راجپوتوں کے ساتھ اورنگزیب کی جنگوں کے نتیجے میں مغل سلطنت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن اصل لڑائی کا

میدان دکن تھا۔

6.6 اورنگ زیب کی دکن پالیسی (Aurangzeb's Deccan Policy)

دکن کی ریاستوں کے ساتھ اورنگ زیب کے تعلقات کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ 1068 تک کا ہے جس کے دوران مغلوں کا اہم مقصد احمد نگر کے ان علاقوں کو بیجاپور سے واپس لینا تھا جو 1636 کے معاہدے کی رو سے بیجاپور کو ملے تھے۔ دوسرا مرحلہ 1684 تک جاری رہا جس کے دوران دکن میں سب سے بڑا خطرہ مراٹھوں کو سمجھا گیا اور مغلوں نے شیواجی اور بعد میں اس کے بیٹے سامبھاجی کے خلاف کارروائی میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی مغلوں نے دکنی ریاستوں کے علاقوں پر چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے اور انہیں مکمل طور پر اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی۔ ان تعلقات کا آخری مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام ہو جانے پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو مکمل طور پر اپنے زیر تسلط لانے کا فیصلہ کیا۔ شاہ جہاں نے مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے 1636 کے معاہدے کے ذریعے احمد نگر کا ایک تہائی حصہ انہیں بطور رشوت دینے کے ساتھ ساتھ یہ عہد بھی کیا تھا کہ وہ کبھی بھی بیجاپور اور گولکنڈہ پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کو خود شاہجہاں ہی نے ترک کر دیا تھا۔ 58-1657 میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو نیست و نابود کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ گولکنڈہ کو بہت بڑا ہرجانہ ادا کرنا پڑا اور بیجاپور کو وہ نظام شاہی علاقے واپس کرنے پڑے جو اسے 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل ہوئے تھے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ان دونوں ریاستوں نے کرناٹک کے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے اور چونکہ یہ دونوں ریاستیں مغل سلطنت کی باج گزار ہیں اس لیے انہیں معاوضہ ادا کرنا چاہیے اور یہ کہ مغل فوجوں کی چشم پوشی کے نتیجے میں ہی انہیں یہ فتوحات حاصل ہو سکی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ دکن میں مغل فوج کا خرچ بہت زیادہ تھا اور مغلوں کے ماتحت دکنی علاقوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ناکافی رہتی تھی۔ یہ اخراجات کافی عرصے تک مالوہ اور گجرات کے خزانے سے بھی پورے کیے جاتے رہے تھے۔ دکن میں محدود پیمانے کی پیش قدمی کی پالیسی کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو نہ تو شاہجہاں ہی بخوبی سمجھ پایا تھا اور نہ ہیا ورنگ زیب۔ اس سے ایک طرف تو مغلوں کے معاہدوں اور وعدوں پر سے ہمیشہ کے لیے اعتماد اٹھ گیا اور دوسرے مغل حکمران، مراٹھوں کے خلاف دوسری طاقتوں کو بھی متحد نہیں کر سکے۔ اورنگ زیب نے اس پالیسی کی کامیابی کے لیے 25 برسوں تک مسلسل کوشش کی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔

6.6.1 پہلا مرحلہ (First Stage, 1658–68)

تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اورنگ زیب کو دکن کے سلسلے میں دو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مسئلہ تھا اور دوسرا مسئلہ بیجاپور کی ریاست کو اس بات کے لیے راضی کرنے کا تھا کہ وہ 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل علاقے مغلوں کو واپس کر دے۔ 1657 میں کلیانی اور بیدر کو واپس لے لیا گیا تھا اور 1660 میں رشوت دے کر پرندا بھی حاصل کیا جا چکا تھا۔ لیکن شولاپور کی واپسی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے شیواجی اور عادل شاہ کو سزا دینے کے لیے راجہ جے سنگھ کو دکن بھیجا۔ اس سے

ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کو اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ تھا اور وہ دشمن کی طاقت کو کم سمجھتا تھا۔ لیکن راجہ جے سنگھ ایک مشاق سیاست باز تھا۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا کہ ان دونوں بے وقوفوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا نادانی ہوگی۔ بہر حال جے سنگھ وہ واحد مغل سیاست داں تھا جس نے اس زمانے میں دکن میں بھرپور پیش قدمی کی تائید کی تھی۔ جے سنگھ کا خیال تھا کہ دکن میں بھرپور حملے کی پالیسی اپنائے بغیر مراٹھوں کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ اورنگ زیب اس نتیجے پر پورے 20 سال بعد پہونچ پایا تھا۔ جے سنگھ نے بیجاپور کے خلاف فوجی تیاریوں کے دوران اورنگ زیب کو لکھا تھا 'بیجاپور پر فتح پورے دکن اور کرناٹک پر فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی' لیکن اورنگ زیب اتنا جرات مندانہ قدم اٹھانے سے کترا رہا تھا۔ ہم اس کے اس رویے کے اسباب کے بارے میں صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غالباً اس وقت ایرانی حکمران، ہند کے شمال مغربی علاقوں پر منڈرا رہا تھا، جس سے شمال مغرب کو خطرہ لاحق تھا۔ پھر یہ کہ دکن کی مہم کافی طویل اور دشوار بھی ثابت ہوسکتی تھی اور خود بادشاہ کی موجودگی کی بھی نوبت آسکتی تھی، کیونکہ اتنی بڑی فوج کسی سردار یا آرزومند شہزادے کی کمان میں زیادہ عرصے کے لیے ہرگز نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ اس بات کا تلخ تجربہ شاہجہاں کو تو ہو ہی چکا تھا اور شاہجہاں کے زندہ رہتے اورنگ زیب کسی دور کی مہم پر خود کیسے جاسکتا تھا؟ اس مہم کے نتیجے میں دکن کی تمام ریاستیں، مغل سلطنت کے خلاف متحد ہوگئیں اور قطب شاہ نے بیجاپور کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج بھی بھیجی۔ دکنی ریاستوں نے چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اپناتے ہوئے جے سنگھ کو بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے راغب کیا جبکہ دیہاتی علاقوں میں دھان کی فصلوں کو خود ہی برباد بھی کرتے گئے تاکہ مغلوں کو ان علاقوں میں کسی طرح کی رسد نہ حاصل ہوسکے۔ اب جے سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شہر پر حملہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایسی بڑی توپیں لایا ہی نہیں تھا جو کسی شہر کی فصیل توڑ سکتی تھیں اور اس طرح شہر کا محاصرہ بھی ناممکن تھا۔ پیچھے ہٹنا بھی بہت مہنگا ثابت ہوا۔ نہ تو کسی طرح دولت ہی ہاتھ آئی اور نہ ہی کوئی علاقہ ہاتھ آیا۔ اس مایوسی اور اورنگ زیب کی ناراضگی کی وجہ سے جلد ہی 1667 میں راجہ جے سنگھ کی موت ہوگئی۔ اگلے سال میں مغل رشوت کے ذریعے شولاپور کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح پہلا مرحلہ تمام ہوا۔

6.6.2 دوسرا مرحلہ (Second Stage, 1668–84)

1668 تا 1670 کی درمیانی مدت میں مغل دکن میں پیش قدمی کرنے کے موقعہ کا انتظار کرتے رہے۔ اس عرصے میں گولکنڈہ کی سیاست میں ایک نیا عصر مدنا اور اکھنا کی ابھرتی ہوئی طاقت تھی۔ گولکنڈہ پر 1672 سے 1687 تک دراصل ان دونوں زیرک بھائیوں نے ہی حکومت کی۔ ان دونوں بھائیوں نے گولکنڈہ بیجاپور اور شیواجی کو ملا کر ایک سہ فریقی طاقت قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال یہ کوشش بیجاپور کے اندرونی خلفشار اور شیواجی کی از حد آرزومندی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکی۔ پھر یہ کہ بیجاپور کے مختلف طبقات سے یہ امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی مستقل پالیسی پر کاربند رہ سکیں گے۔ وہ اپنی فوری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق کبھی تو مغلوں کا ساتھ دیتے اور کبھی ان کے خلاف ہو جاتے تھے۔ شیواجی بھی کبھی بیجاپور کو لوٹتا اور کبھی مغلوں کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دیتا۔ اگرچہ اورنگ زیب مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن میں مغلوں کی محدود پیش قدمی کے حق میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بیجاپور کی گدی پر ایسے حکمران کو بٹھانے کی بارہا کوشش کی جو شیواجی کے خلاف مغلوں کے ساتھ تعاون کر سکتا ہو اور گولکنڈہ

کے زیر اثر نہ ہو۔اس پالیسی کے تحت مغلوں نے بیجاپور کے معاملات میں کئی بار مداخلت کی جن کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مغلوں کی سیاسی اور فوجی کوششوں کا ایک ہی نتیجہ ہوااور وہ یہ کہ اس طرح دکن کی تینوں ریاستوں کو ان کے خلاف متحد ہو جانے کا موقع مل گیا۔ مغل گورنر دلیر خان کی بیجاپور پر قبضے کی آخری کوشش 80-1679 بھی ناکام رہی۔اس ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغل گورنر کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ وہ دکن کی ریاستوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کر سکتا۔اس کے علاوہ اس جنگ میں کرناٹک کی پیادہ فوج نے بھی اہم رول ادا کیا۔ بیجاپور کی مدد کے لیے وراڈ کے حکمران پریم نایک نے 30000 فوجی بھیجے تھے تاکہ وہ مغل فوج کے محاصرے کا مقابلہ کر سکے۔ بیجاپور کی مدد کے لیے شیواجی نے بھی ایک بھاری فوج بھیجی تھی اور مغل علاقوں پر چاروں طرف سے حملے شروع کر دیتے تھے۔اس طرح دلیر خان کو بے نیل مرام واپس لوٹا پڑا بلکہ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اب مراٹھوں کے حملے کے لیے مغل علاقوں کے دروازے پوری طرح کھل گئے۔اورنگ زیب نے دلیر خان کو واپس بلا لیا۔

6.6.3 تیسرا مرحلہ (Third Stage, 1684–87)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 1676 اور 1680 کے درمیان مغلوں کو دکن میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔اورنگ زیب 1681 میں اپنے باقی بیٹے شہزادہ اکبر کا تعاقب کرتا ہوا دکن پہونچا۔اس نے اپنی ساری طاقت شیواجی کے بیٹے اور جانشین سامبھاجی کے خلاف لگاری اور اس کے ساتھ ہی بیجاپور اور گولکنڈہ کو مراٹھوں کا ساتھ چھوڑ دینے کے لیے رضامند کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ لیکن اس کی ان کوششوں کا بھی وہی انجام ہوا جو اس سے پہلے مغل گورنروں کی کوششوں کا ہوا تھا۔ صرف مراٹھنا ہی مغلوں کی طاقت کے خلاف ڈھال بن سکتے تھے اور دکن کی ریاستیں اس ڈھال سے محروم ہونے کے لیے ہر گز تیار نہیں تھیں۔اورنگ زیب نے اب ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے باج گزار کے طور پر عادل شاہ کو یہ حکم دیا کہ وہ مغل فوج کے لیے رسد فراہم کرے، مغل فوجوں کو اپنے علاقوں سے آزادانہ طور پر گزرنے دے اور مراٹھوں کے خلاف جنگ کے لیے 5000 سے 6000 گھڑ سوار فوج بھی دے۔اس نے مغلوں کی مخالفت کرنے والے ایک اہم بیجاپوری امیر شرزہ خان کو برخاست کرنے کی بھی مانگ کی۔ایسی صورت میں عادل شاہ اور مغلوں کا اختلاف کھل کر سامنے آنا لازمی تھا۔عادل شاہ نے گولکنڈہ اور سامبھاجی یعنی دونوں ہی سے مدد کی درخواست کی اور اسے یہ مدد فوراً ہی حاصل بھی ہو گئی۔تاہم دکنی ریاستوں کی یہ مشترکہ فوج بھی مغل طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکی، خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ مغل فوجوں کی کمان خود شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی۔تب بھی مغلوں کو اپنا محاصرہ 18 مہینوں تک جاری رکھنا پڑا اور اس محاصرہ کے آخری مرحلوں تک فوج کی کمان اورنگ زیب نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی۔آخر کار 1686 میں بیجاپور نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ جتنی مشکل سے یہ مغل مہم کامیاب ہو پائی،اس سے 1665 میں جے سنگھ اور 1679-80 میں دلیر خان کی مہموں کی ناکامی کے اسباب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بیجاپور کی شکست کے بعد گولکنڈہ پر مغلوں کا حملہ لازمی تھا۔قطب شاہ کے گناہ اتنے زیادہ تھے کہ انہیں کسی طور معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس نے غیر مسلموں مدنا اور اکھنا کو بے مہار اختیارات دے رکھے تھے اور کئی موقعوں پر شیواجی کی بھی مدد کر چکا تھا۔اس کی غداری کا تازہ واقعہ یہ تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی تنبیہہ کے باوجود 40000 سپاہیوں سے بیجاپور کی مدد کی تھی۔1686 میں بھاری مزاحمت کے باوجود مغل فوجیں گولکنڈہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں

۔ بھاری تاوان جنگ، کچھ علاقوں اور مدنا اور اکھنا بھائیوں کے ہٹانے کے عوض میں اورنگ زیب قطب شاہ کو معافی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ قطب شاہ بھی یہ شرطیں مان لینے کے لیے تیار ہو گیا اور مدنا اور اکھنا کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ لیکن یہ بھی قطب شاہی حکومت کو نہیں بچا سکا۔ اورنگ زیب اپنی اس مہم میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کا خاتمہ، دراصل اس کے لیے نئی مشکلات کا نقطہ آغاز تھا۔ اب اورنگ زیب کی زندگی کا سب سے اہم اور آخری دور شروع ہوا۔

6.6.4 اورنگ زیب اور مراٹھا (Aurangzeb and the Marathas)

بیجاپور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ زیب نے اپنی ساری طاقت، مراٹھوں کے خلاف لگادی۔ 1689 میں اپنے خفیہ ٹھکانے سنگ میشور پر مغلوں کے ایک اچانک حملے سے سامبھانی ششدر رہ گیا۔ اسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا اور باغی اور کافر قرار دے کر اسے قتل کر دیا گیا۔ بلاشبہ یہ اورنگ زیب کی ایک دوسری بھاری سیاسی غلطی تھی۔ وہ مراٹھوں کے ساتھ سمجھوتا کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ پر اپنی فتح کو مستقل شکل دے سکتا تھا۔ اس نے سامبھاجی کو قتل کر کے نہ صرف یہ کہ اس بات کا موقع کھو دیا بلکہ اس طرح مراٹھوں کے لیے جواز بھی پیدا کر دیا۔ کسی ایک جھنڈے تلے اکٹھے نہ ہونے کی وجہ سے مراٹھے سردار مغل علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے لیے آزاد تھے اور مغل فوج کے آنے پر ادھر ادھر غائب ہو جاتے تھے۔ اورنگ زیب نے مراٹھوں کو ختم کر دینے کے بجائے اس نے انہیں سارے دکن میں اپنی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کا موقع دے دیا۔ سامبھاجی کے چھوٹے بھائی، راجہ رام کی تخت نشینی تو عمل میں آئی، لیکن راجدھانی پر مغلوں کے حملے کی وجہ سے اسے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ راجہ رام نے مشرقی ساحل پر واقع بینجی میں پناہ لی۔ وہیں سے مغلوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس طرح مراٹھوں کی مزاحمت اب مغرب سے مشرقی ساحل تک پھیل گئی۔ بہر حال اس وقت اورنگ زیب اپنے تمام مخالفوں اور دشمنوں کو ختم کر کے اپنے اقتدار کے نقطہ عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اس کے بعض امراء کا خیال یہ تھا کہ اسے اب شمالی ہند واپس لوٹ جانا چاہیے اور مراٹھوں کی سرکوبی کا کام دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایک ایسا حلقہ، جسے ولی عہد شاہ عالم کی بھی تائید حاصل تھی، یہ رائے دے چکا تھا کہ کرناٹک کی ریاست کا بندوبست گولکنڈہ اور بیجاپور کے ماتحت حکمرانوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اورنگ زیب نے ان تمام تجویزوں کو مسترد کر دیا اور دکن کے حکمرانوں سے براہ راست بات چیت شروع کرنے کے جرم میں شاہ عالم کو قید کر دیا۔ یہ سمجھ کر کہ 1690 کے بعد مراٹھوں کی طاقت کا قلع قمع ہو چکا ہے، اورنگ زیب نے اپنی ساری توجہ کرناٹک کے وسیع اور خوش حال علاقوں پر قبضے کی طرف مبذول کی۔ لیکن ان سارے علاقوں پر کنٹرول قائم رکھنا اورنگ زیب کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ جیسی مفتوحہ ریاستوں میں انتظام اور بندوبست کو نظر انداز کر کے، دور دراز کے علاقوں تک بلا ضرورت مواصلاتی بندوبست مجموعی طور پر اچھی طرح کیا گیا مگر بیجاپور کے مراٹھا شورش والے علاقے انتشار اور ابتری کے شکار رہے۔

1690 سے 1703 تک کی درمیانی مدت میں اورنگ زیب، مراٹھوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہ کرنے کی ضد پر ہی قائم رہا۔ تیجی میں راجہ رام کا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہ محاصرہ کافی طول کھینچ گیا۔ 1698 میں بیجی بھی فتح ہو گیا لیکن اصل شکار یعنی راجہ رام نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مراٹھوں کی مزاحمت میں اور شدت آگئی اور کئی موقعوں پر مغلوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مراٹھوں نے اپنے کئی قلعے

واپس لے لیے اور راجہ رام بھی ستارا واپس لوٹ آنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان ناکامیوں سے اورنگ زیب کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور اس نے مراٹھوں کے تمام قلعوں پر دوبارہ قبضے کی ٹھان لی۔ 1700 سے 1705 تک کے ساڑھے پانچ سال کے سارے عرصے میں اورنگ زیب اپنے مریض اور تھکے ہوئے جسم کو محاصروں کے سلسلے میں ایک قلعے سے دوسرے قلعے تک ڈھوتا رہا۔ طغیانیوں بیماریوں اور مراٹھوں کے چھاپہ مار حملوں سے مغل فوجوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مغل امراء اور فوج میں تکان اور بے چینی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ ان کے حوصلوں میں بھی کمی آتی گئی اور متعدد جاگیرداروں نے مراٹھوں کے ساتھ خفیہ معاہدے بھی کر لیے اور اس شرط پر چوتھ دینا بھی مان لیا کہ مراٹھے ان کی جاگیروں میں گڑبڑی نہیں کریں گے۔ 1703 میں اورنگ زیب نے مراٹھوں کے ساتھ بات چیت شروع کی وہ سامبھاجی کے بیٹے شاہو کو رہا کرنے کے لیے تیار ہو گیا جو ستارا میں اپنی ماں کے ساتھ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ شاہو کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا۔ اسے راجہ کا خطاب اور 7000 ہزاری منصب دیا گیا۔ بڑا ہونے پر اس کی شادی معزز مراٹھا خاندانوں کی دو لڑکیوں کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ اورنگ زیب، شاہو کو شیواجی کا سوراجیہ اور دکن میں سردیش مکھی کا حق دینے اور اس طرح اس کی مخصوص حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ شاہو کا استقبال کرنے کے لیے 70 سے زائد مراٹھا سردار بھی جمع ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر اورنگ زیب کو مراٹھوں کے اصل عزائم کے بارے میں شک ہو گیا اور اس نے ان تمام تیاریوں کو منسوخ کر دیا۔ 1706 میں اورنگ زیب کو یقین ہو گیا کہ مراٹھوں کے سارے قلعوں پر قبضہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ اورنگ آباد کی طرف واپس ہونا شروع کر دیا جبکہ راستے میں مراٹھوں کے حملے بھی جاری رہے۔ اس طرح 1707 میں اورنگ آباد میں اورنگ زیب نے جب آخری سانسیں لیں تو وہ اپنے پیچھے ایک ایسی سلطنت چھوڑ گیا جو بالکل کمزور ہو چکی تھی اور جس میں مختلف قسم کے مسائل سر اٹھانے لگے تھے۔

6.7 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی (Aurangzeb's Religious Policy)

اورنگ زیب نے تقریباً پچاس برس حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کی توسیع نقطہ عروج کو پہونچ گئی۔ دور عروج میں مغل سلطنت شمال میں کشمیر سے جنوب میں جنجی تک اور مغرب میں کوہ ہندوکش سے مشرق میں چٹاگانگ تک وسیع ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب بہت ہی جفاکش حکمران تھا اور حکومت کے معاملے میں نہ تو خود کو بخشتا تھا اور نہ ہی اپنے کسی ماتحت افسر اور عامل کو۔ اس کے رقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حکومت کے سارے معاملات پر کافی گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ نظم و ضبط کا سخت پابند تھا اور اس معاملے میں اپنے لڑکوں کے ساتھ بھی کسی طرح کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ 1686 میں اس نے اپنے لڑکے شہزادہ معظم کو گول کنڈا کے حکمران کے ساتھ ساز باز کے الزام میں گرفتار کر کے 12 برس تک قید میں رکھا تھا۔ متعدد موقعوں پر اس کے دوسرے بیٹوں کو بھی اس کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اس کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اس کی عمر کے آخری دنوں میں بھی شہزادہ معظم کو جو کہ اس وقت کابل کا گورنر تھا جب کبھی بھی اپنے باپ کا کوئی رقعہ موصول ہوتا تھا تو وہ خوف سے کانپ اٹھتا تھا۔ اورنگ زیب کو اپنے اسلاف کے برخلاف دکھاوے یا ظاہرداری کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ ذاتی طور پر بھی بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لوگ اسے مذہب پسند اور خداترس مسلم حکمراں کے طور پر جانتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ ایک زندہ پیر سمجھا جانے لگا تھا۔ بحیثیت ایک حکمران کے اورنگ زیب کی کامیابیوں کے بارے میں مورخین میں کافی اختلاف

رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو بالکل الٹ دیا تھا جس کی وجہ سے مغل سلطنت نے تئیں ہندوؤں کی وفاداری میں کمی آگئی تھی۔ان مورخین کی رائے کے مطابق اورنگ زیب کی مذہبی نارواداری کی پالیسی کے نتیجے میں کئی بغاوتیں ہوئیں جس سے سلطنت کی طاقت کو کافی نقصان پہونچا۔ وہ کافی شکی بھی تھا جس کی وجہ سے بھی اس کی مشکلات میں کافی اضافہ ہوا۔ خفی خان کے مطابق اس کے منصوبے کافی لمبے ہوتے تھے اور انجام کار اس کے بیشتر منصوبے ناکام ہو جاتے تھے۔ کچھ دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کے سلسلے میں رائے ظاہر کرتے وقت انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ان مورخین کے مطابق اورنگ زیب کے معتقدین کی نرم پالیسیوں کے نتیجے میں ہی مغل سلطنت کے تئیں ہندوؤں کی وفاداری ختم ہوئی تھی اور اورنگ زیب کے سامنے سخت اقدامات کرنے اور مسلمانوں کی مکمل تائید و مدد حاصل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کیونکہ آخر کار مسلمانوں کی تائید پر ہی مغل سلطنت کی بقاء کا انحصار تھا۔

بہر کیف حال کی کچھ تصنیفات میں اورنگ زیب کے بارے میں ایک نیا رجحان ابھرا ہے جس میں اس کی مذہبی اور سیاسی پالیسیوں کا اس زمانہ کے سماجی معاشی حالات کے پس منظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب مذہبی اعتقادات کے معاملے میں بہت. سخت تھا۔اسے فلسفیانہ بحث ومباحثےاور تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، حالانکہ اس نے اپنے لڑکوں کو اس مسلک پر چلنے سے نہیں روکا اور وہ خود بھی صوفیوں کے پاس دعا کے لیے جایا کرتا تھا۔ فقہ حنفی کے تئیں مکمل طور پر پابند رہنے کے باوجود بھی جو کہ کافی پہلے سے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر رائج تھا،اس نے سیکولر (غیر مذہبی) فرمان جاری کرنے میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کیا۔ان فرمانوں کو ضوابط کہا جاتا تھا۔اس کے ان فرمانوں کو ضوابط عالم گیری کے نام سے مدون کیا جاچکا ہے۔اصولی اور نظریاتی طور پر یہ ضوابط بھی دراصل شریعت کا ہی تکملہ ہوتے تھے۔ عملی طور پر مخصوص حالات کے پیش نظر ان ضوابط کے ذریعہ شرعی قوانین میں اکثر اصلاح کی جاتی تھی کیونکہ کچھ ہندوستانی موجودہ حالات ایسے بھی تھے جن کے تقاضے شریعت میں موجود نہیں تھے۔

اورنگ زیب قدامت پرست مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکمران بھی تھا۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی۔ سلطنت کی بیشتر آبادی ہندو ہے جو کہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملے میں کافی پختہ ہیں۔ایسی کوئی بھی پالیسی جس کے نتیجے میں ہندو خاص طور پر طاقت ور ہندو راجہ اور زمیندار مخالف ہو جائیں، قطعی ناقابل عمل تھی۔اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اخلاقی اور مذہبی ضوابط کو مد نظر رکھنا ہوگا۔اپنے عہد حکومت کے شروع میں ہی اورنگ زیب نے سکوں پر کلمہ کندہ کرانا بند کر دیا تاکہ پیروں کے نیچے آکر ان کی بے حرمتی نہ ہو یا لین دین میں گندے نہ ہو جائیں۔اس نے نوروز کی تقریب بھی بند کرادی کیونکہ اسے زرتشتی فرقے کا تہوار مانا جاتا تھا اور اس کی ایران کے صفوی بادشاہوں نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ تمام صوبوں میں محتسب مقرر کیے گئے جن کے ذمے اس بات کی نگرانی تھی کہ لوگ شریعت کے مطابق رہتے ہیں یا نہیں۔ یہ افسران اس بات پر بھی نظر رکھتے تھے کہ عوامی مقامات پر شراب یا بھنگ جیسی نشہ آور چیزوں کا استعمال تو نہیں ہو رہا ہے۔ان لوگوں پر طوائف خانوں، جوئے خانوں اور ناپ تول کی نگرانی کی بھی ذمہ داری ہوتی تھی دوسرے لفظوں میں محتسبوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے لوگ شریعت اور ضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی نہ کر سکیں۔

محتسبوں کے تقرر کی شکل میں اورنگ زیب نے دراصل اس بات پر زور دیا کہ شہریوں کی اخلاقی اصلاح کی ذمہ داری حکومت پر ہے لیکن ان افسروں کو یہ واضح ہدایت تھی کہ وہ لوگوں کے نجی معاملات اور نجی زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہ کریں۔ بعد میں یعنی اپنی حکومت کے گیارہویں سال (1669) میں اورنگ زیب نے ایسے کچھ اقدامت کیے جنہیں قدامت پرستانہ اقدامات قرار دیا جاتا ہے حالانکہ ان میں سے کچھ اقدامات محض معاشی اور سماجی اصلاح کے طور پر کیے گئے تھے اور جن کا اصل مقصد توہم پرستی کو ختم کرنا تھا۔ اورنگ زیب نے دربار میں موسیقی پر پابندی لگادی اور سرکاری موسیقاروں کو پینشن دے دی گئی۔ اس کے باوجود سازوں اور نوبت کو باقی رکھا گیا۔ حرم کی خواتین اور امراء کی بیگمات نے موسیقی کی سرپرستی کو جاری رکھا۔ ایک اہم بات جس کا پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے، یہ ہے کہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے موضوع پر فارسی میں سب سے زیادہ کتابیں اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی ہیں اور خود اورنگ زیب بھی دینا بجانے میں ماہر تھا۔ اس لیے احتجاجی موسیقاروں سے اورنگ زیب کا یہ کہنا کہ موسیقی کے جنازے کو اتنی گہرائی میں دفن کرنا کہ اس کی بازگشت پھر نہ سنائی دے سکے 'صرف غصے کے عالم میں کہی ہوئی ایک بات تھی۔ اورنگ زیب نے جھروکہ درشن کی روایت کو بھی ختم کردیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ محض ایک توہم پرستی اور اسلام مخالف بات تھی۔ اسی طرح اس نے بادشاہ کو اس کے یوم پیدائش کے موقع پر سونے چاندی یا دوسری قیمتی اشیاء میں تولنے کے سلسلے کو بھی بند کردیا۔ یہ روایت اکبر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور ایک کثیر العام روایت بن چکی تھی۔ اس سے چھوٹے امراء پر کافی بوجھ پڑتا تھا۔ لیکن اس کے حق میں رائے عامہ کا اتنا دباؤ تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے بیٹوں کی صحت یابی پر یہ رسم انجام دینے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ اورنگ زیب نے جیوتشیوں کے زائچہ تیار کرنے کے کام پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن خود اس کے خاندان کے لوگوں کے بشمول بیشتر لوگوں نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جیوتشیوں سے رابطہ قائم ہی رکھا۔

اسی طرح کے کچھ دوسرے فرمان بھی جاری کیے گئے۔ ان میں سے کچھ فرامین تو اخلاقی نوعیت رکھتے تھے اور کچھ کا تعلق کفایت شعاری قائم کرنے سے تھا۔ دربار کی، جہاں تخت رکھا جاتا تھا، سجاوٹ بہت سادگی اور ارزان طریقہ سے ہوتی تھی۔ منشیوں کو چاندی کی دوات کی جگہ پر مٹی کی بنی دواتیں دی گئیں۔ ریشمی کپڑوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور دیوان عام میں سونے کی ریکنگ کی جگہ پر لاجورد کی ریکنگ لگائی گئی جس پر سونے کی ملمع کاری کی گئی تھی۔ معاشی پہلو کے مدنظر تاریخ نویسی کے سرکاری دفتر کو بھی بند کردیا گیا۔ ان مسلمانوں میں جو کہ مکمل طور پر ریاست کی مدد پر انحصار کرتے تھے تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے کے لیے اورنگ زیب نے سب سے پہلے مسلمان تاجروں کے محصول کو ختم کردیا۔ لیکن اسے جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ مسلمان تاجر اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور حکومت کو دھوکہ دینے کے لیے ہندو تاجروں کی اشیاء کو بھی اپنی اشیاء بتا رہے ہیں۔ اس لیے اورنگ زیب نے مسلمانوں پر یہ محصول پھر لگادیا لیکن دوسروں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے اس کی شرح نصف کردی گئی تھی۔ اسی طرح اس نے پیشکاروں اور کروڑیوں (چھوٹے درجے کے مالیاتی افسروں) کے عہدے صرف مسلمانوں کے لیے محفوظ کردینے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی امراء کی مخالفت نیر قابل مسلمانوں کی کی وجہ سے اس فرمان کو بھی واپس لینا پڑا۔ اب ہم اورنگ زیب کے چند ان دوسرے اقدامات کا جائزہ لیں گے جن کی بنیاد پر اسے متعصبی اور دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے تئیں امتیازی رویہ اختیار کرنے والا حکمراں کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اقدام مندروں کے تئیں اس کا رویہ اور جزیہ

کا نفاذ ہے۔اور نگ زیب نے زمام حکومت سنبھالتے ہی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے مندروں، یہودیوں کے عبادت خانوں، عیسائیوں کے گرجاگھروں وغیرہ کے بارے میں شریعت کے موقف کی ہی تائید کرتا ہے یعنی یہ کہ قدیم مندروں کو منہدم نہیں کرانا چاہیے لیکن مندروں کی تعمیر کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی۔مزید یہ کہ چونکہ عمارتیں دوامی نہیں ہوتیں۔اس لیے پرانی عبادت گاہوں کی مرمت کی اجازت دی جاسکتی تھی۔اور نگ زیب کی اس پالیسی کا مشاہدہ بنارس (وارانسی) اور ورندابن (متھرا) وغیرہ جیسے مقامات کے برہمنوں کے نام جاری کیے گئے فرامین سے کیا جاسکتا ہے۔

مندروں کے سلسلے میں اورنگ زیب کے یہ فرامین کوئی نئی بات نہیں تھی۔ان فرمانوں کے ذریعے دراصل اس پالیسی کا ہی احیاء کیا گیا تھا: جو عہد سلطنت میں بھی اپنائی جاچکی تھی اور جن پر شاہجہاں نے بھی اپنے عہد حکومت کے شروع میں عمل کیا تھا۔ عملاً مقامی افسروں کو کافی چھوٹ تھی کہ وہ الفاظ 'قدیم مندروں' کی وضاحت کس طرح کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں بادشاہ کے ذاتی خیالات اور جذبات سے افسروں کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔مثال کے طور پر جب شاہجہاں کے مرغوب اور مذہبی رواداری کے علمبردار داراشکوہ کا عروج ہوا تو بادشاہ کے مندروں سے متعلق فرمان کے باوجود بہت کم مندر توڑے گئے۔دوسری طرف اورنگ زیب نے گجرات کا صوبہ دار ہونے کی حیثیت سے کئی مندروں کو منہدم کرنے یا تعمیر کرنے کا حکم دیا۔اس میں سوم ناتھ کا مندر بھی شامل تھا جسے اب بحال کر دیا گیا ہے۔جب اورنگ زیب بادشاہ بنا اور یہ دیکھا کہ مندروں میں مورتیوں کو بحال کر دیا گیا ہے اور ان میں پوجا پاٹھ بھی شروع ہو گئی ہے، تو اس نے 1665 میں ان مندروں کو پھر تباہ کر دینے کا حکم دیا۔اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت کے شروع میں نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگانے کا جو حکم جاری کیا تھا،اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی حکومت کی ابتداء ہی سے مندروں کو بڑے پیمانے پر توڑا گیا۔چونکہ اورنگ زیب کو مراٹھا، جاٹ، اور دوسرے لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا اس لیے اس نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔چنانچہ اس نے مقامی لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں تنبیہ اور عبرت کے طور پر ہندوؤں کے قدیم مندروں کو منہدم کرانا اب جائز سمجھ لیا۔اس کے علاوہ یہ بھی کہ اب اس نے ان مندروں کو ایسے تخریبی افکار کی تبلیغ کا مرکز سمجھنا شروع کر دیا تھا جو قدامت پرست عناصر کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ چنانچہ 1669 میں جب اسے یہ علم ہوا کہ ٹھٹھہ، ملتان اور خاص طور پر بنارس کے مندروں میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی برہمنوں سے حصول علم کے لیے دور دور سے آتے ہیں تو اس نے مندروں کے خلاف کڑی کارروائی کی۔اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لیے تمام صوبوں کے حکمراں وں کے نام فرمان جاری کیا اور یہ کہا کہ جن مندروں میں ایسا ہوتا ہے انہیں منہدم کر دیا جائے۔ان احکامات کے تحت ہی بنارس (وارانسی) میں وشوانا تھ مندر کو، اور جہانگیر کے عہد میں متھرا میں ویر سنگھ دیو بندیل کے ذریعہ تعمیر کردہ کیشورائے جیسے مشہور مندروں کو تباہ کر دیا گیا۔اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ان مندروں کو منہدم کرنے کے پس پشت سیاسی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ معاصر عالم گیری کے مصنف مستعد خان نے متھرا کے کیشورائے مندر کے گرائے جانے کے بارے میں لکھا ہے 'بادشاہ کی زبردست قوت ارادی اور خدا میں اس کے پختہ یقین کو دیکھ کر، خوددار راجے بھونچکارہ گئے تھے اور اچنبھے میں اس طرح کھڑے رہے جیسے دیواروں کی طرف منہ کیے ہوئے مجسمہ کھڑے ہوں۔' اسی پس منظر میں دس بارہ برسوں میں اڑیسہ میں جو کئی مندر تعمیر ہوئے تھے انہیں منہدم کر دیا گیا۔ لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مندروں کو منہدم کرانے کے لیے

کوئی عام حکم جاری کیا گیا تھا۔ بہر حال جنگ کے زمانے میں یہ ہوتا تھا۔ چنانچہ 80-1669 کے دوران، جبکہ میواڑ کے راٹھور حکمرانوں اور اودے پور کے رانا کے ساتھ جنگ چل رہی تھی، راجپوتوں کے علاقے میں اودے پور اور جودھ پور اور آس پاس کے پرگنوں کے متعدد قدیم مندروں کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔

پروفیسر سید عزیز الدین حسین کے مطابق مندروں کے سلسلے میں اپنی پالیسی میں اورنگ زیب نے شریعت سے تجاوز کیا تھا، اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کسی قدیم مندر یا عبادت گاہ کو توڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس معاملے میں اس کے رویے سے اس کے اسلاف کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو دھکا پہونچا۔ اس رویے کے نتیجے میں یہ تصور پیدا ہو گیا کہ کسی بھی بہانے سے مندروں کو توڑنے کی کارروائی کو بادشاہ نہ صرف درگزر کر دے گا بلکہ وہ اس اقدام کا استقبال کرے گا۔ اگرچہ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ اورنگ زیب نے ہندو مندروں اور مٹھوں کو عطیات دیے تھے مگر مجموعی طور پر ہندو مندروں کے تئیں اورنگ زیب نے جو پالیسی اپنائی تھی اس کے نتیجے میں ہندوؤں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1679 کے بعد مندروں کو توڑنے کے اورنگ زیب کے جوش میں کافی کمی آگئی تھی۔ کیونکہ 1681 سے 1707 میں اس کی موت تک کے زمانے میں دکن میں مندروں کو توڑے جانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس اثناء میں بے چینی کے ایک دوسرے عنصر یعنی جزیہ کو پھر سے نافذ کر دیا گیا۔ شرع کے مطابق کسی بھی مسلم ریاست میں غیر مسلموں کو جزیہ محصول کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔ اکبر نے بعض اسباب کے تحت جزیہ کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن کٹر مذہبی علماء کا ایک طبقہ جزیہ کے پھر سے نفاذ پر زور دیتا رہا تھا تاکہ سب پر یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ہندوستان میں اسلام اور ان علماء کو برتری حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد جزیہ کو پھر سے نافذ کرنے کا کئی بار سوچا لیکن سیاسی مخالفت کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ آخر کار 1679 میں یعنی اپنی حکومت کے بائیسویں سال میں اس نے جزیہ کو دوبارہ نافذ کر دیا۔

اورنگ زیب کے اس اقدام کے بارے میں مورخین میں کافی بحث و مباحثہ ہے۔ سب سے پہلے ہم دیکھیں گے کہ جزیہ کیا نہیں تھا؟ اول تو اس کا مقصد قبول اسلام کے لیے ہندوؤں پر معاشی دباؤ ڈالنا ہرگز نہیں تھا کیونکہ ایک تو یہ بہت کم لوگوں پر نافذ ہوتا تھا۔ عورتیں، بچے، معذور افراد، نادار لوگ جن کی آمدنی بہت ناکافی تھی اور سرکاری ملازمین اس سے مستثنیٰ تھے اور نہ ہی حقیقت میں جزیے کی وجہ سے ہندوؤں کے کسی خاص گروہ یا طبقے نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے یہ کہ یہ محصول کسی شکل اقتصادی مسئلے کو حل کرنے کے مقصد سے بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ جزیے سے کافی بڑی آمدنی حاصل تھی، لیکن اورنگ زیب نے کئی ٹیکسوں کو جنہیں ابواب کہا جاتا تھا ختم بھی کر دیا تھا جو شرع کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے غیر قانونی تھے۔ دراصل جزیہ کے دوبارہ نفاذ کی وجہ سیاسی اور نظریاتی تھی۔ اس کا مقصد بر سر جنگ راجپوتوں اور مراٹھوں کے مقابلے پر مسلمانوں کو متحد کرنا تھا۔ اور غالباً یہ جزیہ ایک طرح سے دکن کی ان مسلم ریاستوں، خاص طور پر گول کنڈا کے خلاف بھی تھا جو کہ غیر مسلموں کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ جزیے کی وصولی ایماندار اور خدا ترس مسلمانوں کے ذریعے ہی کرائی جاتی تھی جو خاص طور پر اس کام کے لیے مامور کیے جاتے تھے اور ساری آمدنی علماء کے مصارف میں استعمال ہوتی تھی۔ گویا اس طرح اس رقم کو مذہبی رہنماؤں یعنی علماء کو جن میں سے بیشتر بے روزگار ہی ہوتے تھے ایک بڑی رشوت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بہر حال، جزیہ کے

نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ تھے۔ ہندوؤں میں اس پر کافی برہمی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ کھلا ہوا امتیازی سلوک تھا۔ اس کی وصولی کا طریقہ بھی کچھ مخصوص قسم کا تھا۔ جزیہ والے کو یہ محصول ذاتی طور پر جمع کرانا پڑتا تھا اور بعض اوقات مذہبی رہنماؤں (علماء) کے ہاتھوں انہیں اہانت بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ دیہاتوں میں جزیہ کی وصولی چونکہ لگان کے ساتھ ہی کی جاتی تھی۔ اس لیے اس طریقہ کار سے شہری علاقوں کے متمول ہندو زیادہ متاثر تھے۔ اس لیے ہم ایسے کئی واقعات کے بارے میں سنتے ہیں جہاں شہری علاقوں کے ہندو تاجروں نے جزیہ کے خلاف کئی بار ہڑتالیں کیں۔ اس معاملے میں بدعنوانی بھی کافی ہوتی تھی۔ اور جزیہ وصول کرنے والے کئی امین تو مار بھی ڈالے گئے۔ لیکن ان تمام باتوں سے بھی اورنگ زیب ہرگز متاثر نہیں ہوا اور کسانوں کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے سے انکار کر دیا جبکہ قدرتی آفات کے زمانے میں کسانوں کو لگان کی ادائیگی کے سلسلے میں رعایت دی جاتی تھی۔ آخر میں اس کو دکن میں جنگ کے دوران 1705 (جس کا اختتام نظر نہیں آرہا تھا) جزیہ کی وصولی کو روکنا پڑا تھا۔ لیکن اس کا یہ اقدام مراٹھوں کے ساتھ گفت وشنید کو متاثر نہیں کر سکا بلکہ رفتہ رفتہ یہ جزیہ پورے ملک میں ہی ختم ہوتا چلا گیا اور اسے 1712 میں باقاعدہ طور پر ختم کر دیا گیا۔

بعض جدید مورخین کا خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب کے ان اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو دارالحرب سے دارالاسلام میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اورنگ زیب غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کو جائز سمجھتا تھا لیکن ہندوؤں کو بڑے پیمانے پر اور جبریہ مسلمان بنانے کے شواہد نہیں ملتے۔ اسی طرح نہ ہی ہندو امراء کے خلاف بھی کوئی تفریقی سلوک کیا جاتا تھا۔ حال کے ایک مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے نصف آخر میں اعلیٰ مرتبے کے ہندو جاگیرداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مراٹھوں کے بشمول ان کا تناسب ایک تہائی تک پہنچ گیا جبکہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں اعلیٰ طبقہ کے ہندو امراء کا تناسب ایک چوتھائی تھا۔ ایک دفعہ ایک ایسی درخواست پر جس میں کسی عہدے پر مذہبی بنیاد پر تقرر کی گذارش کی گئی تھی، اورنگ زیب نے یہ لکھا تھا کہ 'دنیاوی امور میں مذہب کا کیا کام اور مذہبی امور میں مذہبی جانبداری یعنی تعصب کا کیا واسطہ ؟ تمہارا مذہب تمہارے لیے ہے اور میرا مذہب میرے لیے ہے۔ اگر تمہارے سمجھائے گئے قاعدے کو میں مان لوں تو ایسی صورت میں سبھی (ہندو) راجاؤں اور ان کے پیروکاروں کو ختم کر دینا مجھے پر فرض ہو جائے گا۔' اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ اورنگ زیب نے ریاست کی ہیئت کو بدل ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس نے بنیادی اسلامی عناصر پر یقیناً زور دیا۔ لیکن اورنگ زیب کے اپنے مذہبی عقائد کو اس کی سیاسی پالیسیوں کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے کے ناطے اسلامی قوانین پر سختی سے عمل درآمد پر یقین رکھتا تھا، لیکن ایک حکمران (بادشاہ) کی حیثیت سے اورنگ زیب کی ساری دلچسپی اپنی سلطنت کی توسیع اور اس کے استحکام میں تھی۔ چنانچہ جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا وہ ہندوؤں کی تائید سے ہرگز محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ بارہا اس کے مذہبی اعتقادات وتصورات اور اس کی سیاسی اور عوامی پالیسیوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آئی اور اسے صحیح فیصلہ کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور جن سے سلطنت کو نقصان ہوا۔

6.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد ہم نے معلوم کیا کہ سترہویں صدی میں ہندوستان میں مغل سلطنت اورنگزیب کے عہد حکومت میں اپنے عروج پر پہنچی اور اس کے ساتھ ہی اتنی بڑی سلطنت کے سنبھالنے کے مسائل بھی ابھرنے لگے۔اس دور میں متعدد بغاوتیں جیسے جاٹ،راجپوت اور افغان اور مذہبی تحریکیں جیسے سکھ اور ست نامی وغیرہ ابھریں۔کچھ مورخین نے ان بغاوتوں اور تحریکوں کے ابھرنے کے پیچھے اورنگزیب کو ذمے دار ٹھہرایا۔ان کے مطابق اورنگزیب نے غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا،ان پر جزیہ عاید کیا،مندروں کو تباہ کیا اور جبری تبدیلی مذہب کرائی۔ویسے اس طرح کے واقعات اورنگزیب کے دور میں پیش آئے جن سے تعصب جھلکتا تھا،مگر یہ اس کی کوئی مقررہ پالیسی نہیں تھی۔شرع پر عمل کو لے کر اس کی ہر کوشش ناکام ہی ہوئی جسے اس کے مسلمان عوام اور امراء نے ہی قبول نہیں کیا۔اس نے ہندوؤں کو بڑی تعداد میں منصب داری نظام میں داخل کیا اور یہاں تک کہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو بڑے صوبوں اور مہموں پر متعین کیا۔مندروں کو توڑنے کے حوالوں کے ساتھ ان کو دیے جانے والے عطیات کی بھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔غالباً جنگی حالت میں دشمن علاقے میں مندر توڑنے کے واقعات سامنے آئے تاکہ سامنے والے کو عاجز ثابت کیا جاسکے۔عام طور پر حالت امن میں مندر توڑے جانے کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔دوسری طرف متعدد افسران بھی اپنی طرف سے ایسی متعصبانہ کاروائیاں کرتے تھے جیسے وزیر خان نے سکھ گرو کا قتل کیا۔اورنگزیب کی طرف سے کسی ایسے حکم نامے کا تذکرہ نہیں ملتا۔پھر بھی یہ کاروائیاں شریعت کے خلاف تھیں اور شریعت کی آڑ لے کر کی گئیں جس کی بدترین مثال داراشکوہ کا قتل تھی۔اورنگزیب شریعت کا ذاتی زندگی میں پابند ضرور تھا لیکن اگر اسے اپنی سیاست کے لیے شرعی حد توڑنا پڑتی تو وہ دریغ نہیں کرتا تھا۔باپ کی زندگی میں تخت نشین ہونا اس کی صرف ایک مثال تھا۔تیرتھ یاترا محصول کا ذکر شریعت کی کسی کتاب میں نہیں تھا مگر اسے مغل خزانے کو بھرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔اسی طرح جزیہ کی ادائیگی صرف جمہور کے ذریعے منتخب شدہ خلیفہ کے ذریعے کی جاسکتی تھی جب کہ سلطنت کا ادارہ تو بذات خود شرع کے خلاف تھا تو ایک سلطان یا شہنشاہ کیسے جزیہ عائد کر سکتا تھا۔

اورنگزیب کی راجپوت پالیسی بھی اس کے خلاف پڑی کیونکہ اس سے اسے غیر ضروری راجپوت جھگڑوں میں الجھنا پڑا۔اس میں مذہبی عنصر تلاشنا بے وقوفی ہوگی کیونکہ راجپوتوں کی اصل ناراضگی کی وجہ مراٹھوں کو منصب داری نظام میں شامل کیا جانا تھا جو کہ ان کے مطابق کمتر درجے کے تھے۔اسی طرح دکن کی طویل مہمات سے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔دکنی ریاستوں کے خاتمے سے درمیانی حد فاصل (buffer zone) بھی ختم ہوگئی اور مغلوں کو مراٹھوں کے چھاپہ مار حملوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی دکنی افواج تو عادی تھیں مگر مغلوں کی توپ بردار فوج کے لیے یہ بے حد خطرناک اور مہنگا ثابت ہوا۔علاوہ ازیں دکن میں مصروفیت نے شمال میں مغل انتظامیہ میں بدنظمی پیدا کردی تھی جس کے پیچھے اہم محرک مذہب نہ ہو کر اجارہ داری یا زمین کی مالگزاری ٹھیکے پر دینے کا رواج تھا۔اکبر کے ضبطی نظام کی جگ اجارہ داری پھیلنے سے کسانوں پر مالگزاری کا بوجھ کافی بڑھ گیا اور وہ بغاوت پر اتر آتے تھے۔اس طرح اورنگزیب کے بعد کسی طاقتور مغل شہنشاہ کی غیر موجودگی اور امراء کی گروہ بندی سے سلطنت کا مرکزی ڈھانچہ ٹوٹنے لگا اور متعدد خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔

6.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

درمیانی حد فاصل : (Buffer Zone) وہ علاقہ جو دو ریاستوں کے درمیان پڑتا تھا۔

جزیہ : اسلامی مملکت میں غیر مسلموں سے ان کی جان مال کی حفاظت کے لیے لیا جانے والا محصول، اس کے عوض وہ فوجی خدمات سے آزاد تھے جو مسلمانوں پر ضروری تھی۔ ساتھ ہی برہمنوں، بوڑھوں، نادار اور کمزوروں سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔

اہوم : آسام میں رہنے والی ایک قوم

6.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

6.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ساموگڑھ کی فیصلہ کن جنگ (1658) میں اورنگزیب نے کسے شکست دی؟

(الف) شجاع (ب) مراد (ج) دارا شکوہ (د) سلیمان شکوہ

2. اورنگزیب نے غیر مسلموں پر جزیہ کب دوبارہ نافذ کیا؟

(الف) 1658 (ب) 1669 (ج) 1679 (د) 1686

3. سکھوں کے نویں گرو، جنہیں اورنگزیب کے دور میں قتل کیا گیا، کون تھے؟

(الف) گرو گوبند سنگھ (ب) گرو تیغ بہادر (ج) گرو ارجن دیو (د) گرو رام داس

4. اورنگزیب نے بیجاپور کو مغل سلطنت میں کب شامل کیا؟

(الف) 1686 (ب) 1687 (ج) 1689 (د) 1707

5. جاٹوں نے 1669 میں کس کی قیادت میں بغاوت کی؟

(الف) راجہ رام (ب) چوڑامن (ج) گوکلا (د) سورج مل

6.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جاٹ اور ست نامی بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
2. افغان بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
3. سکھ بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
4. اورنگزیب اور شواجی کے بعد مراٹھوں سے جنگوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

6.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جانشینی کی جنگ پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. اورنگزیب کی مذہبی پالیسی کے حوالے سے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔
3. اورنگزیب کی دکن مہمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

جوابات:1-(ج),2-(ج),3-(ب),4-(الف),5-(ج)

اکائی 7۔ مراٹھوں کا عروج

(Rise of the Marathas)

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		پس منظر
7.3		مراٹھا سلطنت کے قیام کے اسباب
	7.3.1	شیواجی اور ان کی ابتدائی فتوحات
	7.3.2	سلطنت کا استحکام اور تاجپوشی
	7.3.3	شیواجی کے جانشین اور ان کے اختلافات
7.4		پیشواؤں کا عروج
	7.4.1	عروج کے اسباب
	7.4.2	بالاجی وشوناتھ
	7.4.3	باجی راؤاوّل
	7.4.4	بالاجی باجی راؤ
7.5		اکتسابی نتائج
7.6		کلیدی الفاظ
7.7		نمونہ امتحانی سوالات
	7.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	7.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	7.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات

7.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی تاریخ میں مراٹھا سلطنت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مغلوں کے زوال نے جو سیاسی خلا پیدا کیا تھا اس کو پُر کرنے کی ان میں صلاحیت بھی تھی اور حالات بھی موافق تھے۔ مراٹھا ریاست کا بانی شیواجی ایک فاتح مدبر اور عمدہ منتظم تھا۔ پیشواؤں کے دور میں مراٹھوں کو عروج حاصل ہوا اور شمالی ہند تک گھوڑے دوڑاتے رہے۔ جنوب میں میسور، حیدرآباد اور ان کے حکمرانوں کے ساتھ ان کے ٹکراؤں نے صورتِ حال پیچیدہ بنادی تھی۔ بالآخر 1761 میں افغان حکمران احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں ان کی طاقت توڑ دی۔ حالانکہ اس کے بعد یہ پھر اُٹھ کھڑے ہوئے مگر پورے ملک پہ حکومت کرنے کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مراٹھا سلطنت کے قیام کے اسباب اور حالات کو سمجھ سکیں گے۔
- شیواجی کی زندگی اور ان کی فتوحات سے واقف ہو جائیں گے۔
- دیگر ہمعصر طاقتوں کے ساتھ مراٹھوں کی جدوجہد کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مراٹھا طاقت کے زوال میں کارفرما عناصر کی نشان دہی کر سکیں گے۔

7.2 پس منظر (Background)

مغلوں کی مرکزی حکومت میں پیدا مختلف کمزوریوں نے علاقائی ریاستوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ مراٹھوں کے عروج میں بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ جن میں دکن کی جغرافیائی کیفیت، وہاں کے باشندوں کی جفاکشی، جنوب کا سماجی تانا بانا جہاں ذات پات کا نظام شمالی ہند کی طرف سخت نہیں تھا اور دیگر ریاستوں میں امرا اور حکمرانوں کی گروہ بندیاں اہم ہیں۔ ان حالات میں شیواجی اور بعد میں پیشواؤں کی باصلاحیت قیادت نے ایک مضبوط اور منظم ریاست قائم کی۔

7.3 مراٹھا ریاست کے قیام کے اسباب (Causes for the Establishment of the Maratha State)

مراٹھا طاقت کا عروج نہ تو کسی ایک شخص کی کوششوں کا مرہون منت تھا اور نہ ہی کسی خاص موقع پر پیدا کسی عارضی صورت حال کی دین تھا۔ درحقیقت ان کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے میں کوئی ایسے عوامل و عناصر تھے جو اپنی ذات میں مستقل تھے۔ ہم ایک ایک کر کے ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

1. مہاراشٹر کی جغرافیائی صورت حال: مہاراشٹر کا بڑا حصہ پٹھاری ہے۔ یہاں محفوظ اور بہتر طریقہ سے زندگی گذارنے کے لیے قدرت سے سخت جدوجہد کرنا پڑتی ہے جس کے سبب یہاں کے رہنے والے محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں باہر سے حملہ

کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ایک بڑی حملہ آور فوج کو یہاں بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔یہی نہیں دفاع کے نقطہ نظر سے یہاں بہت سی آسانیاں موجود تھیں ۔اس علاقہ میں آسانی سے پہاڑی قلعے بنائے جاسکتے تھے جس کو فتح کرنا مشکل ہوتااور ان کی حفاظت آسان ہوتی۔پھر یہ علاقہ ملک کے وسط میں تھا یعنی شمال و جنوب کے درمیان واقع تھا۔اس سبب سے یہاں کے رہنے والے دونوں طرف پھیل سکتے تھے۔

2. آریہ جنوبی ہند میں کبھی مکمل تسلط حاصل نہیں کرسکے۔نتیجتاً یہاں دراوڑاور آریوں کی نسلی آمیزش میں بڑی موافقت پائی جاتی ہے۔ یہاں کے باشندوں میں دونوں کی خوبیاں موجود ہیں۔یہاں لگان کا نظام رعیت واری رہا جس کے سبب معمولی کسان بھی زمین پر مالکانہ حق رکھتا تھااور اس سے محبت کرتا تھا۔یہاں معاشی غیر برابری بھی ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں کم تھی۔تجارت پیشہ افراد کے علاوہ یہاں مالدار قوتوں کی تعداد بہت کم تھی۔چنانچہ معاشی استحصال بھی یہاں کم تھا۔مراٹھوں کے دور انتظام میں بھی مختلف علوم وفنون میں بہت ترقی نہیں ہوئی جس کا ایک سبب غربت بھی تھی۔عوام سادہ زندگی گذارتے تھے۔خود پیشواؤں کے رہائشی محل معمولی اور بے ڈھنگے پن سے بنے ہوتے۔ان کے سادہ طرز زندگی نے انہیں اس عیش وآرام سے بچائے رکھا جس کے سبب شمالی ہند میں کھوکھلا پن پیدا ہو چکا تھا۔اس علاقہ کے لوگ ذات و برادری کے اس دقیانوسی و پیچیدہ نظام میں اتنی سختی سے بندھے ہوئے نہیں تھی جو شمالی ہندوستان کا خاصہ تھا۔یہاں برہمن اور شور بھی ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے جس کی مثال کسی دوسرے علاقہ میں آسانی سے نہیں ملے گی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے سماجی و مذہبی مصلحین نے ایکتا کے اس ڈور کو اور مضبوط کردیا تھا۔یہ تحریکیں کسی ایک طبقہ ومذہب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں بلکہ عوامی تھیں۔ایکناتھ، نکارام،رام داس جیسے مصلحین کے ذریعہ چلائی گئیں تحریکیں،ذات پات اور اونچ نیچ کے زبردست مخالف تھے جس کے سبب سماج میں ایکتا کے جذبات پیدا ہوئے۔

3. زبان کی اہمیت: مراٹھی زبان بول چال کے اعتبار سے سادہ اور سہل تھی، لیکن مراٹھی ادب کی ترقی اٹھارویں صدی سے پہلے نہیں ہو سکی۔زبان کی سادگی نے ہی یہاں کے باشندوں کو قریب لانے کا کام کیا۔

4. جنوب میں ہندواور مسلم طاقتوں میں توازن قائم تھا۔دونوں میں سماجی اور معاشرتی ہم آہنگی قائم تھی۔شمالی ہند کے مقابلہ میں یہاں یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔

7.3.1 شیواجی اوران کی ابتدائی فتوحات (Shivaji and His Early Conquests)

مراٹھا ریاست کے بانی شیواجی کا تعلق بھونسلہ نسل سے تھا۔ان کے اجداد احمد نگر کے نظام شاہی سلطان کے ماتحت گاؤں کے مکھیارہ چکے تھے۔20اپریل1627 کو شونیر کے قلعہ میں شیواجی کی پیدائش ہوئی۔اس وقت ان کے باپ شاہ جی بھونسلے بیجاپور کے دربار سے منسلک اہم جاگیردار تھے۔شاہ جی بھونسلے نے دوسری عورت سے شادی کرلی جس کے سبب شیواجی کی ماں جیجا بائی اپنے شوہر سے الگ رہنے لگیں اور شیواجی کی پرورش کی ذمہ داری شاہ جی کے وفادار ملازم دادا جی کونڈدیو نے اُٹھائی۔شیواجی کے کردار پر ان کی ماں جیجا بائی اور دادا جی کونڈدیو نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔شیواجی لکھ پڑھ نہیں سکے مگر فوجی تربیت بہت اچھی طرح حاصل کی۔بارہ سال کی عمر میں انہوں

نے اپنے باپ شاہ جی سے پونا کی جاگیر حاصل کی۔

شیواجی مضبوط قوتِ ارادی اور بلند حوصلہ کا مالک تھا۔اس کی ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز دکن کا ماول علاقہ رہا۔ یہاں کے کولی اور مراٹھا نسل کے جفاکش و محنتی نوجوان شیواجی کے گرد اکھٹا ہو گئے اور آس پاس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ 1646 میں بیجاپور کے تورن کے قلعہ پر انہوں نے فتح حاصل کر لی اور اپنی جاگیر کو وسیع کرنے کا کام شروع کر دیا۔1648 میں عیاری سے کام لے کر 'پورندر' کے مضبوط قلعہ پر قبضہ کر لیا اور 1656 میں جاؤلی کا قلعہ بھی شیواجی کی دسترس میں آگیا۔اسی سال رائے گڑھ کے اہم قلعہ پر بھی ان کا پرچم لہرانے لگا۔رائے گڑھ کو شیواجی نے اپنی راجدھانی بنایا۔ یہ فتوحات جو شیواجی نے دکن کے ہندو جاگیرداروں اور قلعہ داروں پر حاصل کیں ان کی مختلف النوع صلاحیتوں کی عکاس ہیں۔ساتھ ہی ان میں اس بلند حوصلہ شخص کے ارادوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔مذکورہ بالا تمام قلعے جو شیواجی نے حاصل کیے ریاست بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ صورتِ حال بیجاپور کے سلطان کے لیے تشویشناک تھی اور اس نے اس کے سدِّباب کے لیے اپنے ایک باصلاحیت اور اہم افسر افضل خاں کو مقرر کیا۔ ستمبر 1659 میں افضل خاں پندھارپور پہنچا۔اس وقت شیواجی جاؤلی کے جنگلوں میں اپنا ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔افضل خاں نے براہ راست مقابلہ کے بجائے شیواجی کو عیاری سے زیر کرنے کا پروگرام بنایا ۔اس کے لیے گفتگو شروع ہوئی اور پرتاپ گڑھ کے جنوب میں واقع گاؤں پار میں دونوں کی ملاقات طے ہوئی۔2 نومبر 1659 کو اس ملاقات میں شیواجی، افضل خاں کے اندازہ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا اور اس نے دھوکہ سے افضل خاں کو مار دیا۔ جس کے بعد بیجاپور کی فوجوں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ شیواجی نے نہ صرف بہت سی دولت حاصل کی بلکہ کونکن اور کولہاپور سمیت بہت سے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ شیواجی کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے بیجاپور کے سلطان نے اس سے سمجھوتہ کر لیا اور اسے ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

7.3.2 سلطنت کا استحکام اور تاجپوشی (Consolidation of the Empire, and Coronation)

شیواجی جی کے سیاسی مقاصد نے مغلوں سے ان کا ٹکراؤ لازمی کر دیا۔اپنی صوبیداری کے دور میں بھی اورنگ زیب مراٹھوں کو باالمقابل دیکھ چکا تھا۔ حکمران بننے کے بعد اس نے اپنے ماموں شایستہ خاں کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا۔ شایستہ خاں نے بیجاپور کے سلطان کی مدد سے پنہالا اور چاکن کے قلعوں کو چھین لیا۔1660 میں اس نے شیواجی کی راجدھانی پونا پر بھی قبضہ کر لیا۔ شایستہ خاں کی طاقت کے سامنے شیواجی نے اپنے کو بے بس پاکر اس سے چھٹکارہ پانے کے لیے 15 اپریل 1663 کو پونا میں واقع شائستہ خاں کے کیمپ پر شبخون مار دیا۔اس اچانک حملہ سے مغل کیمپ میں افراتفری مچ گئی اور شایستہ خاں کو بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑی۔اس حملہ نے شیواجی کی حیثیت اور مضبوط کر دی ۔اس نے 1664 میں سورت کی بندرگاہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ شیواجی کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر اورنگ زیب نے اپنے مشہور سپہ سالار آمیر کے راجہ جے سنگھ کو جنوبی ہندوستان میں اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ راجہ جے سنگھ نے بیجاپور کے سلطان سے سمجھوتہ کیا۔ 24 اپریل 1765 کو مراٹھوں سے وزیر گڈھ کا قلعہ چھین لیا۔اپنی شکست اور کمزور حیثیت کو قبول کر کے شیواجی نے 22 جون 1665 کو مغلوں سے پورندر کی صلح کر لی۔ جس کی شرائط حسب ذیل۔

1. شیواجی نے 4 لاکھ ہن سالانہ آمدنی والے 23 قلعے اور ان سے متعلقہ علاقے مغلوں کو سونپ دیے۔

2. ایک لاکھ ہن سالانہ آمدنی والے رائے گڈھ اور قرب وجوار کے 12 قلعے اور ان کی زمین شیواجی کی ملکیت رہی۔
3. شیواجی نے اپنے بیٹے شمبھاجی کو مغل دربار میں بھیجنا قبول کیا۔ بادشاہ نے 500 کا منصب اور جاگیر شیواجی کو عطا کی۔
4. شیواجی نے مغل افواج کو دکن میں اپنی پوری اعانت کا وعدہ کیا۔
5. ان شرائط میں بعد میں یہ اضافہ کیا گیا کہ کونکن کی ترائی والی اور بیجاپور اور بالا گھاٹ کی بالائی زمین والی جاگیر اور فرمان شیواجی کو عطا کیا گیا اور اس نے اس کے بدلہ میں 40 لاکھ ہن 13 قسطوں میں مغلوں کو ادا کرنا منظور کیا۔

صلح نامہ کے تحت خود شیواجی اپنے بیٹے اور چنندہ ساتھوں کے ساتھ مغل دربار میں حاضر ہوا۔ اورنگ زیب کا اپنے ساتھ شایانِ شان سلوک نہ ہونے پر شیواجی نے دربار میں بادشاہ کو ناراض کر دیا جس کے بعد انہیں قید کر دیا گیا۔ لیکن وہ وہاں سے اپنے بیٹے کے ساتھ دو ٹوکریوں میں چھپ کر فرار ہو گئے۔ لیکن کچھ وقت کے بعد اس نے پھر اورنگ زیب سے معافی مانگ کر صلح کر لی اور راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ لیکن مغلوں سے یہ کشاکش تھمی نہیں۔ 13 اکتوبر 1670 میں شیواجی نے سورت کو دوبارہ لوٹا۔ اور دکن کے مغل علاقوں سے چوتھ اور سردیش مکھی لینا شروع کر دیا۔ 1672 میں شیواجی نے اورنگ زیب کے سپہ سالار دلیر خاں اور بہادر خاں کو ملیسر کی جنگ میں شکست دی۔ اب وہ اپنی طاقت کے عروج پر تھے۔ چنانچہ 16 جون 1674 کو رائے گڈھ کے قلعہ میں بنارس کے وشویشر جی گاگھٹ کے ہاتھوں ان کی رسمِ تاج پوشی ہوئی اور ان چھترپتی کا خطاب اختیار کیا۔ جشن تاجپوشی کے بعد انہوں نے دوبارہ مغلوں پر حملہ شروع کر دیے۔ اس نے بگلانہ اور خاندیش پر حملہ کر کے مغل صوبہ دار قطب الدین خان کو شکست دی اور شہروں کو لوٹا۔ فروری 1675ء میں اس نے کولہاپور پر حملہ کیا۔ شیواجی نے بہادر خان سے معاہدہ کی جو بات چیت مارچ 1975 میں شروع کی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ بہادر خان نے اسی سال بیجاپور سے سمجھوتہ کر کے شیواجی پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کو اورنگ زیب کی منظوری بھی مل گئی۔ اس کی زندگی کی آخری بڑی مہم کرناٹک کا حملہ تھی۔ جنجی، ویلور کے قلعہ حاصل کیے اور تنگ بھدرا سے کاویری تک اپنی فتوحات کو وسعت دے دی۔ دوسری طرف بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلوں کے حملے جاری تھے چنانچہ مغلوں کے خوف سے وہ اپنی راجدھانی لوٹ آیا۔ جہاں 13 اپریل 1680 کو 53 سال کی عمر میں اس کی جد وجہد بھری زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ شیواجی ایک جری، حوصلہ مند، جفاکش، اٹل ارادوں اور مضبوط قوتِ ارادی والا مہم جو شخص تھا جس نے مسلسل اور انتھک کوششوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا اور ایک طاقتور ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

7.3.3 شیواجی کے جانشین اور ان کے اختلافات (Successors of Shivaji and Their Conflicts)

شیواجی کی موت کے بعد اس کی بیوی سوئیرا بائی نے راجہ رام کو گدی پر بٹھایا مگر وہ دونوں شمبھاجی کے ہاتھوں قید ہوئے اور تخت شمبھاجی کے حصہ میں آیا۔ وہ ایک تیز مزاج، مغرور اور عیش پسند آدمی تھا۔ اورنگ زیب کا بیٹا اکبر جب بغاوت کر کے جنوبی ہند آیا تو شمبھاجی نے اسے پناہ دی لیکن کوئی مدد نہیں کی۔ اورنگ زیب نے 1686 میں بیجاپور اور 1687 میں گولکندہ کی فتح کے بعد شمبھاجی پر دھیان دیا۔ 1688 میں شمبھاجی نے شکست کھائی اور نگ زیب کے سپہ سالار مقرب خاں نے فروری 1688 میں سنگمیشور کے قلعہ سے شمبھاجی کو ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا جنہیں مارچ 1789 میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دکن اورنگ زیب کے زیر نگیں آگیا۔

شمبھاجی کے بعد 19 فروری 1789 کو راجہ رام گدی پر بٹھایا مگر اس نے خود کو شمبھاجی کے بیٹے شاہو کا نمائندہ کہا کیونکہ اس وقت شاہو مغلوں کی قید میں تھا۔ 1700 میں اپنی موت تک راجہ رام کا پورا وقت مراٹھوں کو متحد کرنے اور مغلوں سے جنگ کرنے میں گزرا۔ مراٹھا سردار کبھی کرناٹک میں ہوتے تو کبھی مہاراشٹر اور کبھی مالوہ اور گجرات تک پہنچ جاتے۔ یہ دوران کا مغلوں کے ساتھ گوریلا جنگ کرنے میں گزرا۔ اورنگ زیب کی عظیم فوج پر وہ چھاپے مارتے اور نقصان پہنچاتے رہے۔ اورنگ زیب ان کی طاقت کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اس دور میں راجہ رام کے گرد بہت سے باصلاحیت مراٹھا سردار اکٹھا ہو گئے تھے جنہوں نے اس جدوجہد کو جاری رکھا۔ بالآخر اس تگ و دو میں 12 مارچ 1700 کو 30 سال کی عمر میں راجہ رام کی موت ہو گئی۔ راجہ رام کی موت کے بعد اس کی بیوی تارا بائی نے اپنے 6 سالہ بیٹے کو شیواجی دوم کے نام سے تخت نشین کیا اور مغلوں سے جدوجہد جاری رکھی۔ وہ ایک باصلاحیت عورت تھی اور بخوبی مراٹھا سرداروں کی مدد سے لڑتی رہی۔ 1707 میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اول گدی پانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے شمبھا جی کے بیٹے شاہو کو آزاد کر کے مراٹھا واڑ واپس بھیج دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کچھ لوگ شاہو کے طرف دار ہو جائیں گے اور مراٹھا سرداروں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ ہوا بھی یہی کئی نامی سردار جن میں بالاجی وشوناتھ جو بعد میں پیشوا بنا اور منہیاجی سندھیا نے شاہو کا ساتھ دیا۔ تارا بائی جو اپنے بیٹے شیواجی دوم کی تاجپوشی کرا چکی تھی، اس نے شاہو کو جائز حق دار ماننے سے انکار کر دیا اور ایک فوج اپنے باصلاحیت افسر دھنا جی جادو کی سرکردگی میں شاہو کو مہاراشٹر سے ہٹانے کے لیے بھیج دی۔ مگر شاہو نے دھناجی کو اپنی طرف ملا لیا اور کھید کے مقام پر تارا بائی کو شکست دی۔ اس طرح 22 جنوری 1708 میں ستارہ میں شاہو کا جشن تاج پوشی ہوا۔ دوسری طرف راجہ رام کی دوسری بیوی یشو بائی نے سازش کر کے تارا بائی اور شیواجی دوم کو قید کرا دیا اور اپنے بیٹے شمبھاجی دوم کے ساتھ کولہاپور میں مراٹھا سیاست کا دوسرا مرکز بنا دیا۔ لیکن 1731 میں واریا کے مقام پر شاہو نے شمبھاجی دوم کو بھی شکست دی اور کل مراٹھا طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ 1749 میں شاہو کی موت واقع ہوئی۔

شاہو آخری مراٹھا حکمراں تھا جس نے چھترپتی (راجا) کی حیثیت سے اپنے حقوق استعمال کیے۔ اس کے جانشین برائے نام راجا تھے۔ اصلی اقتدار پیشواؤں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ سردیسائی کے مطابق شاہو مراٹھوں کا سب سے اہم حکمراں تھا۔ وہ وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔ اس وقت ایک ایسے حکمراں کی ضرورت تھی جو مغلوں سے اچھے تعلق رکھ سکے، آزاد خیال اور معتدل مزاج ہو، وزیروں اور افسروں پر اعتماد کر سکے اور دو مراٹھا خاندانوں کو ایک کر سکے اور یہ سب خوبیاں شاہوں میں موجود تھیں۔ وہ رحم دل تھا، اچھے لوگوں کو تلاش کر کے ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لینا جانتا تھا۔ اولین تین پیشوا، بالاجی وشوناتھ، باجی راؤ اول اور بالاجی باجی راؤ کا تقرر اسی نے کیا تھا اور اقتدار و طاقت اُن کے ہاتھوں میں دے کر مطمئن رہا۔ اس طرح پیشواؤں کو مکمل اقتدار سونپنے کے باوجود حکمراں اپنے اختیارات استعمال کرنے کے لائق بنا رہا اور پیشواؤں کے ساتھ اعتماد کی فضا بھی بحال رہی۔ پیشوا بھی اسے عزت کا مقام دیتے رہے۔ شاہو نہ تو ایک لائق سپہ سالار تھا اور نہ ہی باصلاحیت حکمراں، اور یہ بات وہ بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے نہ تو اس نے ملکی انتظام میں کوئی دلچسپی دکھائی اور نہ ہی کسی جنگ میں حصہ لیا۔ وہ پیشواؤں کی صلاحیت سے اچھی طرح واقف تھا اور اسی لیے ان کا حمایتی بنا رہا۔ یہاں تک کہ اقتدار کی طاقت ان کے ہاتھوں میں دینے میں

ذرا بھی نہیں ہچکچایا۔ مغلوں کے تئیں بھی اس کا رخ نرم ہی تھا۔ وہ دلی اور ستارہ کے بیچ کوئی ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا۔ اس میں مذہبی رواداری تھی اور وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ جب تک شاہو زندہ رہا، پیشوا اس کی عزت کرتے رہے اور احکامات بجالاتے رہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد مراٹھا راجا کی برائے نام اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ شاہو بلاواسطہ پیشواؤں کے عروج کے ساتھ ساتھ مراٹھوں کے زوال کا سبب بھی بنا۔ پیشوا سردار تھے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے سرداروں میں بھی طاقت کے حصول کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی جس نے بالا خر مراٹھا طاقت کو کمزور کر دیا۔

7.4 پیشواؤں کا عروج (Rise of Peshwas)

7.4.1 عروج کے اسباب (Causes for the Rise of Peshwas)

جب شاہو نے اقتدار سنبھالا تو مراٹھا سیاست پیچیدہ صورتحال سے دوچار تھی۔ خانہ جنگی کو ختم کرنا، نظم و نسق قائم کرنا، ریاست میں امن بحال کرنا اور علاقے میں سیاسی بالادستی کے لیے مختلف طاقتوں میں ہونے والی جدوجہد میں اپنی جگہ مضبوط کرنا وغیرہ ایسے چیلنج تھے جن سے نبرد آزما ہونا نہ تو امن پسند شاہو کے بس کی بات تھی اور نہ ہی سخت مزاج و کمزور قوت ارادی والی تارا بائی یہ کام انجام دے سکتی تھی۔ شیواجی نے انتظام و انصرام کے نقطہ نظر سے جو وزیروں کی کونسل اشٹ پردھان قایم کی تھی وہ کمزور ساخت پر مبنی تھی اور اورنگزیب کے حملوں کے دوران اس کا وجود تقریباً مٹ چکا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ مراٹھا سردار آپس میں متصادم تھے، حکمراں کمزور اور انتظامی صلاحیتوں سے عاری تھا، سیاسی اور فوجی دونوں اعتبار سے انتشار کی سی کیفیت تھی ایسے میں برہمن خاندان کا باصلاحیت، حوصلہ مند اور دوراندیش فرد بالاجی وشوناتھ، شاہو کا وزیر اعظم یعنی پیشوا بنا۔ اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن کی مراٹھا ریاست کو سخت ضرورت تھی۔ شاہو کے دیگر تمام سرداروں کے مقابلے میں اولین تینوں پیشوا ہر اعتبار سے زیادہ لائق اور باصلاحیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مکمل اقتدار اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرنے میں انہیں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ ایسے وقت میں جب مراٹھا علاقوں میں لالچ، مفاد پرستی، خود غرضی اور دھوکا دہی عام بات بن گئی تھی، انہوں نے عوام کے سامنے سوراجیہ کی شکل میں اعلی مقصد کا حصول رکھا جس کے ذریعے امن و امان اور نظم و نسق قائم کیا جاسکتا تھا۔ جب حکمران اور اس کے وزرا کی کونسل، مسائل حل نہیں کر سکی تو پیشوا کی شکل میں وہ قیادت ابھری جس کے پاس ان تمام پریشانیوں کا حل تھا اور جن کے ہاتھوں مراٹھا طاقت کو عروج حاصل ہونا تھا۔

7.4.2 بالاجی وشوناتھ (Balaji Vishwanath)

1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد پیدا ہوئی سیاسی صورت حال نے مراٹھوں میں نئی جان ڈال دی۔ اٹھارویں صدی میں شمال و جنوب دونوں سمتوں میں مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور وسیع ہوتی ہوئی ریاست کو تسلیم کیا گیا۔ مراٹھوں کو ایک عظیم سیاسی قوت بنانے کا سہرا ان پیشواؤں کو جاتا تھا جو عہدے کے اعتبار سے وزیر اعظم تھے لیکن بہت جلد کل اختیارات کے مالک بن گئے۔ پیشوا کے عہدہ کو سب سے پہلے جس نے مضبوط اور بااختیار بنانے میں کامیابی حاصل کی وہ بالاجی وشوناتھ تھا۔

بالاجی وشوناتھ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ وہ کونکن کے ایک برہمن خاندان سے تھا جو اپنی دیانت اور صلاحیتوں کے لیے معروف تھا۔ ان کے اجداد جنجیرا میں لگان وصول کرنے کے پشتینی عہدہ سے متعلق تھے۔ لیکن جنجیرا کے سدِیوں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے بالاجی وشوناتھ اپنا علاقہ چھوڑ کر سار واڑ میں بس گیا۔ مراٹھوں کے زیر انتظام اس نے ٹیکس وصول کرنے کا کام کیا۔ 1699 سے 1703 تک وہ پونا کا صوبیدار اور پھر 1704 سے 1707 تک دولت آباد کا سر صوبیدار رہا۔ اورنگ زیب 1699 سے 1704 تک پونا میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت بالاجی وشوناتھ نے اورنگ زیب کے لیے رسد مہیا کرنے کا کام کیا جس کی وجہ سے اورنگ زیب نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اورنگ زیب جب تک دکن میں رہا، شاہو اس کی قید میں رہا۔ شاید اسی زمانہ میں بالاجی وشوناتھ اور شاہو کے درمیان کسی قسم کا رابطہ قائم ہوا۔ 1705 میں وشوناتھ نے شاہو کو آزاد کرانے کی کوشش بھی کی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شاہو اور تارا بائی کے اختلاف میں بالاجی نے شاہو کا ساتھ دیا تھا اور یہ ساتھ ہر حال میں برقرار رہا۔ یہاں تک کہ جب شاہو کے کئی بڑے افسر اور سپہ سالار تارا بائی سے مل گئے تھے، یہ بالاجی ہی تھا جس نے نہ صرف شاہو کا ساتھ دیا بلکہ اپنی حکمت عملی اور ذہانت سے اس کی حیثیت کو بھی مضبوط بھی کیا۔ شاہو نے 27 نومبر 1713 کو بالاجی وشوناتھ کو پیشوا کا عہدہ دیا۔ اس نے مختلف مراٹھا سرداروں کو شاہو کے زیر نگیں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر بالاجی کی اصل کامیابی وہ سمجھوتہ ہے جو 1719 میں مغلوں اور مراٹھوں کے درمیان ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عظیم الشان مغلیہ سلطنت بہت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ حکمرانوں کی نااہلی اور امرا کی مفاد پرستی نے عجب صورت حال پیدا کر دی۔ ہر طرف سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے۔ شہنشاہ بے دست و پا تھے اور امرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ اس وقت مغل سلطنت کی باگ ڈور فرخ سیر کے ہاتھوں میں تھی، جب کہ حقیقی اقتدار، تاریخ میں بادشاہ گر کے خطاب سے مشہور، دو سید بھائیوں حسین اور عبداللہ کے ہاتھوں میں تھا۔ فرخ سیر نے جب سید برادران سے چھٹکارا پانے کی کوشش شروع کی، اس وقت حسین علی جنوب میں تھا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے اس کو فوراً دلی بلا یا۔ اس وقت حسین علی نے بھی اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لیے مراٹھوں سے مدد مانگی اور ان سے ایک سمجھوتہ کیا جسے دونوں بھائیوں کی کامیابی کے بعد مغل بادشاہ نے منظوری عطا کر دی۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل اہم نکات طے پائے گئے۔

1. مغل بادشاہ شاہو کو وہ سبھی قلعے اور علاقے دے دے گا جو کبھی شیواجی کے سوراجیہ میں ہوا کرتے تھے۔
2. شاہو کو خاندیش برار، گونڈوانہ، حیدرآباد اور کرناٹک کے وہ علاقے بھی ملیں گے جو اس نے ماضی قریب میں جیتے تھے۔
3. شاہو کو جنوب کے کچھ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق بھی ملے گا۔
4. جنوبی ہند کے مذکورہ صوبوں میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری بھی شاہو پر ہو گی۔
5. شاہو، کولہاپور میں شمبھاجی دوم کو پریشان نہیں کرے گا۔
6. شاہو مغل بادشاہ کو 10 لاکھ روپیہ سالانہ ٹیکس دے گا
7. بادشاہ شاہو کے خاندان اور متعلقہ لوگوں کو جو ابھی تک مغل قید میں تھے، آزاد کر دے گا۔

8. ضرورت پڑنے پر شاہو مغلوں کو 15000 گھوڑ سوار فوج مہیا کرائے گا۔

اس عہد نامہ نے شاہو اور مراٹھوں کی قوت اور اقتدار میں زبردست اضافہ کیا۔ اور پہلی بار 15000 مراٹھا فوج، بالا جی اور کھانڈے راؤ کی قیادت میں دہلی گئی جس کی مدد سے سید برادران نے فرح سیر کو تخت سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بالاجی وشوناتھ نے شاہو کی طاقت میں اضافہ کیا۔ مراٹھا اقتدار کو وسعت دی اور ساتھ ہی پیشوا کی حیثیت سے اپنے عہدے کو اتنا بااختیار بنا دیا کہ بالآخر مراٹھا حکمراں بھی اس کے زیر دست ہونے لگے۔

بالاجی وشوناتھ کی شخصیت: بالاجی نے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی تھی۔ کامیابی کی پہلی سیڑھی سے لیکر پیشوا بننے اور مراٹھا اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے تک کے سارے مراحل اس نے خود ہی طے کیے تھے۔ بہادری کے ساتھ ساتھ سیاسی دور اندیشی بھی اس میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔ وہ مراٹھوں کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تارا بائی یا یشو بائی کو چھوڑ کر شاہو کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسی کی سیاسی سوجھ بوجھ اور مدبرانہ صلاحیتیں تھیں جس کے سبب دھناجی جادَو، کھانڈے راؤ دہاڑے، پرشوجی اور کانہوجی آنگڑے جیسے سرکردہ مراٹھا سردار شاہو کی حمایت میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے مراٹھا ریاست کو خانہ جنگی سے بچایا اور مادھاجی کرشن جوشی جیسے ساہوکاروں کی مدد سے ریاست کے مالی مسائل حل کیے۔ یہ بالاجی وشوناتھ ہی تھا جس کے سبب سید برادران سے سمجھوتہ ہوا اور ریاست کو 30 لاکھ روپیہ ملا اور باقاعدگی سے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں 35 فیصد سالانہ ٹیکس ملنے لگا۔

7.4.3 باجی راؤ اول (Baji Rao-I)

1720 میں اپنے باپ کی موت کے بعد باجی راؤ اول (1720 تا 1740) پیشوا بنا۔ کئی تجربہ کار سرداروں کی موجودگی میں 20 سال سے بھی کم عمر کے اس نوجوان کو شاہو نے فوقیت دی اور اس کا انتخاب وقت نے صحیح ثابت کیا۔ وہ ایک باہمت فوجی باصلاحیت سپہ سالار اور دور اندیش سیاست داں تھا۔ باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو داخلی طور پر مضبوط بنانے کے لیے جاگیروں کو سرداروں میں اس طرح تقسیم کیا کہ کوئی بھی سردار کسی جاگیر پر خود مختار نہ ہو سکے۔ اور وہ ایک دوسرے پر منحصر رہیں۔ خارجی طور پر اس نے مغلیہ سلطنت کے کھوکھلے ہوتے ہوئے درخت پر دار کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ اس کے دورِ اقتدار کے مختلف پہلوؤں کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

نظام سے تعلقات: نظام الملک آصف جاہ دکن کا وائسرائے رہ چکا تھا۔ وہ پھر واپس آیا۔ اس کا ارادہ اپنے لیے ایک آزاد خود مختار ریاست قائم کرنے کا تھا۔ اس لیے مراٹھوں سے ٹکراؤ لازمی تھا۔ 1726 میں اس نے کولہاپور میں سمبھاجی دوم کی مدد کی اور شاہو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ باجی راؤ اول کی غیر موجودگی میں شاہو کی حیثیت خراب ہو گئی لیکن باجی راؤ اول نے کرناٹک سے واپس لوٹ کر فروری 1728 میں پالکھیڑا کے مقام پر نظام کو اس طرح گھیر لیا کہ اسے مجبوراً 16 مارچ 1728 کو منکی شوگاواں کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس سمجھوتے کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

1. نظام نے شاہو کو مہاراشٹر کا بلاشرکت غیرے حکمراں تسلیم کر لیا۔
2. اسے باقی رہ گئی چوتھ اور سردیس مکھی کی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

3. اس نے منکی شوگاواں کے مراٹھا سرداروں کو اپنی حدود میں رہنے دینا قبول کر لیا۔

نظام اور مراٹھوں کا یہ ٹکراؤ یہیں ختم نہیں ہوا۔ 1737 میں دلی کی ہدایت پر نظام نے ایک بڑی فوج بھوپال کے قریب جمع کر لی۔ مگر اس کی ذرا سی غلطی کے سبب اس کی فوج میں رسد کی کمی اور بھکمری پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے بنا جنگ کیے ہی جنوری 1738 میں ذدئی سرائے کا معاہدہ قبول پڑا۔ معاہدہ کے مطابق مالوہ اور نرمدا اور چنبل ندیوں کے درمیان کا پورا علاقہ باجی راؤ اول کو حاصل ہو گیا۔ علاوہ ازیں 50 لاکھ روپیہ کا تاوان جنگ بھی نظام نے دینا قبول کر لیا۔

دلی پر حملہ: مراٹھوں کے دوآب، راجستھان اور دہلی کے آس پاس کے مغل علاقوں پر لگاتار حملے اور لوٹ مار جاری تھی جس کے سبب مغل بادشاہ نے مراٹھوں کو چمبل ندی کے جنوبی علاقے کے لیے 13 لاکھ روپیہ، راجستھان کے لیے 13 لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ اور جنوبی ہندوستان کی آمدنی کا 5 فیصد حصہ سردیش مکھی کی شکل میں دینا قبول کر لیا۔ اس سے حوصلہ پاکر باجی راؤ نے اودھ اور بنگال جیسے صوبوں اور الہ آباد، گیا، بنارس جیسے شہروں کی مانگ کی جسے قبول کرنے سے مغل بادشاہ نے انکار کر دیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر باجی راؤ نے اپنے ایک سپہ سالار ملہار راؤ ہولکر کے ذریعے اودھ پر حملہ کر دیا لیکن اودھ کے صوبے دار سعادت علی خان کی گھڑ سوار فوج نے مراٹھوں کو مار بھگایا۔ سعادت علی خان نے اپنی اس فتح کے بعد مغل بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ اس نے باجی راؤ کو چنبل ندی کے جنوب میں بھگا دیا ہے۔ اس خط کی خبر پاکر باجی راؤ نے دہلی کا رخ کیا۔ وہ بہت تیزی سے سفر کرتا رہا اور 29 مارچ 1737ء کو دہلی پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے کی خبر سن کر مغل بادشاہ نے دہلی چھوڑنے کی تیاری کر دی۔ مگر باجی راؤ کا مقصد دہلی پر حملہ اور لوٹ مار نہیں تھا، وہ تو صرف سعادت خان کو جھوٹا ثابت کرنا اور مغل بادشاہ کو دہشت زدہ کرنا کرنا چاہتا تھا۔ تین دن دہلی رکنے کے بعد جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے واپس لوٹ گیا، کیونکہ سعادت خان، وزیر فخر الدین اور شمس الدولہ کی افواج دلی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچنا اس کے لیے ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے راجستھان کا راستہ اپنایا اور تھار کے ریگستان میں داخل ہو گیا جہاں اس کا تعاقب آسان نہیں تھا۔ اس طرح باجی راؤ دو بڑی مغل افواج سے بنا تصادم کے بچ کر نکل گیا۔

کونکن کی فتح: کونکن میں سدّیوں کو طاقت حاصل تھی اور وہ مراٹھوں کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ 1733 تک ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1733 میں باجی راؤ خود وہاں گیا اور ایک سال تک وہیں رکا رہا۔ آخر میں ایک سمجھوتہ کر کے واپس ہوا۔ اس سمجھوتے سے مراٹھوں کو کچھ علاقہ تو مل گیا مگر سدیوں کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ جنگ دوبارہ چھڑ گئی۔ بالآخر 1736 میں باجی راؤ کے بھائی چیاجی اپانے سدی سردار کو ایک جنگ میں مار دیا جس کے نتیجے میں ان کی کمر ٹوٹ گئی اور انہوں نے معاہدہ کر کے کونکن پر پیشوا کی برتری قبول کر لی۔

پرتگالیوں سے تصادم: پرتگالیوں سے مراٹھوں کے ٹکراؤ کی شروعات 1731ء سے ہوئی۔ انہوں نے سدیوں کی مدد کی تھی۔ 1732ء میں انہوں نے مراٹھوں سے سمجھوتہ کر لیا لیکن 1737ء میں انہوں نے پھر جنگ چھیڑ دی جس کا اختتام 1739ء میں بسین (Bassein) پر مراٹھوں کے قبضے کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد پرتگالیوں سے مراٹھوں کا سمجھوتہ ہو گیا اور انہوں نے کونکن علاقے میں مراٹھوں کی بالادستی کو تسلیم کر لیا۔ 28 اپریل 1741ء کو اپنی مرنے سے پہلے باجی راؤ اول نے مراٹھا ریاست کی شکل و صورت ہی بدل دی۔ مغربی ساحل کی ایک

چھوٹی سی ریاست سے اسے شمال تک پھیلی ہوئی وسیع سلطنت بنادیا۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ نئے علاقے جیتے گئے مگر ان کے انتظام و انصرام پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

باجی راؤاول کی شخصیت: باجی راؤ کو پیشواؤں میں بلند مقام حاصل ہے۔اسے عظیم پیشواؤں میں گنا جاتاہے۔ یہ باجی راؤ ہی تھا جس نے مراٹھوں کو ہندوستان کی اہم ترین طاقت بنادیا۔ مورخین کے مطابق اس نے مراٹھوں میں ایک نئی امید جگادی۔اس کی فوجی لیاقت اور قیادت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتاہے کہ نظام جوایک باصلاحیت سپہ سالار تھااور جس نے سو سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا تھا،وہ باجی راؤ کے سامنے دو بار آیااور دونوں ہی بار بنا جنگ کیے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سیاسی تدبر میں بھی نظام جیسے زیرک حکمراں کی اس کے سامنے کچھ نہیں چلی۔ مغلوں کے زوال سے ہندوستان میں جو سیاسی خلا پیدا ہو رہا تھا، باجی راؤنے اسے مراٹھاطاقت سے پُر کرنے کی کوشش کی۔اس کے زیر قیادت مراٹھاشہ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں پورے ہندوستان میں گونج رہی تھیں۔

7.4.4 بالاجی باجی راؤ (Balaji Baji Rao)

باجی راؤ کی موت کے بعد شاہو نے اس کے 19 سالہ بیٹے بالاجی باجی راؤ(1740تا1761ء) کو پیشوابنادیا۔ یہاں تک آتے آتے پیشوا کا عہدہ نہ صرف موروثی بن گیا تھابلکہ اصل طاقت واختیار کا مرکز بھی وہی تھا۔ بالاجی باجی راؤاپنے باپ کی طرح عظیم سپہ سالار تو نہیں تھا لیکن وہ میدان عمل کا آدمی تھا۔ کہا جاتاہے کہ باجی راؤاول نے دشمن زیادہ بنائے،دوست کم،اور بالاجی باجی راؤنے دوست زیادہ بنائے،دشمن کم۔ بالاجی نے بھی آغاز سے ہی مراٹھار یاست کی توسیع کی پالیسی کو جاری رکھا۔ بالاجی کے عہد میں 1749 میں چھترپتی شاہو کی موت واقع ہوئی۔اس کے آخری دن پریشانی اور مشکل میں گزرے۔تارابائی حکومت حاصل کرنے کے لیےایک بار پھر سرگرم عمل ہوگئی۔ مختلف مراٹھا سردارایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ کچھ وقت کو پیشوانے بھی اپنا عہدہ چھوڑدیا۔ شاہو کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ جیل میں بند تارابائی نے ایک لڑکے کے بارے اعلان کیا کہ یہ اس کے بیٹے شیواجی دوم کا بیٹا ہے ۔اس نے شاہو سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکے کو گود لے لے۔دوسری طرف کولہاپور کا شمبھاجی دوم بھی شاہو کا جانشین بننے کے لیے بے چین تھا۔ان حالات میں 25دسمبر 1749 کو اپنی موت سے قبل شاہو نے تارابائی کے پیش کردہ لڑکے راجہ رام دوم کو اپنا وارث بنانے کا اعلان کیا۔ جنوری1750 میں راجہ رام دوم چھترپتی بنا۔تارابائی اس کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھتی۔ جب اس نے تارابائی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی توتارابائی نے یہ راز کھولا کہ راجہ رام دوم شیواجی کے نسب سے نہیں ہے۔ یہ صورت حال جان کر پیشوا بالاجی باجی راؤ نے راجہ رام دوم کو پونا بلایا جسے وہ اپنی راجدھانی بنا چکا تھا۔ یہاں اس نے راجہ رام دوم سے سنمگھ لاکا سمجھوتہ کیا جس کے مطابق چھترپتی نے اپنے سبھی اختیار پیشوا کو سونپ دیے جس کے بعد پیشوا اصل حکمراں بن گیااور مراٹھا چھترپتی ستارا میں نام کا حکمراں اور حقیقت میں ایک قیدی بن گیااس سمجھوتے کے بعد بھی تارابائی نے اقتدار حاصل کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھی۔ جب پیشوا نظام پر حملے کی غرض سے ریاست سے باہر تھا۔ تواس نے دماجی گائکواڑاور کچھ دوسرے سرداروں کی مدد سے پونا پر حملہ کردیا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ راجہ رام قید میں ڈال دیا گیا۔ پیشوا کی طاقت کو للکارنے کرنے والے شکست کھاگئے۔

بالاجی باجی راؤ کی فتوحات: سب سے پہلے بالاجی نے 1740ء میں مالوہ پر حملہ کی تیاری کی لیکن درمیان میں جے پور کے حکمراں راجہ جے سنگھ نے مغل بادشاہ اور پیشوا کے درمیان صلح و معاہدہ کرادیا۔ جس کی رو سے مالوہ، پیشوا کو مل گیا۔ اس کے بدلے پیشوا نے 500 مستقل فوجی اور ضرورت پڑنے پر 400 فوجی مہیا کرانے کا وعدہ کیا۔ معاہدہ کے مطابق شہزاد احمد مالوہ کا صوبیدار اور پیشوا نائب صوبیدار مقرر ہوئے اور مالوہ پر پیشوا کو قانونی حق حاصل ہو گیا۔ کرناٹک پر پہلا حملہ 1739ء میں راگھوجی بھونسلے نے کیا تھا 1741ء میں وہاں کے نواب دوست علی کو قتل کر دیا اور اس کے داماد چندا صاحب کو قید کر لیا لیکن 1743ء میں نظام نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ 1745ء میں بابوجی کرناٹک کو بھیج کر پیشوا نے کرناٹک کو مکمل طور سے اپنے قبضے میں لے لیا۔ پیشوا کی طرف سے رگھوجی بھونسلے نے اڑیسہ پر حملہ کر دیا اور بنگال کے نواب علی وردی خاں کو 1751ء میں 12 لاکھ روپیہ سالانہ چوتھ کی شکل میں دینے پر مجبور کر دیا۔ نظام حیدرآباد اور پیشوا بالاجی میں دوستی دشمنی کے مختلف موڑ آتے جاتے رہے۔ نظام نے اپنے باغی بیٹے ناصر جنگ کے خلاف مراٹھوں کی مدد کے بدلے انہیں 15 لاکھ روپیہ دیا۔ 1743 میں نظام نے کرناٹک جیت لیا لیکن 1757 کی سندکھڑ جنگ میں شکست کھا کر 25 لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی والے علاقے پیشوا کو دینے پڑے۔ 1760 میں ادے گیر کی جنگ میں پیشوا نے پھر نظام کو شکست دی اور بدلہ میں ایک بڑا علاقہ حاصل کیا۔ پیشوا نے راجپوتوں اور جاٹوں سے بھی اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔

پانی پت کی تیسری جنگ

اسباب: مغل اور بالاجی راؤ مغل بادشاہ کے نواب وزیر صفدر جنگ سے 1752 میں ہوئے معاہدے کے مطابق انہوں نے پورے ہندوستان سے چھوتھ وصول کرنے کا اختیار حاصل کر لیا تھا اور اس کے بدلے ضرورت پڑنے پر مغل بادشاہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ نے مراٹھوں کو شمالی ہندوستان کی سیاست میں ملوث کر دیا۔ دراصل مراٹھوں نے 1752 میں عمادالدولہ کو وزیر بننے میں مدد کی جس کے بدلے وہ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس سے شمالی ہند میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ دلی کے بعد پنجاب میں بھی مراٹھوں نے احمد شاہ ابدالی کے نمائندے کو نکال کر اپنا قبضہ کر لیا۔ شمالی ہند میں قبضہ واقتدار کی اس کشمکش نے صورتِ حال میں بڑی تبدیلیاں کیں۔ مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ امراء کی خود غرضی اور مفاد پرستی نے انہیں دو حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ ایک ہندوستانی مسلمانوں کا گروپ اور دوسرا باہر سے آئے مسلمانوں کا گروپ۔ باہر سے آئے مسلمانوں کا گروہ مراٹھوں کے خلاف کسی قسم کی روک تھام نہ ہونے اور مغل بادشاہ کے ان کے ماتحت چلے جانے سے ناراض ہو گیا۔ انہوں نے ملک سے باہر سے مدد کی کوشش شروع کر دی۔ سلطنت کا مضبوط ستون کہے جانے والے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور روہیل کھنڈ کے نجیب الدولہ نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچانے کے لیے بلایا۔ چنانچہ افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی اپنی فوج لے کر ہندوستان کی طرف چل پڑا اور اسے پانی پت کے میدان میں مراٹھوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مراٹھوں نے بھی مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر مراٹھوں کو ان کی پچھلی کارگزاریوں، بے جا مداخلت اور ظلم و بربریت کے سبب کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کے غیر مسلم راجپوتوں، سکھوں اور جاٹوں کو بھی ان پر بھروسہ نہیں تھا۔

جنگ: چنانچہ 16 جون 1761 کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں اور مراٹھوں کے درمیان جو خونریز جنگ ہوئی اس میں

مراٹھوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ کوئی مراٹھا گھر ایسا نہیں تھا جہاں سوگ نہ منایا گیا ہو۔ اس جنگ نے مراٹھا قوت کو ختم تو نہیں کیا مگر مغلوں کی جگہ لینے کا خواب ہمیشہ کے لیے چور چور کر دیا۔

مراٹھوں کی شکست کے اسباب: ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی اس شکست فاش کے کچھ بنیادی اسباب تھے۔

- مراٹھوں میں جاگیر دارانہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ جو ایک قیادت، ایک عمومی تربیت اور ایک جنگی پالیسی کے خلاف تھا۔
- مراٹھوں کی لوٹ مار کی سرشت نے ہندو راجاؤں کو بھی ان کے مخالف بنا دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں راجستھان میں بھی انہیں کوئی مدد نہیں ملی۔ سورج مل جاٹ نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔
- وقت کے ساتھ مراٹھوں میں سادگی، جفاکشی اور ڈسپلن کم ہوتا جا رہا تھا۔
- فوج کے ساتھ عورتیں بھی چلنے لگی تھیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے فوج پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اس جنگ میں عورتوں اور نوکروں کی کثیر تعداد نے پریشانیاں پیدا کر دیں۔
- پیشواؤں کے عروج نے دیگر سرداروں میں حدور قابت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان میں آپسی اختلاف بڑھ گئے تھے۔
- شکست کا ایک فوری سبب بھی تھا اور وہ تھا ابدالی کے مقابلہ میں سداشوراؤ بھاؤ کی کمزور قیادت۔ مراٹھا سپہ سالار تدبر اور جنگ دونوں میں اپنے حریف سے کمزور پڑا۔ بھاؤ نے گوریلا جنگ کا طریقہ استعمال نہیں کیا۔ توپ خانے پر بھروسہ کر کے مدافعانہ جنگ لڑی، جو غلط فیصلہ ثابت ہوی۔ اس کے علاوہ ابدالی کے پاس آتشی اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اس کی گھڑ سوار اور شتر سوار فوج بھی مراٹھوں سے بہتر تھی۔

جنگ کے نتائج: اس جنگ کے نتائج کے موضوع پر مورخین میں بہت اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے میں اس جنگ نے مراٹھوں کو جانی و مالی نقصان تو بہت پہنچایا لیکن اس شکست سے نہ تو ان کی طاقت ختم ہوئی اور نہ ہی ان کے مقاصد تبدیل ہوئے۔ وہیں کچھ دوسرے مورخین کے مطابق یہ جنگ مراٹھوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ان کے بڑے بڑے لائق و باصلاحیت سرداروں کے مارے جانے سے کمزور اور سازشی سرداروں کو آگے آنے کا موقع ملا۔ مراٹھا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہند میں ان کی پیش رفت تھم گئی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ بلاشبہ اس جنگ نے مراٹھا قوت و اقتدار اور ان کے وقار کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مراٹھا فوج کی ناقابل شکست حیثیت ختم ہو گئی اور انہیں دوبارہ اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں وسائل اور قوت خرچ کرنی پڑی۔ لیکن پھر بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکے کہ انگریزوں کو شکست دے سکیں۔

بالاجی باجی راؤ کی شخصیت: پیشوا بالاجی باجی راؤ، وجیہ اور خوش گفتار تھا۔ اپنے پیش روؤں کے برعکس وہ فنون کا رسیا اور سست کاہل مزاج کا تھا لیکن ساتھ ہی ایک لائق فوجی اور قابل منتظم بھی تھا۔ اس کے عہد میں مراٹھا سلطنت وسیع ہوئی۔ اس کے دور حکومت میں مراٹھا گھوڑوں نے کنیا کماری سے لیکر ہمالیہ کی جھرنوں تک اپنی پیاس بجھائی۔ مختلف صلاحیتوں کا حامل ہوتے ہوئے بھی بالاجی باجی راؤ میں کچھ کمیاں تھیں۔ عصری تقاضوں کے مطابق نہ تو اس میں فوجی قیادت کی اہلیت تھی، نہ ہی وہ اعلیٰ درجہ کا منتظم تھا۔ بحیثیت مدبر بھی وہ وقت اور حالات کی کسوٹی پر کھرا

نہیں اترا۔ مراٹھا سرداروں کے آپسی اختلافات اور مخالفین کی سرگرمیوں پر بھی وہ کوئی قدغن نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ سے کہ ایک طرف تو اس کا دور حکومت کامیابیوں کی کہانیاں سناتا ہے تو دوسری طرف ناکامی اور زوال کا راستہ بھی وہیں سے شروع ہوتا ہے۔

7.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں مراٹھا، جنوبی ہندوستان میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ شیواجی نے ایک کامیاب قائد اور لائق منتظم کی حیثیت سے اپنی سلطنت قائم کی جس نے نہ صرف ہمعصر علاقائی طاقتوں بلکہ عظیم مغلوں سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ شیواجی کے جانشینوں کے اختلافات اور کمزوری نے پیشواؤں کو جو وزیر کی حیثیت رکھتے تھے، اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع دیا۔ شیواجی کے بعد اولین تین پیشواؤں کا دور مراٹھا اقتدار کا عہد زریں ثابت ہوا۔ اسی تناظر میں پہلے تین عظیم پیشواؤں بالاجی وشوناتھ، باجی راؤ اول اور بالاجی باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو عظیم بلندیوں تک پہنچایا۔ انہوں نے اس عہد میں جنوب کے علاوہ شمالی ہند میں بھی اپنے بازوں پھیلائے۔ جنوب میں حیدر آباد، میسور اور انگریزوں کے علاوہ دیگر چھوٹی ریاستوں کے ساتھ علاقائی سیاست میں کامیاب کردار ادا کیا اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مراٹھوں نے کمزور مغل بادشاہ اور آپسی رسہ کشی میں مصروف امرا پر مسلسل اپنی بالادستی ثابت کی۔ شمالی اور جنوبی ہند کے مختلف علاقوں سے انہوں نے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں ٹیکس وصول کیا۔ ان کی فوجی کامیابیوں نے ایسی صورت پیدا کر دی جسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ مغلوں کے زوال کے بعد ہندوستان کی قسمت انہیں کے ہاتھوں لکھی جائے گی۔ لیکن ملک کی پیچیدہ سیاسی صورتحال میں ان کی راہ آسان نہیں تھی۔ مغل بادشاہ، اس کے امراء اور مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کی آپسی کھینچ تان نے افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی کو یہ موقع فراہم کیا کہ ہندوستان میں حملہ آور ہو۔ ابدالی کی باصلاحیت قیادت اور مراٹھوں کی کمزور جنگی حکمت عملی نے پانی پت کے میدان میں جنگ کا نتیجہ طے کر دیا۔ پانی پت کی اس شکست نے ان کا ملک گیر سلطنت قائم کرنے کا خواب چکنا چور کر دیا۔

7.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

چوتھ	:	چوتھ، مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے مراٹھوں کے ذریعے وصول کیا جانے والا ایک حفاظتی محصول تھا اور کل مقررہ محصول کا چوتھائی حصے پر مشتمل تھا۔
سردیش مکھی	:	سردیش مکھی محصول کا 10 فیصد اضافی محصول تھا جس کا دعویٰ شیواجی نے سردیش مکھ (سردار) ہونے کے طور پر کیا تھا۔
پیشوا	:	مراٹھا وزیر اعظم
اشٹ پردھان	:	آٹھ وزیروں کی کونسل
سوراجیہ	:	شواجی کی قائم کردہ سلطنت

7.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مراٹھا سلطنت کا بانی کون تھا؟

(الف) شاہو (ب) باجی راؤ (ج) شیواجی (د) بالاجی وشوناتھ

2. شیواجی کی تاج پوشی کس قلعے میں ہوئی؟

(الف) پونا (ب) پورندر (ج) رائے گڑھ (د) سنگمیشور

3. 1665 میں شیواجی نے کس مغل سپہ سالار کے ساتھ پورندر کا معاہدہ کیا؟

(الف) راجہ جے سنگھ (ب) شائستہ خان (ج) افضل خان (د) دلیر خان

4. مراٹھا سلطنت کا پہلا پیشوا (وزیر اعظم) کون تھا؟

(الف) باجی راؤ اول (ب) بالاجی وشوناتھ (ج) بالاجی باجی راؤ (د) راجہ رام

5. پانی پت کی تیسری جنگ کب لڑی گئی؟

(الف) 1526 (ب) 1556 (ج) 1761 (د) 1764

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پورندر کی صلح کی کیا شرائط تھیں؟ بیان کیجیے۔
2. شیواجی کی ریاست کے استحکام اور تاجپوشی پر نوٹ لکھیے۔
3. باجی راؤ اول کے دہلی پر حملے اور پرتگالیوں سے تصادم پر نوٹ لکھیے۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. شواجی ایک سلطنت کے بانی اور عظیم فاتح تھے اس کی تشریح کیجیے۔
2. پیشواؤں کے دور میں مراٹھا سلطنت کی وسعت پر اظہارِ خیال کیجیے۔

جوابات: 1-(ج), 2-(ج), 3-(الف), 4-(ب), 5-(ج)

اکائی 8۔ مغلوں کے تحت دکن

(The Deccan under the Mughals)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 اکبر کے عہد میں دکن

8.2.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح

8.2.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی

8.3 جہانگیر کے عہد میں دکن

8.3.1 میواڑ کے ساتھ صلح اور احمد نگر سے جنگ

8.3.2 احمد نگر کا الحاق

8.3.3 گولکنڈہ کی مہم

8.3.4 بیجاپور کی مہم

8.4 اورنگ زیب کی دکن پالیسی

8.4.1 پہلا مرحلہ

8.4.2 دوسرا مرحلہ

8.4.3 تیسرا مرحلہ

8.4.4 اورنگ زیب اور مراٹھا

8.5 اکتسابی نتائج

8.6 کلیدی الفاظ

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.0 تمہید (Introduction)

دکن کا خطہ برصغیر کی تاریخ میں ایک نہایت اہم اور پیچیدہ سیاسی و جغرافیائی حیثیت رکھتا تھا۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے درمیان قدرتی رکاوٹیں موجود ہونے کے باوجود دونوں خطوں کے درمیان ثقافتی اور معاشی روابط ہمیشہ قائم رہے۔ مغل سلطنت نے جب شمالی ہندوستان میں اپنی طاقت مستحکم کرلی تو اس کی توسیعی پالیسی کے تحت دکن کی ریاستیں اس کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ اکبر کے زمانے میں دکن میں مداخلت کا آغاز ہوا، جس کا مقصد نہ صرف سیاسی اتحاد قائم کرنا تھا بلکہ پورے برصغیر پر مغل اقتدار کو مستحکم کرنا بھی تھا۔ دکن کی ریاستیں جیسے احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ اپنی خود مختاری برقرار رکھنا چاہتی تھیں، جس کے باعث مغلوں اور دکنی طاقتوں کے درمیان مسلسل کشمکش جاری رہی۔ اس دوران ملک عنبر جیسے مدبر رہنما اور مراٹھوں کی گوریلا جنگی حکمت عملی نے مغلوں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے ادوار میں یہ کشمکش جاری رہی، جبکہ اورنگزیب کے دور میں یہ مسئلہ انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ دکن کی مہمات نہ صرف فوجی بلکہ سیاسی اور معاشی لحاظ سے بھی مغل سلطنت کے لیے ایک بڑا چیلنج ثابت ہوئیں۔ اس اکائی میں دکن میں مغل پالیسی، فتوحات، مشکلات اور نتائج کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اکبر کی دکنی پالیسی کو سمجھ سکیں گے۔
- جہانگیر کی دکن پالیسی کا تجزیہ کر سکیں گے
- دکن میں مغل سرحدوں میں تبدیلی میں شاہ جہاں کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- اورنگزیب کی دکنی فتوحات اور دکنی ریاستوں کے الحاق کو جان سکیں گے۔
- مغلوں کی مراٹھوں سے جنگوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔

8.2 اکبر کے عہد میں دکن (Deccan during the reign of Akbar)

8.2.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح (Conquest of Berar, Ahmednagar, and Khandesh)

شمالی ہندوستان میں اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے بعد مغلوں نے جنوب کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جغرافیائی نقطہ نظر سے شمال اور جنوب ایک دوسرے سے الگ تھے۔ دونوں کے درمیان ایک جغرافیائی حد فاصل تھی جو اور کہیں نہیں ملتی۔ لیکن یہ ایسی سرحد نہیں تھی جس کے پار افراد اور خیالات کا آنا جانا نہ ہو سکے تاکہ کسی حد تک دونوں کے درمیان ثقافتی اور جغرافیائی اتحاد قائم رہے۔ لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان ایک دوسرے سے الگ تھے کیونکہ دونوں میں اقتدار کی نوعیت مختلف تھی اور جغرافیای رکاوٹ تھی۔ مورخ بینی پرساد مغلوں کی جنوب کے لیے اپنائی جانے والی پالیسی کیلیے جغرافیائی حقائق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ نظریہ تھا کہ

پورے ملک میں ہمالیہ سے کنیا کماری تک ایک ہی طرح کا سیاسی نظام ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہاں علاقائیت اور جارحیت ہمیشہ بنی رہتی تھی۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا ہے کہ شمال ہی اکثر جارحیت پسند ہوتا تھا۔ جنوب میں فطرت نے ایک ایسا سیاسی نظام فروغ دیا جہاں اقتدار ایک ہی اکائی میں مرکوز نہیں ہو سکتا تھا جبکہ شمال میں ایک طاقت کے عروج کے ذریعے پورے شمال کو ایک ہی سیاسی نظام میں لانا ممکن ہو گیا لیکن زندہ رہنے کے لیے اسے اپنی توسیع کرنا ضروری تھا اور توسیع کے لیے سب سے بہترین علاقہ جنوب تھا۔ جب جنوبی ہندوستان کمزور اور بٹا ہوا تھا اس وقت شمالی ہندوستان میں ایک بڑی طاقتور ریاست کا عروج ہو رہا تھا۔ ایسی صورتحال میں اس بات کا پورا امکان تھا کہ شمال کی طرف سے جنوب پر حملہ ہو۔ جب جنوب کم دباؤ والا علاقہ ہو گیا تو وہاں باہری طاقت کا آنا فطری امر تھا۔ بنی پرساد کے مطابق 'یکسانیت (homogeneity) کے عناصر نے ہمیشہ شمال اور جنوب کو ایک دوسرے کے اوپر قبضہ کرنے کی تحریک دی ہے اور غیر جنسیت (heterogeneity) کے عناصر نے انہیں ایسا کرنے سے روکا ہے۔' اس لیے مالوہ اور گجرات کی فتح کے بعد اکبر جنوب کی سیاست میں مداخلت نہ کرتا، یہ ناممکن تھا۔ 1576 میں ایک مغل فوج نے خاندیش پر حملہ کیا اور اس کے حکمراں کو اطاعت قبول کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اسی درمیان جنوب کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ جنوبی ریاستوں میں باہمی لڑائیوں سے جنوب کی سیاست میں ابال آ رہا تھا۔

اکبر کو پورے ملک پر فرمانروائی کا دعوی تھا اس لیے وہ یہ چاہتا تھا کہ راجپوت راجاؤں کی طرح دکنی ریاستوں کے حکمران بھی اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس سے پہلے اس نے اپنا ایک ایلچی بھیج کر دکنی ریاستوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کے اقتدار کو قبول کر کے اس سے دوستی کر لیں۔ لیکن اس کے مشورے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ جب تک مغل سلطنت فوجی دباؤ نہیں ڈالے گی دکنی ریاستیں مغلوں کی اطاعت قبول نہیں کریں گی۔ 1591 میں اکبر نے ایک سفارتی مہم شروع کی۔ اس نے تمام دکنی ریاستوں کو مغلوں کی ماتحتی قبول کرنے کی دعوت دی۔ حسب توقع کسی بھی ریاست نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا البتہ خاندیش نے یہ دعوت قبول کر لی کیونکہ دوسری دکنی ریاستوں کی بنسبت خاندیش مغلوں کے قریب تھا اور اسے مغلوں کی طرف سے برابر خطرہ تھا۔ احمد نگر کے حکمران برہان نظام شاہ نے مغل ایلچی کے ساتھ بہت سخت سلوک کیا جبکہ دوسری دکنی ریاستیں دوستی کا وعدہ کر کے معاملے کو ٹال گئیں۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اکبر نے دکن کے سلسلے میں کسی خاص اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ 1595 میں برہان نظام شاہ کی موت کے بعد نظام شاہی امراء میں آپس کی لڑائی پھوٹ پڑی جس سے اکبر کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ ہوا یہ تھا کہ برہان نظام شاہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین متعین کیا تھا، لیکن بیجاپور احمد نگر کے بیچ ہوئی ایک جنگ میں اس کی موت ہو گئی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی تخت شاہی کے چار دعوے دار پیدا ہو گئے جنہیں چار مختلف گروہوں کی تائید حاصل تھی۔ سب سے مضبوط دعوی بہادر نظام شاہ کا تھا جو کہ مرحوم حکمراں کا بیٹا تھا۔ بیجاپور کا حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی بہادر کے دعوے کی تائید میں تھا جس کی حمایت عادل شاہ اول کی بیوہ چاند بی بی بھی کر رہی تھی جو کہ برہان نظام شاہ کی بہن تھی۔ وہ ایک ممتاز خاتون تھی جو ابراہیم عادل شاہ کی کم سنی کے زمانے میں دس سال تک بیجاپور کی اصل حکمراں رہ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی برہان کی تعزیت کے لیے آئی تھی لیکن وہاں اپنے بھتیجے بہادر کی تائید کے لیے اسے رکنا پڑا۔ دوسرا دعوی اخلاص خان کے گروہ کا تھا۔ اس نے موتی نامی ایک لڑکے کو لا کر اسے سلطان منتخب کر دیا تھا۔ تیسرے گروہ کی قیادت ایک حبشی سردار ابھنگ خان نے کی اور برہان نظام شاہ اول کے بیٹے شاہ علی کی حمایت

کی۔ چوتھا فریق احمد کی حمایت کر رہا تھا جس کی قیادت میاں منجھو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بہادر کو پکڑ کر اسیر بنالیا تھا، لیکن یہ جلد ہی پتہ چل گیا کہ احمد سچا وارث نہیں تھا اور اخلاص خان کی کڑی مخالفت کی وجہ سے میاں منجھو کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس نے احمد نگر شہر میں پناہ لی اور اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد سے مدد مانگی جو اس وقت گجرات کا صوبے دار تھا۔ اکبر نے احمد نگر پر حملہ کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ میاں منجھو کے ذریعے مدد مانگنے پر اکبر کو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے مناسب موقع مل گیا اور شہزادے نے خاندیش کے حکمراں رضا علی خان اور عبدالرحیم خانخاناں کو ساتھ لے کر 1595 میں احمد نگر کی طرف کوچ کیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں حریف پارٹی کے لیڈروں نے مغلوں کو مداخلت کی دعوت دے دی۔ اس طرح اب جو جد وجہد شروع ہوئی وہ دراصل احمد نگر پر غلبہ کے لیے مغلوں اور بیجاپور کے مابین جد وجہد تھی۔ احمد نگر کے امراء چونکہ آپس میں ہی الجھے ہوئے تھے اس لیے مغل فوج کو بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس طرح مغل فوجیں راجدھانی احمد نگر تک پہنچ گئیں۔ چاندبی بی اپنے بھتیجے اور کمسن بادشاہ بہادر کے ساتھ قلعہ میں محصور ہو گئی۔ چار ماہ تک قلعہ کا محاصرہ رہا جس کے دوران چاندبی بی نے عظیم حوصلے اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ چار ماہ بعد ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ مغل بہادر کے دعوے کو تسلیم کر لیں گے اور اس کے بدلے میں برار کا علاقہ مغلوں کو مل جائے گا۔ اس طرح 1596 میں مغلوں کا اقتدار بھی قبول کر لیا گیا۔

چاندبی بی کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مغلوں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مغلوں نے احمد نگر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جن میں پتھری بھی شامل تھا۔ اسے احمد نگر کو ابھی واپس نہیں کیا گیا تھا۔ جبکہ برار کے دو قلعے غالب گڑھ اور نرنالہ، احمد نگر کے افسروں کے قبضے میں تھے۔ اس لیے لڑائی پھر سے شروع ہونے کے اسباب تو پہلے سے ہی موجود تھے۔ محمد خان کے ذریعے مغلوں سے مدد کی درخواست کرنے پر حملے کا دوسرا بہانہ بھی مل گیا۔ مغل سلطنت میں برار کے انضمام سے دکنی ریاستیں ہوشیار ہو گئیں۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برار حاصل ہو جانے کے نتیجے میں دکن میں مغلوں کے قدم جم جائیں گے اور وہ کسی بھی وقت پیش قدمی کی حیثیت میں آجائیں گے۔ یہ خدشہ بے وجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ احمد نگر کی حامی ہو گئیں اور مغلوں کے ذریعے برار کے الحاق کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں۔ جلد ہی بیجاپور کے ایک کمان دار جمال خان کی قیادت میں بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر کی ایک بڑی اور مشترکہ فوج نے برار پر حملہ کر دیا۔ 1597 کی زبردست جنگ میں مغل فوج نے اپنے سے تین گنی دکنی فوج کو شکست دے دی۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں اور چاندبی بی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل اکیلی رہ گئی۔ حالانکہ چاندبی بی 1596 کے معاہدے کی پابندی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنے ان امیروں کو قابو میں نہیں رکھ سکی جو مغلوں کو پریشان کرنے کے لیے ان پر برار میں برابر حملے کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمد نگر کے قلعے کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔ کسی جگہ سے بھی کمک نہ ملنے کی وجہ سے چاندبی بی نے مغلوں کے ساتھ سمجھوتے کی بات شروع کی۔ لیکن مخالف گٹوں نے اس پر غداری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیا۔ اس طرح دکن کی سیاست کے ایک بہت ہی رومانوی کردار کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد مغلوں نے احمد نگر قلعے پر حملہ کر کے 1600 میں اس پر فتح حاصل کر لی۔ نوعمر سلطان بہادر کو گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ بالاگھاٹ کو بھی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ احمد نگر میں مغل چھاونی قائم کر دی گئی۔ احمد نگر کی شکست اور بہادر نظام شاہ کو قیدی بنا لینے سے دکن میں اکبر کے مسائل کا خاتمہ نہیں ہو گیا کیونکہ وہاں اب کوئی ایسا نظام شاہی شہزادہ یا امیر باقی نہیں بچا تھا جسے کافی تائید اور حمایت حاصل

ہوتی اور جو اکبر کے ساتھ صلح کی بات چیت کر سکتا۔ اس کے علاوہ مغل، احمد نگر سے آگے بڑھنے یا ریاست کے باقی ماندہ علاقوں کو زیر تسلط لانے کے بھی خواہش مند نہیں تھے۔ مغل امیروں کی آپسی تکرار سے صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔ اکبر صورت حال کا بچشم خود جائزہ لینے کے لیے پہلے مالوہ اور پھر خاندیش کی طرف بڑھا۔ وہاں اسے یہ معلوم ہوا کہ خاندیش کے نئے سلطان نے شہزادہ دانیال کا مناسب طریقے پر احترام نہیں کیا تھا جبکہ وہ خاندیش کے علاقے سے گذر کر احمد نگر جا رہا تھا۔ اکبر خاندیش میں واقع اسیر گڑھ کے قلعے کو بھی اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ قلعہ دکن کا مضبوط ترین قلعہ مانا جاتا تھا۔ قلعے کے مضبوط محاصرے اور اندرونی پھوٹ پڑنے کی وجہ سے 1601 میں خاندیش کے سلطان کو قلعے سے باہر آنا پڑا اور ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس طرح خاندیش کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس دوران شہزادہ دانیال نے جو کہ اکبر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور جس کے ہاتھوں میں دکن میں موجود تمام فوجوں کی کمان تھی، مرتضی نظام شاہ دوم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ مرتضی نظام شاہ کو احمد نگر کے زوال کے بعد نظام شاہی امیروں کے ایک گروہ نے سلطان قرار دے دیا تھا۔ معاہدے کے مطابق 1601 میں بالا گھاٹ اور تلنگانہ کے کچھ علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے گئے اور ریاست کے باقی حصے کو اس شرط کے ساتھ مرتضی نظام شاہ کے قبضے میں رہنے دیا گیا کہ وہ کبھی سرکشی نہیں کرے گا۔ اسیر گڑھ پر قبضے کے بعد اکبر شہزادہ سلیم کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے شمال کی طرف واپس لوٹ آیا۔ اگرچہ خاندیش، برار اور بالا گھاٹ کی فتح اور احمد نگر کے قلعے پر مغلوں کا قبضہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن مغلوں کو دکن میں ابھی اپنی حیثیت کو اور بھی مضبوط کرنا باقی تھا۔ اکبر کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ بیجاپور کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیے بغیر دشمن کے مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو یقین دہانی کرانے کے لیے اس کے پاس پیغامات بھیجے۔ سلطان عادل شاہ نے شہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی تجویز رکھی جو قبول کر لی گئی۔ لیکن شادی کے فوراہی بعد 1602 میں زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے شہزادہ دانیال کی موت ہو گئی۔ اس طرح دکن کی صورت حال غیر واضح اور پیچیدہ ہی رہی جس سے بعد میں اکبر کے جانشین جہانگیر کو نمٹنا پڑا۔

8.2.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی

(The Rise of Malik Ambar and the Failure of Mughals to Stabilise the Empire)

احمد نگر کے زوال نیز ضابطوں (نظام شاہی افسروں) کے ہاتھوں بہادر نظام شاہ کے قیدی بنا لیے جانے کے بعد غالب امکان یہی تھا کہ احمد نگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور اس کے مختلف حصوں پر آس پاس کی ریاستیں قبضہ کر لیتیں۔ لیکن ملک عنبر کی شکل میں ایک قابل شخص کے عروج کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ملک عنبر ایک حبشی تھا جس کی پیدائش ایتھوپیا میں ہوئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے نادار والدین نے اسے بغداد کے غلام بازار میں فروخت کر دیا تھا جسے بعد میں ایک تاجر خواجہ بغدادی نے خرید لیا اور اپنے ساتھ دکن لے آیا جہاں کی خوش حالی اس وقت میں چاروں طرف کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بغدادی نے اسے احمد نگر میں چنگیز خان کے ہاتھوں بیچ دیا، جو کہ مرتضی نظام شاہ اول کا وزیر تھا۔ ملک عنبر نے امیر چنگیز خان کے یہاں ملازمت کے دوران کافی ترقی کی۔ جب مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا تو ملک عنبر اپنی قسمت آزمانے کے لیے بیجاپور چلا گیا۔ لیکن وہ جلد ہی واپس آ گیا اور چاند

بی بی کے مخالف حبشی گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد نگر کی شکست کے بعد ملک عنبر نے ایک نظام شاہی شہزادہ کو ڈھونڈ نکالا جسے اس نے بیجاپور کے حکمران کی درپردہ تائید اور مدد سے مرتضی شاہ دوم کے نام سے گدی پر بٹھادیا، اور خود اس کا پیشوا بن گیا۔ پیشوا کا خطاب احمد نگر میں پہلے ہی سے رائج تھا۔ ملک عنبر نے کافی بڑی تعداد میں مراٹھا فوج (بارگی) اکٹھی کرلی۔ مراٹھا کافی تیز رفتاری سے حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دشمن کی فوجوں کی رسد کی لوٹ مار اور کمک کا راستہ کاٹ دینے میں کافی ماہر تھے۔ اگرچہ دکن میں یہ چھاپہ مار طریقہ جنگ مراٹھوں کے لیے ایک روایت بن چکی تھی، لیکن مغل اس سے قطعی ناآشنا تھے۔ ملک عنبر نے مراٹھوں کی مدد سے مغلوں کے لیے برار، احمد نگر اور بالا گھاٹ میں اپنی حیثیت مضبوط بنانا مشکل کر دیا۔ اس وقت دکن میں مغلوں کا کمانڈر عبدالرحیم خانخاناں تھا جو کہ ایک بہت ہی دور اندیش اور زیرک سیاست داں نیز قابل فوجی تھا۔ اس نے 1601 میں موجودہ مہاراشٹر کے مقام نانڈیر میں ملک عنبر کو شکست فاش دی لیکن اس نے ملک عنبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ نظام شاہی کے باقی علاقے میں استحکام برقرار رہنا ہی مناسب ہو گا۔ دوسری طرف ملک عنبر نے بھی خانخاناں کے ساتھ دوستی میں بہتری سمجھی کیونکہ اس طرح اسے اپنے اندرونی مخالفوں سے نپٹنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ یہ معاہدہ 1605 میں اکبر کی موت تک قائم رہا۔ اس کے بعد ملک عنبر نے مغلوں پر برابر حملے کیے۔

8.3 جہانگیر کے عہد میں دکن

8.3.1 میواڑ کے ساتھ صلح و احمد نگر سے جنگ

(Truce with Mewar and, War with Ahmadnagar)

جہانگیر نے دکن کی ریاستوں کے بارے میں اپنے باپ کی سیاست کی پیروی کی۔ وہ سارے دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ مغلوں کی پیش رفت میں سب سے بڑی روکاوٹ خود ملک عنبر تھا جس کی تنظیمی لیاقت، استحکام اور اثر و رسوخ ناقابل انکار تھے۔ عنبر کو بغداد کے بازار سے قاسم خواجہ نامی شخص نے خریدا اور احمد نگر لاکر مرتضی نظام شاہ اول کے لائق و ممتاز وزیر میر کک دبیر چنگیز خاں کے ہاتھ فروخت کیا۔ جب برار اور خاندیش مغلوں کے قبضے میں آگئے تو عنبر نے بیجاپور میں ملازمت کرلی لیکن اس کی قسمت میں احمد نگر ہی لکھا تھا لہذا وہ احمد نگر واپس آیا اور حبشی سردار ابھنگ خاں نے اس کو 150 گھوڑوں کا منصب دار بنادیا۔ جب دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا تو عنبر اور ملک راجو کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مغل علاقے میں لوٹ مار اور غارت گری پھیلائیں۔ اس دوران اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عنبر کی کاروائیوں کا حلقہ تلنگانہ کی سرحدوں سے لے کر بیڑ اور چیول تک پھیل گیا۔ اس حلقے میں احمد نگر و احمد آباد کے بھی کچھ علاقے شامل تھے۔ احمد نگر کے زوال کے بعد بھی انہوں نے غارت گری کا کام جاری رکھا اور اس طرح مغلوں کو زبردست پریشانی لاحق ہو گئی۔

مغلوں اور ملک عنبر کے درمیان پہلی جھڑپ 02-1601ء میں ہوئی۔ مغل فوج کی کمان عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا مرزا ایرج کر رہا تھا۔ مندیر کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا لیکن اس کے وفادار ساتھی اس کو نکال لے گیے۔ ملک عنبر کی کاروائیوں میں ملک راجو کی رقابت اور مخاصمانہ سرگرمیاں رکاوٹ بن گئیں۔ چونکہ ان دونوں میں صلح کا کوئی راستہ نہ نکل سکا لہذا ملک عنبر

نے مغلوں سے صلح کرنے کی ٹھان لی۔اس نے سرحد کا مسئلہ مغلوں کے ساتھ طے کر لیااور خود خانخاناں کا منظور نظر بن گیا۔اس کے بعض حامیوں نے اس تبدیلی سیاست کو پسند نہ کیااور اس کی حمایت سے دست کشی اختیار کر کے مرتضی شاہ سے جاملے۔ نظام شاہ نے ملک عنبر سے لڑنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن 1603ء میں اس کو شکست ہوئی۔اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عنبر نے پرندا کے قلعہ پر قبضہ کر لیااور یہ قلعہ اس کے خاندان کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ جس کی اس کو سخت ضرورت تھی۔جب دانیال نے دکن پر حملہ کیاتواس وقت نظام شاہ نے عنبر کواپنی طرف ملالیااور وہ مغلوں کو پریشان کرنے لگا۔ نظام شاہ عنبر کی ادھوری حمایت سے اکتا گیااور اس نے راجو سے عنبر کو زیر کرنے کے لیے مدد طلب کی۔جب عنبر نے یہ دیکھا کہ وہ راجو کا مقابلہ نہ کر سکے گا تو وہ پھر مغلوں سے مدد کا طالب ہوا۔خانخاناں کی زیرکانہ سیاست یہ تھی کہ وہ ان دونوں رقیبوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھے تاکہ وہ اپنے معاملات میں منہمک رہیں۔ نظام شاہ نے 1607ء میں عادل شاہ کی مدد سے راجو کو گرفتار کر لیااور اس طرح عنبر کا راستہ صاف ہو گیا۔

ملک عنبر نے اپنی عقل خداداد سے یہ سمجھ لیا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل اور مقابل کے ترقی یافتہ فن جنگ کے سبب مغلوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہو سکتااور یہ بات پچھلے تجربوں سے خوب واضح تھی۔اس نے گوریلا جنگ کے فوائد کا اندازہ لگایا جو میواڑ کے ہندو راجااور بندیل کھنڈ اور افغانستان کے سرحدی قبائل نے مغلوں کے برخلاف جاری کر رکھی تھی اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔ملک عنبر نے مراٹھوں کی پھرتیلی سوار فوج کی تعداد بڑھائی اور ان لوگوں کو گوریلا فن جنگ کی سخت تربیت دی۔ عنبر نے بحری فوج کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہ کیا جو اس کی ریاست اور ایران کے درمیان تجارتی تعلقات کی حفاظت کے لیے ضروری تھی۔اس نے راج گڑھ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ جنجیرہ کو بحری چوکی بنانے کے لیے تجویز کیااور فوجی کشتیوں پر عربی النسل حبشیوں کو ملازم رکھا۔یہ لوگ سیدی کہلائے۔ان کی قوت مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی قائم رہی اور وہ مراٹھوں اور یورپی طاقتوں کو عرصے تک پریشان کرتے رہے۔ان تیاریوں کی تکمیل کے بعد اس نے احمد نگر کے ان علاقوں کی واپسی کی کوشش کی جن کو مغل فتح کر چکے تھے۔خوش قسمتی سے اس وقت دکن میں مغل سلطنت آپس کی رنجشوں اور نااتفاقی کے سبب کمزور ہو گئی تھی. نااتفاقی کچھ تو جنوبی ریاستوں کے زر و جواہر کے سبب پیدا ہوئی جو فساد کی جڑ ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ مغل افسر دکن کی طولانی پہاڑی جنگوں سے اکتا چکے تھے۔حالانکہ جہانگیر دکن کی سیاست کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا پھر بھی اس نے اپنے بہترین افسروں کو جن پر اسے پورا اعتماد تھا دکن روانہ کیا۔1608ء میں اس سے عبدالرحیم خانخاناں نے یہ تحریری وعدہ کیا کہ اگر اس کو بارہ ہزار مزید فوج اور دس لاکھ روپیہ دے دیا جائے تو وہ اس خدمت کو سرانجام دے گا۔ جہانگیر نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور شاہی اصطبل سے بہترین گھوڑے، پانچ ہاتھی، مرصع تلوار اور خلعت عطا کیا۔جب عبدالرحیم خانخاناں نے جنگ میں کافی جوش و خروش نہ دکھایا تو پھر شہزادہ پرویز اور شریف خاں وزیر اعظم کو 1610ء میں مزید فوج دے کر روانہ کیا گیا لیکن شہنشاہ کے ان سب اقدامات کے باجود کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ عنبر کے مقابلے میں مغلوں کی کچھ نہ چلی کیونکہ اس کے پرچم کے نیچے ایک بڑی فوج جمع ہو گئی تھی۔

ایک دفعہ جہانگیر نے بھی یہ ارادہ کیا کہ وہ خود دکن جا کر وہاں کے معاملات کو سلجھائے لیکن امراء نے اس کو باز رکھااور خانخاناں نے وعدہ کیا کہ دکن کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا جائے گا۔سچ تو یہ ہے کہ بہت کم مغل افسروں کو جنوب کے سیاسی و فوجی حالات اور دشمن

کے اثر ورسوخ اور وسائل کا صحیح علم تھا۔تازہ فوجی کمک پہنچنے سے قبل خانخاناں کو دکن میں زبردست زک اٹھانی پڑی اس نے یہ کوشش کی کہ احمد نگر پر یکایک حملہ کر کے اس کو فتح کر لے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی دشمن باہر نکل کر لڑنے کو تیار نہ ہوا۔اس کے برخلاف انہوں نے گوریلا ترکیبیں اس کامیابی کے ساتھ انجام دیں کہ مغل فوج کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی رسد جو کہ پہلے ہی سے قحط کے سبب کم تھی بالکل ہی منقطع ہو گئی۔خانخاناں کو زبردست نقصان ہوا اور اس نے صلح کر لی۔وہ برہان پور واپس لوٹ گیا۔اس ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ 1610ء میں احمد نگر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔جہانگیر کو اس بات کا یقین دلا گیا کہ مغلوں کی شکست کی بنیادی وجہ خان خانان کی دورویہ پالیسی ہے۔یہ کہا جاتا تھا کہ خانخاناں ملک عنبر کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور عنبر نظام شاہ کی ریاست کی مالگزاری کا 1/2 حصہ خانخاناں کو ادا کرتا تھا۔چنانچہ خانخاناں کو واپس بلا کر دکن کی مہم کی کمان خان جہان لودی کے سپرد کر دی گئی۔خانخاناں کی طرح خان جہاں نے بھی شہنشاہ کو لکھا کہ اگر وہ اس مہم کو کامیابی سے سرانجام نہ دے سکے تو اس کو شہنشاہ کی خدمت میں حضوری کے شرف سے محروم کر دیا جائے اور پھر وہ غلامان دربار کو بھی اپنی صورت نہ دکھائے گا۔

شہنشاہ کا خیال خاں جہان کے بارے میں بہت تھا اور وہ اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔چنانچہ شہنشاہ نے خان جہان کا مشورہ بخوشی مان لیا اور دوہزار احدی، دس ہزار سوار اور ساڑھے تین لاکھ روپیہ دے کر روانہ کیا۔شہنشاہ نے اپنی پگڑی بھی خان جہاں کے سر پر رکھی۔اس کے علاوہ عبداللہ کو میواڑ سے گجرات روانہ کیا اور یہ ہدایت دی کہ وہ خان جہاں سے میل جول قائم رکھے اور ناسک کے محاذ پر سرگرم عمل رہے۔ 1611ء میں خان جہاں اور ان کی اصل فوج برار اور خاندیش کے راستے روانہ ہوئی اور عبداللہ خاں براستہ ناسک روانہ ہوا۔قرار یہ پایا کہ دونوں فوجیں دولت آباد کی طرف رخ کریں اور وہاں جا کر مل جائیں۔عبداللہ نے اپنی لیاقت واستعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہا۔وہ اصل فوج کو نظر انداز کر کے دشمنوں کی سرزمین میں گھستا ہوا دولت آباد تک پہنچ گیا۔عبداللہ کو اس بے باکی و بے احتیاطی کا خمیازہ اٹھانا پڑا کیوں کہ احمد نگر کے سبک سوار دستے نے گوریلا طرز جنگ سے کام لے کر اس کو سخت پریشانی کیا،اس کی رسد منقطع کر دی اور اس کا ساز وسامان لوٹ لیا۔آخر اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور لڑتا ہوا گجرات کی سرحد تک لوٹ آیا۔اس لڑائی میں اسے اپنے چند قابل اور بہادر سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔سپہ سالار خان جہان نے اس پسپائی کی وجہ یہ بیان کی کہ امراء کے درمیان اختلافات موجود تھے۔اس کے علاوہ اس نے خانخاناں پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ظفر نگر میں روکے رکھا اور اس طرح اس پر غداری کا الزام لگایا۔شہنشاہ نے اس شکست کو پیشتر عبداللہ خاں کی جلد بازی پر محمول کیا۔1612ء میں خان جہاں سے کمان واپس لے کر ایک مرتبہ پھر عبدالرحیم خانخاناں کو سونپ دی گئی۔اس وقت عارضی طور پر شہنشاہ کی توجہ میواڑ کی طرف مبذول ہو گئی۔

8.3.2 احمد نگر کا الحاق (Annexation of Ahmednagar)

1633ء میں احمد نگر کو مغل سلطنت میں ملا لیا گیا اور آخری نظام شاہی سلطان حسین شاہ کو قید کر کے گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔فتح خاں احمد نگر مہم میں مغلوں کا ایک سیناناپک تھا۔احمد نگر کے زوال کے بعد شاہ جی بھونسلے احمد نگر کو چھوڑ کر بیجاپور کی خدمت میں چلے گئے تھے۔اسی وقت شاہ جہاں نے مراد کے کہنے پر شاہ جی کو پانچ ہزار کا منصب اور پونا کی جاگیر دی تھی۔1636ء کے بعد شاہ جہاں کی دکن

پالیسی کافی حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس نے کافی وقت جنوب میں لگا دیا اسے جنوب کا تجربہ اور علم حاصل ہو گیا تھا۔

8.3.3 گولکنڈہ کی مہم (Campaign against Golconda)

1636ء میں گولکنڈہ کے حکمراں عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر کے معاہدہ کر لیا۔ گولکنڈہ میں ایران کے شاہ کی جگہ پر شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر بھی شاہ جہاں کا نام شامل کر لیا گیا۔ گولکنڈہ جو چار لاکھ ہنوں کا ٹکس بیجاپور کو دیتا تھا، وہ معاف کر دیا گیا۔ اسی وقت گولکنڈہ کا وزیر میر جملہ گولکنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی خدمت میں آگیا۔ میر جملہ پہلے فارسی بیوپاری تھا۔ میر جملہ نے شاہ جہاں کو کوہ نور ہیرا نذر کیا تھا۔

8.3.4 بیجاپور کی مہم (Campaign against Bijapur)

1631ء میں شاہ جہاں نے آصف کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن آصف خاں کا حملہ ناکام رہا۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے مہابت خاں کو جنوب کا صوبہ دار متعین کیا۔ 1636ء میں ہی بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ نے بھی مغلوں سے معاہدہ کر کے مغل ماتحتی قبول کر لی۔ شاہ جہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبے داروں کی راجدھانی برہان پور تھی۔

8.4 اورنگ زیب کی دکن پالیسی (Aurangzeb's Deccan Policy)

دکن کی ریاستوں کے ساتھ اورنگ زیب کے تعلقات کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ 1068 تک کا ہے جس کے دوران مغلوں کا اہم مقصد احمد نگر کے ان علاقوں کو بیجاپور سے واپس لینا تھا جو 1636 کے معاہدے کی رو سے بیجاپور کو ملے تھے۔ دوسرا مرحلہ 1684 تک جاری رہا جس کے دوران دکن میں سب سے بڑا خطرہ مراٹھوں کو سمجھا گیا اور مغلوں نے شیواجی اور بعد میں اس کے بیٹے سامبھاجی کے خلاف کارروائی میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی مغلوں نے دکنی ریاستوں کے علاقوں پر چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے اور انہیں مکمل طور پر اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی۔ ان تعلقات کا آخری مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام ہو جانے پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو مکمل طور پر اپنے زیر تسلط لانے کا فیصلہ کیا۔ شاہ جہاں نے مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے 1636 کے معاہدے کے ذریعے احمد نگر کا ایک تہائی حصہ انہیں بطور رشوت دینے کے ساتھ ساتھ یہ عہد بھی کیا تھا کہ وہ کبھی بھی بیجاپور اور گولکنڈہ پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کو خود شاہجہاں ہی نے ترک کر دیا تھا۔ 58-1657 میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو نیست و نابود کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ گولکنڈہ کو بہت بڑا ہرجانہ ادا کرنا پڑا اور بیجاپور کو وہ نظام شاہی علاقے واپس کرنے پڑے جو اسے 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل ہوئے تھے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ان دونوں ریاستوں نے کرناٹک کے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے اور چونکہ یہ دونوں ریاستیں مغل سلطنت کی باج گزار ہیں اس لیے انہیں معاوضہ ادا کرنا چاہیے اور یہ کہ مغل فوجوں کی چشم پوشی کے نتیجے میں ہی انہیں یہ فتوحات حاصل ہو سکی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ دکن میں مغل فوج کا خرچ بہت زیادہ تھا اور مغلوں کے ماتحت دکنی علاقوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ناکافی رہتی تھی۔ یہ اخراجات

کافی عرصے تک مالوہ اور گجرات کے خزانے سے بھی پورے کیے جاتے رہے تھے۔ دکن میں محدود پیمانے کی پیش قدمی کی پالیسی کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو نہ تو شاہجہاں ہی بخوبی سمجھ پایا تھا اور نہ ہیاورنگ زیب۔ اس سے ایک طرف تو مغلوں کے معاہدوں اور وعدوں پر سے ہمیشہ کے لیے اعتماد اٹھ گیا اور دوسرے مغل حکمران، مراٹھوں کے خلاف دوسری طاقتوں کو بھی متحد نہیں کر سکے۔ اورنگ زیب نے اس پالیسی کی کامیابی کے لیے 25 برسوں تک مسلسل کوشش کی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔

8.4.1 پہلا مرحلہ (First Stage, 1658–68)

تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اورنگ زیب کو دکن کے سلسلے میں دو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مسئلہ تھا اور دوسرا مسئلہ بیجاپور کی ریاست کو اس بات کے لیے راضی کرنے کا تھا کہ وہ 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل علاقے مغلوں کو واپس کر دے۔ 1657 میں کلیانی اور بیدر کو واپس لے لیا گیا تھا اور 1660 میں رشوت دے کر پرندا بھی حاصل کیا جا چکا تھا۔ لیکن شولاپور کی واپسی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے شیواجی اور عادل شاہ کو سزا دینے کے لیے راجہ جے سنگھ کو دکن بھیجا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کو اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ تھا اور وہ دشمن کی طاقت کو کم سمجھتا تھا۔ لیکن راجہ جے سنگھ ایک مشاق سیاست باز تھا۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا کہ ان دونوں بے وقوفوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا نادانی ہو گی۔ بہر حال جے سنگھ وہ واحد مغل سیاست داں تھا جس نے اس زمانے میں دکن میں بھرپور پیش قدمی کی تائید کی تھی۔ جے سنگھ کا خیال تھا کہ دکن میں بھرپور حملے کی پالیسی اپنائے بغیر مراٹھوں کے مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ اورنگ زیب اس نتیجے پر پورے 20 سال بعد پہونچ پایا تھا۔ جے سنگھ نے بیجاپور کے خلاف فوجی تیاریوں کے دوران اورنگ زیب کو لکھا تھا 'بیجاپور پر فتح پورے دکن اور کرناٹک پر فتح کا پیش خیمہ ثابت ہو گی' لیکن اورنگ زیب اتنا جرات مندانہ قدم اٹھانے سے کترا رہا تھا۔ ہم اس کے اس رویے کے اسباب کے بارے میں صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غالباً اس وقت ایرانی حکمران، ہند کے شمال مغربی علاقوں پر منڈرا رہا تھا، جس سے شمال مغرب کو خطرہ لاحق تھا۔ پھر یہ کہ دکن کی مہم کافی طویل اور دشوار بھی ثابت ہو سکتی تھی اور خود بادشاہ کی موجودگی کی بھی نوبت آسکتی تھی، کیونکہ اتنی بڑی فوج کسی سردار یا آرزومند شہزادے کی کمان میں زیادہ عرصے کے لیے ہرگز نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ اس بات کا تلخ تجربہ شاہجہاں کو تو ہو ہی چکا تھا اور شاہجہاں کے زندہ رہتے اورنگ زیب کسی دور کی مہم پر خود کیسے جا سکتا تھا؟ اس مہم کے نتیجے میں دکن کی تمام ریاستیں، مغل سلطنت کے خلاف متحد ہو گئیں اور قطب شاہ نے بیجاپور کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج بھی بھیجی۔ دکنی ریاستوں نے چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اپناتے ہوئے جے سنگھ کو بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے راغب کیا جبکہ دیہاتی علاقوں میں دھان کی فصلوں کو خود ہی برباد بھی کرتے گئے تاکہ مغلوں کو ان علاقوں میں کسی طرح کی رسد نہ حاصل ہو سکے۔ اب جے سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شہر پر حملہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایسی بڑی توپیں لایا ہی نہیں تھا جو کسی شہر کی فصیل توڑ سکتی تھیں اور اس طرح شہر کا محاصرہ بھی ناممکن تھا۔ پیچھے ہٹنا بھی بہت مہنگا ثابت ہوا۔ نہ تو کسی طرح دولت ہی ہاتھ آئی اور نہ ہی کوئی علاقہ ہاتھ آیا۔ اس مایوسی اور اورنگ زیب کی ناراضگی کی وجہ سے جلد ہی 1667 میں راجہ جے سنگھ کی موت ہو گئی۔ اگلے سال میں مغل رشوت کے ذریعے شولاپور کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح پہلا مرحلہ تمام ہوا۔

8.4.2 دوسرا مرحلہ (Second Stage, 1668–84)

1668 تا1670 کی درمیانی مدت میں مغل دکن میں پیش قدمی کرنے کے موقعہ کا انتظار کرتے رہے۔اس عرصے میں گولکنڈہ کی سیاست میں ایک نیا عصر مدنا اور اکھنا کی ابھرتی ہوئی طاقت تھی۔ گولکنڈہ پر 1672 سے 1687 تک دراصل ان دونوں زیرک بھائیوں نے ہی حکومت کی۔ان دونوں بھائیوں نے گولکنڈہ بیجاپور اور شیواجی کو ملا کر ایک سہ فریقی طاقت قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال یہ کوشش بیجاپور کے اندرونی خلفشار اور شیواجی کی از حد آرزومندی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ پھر یہ کہ بیجاپور کے مختلف طبقات سے یہ امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی مستقل پالیسی پر کاربند رہ سکیں گے۔ وہ اپنی فوری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق کبھی تو مغلوں کا ساتھ دیتے اور کبھی ان کے خلاف ہو جاتے تھے۔ شیواجی بھی کبھی بیجاپور کو لوٹتا اور کبھی مغلوں کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دیتا۔ اگرچہ اورنگ زیب مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن میں مغلوں کی محدود پیش قدمی کے حق میں تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے بیجاپور کی گدی پر ایسے حکمران کو بٹھانے کی بارہا کوشش کی جو شیواجی کے خلاف مغلوں کے ساتھ تعاون کر سکتا ہو اور گولکنڈہ کے زیر اثر نہ ہو۔اس پالیسی کے تحت مغلوں نے بیجاپور کے معاملات میں کئی بار مداخلت کی جن کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مغلوں کی سیاسی اور فوجی کوششوں کا ایک ہی نتیجہ ہوا اور وہ یہ کہ اس طرح دکن کی تینوں ریاستوں کو ان کے خلاف متحد ہو جانے کا موقع مل گیا۔ مغل گورنر دلیر خان کی بیجاپور پر قبضے کی آخری کوشش 80-1679 بھی ناکام رہی۔اس ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغل گورنر کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ وہ دکن کی ریاستوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کر سکتا۔اس کے علاوہ اس جنگ میں کرناٹک کی پیادہ فوج نے بھی اہم رول ادا کیا۔ بیجاپور کی مدد کے لیے وراڈ کے حکمران پریم نایک نے 30000 فوجی بھیجے تھے تاکہ وہ مغل فوج کے محاصرے کا مقابلہ کر سکے۔ بیجاپور کی مدد کے لیے شیواجی نے بھی ایک بھاری فوج بھیجی تھی اور مغل علاقوں پر چاروں طرف سے حملے شروع کر دیتے تھے۔اس طرح دلیر خان کو بے نیل مرام واپس لوٹا پڑا بلکہ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اب مراٹھوں کے حملے کے لیے مغل علاقوں کے دروازے پوری طرح کھل گئے۔اورنگ زیب نے دلیر خان کو واپس بلا لیا۔

8.4.3 تیسرا مرحلہ (Third Stage, 1684–87)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 1676 اور 1680 کے درمیان مغلوں کو دکن میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔اورنگ زیب 1681 میں اپنے باقی بیٹے شہزادہ اکبر کا تعاقب کرتا ہوا دکن پہونچا۔اس نے اپنی ساری طاقت شیواجی کے بیٹے اور جانشین سامبھاجی کے خلاف لگاری اور اس کے ساتھ ہی بیجاپور اور گولکنڈہ کو مراٹھوں کا ساتھ چھوڑ دینے کے لیے رضامند کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ لیکن اس کی ان کوششوں کا بھی وہی انجام ہوا جو اس سے پہلے مغل گورنروں کی کوششوں کا ہوا تھا۔ صرف مراٹھنا ہی مغلوں کی طاقت کے خلاف ڈھال بن سکتے تھے اور دکن کی ریاستیں اس ڈھال سے محروم ہونے کے لیے ہر گز تیار نہیں تھیں۔اورنگ زیب نے اب ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے باج گزار کے طور پر عادل شاہ کو یہ حکم دیا کہ وہ مغل فوج کے لیے رسد فراہم کرے، مغل فوجوں کو اپنے علاقوں سے آزادانہ طور پر گزرنے دے اور مراٹھوں کے خلاف جنگ کے لیے 5000 سے 6000 گھڑ سوار فوج بھی دے۔اس نے مغلوں کی مخالفت کرنے والے

ایک اہم بیجاپوری امیر شرزہ خان کو برخاست کرنے کی بھی مانگ کی۔ایسی صورت میں عادل شاہ اور مغلوں کا اختلاف کھل کر سامنے آنا لازمی تھا۔عادل شاہ نے گولکنڈہ اور سامبھاجی یعنی دونوں ہی سے مدد کی درخواست کی اور اسے یہ مدد فوراہی حاصل بھی ہوگئی۔تاہم دکنی ریاستوں کی یہ مشترکہ فوج بھی مغل طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکی، خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ مغل فوجوں کی کمان خود شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی۔تب بھی مغلوں کو اپنا محاصرہ 18 مہینوں تک جاری رکھنا پڑا اور اس محاصرہ کے آخری مرحلوں تک فوج کی کمان اورنگ زیب نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی۔آخر کار 1686 میں بیجاپور نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔جتنی مشکل سے یہ مغل مہم کامیاب ہو پائی،اس سے 1665 میں جے سنگھ اور 1679-80 میں دلیر خان کی مہموں کی ناکامی کے اسباب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔بیجاپور کی شکست کے بعد گولکنڈہ پر مغلوں کا حملہ لازمی تھا۔قطب شاہ کے گناہ اتنے زیادہ تھے کہ انہیں کسی طور معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس نے غیر مسلموں مدنا اور اکھنا کو بے مہار اختیارات دے رکھے تھے اور کئی موقعوں پر شیواجی کی بھی مدد کر چکا تھا۔اس کی غداری کا تازہ واقعہ یہ تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی تنبیہہ کے باوجود 40000 سپاہیوں سے بیجاپور کی مدد کی تھی۔1686 میں بھاری مزاحمت کے باوجود مغل فوجیں گولکنڈہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں ۔بھاری تاوان جنگ، کچھ علاقوں اور مدنا اور اکھنا بھائیوں کے ہٹانے کے عوض میں اورنگ زیب قطب شاہ کو معافی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔قطب شاہ بھی یہ شرطیں مان لینے کے لیے تیار ہو گیا اور مدنا اور اکھنا کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔لیکن یہ بھی قطب شاہی حکومت کو نہیں بچاسکا۔اورنگ زیب اپنی اس مہم میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کا خاتمہ،دراصل اس کے لیے نئی مشکلات کا نقطہ آغاز تھا۔اب اورنگ زیب کی زندگی کا سب سے اہم اور آخری دور شروع ہوا۔

8.4.4 اورنگ زیب اور مراٹھا (Aurangzeb and the Marathas)

بیجاپور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ زیب نے اپنی ساری طاقت، مراٹھوں کے خلاف لگادی۔1689 میں اپنے خفیہ ٹھکانے سنگ میشور پر مغلوں کے ایک اچانک حملے سے سامانی ششدر رہ گیا۔اسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا اور باغی اور کافر قرار دے کر اسے قتل کر دیا گیا۔بلاشبہ یہ اورنگ زیب کی ایک دوسری بھاری سیاسی غلطی تھی۔وہ مراٹھوں کے ساتھ سمجھوتا کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ پر اپنی فتح کو مستقل شکل دے سکتا تھا۔اس نے سامبھاجی کو قتل کر کے نہ صرف یہ کہ اس بات کا موقع کھو دیا بلکہ اس طرح مراٹھوں کے لیے جواز بھی پیدا کر دیا۔کسی ایک جھنڈے تلے اکٹھے نہ ہونے کی وجہ سے مراٹھے سردار مغل علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے لیے آزاد تھے اور مغل فوج کے آنے پر ادھر ادھر غائب ہو جاتے تھے۔اورنگ زیب نے مراٹھوں کو ختم کر دینے کے بجائے اس نے انہیں سارے دکن میں اپنی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کا موقع دے دیا۔سامبھاجی کے چھوٹے بھائی،راجہ رام کی تخت نشینی تو عمل میں آئی، لیکن راجدھانی پر مغلوں کے حملے کی وجہ سے اسے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔راجہ رام نے مشرقی ساحل پر واقع بینجی میں پناہ لی۔وہیں سے مغلوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔اس طرح مراٹھوں کی مزاحمت اب مغرب سے مشرقی ساحل تک پھیل گئی۔بہر حال اس وقت اورنگ زیب اپنے تمام مخالفوں اور دشمنوں کو ختم کر کے اپنے اقتدار کے نقطہ عروج پر پہونچ چکا تھا۔اس کے بعض امراء کا خیال یہ تھا کہ اسے اب شمالی ہند واپس لوٹ جانا چاہیے اور مراٹھوں کی سرکوبی کا کام دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایک ایسا حلقہ،

جسے ولی عہد شاہ عالم کی بھی تائید حاصل تھی، یہ رائے دے چکا تھا کہ کرناٹک کی ریاست کا بندوبست گولکنڈہ اور بیجاپور کے ماتحت حکمرانوں پر چھوڑ دیا جائے۔اورنگ زیب نے ان تمام تجویزوں کو مسترد کر دیا اور دکن کے حکمرانوں سے براہ راست بات چیت شروع کرنے کے جرم میں شاہ عالم کو قید کر دیا۔ یہ سمجھ کر کہ 1690 کے بعد مراٹھوں کی طاقت کا قلع قمع ہو چکا ہے،اورنگ زیب نے اپنی ساری توجہ کرناٹک کے وسیع اور خوش حال علاقوں پر قبضے کی طرف مبذول کی۔ لیکن ان سارے علاقوں پر کنٹرول قائم رکھنا اورنگ زیب کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ جیسی مفتوحہ ریاستوں میں انتظام اور بندوبست کو نظر انداز کر کے، دور دراز کے علاقوں تک بلا ضرورت مواصلاتی بندوبست مجموعی طور پر اچھی طرح کیا گیا مگر بیجاپور کے مراٹھا شورش والے علاقے انتشار اور ابتری کے شکار رہے۔

1690 سے 1703 تک کی درمیانی مدت میں اورنگ زیب، مراٹھوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہ کرنے کی ضد پر ہی قائم رہا۔ تیجی میں راجہ رام کا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہ محاصرہ کافی طول کھینچ گیا۔1698 میں یہ بھی فتح ہو گیا لیکن اصل شکار یعنی راجہ رام نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مراٹھوں کی مزاحمت میں اور شدت آگئی اور کئی موقعوں پر مغلوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مراٹھوں نے اپنے کئی قلعے واپس لے لیے اور راجہ رام بھی ستارا واپس لوٹ آنے میں کامیاب ہو گیا۔ان ناکامیوں سے اورنگ زیب کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور اس نے مراٹھوں کے تمام قلعوں پر دوبارہ قبضے کی ٹھان لی۔1700 سے 1705 تک کے ساڑھے پانچ سال کے سارے عرصے میں اورنگ زیب اپنے مریض اور تھکے ہوئے جسم کو محاصروں کے سلسلے میں ایک قلعے سے دوسرے قلعے تک ڈھوتا رہا۔ طغیانیوں بیماریوں اور مراٹھوں کے چھاپہ مار حملوں سے مغل فوجوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مغل امراء اور فوج میں تکان اور بے چینی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ ان کے حوصلوں میں بھی کمی آتی گئی اور متعدد جاگیرداروں نے مراٹھوں کے ساتھ خفیہ معاہدے بھی کر لیے اور اس شرط پر چوتھ دینا بھی مان لیا کہ مراٹھے ان کی جاگیروں میں گڑبڑی نہیں کریں گے۔1703 میں اورنگ زیب نے مراٹھوں کے ساتھ بات چیت شروع کی وہ سامبھاجی کے بیٹے شاہو کو رہا کرنے کے لیے تیار ہو گیا جو ستارا میں اپنی ماں کے ساتھ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ شاہو کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا۔اسے راجہ کا خطاب اور 7000 ہزاری منصب دیا گیا۔ بڑا ہونے پر اس کی شادی معزز مراٹھا خاندانوں کی دو لڑکیوں کے ساتھ کر دی گئی تھی۔اورنگ زیب، شاہو کو شیواجی کا سوراجیہ اور دکن میں سردیش مکھی کا حق دینے اور اس طرح اس کی مخصوص حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ شاہو کا استقبال کرنے کے لیے 70 سے زائد مراٹھا سردار بھی جمع ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر اورنگ زیب کو مراٹھوں کے اصل عزائم کے بارے میں شک ہو گیا اور اس نے ان تمام تیاریوں کو منسوخ کر دیا۔1706 میں اورنگ زیب کو یقین ہو گیا کہ مراٹھوں کے سارے قلعوں پر قبضہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔اس نے آہستہ آہستہ اورنگ آباد کی طرف واپس ہونا شروع کر دیا جبکہ راستے میں مراٹھوں کے حملے بھی جاری رہے۔اس طرح 1707 میں اورنگ آباد میں اورنگ زیب نے جب آخری سانسیں لیں تو وہ اپنے پیچھے ایک ایسی سلطنت چھوڑ گیا جو بالکل کمزور ہو چکی تھی اور جس میں مختلف قسم کے مسائل سر اٹھانے لگے تھے۔

8.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغلوں کی دکن پالیسی ایک طویل اور پیچیدہ عمل تھا جس میں ابتدائی کامیابیوں کے باوجود مستقل استحکام حاصل نہ کیا جاسکا۔ اکبر نے دکن میں مداخلت کر کے مغل اقتدار کی بنیاد رکھی، لیکن وہاں کے داخلی اختلافات اور مضبوط مقامی قیادت نے مغلوں کو مکمل کامیابی سے محروم رکھا۔ جہانگیر کے دور میں ملک عنبر کی قیادت میں مزاحمت نے مغلوں کی پیش قدمی کو محدود کر دیا، جبکہ شاہجہاں نے وقتی طور پر کچھ کامیابیاں حاصل کیں اور معاہدات کے ذریعے دکن کی ریاستوں کو تابع بنایا۔ تاہم اورنگزیب کے دور میں دکن کی مہمات طویل اور مہنگی ثابت ہوئیں۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو فتح تو کر لیا، لیکن مراٹھوں کی مسلسل مزاحمت اور گوریلا جنگی حکمت عملی نے مغل طاقت کو کمزور کر دیا۔ ان طویل جنگوں نے سلطنت کے مالی وسائل کو ختم کیا اور انتظامی نظام کو بھی متاثر کیا۔ بالآخر دکن کی مہمات مغل سلطنت کے زوال کی ایک بڑی وجہ بنیں، کیونکہ ان کے نتیجے میں نہ صرف فوجی طاقت کمزور ہوئی بلکہ سیاسی استحکام بھی ختم ہو گیا۔

8.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

گوریلا طرزِ جنگ: یہ ایک ایسی جنگی حکمت عملی ہے جس میں دشمن پر اچانک حملہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ جایا جاتا ہے۔ مراٹھوں نے اس طریقۂ جنگ کو مہارت سے استعمال کیا، جس سے مغل فوج کو شدید مشکلات پیش آئیں کیونکہ وہ روایتی جنگ کے عادی تھے۔

ملک عنبر: ملک عنبر ایک قابل حبشی رہنما تھا جس نے احمد نگر کی ریاست کو مغلوں کے خلاف منظم کیا۔ اس نے مراٹھوں کی مدد سے گوریلا جنگ کو فروغ دیا اور مغلوں کی پیش قدمی کو طویل عرصے تک روکے رکھا۔

مراٹھا مزاحمت: مراٹھوں کی وہ مسلسل جدوجہد جس کے ذریعے انہوں نے مغلوں کے خلاف اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی تیز رفتار فوج اور گوریلا حکمت عملی نے مغل سلطنت کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

دکن پالیسی: مغل حکمرانوں کی وہ حکمت عملی جس کے تحت انہوں نے دکن کی ریاستوں کو فتح یا تابع کرنے کی کوشش کی۔

8.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اکبر کے عہد میں دکن کی کس ریاست کو سب سے پہلے فتح کیا گیا؟

(الف) خاندیش (ب) گولکنڈہ (ج) بیجاپور (د) میسور

2. ملک عنبر کس ریاست کا مشہور اور باصلاحیت وزیر تھا؟

(الف) بیجاپور (ب) احمد نگر (ج) گولکنڈہ (د) برار

3. مراٹھا کی گوریلا طرز جنگ کو دکن میں کس نے مؤثر بنایا؟

(الف)چاندبی بی (ب)ملک عنبر (ج)ابراہیم عادل شاہ (د) قلی قطب شاہ

4. شاہجہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبیداروں کادارالحکومت کیا تھا؟

(الف)اورنگ آباد (ب)برہان پور (ج)احمد نگر (د)دولت آباد

5. گولکنڈہ کو مغل سلطنت میں فتح کرنے والا بادشاہ کون تھا؟

(الف)اکبر (ب)جہانگیر (ج)شاہجہاں (د)اورنگزیب

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ملک عنبر کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔
2. اکبر کی دکن پالیسی کے اہم مقاصد کیا تھے؟
3. مراٹھوں کی مزاحمت نے مغلوں کو کس طرح متاثر کیا؟

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اورنگزیب کی دکن پالیسی کے مختلف مراحل کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. دکن میں مغلوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ پیش کریں۔

جوابات:1-(الف),2-(ب),3-(ب),4-(ب),5-(د)

اکائی 9۔ مغل نظم ونسق: مرکزی اور صوبائی

(Mughal Administration: Central and Provincial)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 مغل نظریہ بادشاہت

9.3 مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ

9.3.1 وکیل (وزیر اعظم)

9.3.2 دیوان (وزیر مالگزاری وخزانہ)

9.3.3 میر بخشی (وزیر عساکر)

9.3.4 میر سامان (سرکاری فرنیچر کا نگران)

9.3.5 صدر الصدور

9.3.6 نظام عدل وانصاف

9.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران

9.4 صوبائی نظم ونسق

9.4.1 صوبائی انتظامیہ کی نوعیت

9.4.2 صوبائی گورنر

9.4.3 دیوان صوبہ

9.4.4 صدر صوبہ

9.4.5 قاضی صوبہ

9.4.6 میر عدل

9.4.7 بخشی

9.4.8 کوتوال
9.4.9 دیگر انتظامی محکمہ جات
9.5 مقامی نظم ونسق یا انتظامیہ
9.5.1 سرکار
9.5.2 پرگنہ
9.5.3 گاؤں
9.6 اکتسابی نتائج
9.7 کلیدی الفاظ
9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.0 تمہید (Introduction)

1526ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر نے 1526ء میں رکھی جسے اس کے جانشینوں نے پروان چڑھایا۔ ہمایوں کی شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد شیر شاہ نے ایک بہترین انتظامیہ شمالی ہند میں قائم کی جس سے بعد میں اکبر نے فائدہ اٹھایا۔ اکبر سے اورنگ زیب تک تمام مغل حکمرانوں نے مغل سلطنت کو بہتر نظم ونسق کے ذریعہ استحکام بخشا اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس اکائی میں ہم مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی نوعیت، مغل نظریہ بادشاہت اور مرکزی ڈھانچے کے تحت ان محکموں اور افسروں کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے جن کی موجودگی سے مغل سلطنت کا مرکزی نظام بحسن خوبی چل رہا تھا۔

سلطنت کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنا نظم ونسق کے نقطہ نظر سے بہت ہی ضروری تھا۔ قدیم ہندوستان اور مسلم دنیا میں یہ روایت پہلے سے موجود تھی۔ دہلی سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلسل سیاسی کمزوری کے باعث سلاطین، صوبائی نظم ونسق کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ بابر اور ہمایوں کو صوبائی نظم ونسق میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے یا نئی روایت قائم کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم تھی اس کے عہد کے اہم صوبوں میں بنگال، مالوہ، راجپوتانہ اور ملتان وغیرہ تھے۔ صوبائی نظم ونسق کو نئی شکل دینے اور اس کو اچھی طرح عمل میں لانے کا سہرا مغل بادشاہ اکبر کے سر بندھتا ہے۔ اکبر نے 1576ء میں خالصہ زمین (جس میں بنگال، بہار اور گجرات شامل تھے) کو مالگزاری وصول کرنے کے لیے 182 اکائیوں میں تقسیم کیا۔ اس نے ہر ایک اکائی کی مالگزاری ایک کروڑ دام متعین کی۔ وہاں مالگزاری وصول کرنے والا افسر (عامل) اور ایک کروڑی کی تقرری کی مگر یہ عمل کامیاب نہ ہو سکا۔ جنوری 1580 میں اس نے اپنی سلطنت کو بارہ 12 صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبوں سے اکبر کو 90744000 روپئے مالگزاری ملتی تھی

۔اکبر نظم ونسق میں یکسانیت لانا چاہتا تھا جس کے باعث اس نے اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا۔اس کے عہد کے صوبے درج ذیل ہیں۔

1۔الٰہ آباد 2۔آگرہ 3۔اودھ 4۔اجمیر 5۔احمد آباد(گجرات) 6۔بہار

7۔بنگال 8۔دلی 9۔کابل 10۔لاہور 11۔ملتان 12۔مالوہ

اکبر نے ہر صوبے میں صوبائی صدر مقام متعین کیا۔اکبر نے جب برار، خاندیش اور احمد نگر کے قلعہ کو فتح کیا تو تین اور صوبے قائم کر دیے اس طرح اکبر کے عہد میں کل صوبوں کی تعداد 15 ہو گئی۔قندھار، کشمیر ٹھٹہ اور اڑیسہ کی فتح کے بعد اس نے کشمیر اور قندھار کو صوبہ کابل اور ٹھٹہ کو صوبہ ملتان میں ملا دیا اسی طرح اڑیسہ کو صوبہ بنگال سے ملحق کر دیا گیا اس سے صوبوں کی تعداد 15 تھی۔جہانگیر کے عہد میں اڑیسہ اور ٹھٹہ نئے صوبے بن گئے۔اس طرح جہانگیر کے عہد میں کل سترہ صوبے تھے۔شاہجہاں کے عہد میں صوبوں کی تعداد بائیس ہو گئی۔اس میں سے قندھار 1648 میں مغلوں کے کنٹرول سے نکل گیا۔دکن میں شاہی ریاست کو فتح کرنے کے بعد دکن کے صوبوں دولت آباد، احمد نگر، تلنگانہ، خاندیش اور برار کے نظم ونسق کو بہتر اورنگ زیب نے اپنی صوبیداری کے دوران کیا۔ان صوبوں کی راجدھانی پہلے دولت آباد تھی بعد میں اورنگ آباد میں قائم کی گئی۔اورنگ زیب کے عہد حکومت میں خصوصاً اس کی وفات کے وقت صوبوں کی تعداد 21 تھی۔صوبائی نظم ونسق مرکزی انتظامیہ کی ایک چھوٹی شکل تھی۔صوبائی نظم ونسق یا انتظامیہ میں جو اعلیٰ افسر ہوتے تھے ان میں سپہ سالار یا صوبیدار، دیوان، بخشی، صدر کوتوال وغیرہ اہم تھے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغلوں کے نظریہ بادشاہت سے واقف ہو سکیں گے۔
- مرکزی نظام حکومت کی نوعیت اور اس کے ڈھانچہ کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔
- بادشاہ کے فرائض اور رعایا کے ساتھ اس کے طریقِ کار وطرز عمل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغل انتظامیہ میں رائج محکمہ جات اور ان کے افسران مثلاً وکیل، وزیر، دیوان، میر بخشی، میر سامان، صدر الصدور کے کاموں، ان کے فرائض اور شعبہ پر پڑنے والے ان کے اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔
- نظام عدل وانصاف سے متعلق معلومات فراہم کر سکیں گے۔
- مغل انتظامیہ کے صوبائی ومقامی نظم ونسق کی ماہیت اور نوعیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- صوبائی نظم ونسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے کون سے اہم محکمے اور شعبہ جات تھے اس کی معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- صوبہ کے گورنر یا حکمراں کے فرائض اور اس کے امور واختیارات کا علم ہو سکے گا۔
- دیوان اور بخشی کے فرائض منصبی اور ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں گے۔
- مقامی انتظامیہ کے شعبہ جات اور اس کے اعلیٰ افسران کے فرائض واختیارات کا علم ہو سکے گا۔

- سرکار، پرگنہ، اور گاؤں سطح کے بڑے اور چھوٹے افسران اور ان کے ماتحت کام کرنے والے عملہ کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔

9.2 مغل نظریہ بادشاہت (Mughal Theory of Monarchy)

مغل سلطنت کے فرمانرواں ظہیر الدین محمد بابر نے مغل بادشاہت کی بنیاد ترک اور منگول نظریہ بادشاہت پر رکھی جس میں کچھ عنصر ترک نظریہ حکومت سے لیے اور کچھ منگول نظریہ بادشاہت سے۔ ترک سلاطین سے لیکر اورنگ زیب تک سبھی مطلق العنان فرنرواں تھے لیکن دونوں (سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ) میں جو ایک نمایاں فرق فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مغلوں نے سلاطین دہلی کی طرح خلیفہ کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ مغل سمجھتے تھے کہ اقتدار اعلیٰ ان کو حاصل ہے۔ اس لیے انہوں نے سلطان کے بجائے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ مسلم دور حکومت میں جو نظام رائج تھا وہ شخصی حکومت واقتدار کا مظہر تھا۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اپنے طور پر ایسا نظام تجویز کیا تھا جس سے ان کی مطلق العنانی بھی قائم رہ سکتی تھی اور وہ ظالم بھی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ پوری سلطنت میں کسی مفتی اور عالم کو یہ اختیار نہ تھا کہ بادشاہ کے فیصلہ کے خلاف کوئی قدم اٹھالے۔ اگر علماء بادشاہ کے کسی فیصلے کے خلاف آواز اٹھاتے انہیں جلاوطنی کی سزا دی جاتی۔ اکبر تو مذہبی معاملات میں آخری حجت تسلیم کیا گیا تھا۔ بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ تھا۔ تمام سیاسی افکار اور ریاست کے فرائض بادشاہ میں مرکوز سمجھے جاتے تھے۔

مغل نظریہ بادشاہت جو ترک منگول نظریہ بادشاہت پر مشتمل تھا اس میں فرمانروا ایک عام رہنما سے زیادہ اعلیٰ و برتر سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہت کا مطلب ہوتا تھا طاقت، عام طور پر روز مرہ کی زندگی میں شریعت کو عام قانون سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھیں۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستان سے باہر کسی بھی طاقت کی فکری اور عملی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا۔ باہر سے اورنگ زیب تک سبھی نے یہ تسلیم کیا کہ بادشاہت عطیہ خداوندی ہے۔ مغل نظریہ بادشاہت بھی خدائی نظریہ پر قائم تھا۔ انہوں نے بھی ظل اللہ کا لقب اختیار کیا لیکن یہ نظریہ بادشاہت جو فرایزدی پر قائم تھا شاہجہاں تک چلا۔ شاہجہاں کی نظر میں بادشاہت کا مطلب ان لوگوں کی زندگی کو آسان اور آرام دہ بنانا ہے جو خدا کی امانت اور دولت ہیں۔ بادشاہ کو اپنی ساری دولت کمزوروں کی بہتری اور خدا کے بندوں کے لیے صرف کر دینی چاہیے۔ ابوالفضل نے مغل نظریہ بادشاہت کی تفصیل درج ذیل لفظوں میں بیان کی ہے۔

'بادشاہت خدا کا نور پر اور آفتاب کی ضیاء ہے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں ہم اسے فرایزدی کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اسے پر عظمت حلقہ انور کہتے تھے۔ یہ روشنی براہ راست خدا کی جانب سے بادشاہوں کو ودیعت کی جاتی ہے اور انسان اس کو دیکھ کر ان کی بارگاہ میں اپنا سر عقیدت سے خم کر دیتا ہے۔' شاہجہاں عادل خاں کے نام ایک فرمان میں اپنے آپ کو سایہ خداوندی قرار دیتا ہے۔ 'سایہ خدائیم۔' ابوالفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہت خدا کا عطیہ ہے جو اس وقت تک کسی کو ودیعت نہیں کیا جاتا جب تک اس میں ہزاروں اوصاف جمع نہیں ہو جاتے۔ ابو لفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہ کو مذاہب سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اسے تقلید کے بجائے تحقیق سے کام لینا چاہیے۔ جہانگیر بھی بادشاہت کو عطیہ خداوندی سمجھتا ہے۔ شاہجہاں اور جہانگیر دونوں نے اکبر کے ذریعہ نافذ کیے گئے اصول سیاست اور نظم حکمرانی کو اہمیت دی اور اس کی

پیروی بھی کی۔

اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے سے پہلے کے حکمرانوں سے متاثر تھا وہ خود اس پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اپنے بیٹوں کو بھی اس طرح کی تلقین کرتا رہتا تھا اس کی شہادت اورنگ زیب کے وہ رقعات ہیں جو اس نے اپنے بیٹے سلطان محمد اعظم کے نام تحریر کیے ہیں۔ 'ایک روز سعد اللہ خان شاہجہاں کی خدمت میں دیر سے حاضر ہوئے اعلیٰ حضرت نے سبب پوچھا اس نے عرض کیا کہ ایک بیاض میں چند فقرے نظر آئے تھے انہیں نقل کر رہا تھا تاکہ خدمت والا میں عرض کر دوں کہ سلطنت کی بنیاد کا قیام انصاف سے ہے، ملک و مال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالموں اور فاضلوں کے ساتھ صحبت رکھنا اور جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔ عقیدوں پر عمل کرنا ۔۔۔۔ ہنا، مصیبت کی حالت میں مستقل مزاج، دنیا کے کاموں میں کوتاہی نہ کرنا، تدبیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا، خاندان کے دائمی قیام کی بنیاد یتیموں پر رحم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے، ملکی کام وزراء کے صلاح و مشوروں سے انجام پاتے ہیں اور فتح و کامرانی فقیروں کی دعا سے، اور تندرستی دردمندوں کا درد دور کرنے سے نصیب ہوتی ہے، مجرموں کے گناہ معاف کر کے خدا کی جانب سے رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔'

اس خط میں پورا نظریہ بادشاہت اور حکمرانی کے تمام اصول موجود ہیں۔ انہیں خطوط پر اس نے اپنی سیاسی زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت یہ تھا کہ بادشاہ کو لطف و قہر کے معاملہ میں جادہ اعتدال پر رہنا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ بادشاہت کا مطلب ہے کہ لوگوں کو ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنا، عوام کی سرپرستی کرنا اور عیش و عشرت کی زندگی سے بچنا چاہیے۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے پیشرو حکمرانوں سے ضرور مطابقت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس نے کچھ مذہبی نظریات کو بھی ترجیح دی ہے۔ اس نے جہاں مغل بادشاہت اور شاہی طور و طریق کو تسلیم کیا وہیں وہ فرایزدی کا کہیں قائم نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نظریات قرآن کے سیاسی اصول پر مبنی تھے۔ بحیثیت حکمراں دیگر مغل بادشاہوں کی طرح اس کا یقین تھا کہ بادشاہ بنانے کا اختیار اللہ کو حاصل ہے۔ اوپر ابوالفضل کے الفاظ اور اورنگ زیب کے خطوط سے جس نظریہ بادشاہت کو ظاہر کیا گیا ہے وہی دراصل مغلوں کا نظریہ بادشاہت تھا۔

9.3 مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ (Central Structure of Mughal Administration)

مرکزی نظام حکومت میں اگرچہ بادشاہ ہی سب سے اہم ہوتا تھا اور حکومت کے سارے معاملات اسی کے ارد گرد ہوتے تھے پھر بھی مرکز کے سارے معاملات کی نگرانی کرنا تنہا بادشاہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ حکومت کے نظم و نسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک مجلس وزارت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ کتنا ہی لائق، مطلق العنان، اور قابل ہو لیکن بغیر وزیروں و عہدیداروں کی مدد کے وسیع و عریض سلطنت پر کنٹرول ممکن نہیں تھا۔ سیاسی مفکرین نے بادشاہ کے لیے وزیروں و صلاح کار کی ضرورت پر خاص زور دیا جاتا ہے اور کہا ہے کہ ان کی ذمہ داری اور فرائض میں سے ہے کہ وہ بادشاہ کی مدد کریں اور نظم و نسق کے سلسلے میں اسے مشورہ دیں اور اس کے کاموں کو عملی جامہ پہنائیں۔ مغل انتظامیہ میں وزیروں کی حیثیت حکمرانوں کے ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ بابر نے مہدی خواجہ کو اپنا وزیر اور زین الدین کو اپنا صدر بنایا تھا۔ مگر

ہمایوں کے عہد میں کسی کو بھی سکریٹری سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی گئی۔وزیروں کی تعداد ہمیشہ غیر متعین رہتی تھی۔وزراء کی مدد سے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے۔ مغل انتظامیہ میں سب سے اہم عہدہ وکیل یا وزیر کا ہوتا تھا۔ عملاً وہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔اکبر کا پہلا وکیل بیرم خان تھا۔ مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ درج ذیل محکموں پر مشتمل تھا۔

1. وکیل (وزیر اعظم)
2. دیوان (وزیر مالگزاری و خزانہ)
3. میر بخشی (وزیر عساکر)
4. سپہ سامان (وزیر کارخانہ و ذخائر سلطنت)
5. صدر الصدور (وزیر انصاف و امور مذہبی)
6. نظام عدل و انصاف

اس کے علاوہ محتسب، سپہ آتش، داروغہ ڈاک چوکی، مستقفی، ناظر بیوتات، سپہ بر اور داروغہ ٹکسال جیسے عہدے بھی تھے۔

9.3.1 وکیل (وزیر اعظم) (Prime Minister)

مرکزی حکومت بلکہ پوری سلطنت میں اعلیٰ ترین افسر وکیل ہوتا تھا۔وہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔اس کے خیالات لامحدود ہوتے تھے۔اس کو وکیل/وزیر اعظم کہا جاتا تھا۔وہ تمام شاہی اختیارات کا استعمال کرتا تھا۔امور خانہ داری سے لیکر شعبہ انتظامیہ تک اس کے دائرہ اختیار میں تھے۔اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمام کاروائیوں سے بادشاہ کو باخبر رکھے۔وہ کسی افسر کو مقرر یا برخاست کر سکتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ بابر اور ہمایوں ایک وزیر رکھے جانے کی روایت پر قائم تھے۔ان میں بابر کے تحت نظام الدین خلیفہ اور ہمایوں کے تحت امیر واعظ اور ہندو بیگ کو یکساں درجہ حاصل رہا۔ان کو سارے فوجی اور غیر فوجی اختیارات حاصل تھے۔شیر شاہ سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔اس کے عہد میں بادشاہ پردے کے پیچھے تھا اور حکومت وکیل (بیرم خان) کی تھی۔بیرم خان نے اپنی مرضی سے جاگیریں تقسیم کیں۔وہ ہفتہ میں دو مرتبہ دیوان خاص میں بیٹھتا اور فوجی وغیرہ فوجی امور کی مناسب طور سے انجام دیتا تھا اور اس کی اطلاع بہ کمال ادب بادشاہ کو بھیج دی جاتی تھی۔وہ بادشاہ کے ذاتی معاملات میں مداخلت بھی کیا کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اکبر نے بیرم خان کے اختیارات سلب کر لیے اور اسے معزول کر دیا۔

بیرم خان کے بعد سیاسی و مالی امور شہاب الدین گورنر دہلی کے سپرد کر دیے گئے تھے اور بعد میں بھی اس کی شریک کار بنادی گئی۔ بیرم خان کا علم، طبل اور تمن شمس الدین اتکہ خان کو عطا کر دیا گیا۔ منعم خان کو خانخانان کا خطاب عطا کیا گیا اور منصب وکالت سے بھی نوازا گیا۔اس طرح بیرم خان کے اختیارات اور اعزازات تین اشخاص کے درمیان تقسیم کر دیے گئے۔ اکبر نے منعم خان کو وکیل بنایا لیکن اسی کے بعد اکبر نے آہستہ آہستہ وکیل کے اختیارات اور طاقت کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس مقصد سے اکبر نے دیوان یا وزیر کے اختیارات میں

اضافہ کر دیااور مستقبل میں وکیل کے عہدے کی اہمیت کم ہو گئی۔ منعم خان کے بعد سال بہ سال تک اس عہدے پر کسی کا تقرر نہیں ہوا۔اکبر نے اپنے جلوس کے انیسویں سال مظفر کو ان خدمات کے اعتراف میں منصب وکالت پر سرفراز کیا۔اسے بیک وقت دیوانی اور وکالت دونوں عہدے تفویض کیے گئے لیکن کچھ ہی دنوں میں اسے وکالت سے برطرف کر دیا گیا۔اس کے بعد بالترتیب عبدالرحیم خانخانان تین سال اور خان اعظم دس سال منصب وکالت پر فائز رہے۔اکبر کے جانشیوں کے عہد میں کسی بھی وکیل کو وہ اختیارات حاصل نہ ہو سکے جو ایک شاہی حکومت میں ایک وکیل (وزیر اعظم) کو حاصل ہوتے ہیں۔

جہانگیر (1605-1627) کے عہد میں منصب وکالت پر شریف اور آصف خان کا تقرر ہوا دونوں کو دکن روانہ کر دیا گیا اور انہیں دارالسلطنت آنے کا موقع نہیں ملا۔اس لیے وکیل ہوتے ہوئے بھی انہیں اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا۔ تخت نشینی کے چوتھے سال جہانگیر نے امور سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اکیس سال تک کسی وکیل کا تقرر نہیں کیا۔اپنے عہد حکومت کے آخری سال میں جہانگیر نے اعتماد الدولہ کے لڑکے آصف خان کو اپنا وکیل مقرر کیا اس طرح جہانگیر کے بائیس سالہ عہد حکومت میں کل تین شخص صرف پانچ سال تک وکالت کے فرائض انجام دیے۔ شاہجہاں (1627-1658) نے وکیل کے اہم عہدہ پر آصف خان کا تقرر کیا اور ملکہ کی سفارش پر مہراز ک یا مہر اعظم بھی اسی کے سپرد کر دی تھی۔ آصف خان نے شہنشاہ شاہجہاں کی تخت نشینی کے پندرہویں سال وفات پائی اور اس کے بعد شاہجہاں کے عہد میں کسی نئے وکیل کی تقرری عمل میں نہیں آئی۔

وکیل کے ذمہ جو کام تھے اس میں اتکہ خان اور منعم خان نے سیاست اور مالگزاری سے متعلق سارے امور انجام دیے۔اسی طرح مظفر اپنے منصب وکالت کے دوران انتظام سلطنت میں پوری طرح دخیل تھا۔ جہانگیر کے عہد میں آصف کو قطعی طور پر یہ حکم تھا کہ وہ دیوان میں بیٹھے اور سیاست ومالیات سے متعلق معاملات کو سلجھائے۔ وکیل حیثیت اور رتبے کے لحاظ سے سلطنت کے اعلیٰ ترین فرد سمجھے جاتے تھے! اس طرح ان کا مقام ومرتبہ دیوان سے کہیں زیادہ بلند تھا۔انہیں اعزاز ووقار حاصل تھا مگر اختیار نہیں حاصل تھا۔

9.3.2 دیوان (وزیر مالگزاری وخزانہ) (Finance Minister)

مغل سلطنت میں دوسرا اہم عہدہ دار وزیر تھا جسے دیوان کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔دیوان یہ ایرانی لفظ ہے اس کا تعلق 'دبیر' بمعنی کاتب سے ہے اور یہ سریانی لفظ 'دیب' سے متعلق ہے جس کے معنیٰ جمع خرچ کے ایسے رجسٹر کے ہیں جن میں ابتدائی فتوحات کے زمانے میں اندراجات کیے جاتے تھے۔ابن خلدون کا کہنا ہے 'دیوان لفظ اس رجسٹر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں مالگزاری اور مالیات کے افسروں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے قواعد وضوابط کا اندراج ہوتا تھا۔' بعد میں اس کا استعمال ان افسروں کے لیے اور ان کے بیٹھنے کے ایوان کے لیے بھی ہونے لگا۔ مغل عہد میں یہ مالگزاری اور مالیات کے سربراہ کے لیے مخصوص ہو گیا۔اکبر کے عہد میں دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جبکہ جہانگیر کے عہد میں لفظ دیوان کی جگہ وزیر کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور شاہجہاں کے عہد میں وزیر کو دیوان کل، دیوان اعلیٰ اور اس کے شرکائے کار کو دیوان کہا جانے لگا۔ وکیل کے بعد سب سے بااختیار افسر دیوان تھا جو وزیر یا دیوان کل بھی کہلاتا تھا۔اکبر کے عہد میں اس شعبے کے لیے

کبھی کبھی وزیر اور عام طور پر دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں دیوان یا وزیر شاہجہاں کے عہد میں دیوان کل یا دیوان اعلیٰ اور اورنگ زیب کے عہد میں وزیر، وزیر اعظم جیسے الفاظ کا استعمال شعبہ مالیات کے وزیر کے لیے ہوتا تھا۔ دراصل دیوان ہی شعبہ مال و مالگزاری کا اہم وزیر ہوتا تھا مگر سبھی دیوان وزیر نہیں ہوتے تھے۔

دیوان شعبہ مالیات کا مستقل صدر ہوتا تھا۔ وہ جملہ انتظامی شعبہ جات کی باقاعدہ کارکردگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق مال سے متعلق تمام معاملات میں وہ بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔ وہ ہر اہم و ضروری کاغذ پر دستخط کرتا تھا۔ وہ مالگزاری کی تشخیص و تعیین اور اس کی وصولی کا نظم کرتا تھا اور ان کاموں سے متعلق بادشاہ کی رائے بھی لیا کرتا تھا۔ شعبہ مالگزاری کے اہم عہدیدار ہونے کی وجہ سے اس کا تعلق سبھی سرکاری عملے سے تھا جو کہ نقد تنخواہ یا جاگیر حاصل کرتے تھے۔ اس کی نیابت میں نائب نائب دیوان ہوتے تھے۔ ایک 'دیوان تن' کہلاتا تھا جو جاگیروں کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا 'دیوان خالصہ' کہلاتا تھا جو شاہی املاک کا ذمہ دار ہوتا تھا ۔ تیسرا 'دیوان بیوتات' کہلاتا تھا جس کا کام مختلف کارخانوں کی آمد و صرف کا بیورا رکھنا ہوتا تھا۔ مرکزی شاہی خزانے کی دیکھ بھال کے لیے 'مشرف خزانہ' نامی عہدیدار ہوتا تھا جو دیوان کے ماتحت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دیوان وزارت میں واقعہ نویس اور دوسرے عہدیدار بھی ہوا کرتے تھے۔ حسب ذیل عہدیدار براہ راست وزیر (دیوان) سے متعلق تھے۔

1. مستوفی یا محاسب اعلیٰ: یہ سلطنت کی آمدنی اور خرچ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھا۔ اس کو اختیار تھا کہ اخراجات کی مد کم کردے۔ شعبہ جات مالگزاری کے جملہ کاغذات پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔
2. صاحب توجیہہ: تنخواہ تقسیم کرنے والا، اس کی ذمہ داری صرف دارالسلطنت کے ملازمین کی تنخواہ بانٹنا تھا۔ معماروں اور دستکاروں کی فرد حساب پر پہلے وہ دستخط کرتا تھا۔ تب مستوفی کے پاس کاغذات جاتے تھے۔

حسب ذیل عہدیداروں کا تقرر دیوان کے ذریعہ ہوتا تھا۔

1. صدر مقام : صوبیدار، فوجدار، دیوان، کروڑی، امین اور داروغہ
2. صوبائی : مشرف، تحویلدارانِ دیہات (جو دفتر خزانہ میں تعینات رہتے تھے) خزانچی اور خزانے کے داروغہ اور محرران دفتر خزانہ
3. امین اور کروڑی : وہ اشخاص جو اہم اور ضروری کاموں کی عمل درآمد کرانے کی خدمات پر مامور ہوتے تھے۔
4. تحصیل دار : بقایہ جات کی وصولی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔
5. زمین دار : مالگزاری وصول کرنے والے ایجنٹ

اکبر کے دیوان میں مظفر خان، ٹوڈر مل اور شاہ منصور جہانگیر کے دیوانوں میں اعتماد الدولہ اور خواجہ ابوالحسن اسی طرح شاہجہاں اور اورنگ زیب کے وزیروں میں بالترتیب سعداللہ خان اور اسد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

9.3.3 میر بخشی (وزیر عساکر) (Defence Minister)

مغل سلطنت میں بخشی اعلیٰ عہدے پر فائز عہدیدار ہوا کرتا تھا جس کے ذمہ فوجیوں کی بھرتی اور ان کی تنخواہ دینے کا کام سپرد تھا۔ میر بخشی کا منصب ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مغل سلطنت میں میر بخشی کو محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو ولی سلطنت میں دیوان عرض کو حاصل تھے۔اس کے اختیارات مرکزی حکومت کے تمام شعبے تک پھیلے ہوئے تھے۔ محکمہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا ہر منصب دار سے تعلق تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی کا جائزہ اور دوسرے عسکری معاملات کا نگران بھی تھا۔اس کی مدد کے لیے ایک نائب بخشی بھی رہتا تھا جس کو بخشی دوم کہا جاتا تھا۔ نئے سپاہیوں اور منصب داروں کے گھوڑوں کو داغ و نشانی کے بعد بخشی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔اسی طرح مستقل عہدیداروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی مقررہ وقفہ کے بعد وہی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ صوبوں سے آنے ولے تمام عہدیداروں کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔ میر بخشی غسل خانے (خلوت خانہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا۔اس طرح سلطنت کے تمام اہم معاملات سے اس کا تعلق ہوتا تھا۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔اکثر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اور اس کے رفقاء کار خود میدان جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ کرتے۔ میر بخشی اور اس کے شریک کار روزانہ کے دفتری کام بھی انجام دیا کرتے تھے۔ میر بخشی کی غیر موجودگی میں بخشی دوم دربار میں حاضر ہو کر رہنے والے منصب داروں کی فہرست تیار کرتا تھا لیکن اس کی غیر موجودگی میں جاری ہونے والے تمام احکام اس کے سامنے اس کے دفتر میں پیش کیے جاتے تھے جہاں تک منصب داروں کی تنخواہوں کے حساب کا تعلق تھا میر بخشی اپنے دفتر میں وہ تمام کاغذات محفوظ رکھتا تھا جن پر اس کی مہر لگتی اور اس کے دستخط ہوتے تھے۔ لیکن تنخواہ پر اثر انداز ہونے والی رخصت اور غیر حاضری کے کاغذات بخشی دوم کے دفتر میں رکھے جاتے تھے۔ میر بخشی شہزادوں اور بڑے بڑے امراء کا کام انجام دیتا۔ بخشی دوم اس سے کچھ کم درجہ کے منصب داروں کے کام انجام دیتا اور بخشی سوم کے ذمہ منصب داروں سے متعلق کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا وہ صرف یومیہ داران کے تقرر اور ان کی تنخواہوں میں ترقی سے متعلق کام انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اختیارات، حیثیت اور اثر و رسوخ میں دیوان اعلیٰ کا ہم پلہ تھا۔ میر بخشی کو عموماً فوجوں کی تنخواہ تقسیم کرنے والا عہدیدار سمجھا جاتا تھا لیکن یہ اس کے روزمرہ کے مستقل فرائض میں داخل نہیں تھا۔

9.3.4 میر ساماں (سرکاری فرنیچر کا نگران) (Minister of the Royal Household)

میر ساماں کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا تھا، صرف ان کو دیا جاتا تھا جو باصلاحیت اور قابل اعتماد ہوں۔ چنانچہ افضل خان، سعداللہ خان اور فاضل خان اس عہدہ پر کام کر چکے تھے اور بعد میں وزرائے سلطنت ہوئے۔اس محکمہ کے عہدیدار دربار میں بادشاہ کے سامنے تمام اہم معاملات اور بڑے بڑے کاموں کے خرچ کے تخمینے پیش کرتے تھے۔ یہ محکمہ مصنوعہ سامان بادشاہ کے سامنے نمائش کے لیے رکھتا اور متعلقہ دستکار کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ میر ساماں کے محکمہ کو کارخانہ جات کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ محکمہ ان گوداموں اور کارخانوں پر مشتمل تھا جنہیں مرکزی حکومت نے سرکاری اغراض سے قائم کر رکھا تھا۔اس کا تعلق ہیرے جواہرات، تلواروں، بندوقوں اور قیمتی پتھروں

سے ہوتا تھا۔ یہ محکمہ فوج کے لیے گھوڑے اور ہاتھی، نقل و حمل کے لیے بار برداری کے جانور اور شاہی شکار کے لیے دوسرے جانوروں کا انتظام رکھتا تھا۔ میر ساماں لفظ کا استعمال اکبر کے زمانے میں نہیں ملتا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں میر ساماں اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں تقررات اور دربار شاہی کے دوروں کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے تمام ہمعصر مؤرخین نے میر ساماں ہی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ آئین وضوابط جن کا تعلق اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے ہی ان میں زیادہ تر 'خان سامان' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میر ساماں کا لفظ صرف ایک دستور میں ملتا ہے جو اس میں خان ساماں ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میر ساماں اپنے محکمہ کا سب سے بڑا انتظامی عہدیدار ہوتا تھا جو محکمے کی عام نگرانی اور اس کی کامیاب کارکردگی کا ذمہ دار ہوتا تھا اس کے ماتحت جو دوسرے عہدیدار تھے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ دیوان بیوتات، مشرف کل و جزء، داروغہ، تحویلدار، مستوفی، داروغہ کی کچہری، ناظر وغیرہ مغل انتظامیہ میں داروغہ اور تحویل دار کا ذکر جہانگیر اور شہاجہاں کے زمانے میں اکثر ملتا ہے لیکن ناظر محکمہ کا ذکر نہیں ملتا۔ میر ساماں صدر محکمہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا اور ہر شعبے کی عام نگرانی بھی کرتا تھا۔ وہ تمام امور اور تجارتی معاملات کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کراتا اور بقیہ کام خود ہی انجام دیا کرتا تھا۔ شاہی کارخانے اور بھنڈار اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ وہ مختلف چیزوں کی پیداوار اور ان کی فراہمی کے لیے بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ بادشاہ کے لیے اسلحہ وغیرہ کا بھی انتظام کرتا تھا۔ اسے دیوان عام و خاص کا انتظام، کارخانوں کا انتظام وانصرام، اشیاء، شاہی اصطبل کے جانوروں اور لائق صنعت کاروں کے بارے میں بھی بادشاہ کو اطلاع دینی ہوتی تھی اور ششماہی بجٹ بنا کر بھی دینا ہوتا تھا۔ بادشاہ تین طرح سے میر ساماں کے محکمہ پر کنٹرول رکھتا تھا۔

1. وہ ہر چھ مہینہ پر اس محکمہ کے حساب کی جانچ کرتا تھا اور اس کے معاشی انتظام کے لیے حکم دیا کرتا تھا۔
2. وہ دربار میں اس محکمہ کے کام کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا، اشیاء کی قیمتیں متعین کرتا تھا اور احکام صادر کیا کرتا تھا۔
3. وہ شاہی کارخانوں میں تیار کی گئی اشیاء کی خرید و فروخت کی جانچ کرتا تھا اور اچھے و قابل صنعت کاروں کو انعامات و اعزازات سے نوازتا تھا۔

9.3.5 صدر الصدور

صدر بادشاہ اور رعایا کے درمیان بیچ کی ایک کڑی، شریعت کا محافظ اور علماء کا نقیب ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت میں صدر الصدور کا عہدہ بڑا اہم ہوتا تھا۔ وہ محکمہ عدل وانصاف، خیرات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ صدر معاش میں دی جانے والی زمینوں کا منتظم تھا اور یہ زمین کس کو دی جائے اس کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ نئی گرانٹ کے لیے درخواستوں کی چھان بین کرنا اس کے فرائض میں تھا۔ وہ بادشاہ کو مذہبی معاملات میں مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ خیرات و مدد معاش میں دی جانے والی زمین کا تقسیم کار بھی تھا۔ چیف قاضی کی شکل میں مقدمہ کی سماعت کر کے فیصلے بھی دیتا تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضی کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کرتا اور فیصلے بھی دیا کرتا تھا۔ عدل وانصاف کے میدان میں بادشاہ کے بعد اسے دوسرا اہم مقام حاصل تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضیوں کی تقرری کے لیے بادشاہ سے سفارش بھی کیا کرتا تھا۔ اکبر کے ابتدائی دور حکومت میں صدر کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ صدر الصدور کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔ اکبر کے اولین صدر شیخ گدائی کے متعلق

بدایونی کہتا ہے کہ وہ قدیم خاندانوں کی مقبوضہ اراضی ضبط کر کے ان لوگوں کو عطا کرتا تو جو جو کی خوش آمد کرتے تھے جبکہ لائق اور اچھے خاندان کے افراد کو ہر طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اس کی تقرری بیرم خان نے 59-1558 میں کی تھی اس کے بعد خواجہ محمد صالح ہردی صدر بنے۔ بحیثیت صدر خواجہ محمد صالح ہردی کو بھی یہی اختیارات حاصل تھے۔اس کے بعد 1565 میں شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال پوری آزادی سے کیا اور بڑی بڑی آراضی مستحقین کو عطا کیں۔اکبر نے انہیں خرد برد میں ملوث ہونے کے باعث 1579 میں ہٹادیا اس کے بعد سلطان خواجہ اس عہدے پر تقرری ہوئی۔1581 میں اکبر نے نو 9 صوبوں میں صدر کی تقرری کی جس سے صدر الصدور کے اختیارات کم ہوئے۔

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کا محکمہ بہت بڑا نہیں معلوم ہوتا۔آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اہم فرائض کی انجام دہی میں ایک ممتاز کلرک بنگچی صدر کی مدد کرتا تھا جو دیوان سعادت کہلاتا تھا۔وہ تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔اکبر کے عہد میں شیخ گدائی، خواجہ محمد صالح، شیخ عبدالنبی، سلطان خواجہ، میر فتح اللہ شیرازی، اور میران صدر جہاں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔اسی طرح جہانگیر کے عہد میں میران صدر جہاں تاحیات صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا اس کے بعد موسوی خان صدر الصدور بنا۔شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں موسوی خان پندرہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا 1642 میں بادشاہ کی غیر اطمینان بخش کردار کی بنا پر برخاست کر کے اس کی جگہ پر سید جلال الدین گجراتی کا تقرر کر دیا اس کے بعد سید ہدایت اللہ دوسرے سن جلوس سے اختتام حکومت تک صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا۔اورنگ زیب نے اپنے عہد میں آٹھ صدر الصدور کی تقرری کی۔شاہجہاں کے عہد میں سید جلال الدین تمام صدور میں بہترین تھا اور اپنی علمی فضیلت، دیانت ،ایمانداری اور بے لوثی کے لیے مشہور تھا اور محترم تھا۔

9.3.6 نظام عدل وانصاف (Judiciary)

مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔اس محکمہ کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔وہ سلطنت میں محکمہ عدل وانصاف کا اعلیٰ افسر ہوا کرتا تھا۔وہ عدل وانصاف سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار اور جوابدہ ہوتا تھا۔وہ فوجداری اور دیوانی دونوں طرح کے مقدمات کو سنتا اور فیصلے صادر کرتا تھا اس کی مدد کے لیے بہت سے مفتی اور افسر ہوتے تھے۔ مغل عہد میں قاضی صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی مقرر کیے جاتے تھے۔جج ہونے کے ساتھ قاضی اپنے علاقے کے تمام اوقاف کا متولی بھی ہوتا تھا۔ بادشاہ عدل سے متعلق امور میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔روزانہ دربار میں معمولی مقدمے کی سماعت ہوتی ہے۔اہم مقدمات ہفتہ میں ایک بار، ایک دن صرف عدالتی کاموں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ بادشاہ کے سامنے زیادہ تر فوجداری مقدمے پیش ہوتے تھے۔دیوانی کے مقدمات بھی پیش ہوا کرتے تھے۔اکبر نے پنج شنبہ، جہانگیر نے سہ شنبہ اور شاہجہاں نے چہار شنبہ اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔اکبر کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ 'وہ باب عدل کھولتا ہے اور ایک عام دربار منعقد کرتا ہے۔اس کی عدالت میں صداقت وانصاف کا بول بالا ہے اس کام کے لیے وہ ساڑھے چار گھنٹے صرف کرتا ہے۔وہ کسی شخص کی شہادت اور قسم پر اعتبار نہیں

کرتا۔ ہاکنز یہی باتیں جہانگیر کے لیے لکھتا ہے۔ 'بادشاہ اس جگہ تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور روزانہ تقریباً دو گھنٹوں تک دادرسی کے بیٹھتا ہے۔' ڈیلائٹ لکھتا ہے۔ 'جہانگیر ہفتے میں ایک دن سہ شنبہ کو کرسی عدالت پر بیٹھتا ہے اور پیش کیے جانے والے تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات پورے سکون کے ساتھ سنتا ہے اور اپنے فیصلے صادر کرتا ہے جو آخری اور قطعی ہوتا ہے۔' لاہوری کے مطابق 'شاہجہاں چہار شنبہ کو جھروکہ درشن کرتا اور وہاں سے اٹھ کر دولت خانہ خاص میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس روز متصدیان عدالت، دادخواہوں کے لیے یادیگر کے لیے استغاثے پیش کرتا ہے۔ بادشاہ توجہ سے ان کی باتیں سنتا اور نرمی سے ان پر جرح کرتا اور وہاں موجود علماء کے فتوے کے مطابق فیصلہ صادر کرتا تھا۔

مغل بادشاہوں کا نظام عدل بالکل اسی نہج پر تھا جسے سلاطین دہلی نے شمالی ہندوستان میں قائم کیا تھا۔ بادشاہ ایک قاضی القضاۃ کا تقرر کرتا تھا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے۔ قاضی القضاۃ کو سلطنت میں ماتحت قاضیوں کو مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا لیکن بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں، قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کیے جاتے تھے۔ قاضیوں کی نقد تنخواہ ملتی اور ملازمت کی مدت تک کے لیے آراضی مدد معاش عطا کی جاتی۔ ہر پرگنے کی بازاروں کے صحیح نرخ کی تصدیق قاضی کیا کرتے تھے جسے دارالحکومت میں بطور اطلاع بھیج دیا جاتا تھا۔ مغلوں کے نظام عدل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ کسی کے ساتھ کسی طرح کی رورعایت روا نہیں رکھتے اور قانون کی نگاہ میں سب کو برابر سمجھتے تھے۔

9.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران (Other Officers of the Mughal Administration)

مذکورہ عہدیداران کے علاوہ دوسرے افسران بھی تھے۔ ان کا ذکر درج ذیل ہیں۔

1. محتسب: یہ عوام کے اخلاق و کردار سے متعلق شعبہ کا اعلیٰ افسر تھا اس کا کام لوگوں کو بااخلاق بنائے رکھنا تھا۔ محتسب یہ دیکھتا تھا کہ مسلمان شریعت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں یا نہیں۔ عوام کے اخلاق کو درست بنائے رکھنے کے لیے اکبر نے شہروں میں شراب کی خرید و فروخت اور طوائفوں کی رہائش کو ممنوع قرار دیا تھا۔

2. مستوفی (چیف آڈیٹر): یہ کارخانہ جات کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ پورا حساب تیار کرتا۔ مستوفی تحویلدار کی نگرانی میں رہنے والے ہر محکمے کی آمد و خرچ کے گوشوارے تیار کرتا تھا۔

3. میر آتش: یہ داروغہ توپ خانہ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ مغل فوج میں توپ خانے کا اہم افسر ہوا کرتا تھا۔ اس کے ذمہ توپ خانے کا نظم و نسق ہوتا تھا۔

4. داروغہ ڈاک چوکی: یہ محکمہ ڈاک و خفیہ شعبہ کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا وہ اپنے ماتحت عملہ کے تعاون سے حکومت کے مختلف حصوں میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات کی جانکاری اکٹھا کرتا تھا اور اس کی اطلاع بادشاہ کو ارسال کرتا تھا۔ سلطنت کے مختلف مقامات پر ڈاک لے جانے کا نظم وہی کرتا تھا۔ اس کام میں اس کی مدد کے لیے واقعہ نویس، سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے ہوا کرتے تھے۔

9.4 صوبائی نظم ونسق (Provincial Administration)

9.4.1 صوبائی انتظامیہ کی نوعیت (Nature of Provincial Administration)

صوبائی انتظامیہ، مرکزی نظم و نسق کا عکس تھا۔اکبر نے ملک کو چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم کرنے کے بجائے بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کرکے منظم و مستحکم کیا۔اس طرح اس نے سارے ملک میں دارالحکومت کے زیر اثر یکساں نظام اور ادارے قائم کیے۔اکبر نے ہر صوبے میں ایک سپہ سالار، دیوان، بخشی، میر عدل، صدر، کوتوال، میر بر، میر بحر اور واقعہ نویس مقرر کیے۔صوبوں میں میر ساماں اور دیوان بیوتات نہیں ہوتے تھے۔نظام مالگزاری کی نگرانی کے لیے عامل، بنکچی، فوطہ دار یا خزانہ دار، قانون گو اور پٹواری ہوتے تھے اور گاؤں کی سطح پر مقدم اور چودھری ہوتے تھے۔خفیہ نظام کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے واقعہ نویس ہوتے تھے۔صوبے کے اہم شہروں میں پولیس کوتوال کے ماتحت ہوتی تھی۔ان سبھی افسروں کی تقرری مرکزی حکومت کیا کرتی تھی۔اگرچیکہ تمام آفیسر صوبیدار یا حکمراں کے زیر نگرانی کام کرتے تھے مگر وہ مرکزی حکومت کے ساتھ جوابدہ ہوا کرتے تھے۔

9.4.2 صوبائی گورنر (Provincial Governor)

صوبے کے اہم افسر کو ناظم، سپہ سالار، صوبہ دار، صاحب صوبہ یا ولی کہتے تھے۔اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔عموماً اس عہدہ پر تجربہ کار اور انتظامی امور سے متعلق بادشاہ کے بھروسے مند افراد ہی کا تقرری ہوا کرتی تھی۔امراء کے علاوہ شہزادے بھی اس عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے۔جب کبھی صوبیدار بادشاہ کے ساتھ فوجی مہم پر روانہ ہوتا تھا یا راجدھانی میں موجود ہوتا تھا تو ایسے حالات میں اس کا کام دیکھنے کے لیے صوبے میں اس کا نائب یا نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا۔صوبیدار کے لیے اپنے عہدہ پر کام کرنے کی کوئی میعاد یا وقت مقرر نہیں تھا۔پھر بھی وہ تین چار سال تک اپنے عہدہ پر رہتا تھا۔اس کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔صوبیدار کے عہدے پر عموماً بڑے منصب داروں یا اعلیٰ درجہ کے امیروں کی تقرری ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ شہزادے بھی صوبیدار بنائے جاتے تھے۔سلطنت کے ہر صوبے کا ایک صوبیدار یا سپہ سالا ہوتا تھا۔ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار ہوتا تھا۔ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار صرف بادشاہ کی عدم موجودگی میں مقرر کیا جاتا تھا۔بلخ و بخارا قلیل مدت کے لیے شاہی مقبوضات میں رہے۔قندھار ایرانیوں نے واپس لے لیا تھا اور دکن کے چار صوبہ جات کبھی کبھی ایک ہی افسر کے ماتحت رہے۔باقی صوبوں میں صوبہ داروں کا انتظام ہوتا۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سپہ سالاروں اور صوبہ داروں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔شاہجہاں کے عہد حکومت کے صرف بائیسویں سال مرزا خان کی جگہ اعتقاد خان کا اودھ کے صوبیدار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

صوبیدار صوبہ میں بادشاہ کا نمائندہ اور صوبہ کا اہم افسر ہوتا تھا۔مغل حکمراں چونکہ مرکزیت میں پورا یقین رکھتے تھے اس لیے وہ صوبیداروں کو بہت زیادہ اختیار دینے کے حق میں نہیں تھے۔صوبیدار کے اختیارات اور فرائض پوری طرح متعین تھے۔جس وقت ان کی تقرری کی جاتی تھی انہیں ان کے عہدہ کے مطابق منصب اور اعزازی نشانات انعامات کے ساتھ ہی عہدے کے مطابق انہیں یہ ہدایت دی

جاتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری اور فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دیں گے۔ابوالفضل کے مطابق صوبیدار، رعایا کا اتابک اور نگہبان ہوتا ہے۔ رعایا کی بھلائی اس کے عدالت پسندی پر منحصر ہوتی ہے۔اسے سماج کے سبھی طبقوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور کمزور طبقوں پر ہونے والے ظلم کو اسے روکنا چاہیے۔اسے ہدایت تھی کہ وہ ہمیشہ اسلحہ کا استعمال کرتا رہے۔گھڑ سواری اور شکار کرتا رہے تاکہ وہ چاق و چوبند رہے اور ہمہ وقت اپنے فرائض کے تئیں بیدار رہے۔اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لیے یہ بھی ہدایات تھیں کہ وہ شان و شوکت میں بادشاہ کے دربار کی نقل نہ کریں۔مجرموں کی کھال کھنچوانے، انہیں ہاتھی کے پیروں تلے روندوانے کی کوشش نہ کرے۔جو بھی صوبیدار ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اسے سزا دی جاتی تھی۔صوبہ کے صوبیداروں کا انتخاب ان فوجی افسروں میں سے ہوتا تھا جن میں انتظامی امور کی سبھی خداداد صلاحیت ہوتی۔امید کی جاتی کہ وہ صاحب کردار و ایمان دار ہونگے۔شاہجہاں صوبہ داروں کی نااہلی یا صوبہ جات کی بدنظمی گوارا نہ کرتا تھا۔ بادشاہ تک جس کی شکایت پہنچتی اسے برطرف کرنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا اس کی مثال اعظم خان اور شائستہ خان ہیں۔ان دونوں کو گجرات کی صوبیداری سے برطرف کر دیا گیا چونکہ یہ لوگ نااہل تھے اور تربیت خان کو کشمیر کی صوبیداری سے اس لیے برخاست کیا گیا کیونکہ لوگوں نے اس کی شکایت کی تھی۔ برخلاف اس کے ظفر خان کو کشمیر کا صوبہ دار اس لیے بنایا گیا کہ لوگ اس کو چاہتے تھے۔صوبہ دار کی برطرفی کی ایک اور مثال وزیر خان کی ہے وہ پنجاب کی صوبیداری سے اس لیے برطرف کیا گیا کہ وہ ظلم کرتا تھا۔

صوبہ داروں کے اختیارات، شہری، عدالتی اور فوجی تین ضمروں میں منقسم تھے۔بحیثیت شہری افسر کے وہ پوری انتظامیہ کے نظم و نسق کا سربراہ تھا۔بحیثیت حکمراں عدل و انصاف وہ قاضی و میر عدل کے فیصلوں کی اپیل سنتا تھا۔اور بہ لحاظ فوجی افسر اپنے صوبے کے مخصوص عسکری حصہ پر حکمرانی کرتا اور اس کی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا۔وہ اپنے ماتحت افسروں کو برطرف کر سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جو براہ راست بادشاہ کے زیر اثر ہوتے تھے۔وہ کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جن کی سزائے موت کی اجازت مرکز سے حاصل کر لیتا۔وہ لوگوں کے شہری حقوق کا نگران ہوتا اس سے امید کہ جاتی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مشورہ سے انتظامی امور فیصل کرے گا۔صوبیدار کو اپنے پاس فوج رکھنی پڑتی تھی اس فوج کا وہ سربراہ ہوتا تھا۔اس کا کام مقامی بغاوتوں کو فرو کرنا۔ڈاکوؤں کے خلاف مہم چلانا اور صوبے میں امن و آشتی قائم کرنا تھا۔صوبہ دار کی مدت ملازمت کا دارومدار بادشاہ کی مرضی پر تھا۔اس کے لیے کوئی اصول متعین نہیں تھا۔

9.4.3 دیوان صوبہ (Diwan of Province)

وزارت مال کے براہ راست نمائندے کی حیثیت سے 'دیوان صوبہ' کے عہدے کا قائم کرنا اکبر کا کام تھا۔صوبائی دیوان بشمولیت دیگر افسران کے ہر صوبے میں چوبیسویں سال جلوس مقرر کیا گیا۔اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک صوبائی دیوان کا اقتدار اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ صوبیدار سے آزاد ہو گیا تھا۔وہ دیوان اعلیٰ کے ذریعہ بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھا اور اپنے کاغذات براہ راست وزیر کو پیش کرتا تھا۔دیوان صوبہ کو صوبائی انتظام میں ایک اہمیت حاصل تھی اور اس کا اختیار و اقتدار صوبے کے انتظامی اور مالی معاملات تک وسیع تھا۔اس کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ زیر کاشت رقبے کی توسیع کے سلسلے میں اقدامات کرتا رہے۔ خزانے کا تحفظ اور نگرانی اس کے اہم امور میں شامل تھے۔دیوان کے ذمہ یہ بھی تھا کہ کوئی غیر قانونی رقومات جو حکومت کی طرف سے ممنوع یا معاف کر دی گئی ہیں وصول نہ کرے۔دیوان مالیات کا افسر خاص ہوتا تھا۔

نظریاتی اعتبار سے وہ صوبہ دار کا ماتحت ہوتا مگر عملی اعتبار سے مرتبہ میں اس کا ہم پایہ ہوتا۔اس کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا اور اس سے امید کی جاتی کہ وہ صوبیدار پر بھی نظر رکھے گا۔ مغل عہد میں صوباجاتی دیوان بیک وقت مقتدر عہدوں پر مامور ہوتا۔ محمد وارث نے شیخ موسی گیلانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ شاہجہاں کے سن جلوس کے اکیسویں سال میں دیوان ،امین اور فوجدار کے مختلف عہدوں پر ملتان میں بیک وقت کام کرتا رہا۔اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں ۔دیوان صوبہ صرف مالیات کا خاص افسر ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ مرکزی نظام مالگزاری کے شعبہ کا صوبہ میں نمائندہ ہوا کرتا تھا۔اس کا عہدہ صوبہ دار کے بعد تھا۔اکبر کے عہد میں اس عہدہ کی تشکیل ہوئی۔دیوان مرکزی حکومت کے تئیں جوابدہ ہوتا تھا۔ وہ مرکزی سرکار کے دیوان اعلیٰ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا اور اس کے لیے وہ برابر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔وہ صوبہ دار کے دربار میں ضرور حاضر ہوتا تھا مگر اس کا عہدہ صوبہ دار کے عہدہ کے برابر ہوتا تھا۔دیوان کی تقرری کے وقت مرکز سے کچھ خاص ہدایات ملتی تھیں وہ زیر کاشت زمین کی توسیع کرے اور زراعت کو فروغ دے۔ایمان دار، تجربہ کار اور لائق عامل کی تقرری کرے تاکہ وہ کسانوں کو پر امن طریقے سے مالگزاری ادا کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔دیوان کے محکمے میں دو طرح کے افسر ہوتے تھے:

1۔مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر۔ 2۔صوبائی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر۔

اس کے شعبہ میں پیش کار اور داروغہ مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے جاتے تھے۔بقیہ افسران و عملہ مثلاً منشی، حضور نویس اور محرر وغیرہ کی تقرریاں وہ خود کرتا تھا۔یہ تمام لوگ اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔صوبائی دیوان کے کام درج ذیل تھے۔

1. خالصہ محالوں سے مالگزاری وصول کرنا۔
2. وصول شدہ بقایا مالگزاری کا حساب رکھنا۔
3. مدد معاش میں دی گئی زمینوں کی تفصیل کا تعین رکھنا۔
4. صوبوں میں تعینات افسروں کے کام کے مطابق ان کی تنخواہ متعین کرنا اور ادا کرنا۔
5. خالصہ علاقوں میں دی گئی جاگیروں کا انتظام کرنا۔
6. زراعت کو فروغ دینا۔
7. خانہ زادوں پر نظر رکھنا۔
8. عاملوں کے حساب کی جانچ کرنا اور خراب عاملوں کو عہدے سے ہٹانے کی سفارش کرنا۔
9. بقایہ مالگزاری و نقادی وصول کرنا۔
10. مختلف شعبوں کے خرچ پر کنٹرول رکھنا اور صوبائی ٹکسالوں کا نظم کرنا وغیرہ۔

صوبائی دیوان کے دفتر میں مالگزاری سے متعلق آمد و صرف کے تمام حساب کتاب محفوظ رہتے تھے۔یہیں حساب کی جانچ ہوتی تھی اور اس کی تلخیص تیار کر کے مرکز کو ارسال کر دی جاتی تھی۔اسے مہینہ میں دوبارہ دیوان اعلیٰ کے پاس صوبہ میں ہونے والے واقعات و حادثات اور خزانہ میں نقد مال کی اطلاع ارسال کرنی پڑتی تھی۔صوبائی دیوان مالگزاری سے متعلق مقدمات کو بھی فیصل کرتا تھا۔ سرکاری پرگنوں

کی مالگزاری سے متعلق مقدموں پر ہوئی اپیل کی سماعت کرتا تھااور فیصلے بھی دیتا تھا۔دیوان کے ذریعہ دیے گئے فیصلوں کی اپیل مرکز میں دیوان اعلیٰ کے حضور پیش کی جاسکتی تھی۔

9.4.4 صدر صوبہ

مرکزی صدر الصدور کی سفارش پر بادشاہ صوبائی صدر کی تقرری کرتا تھا۔صوبائی صدر مرکزی صدر کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔اس کا دفتر مستقل نہیں ہوتا تھا۔دوسرے افسروں کی طرح اس کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔اس کا کام صوبہ میں مسلمانوں کے مذہبی امور سے متعلق بھی تھا۔وہ سیور غال اور مدد معاش گرانٹ جیسے اہم کام کی نگرانی کرتا تھا۔علماءاور دانشوروں کو دیے جانے والے وظائف کا انتظام کرنا اور کن لوگوں کو وظائف، پنشن یا مدد معاش دی جاتی ہیں ان کے ناموں کی سفارش بھی کرتا تھا۔وہ اپنے پاس دانشوروں، علماء، مشائخ اور مذہبی شخصیات کی فہرست بھی رکھتا تھا۔

9.4.5 قاضی صوبہ (Provincial Qazi)

ہر صوبہ میں ایک قاضی جسے قاضی صوبہ کہتے تھے کی تقرری مرکزی حکومت کے قاضی القضاۃ کی سفارش پر بادشاہ کیا کرتا تھا۔اسے دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات سننے اور فیصلہ دینے کا اختیار تھا۔وہ مسلمانوں کی شادی وغیرہ کے مراسم ادا کراتا۔املاک وغیرہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔عدل وانصاف سے متعلق کاموں میں اس کی مدد میر عدل، مفتی، قاضی، محتسب اور داروغہ عدالت کیا کرتے تھے۔اس کی سفارش پر سرکاروں کے قاضی کی تقرری بھی ہوتی تھی۔

9.4.6 میر عدل (Mir Adl)

اس کا کام گواہوں کی گواہی کی جانچ پڑتال کرنا تھا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پہنچنے سے پہلے وہ گواہی کی جانچ کرکے اس پر اپنی رپورٹ دیا کرتا تھا جس کی بنیاد پر مقدمے کا فیصلہ ہوتا تھا۔

9.4.7 بخشی (Bakshi)

مرکزی حکومت کی انتظامیہ کی طرح صوبہ میں بھی ایک بخشی ہوتا تھا۔یہ صوبہ میں ان تمام امور کا ذمہ دار اہوتا تھا جو مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں بخشی ہوتے تھے۔میر بخشی کی سفارش پر صوبائی بخشی کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔صوبہ میں فوج کا انتظام کرنا اس کی اہم ذمہ داری تھی۔وہ صوبائی فوج کی صلاحیت بنائے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔بخشی اپنے صوبے میں خفیہ محکمہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھااور صوبہ کی تمام سرگرمیوں کی اطلاع مرکز کو بھیجتا تھا۔اس کے علاوہ وہ مرکز کی مدد کے لیے صوبائی فوجیوں کو بھی بھیجتا تھا۔فوجیوں کی بھرتی، رہن سہن، ڈسپلن، نظم وضبط اور ان کے فوجی ساز وسامان کا انتظام بھی کرتا تھا۔فوجیوں کا حلیہ رکھنا اور میر بخشی کے حکم سے فوجیوں اور گھوڑوں کی سالانہ جانچ بھی اسی کے ذمہ تھی۔باغی اور نافرمان زمین داروں و دیگر سرکش عناصر کے خلاف صوبیدار کی مدد بھی کرتا تھااور خود بھی حکومت کے مفاد کے تحفظ کے لیے فوجی مہم کی نمائندگی کرتا تھا۔بخشی صوبیدار کے ماتحت کام کرتا تھا۔منصب دار کی وفات ہو جانے پر

بخشی اس کی جاگیر کو اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور اس کی اطلاع اعلیٰ افسران کو بھیج دیتا تھا۔ بخشی مہینہ میں دو بار اہم اطلاعات بادشاہ کو بھیجتا تھا۔ ان میں مالگزاری کی وصولی، صوبائی امن وامان اور فوجی نظم ونسق کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔

9.4.8 کوتوال (Kotwal)

ہر صوبے کے ہیڈ کوارٹر پر ایک کوتوال ہوتا تھا جو شہر کوتوال کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کوتوال کے امور، اختیارات اور فرائض منصبی کا علم ہمیں 'مرآۃ احمدی' سے ہوتا ہے جس میں کوتوال کے امور سے متعلق اکبر کی ہدایات درج ذیل ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ 'کوتوال کلرک کے تعاون سے اس جگہ کے مکانوں، عمارتوں اور اس میں رہنے والوں کی فہرست تیار کرے گا اور اس بات کا بھی ذکر کرے کہ وہ کس طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں سے کتنے لاوارث ہیں، کتنے کاریگر ہیں، کتنے فوجی ہیں اور کتنے درویش ہیں۔' اس کے علاوہ کوتوال کے فرائض میں درج ذیل چیزیں بھی آتی ہیں۔ یومیہ (روز وشب) جاسوس کوتوال کے دفتر میں محلے میں ہونے والے واقعات وحادثات کے اسباب وعلل کو درج کرائیں۔ ایک مہمان کی آمد چاہے وہ قریبی ہو، تعلقاتی ہو یا اجنبی اس کی اطلاع اس محلے کے مکھیا کو ہو جانی چاہیے۔ کوتوال کو ہر آدمی کی آمد ورفت کے بارے میں جانکاری ہونی چاہیے کیونکہ جب ایک آدمی اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے تو یہ یقینی ہے کہ وہ بدعنوانی میں ملوث ہے۔ کوتوال کو بازاروں میں اشیاء کی قیمتیں متعین کر دینی چاہیے اور اسے اپنے علاقہ میں شراب نوشی اور اس کی آمد وفروخت پر بھی پابندی لگا دینی چاہیے۔ مذکورہ اقوال کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ کوتوال صوبائی صدر مقام کا اہم پولیس افسر ہوتا تھا۔ اس کا کام عوام کی نگرانی اور حفاظت کے ساتھ امن وامان قائم کرنا ے تھا۔ وہ رات کو شہر کا گشت لگاتا۔ خفیہ شعبہ میں کام کرنے والوں کی تقرری کرتا۔ گھروں اور سڑکوں کی فہرست تیار کرتا ۔آلہ ناپ و تول کی جانچ کرتا۔ شہر شہر میں آمد ورفت رکھنے والے مسافروں پر نظر رکھتا۔ چوری اور ڈکیتی کو روکنا، چوروں پر کنٹرول رکھنا ،شراب بنانے اور بیچنے پر پابندی عائد کرنا۔ لاوارث جائداد کی فہرست تیار کرنا وغیرہ اس کے اہم امور تھے۔ اس کے علاوہ کوتوال سزا دینے والا افسر بھی ہوتا تھا۔ شہر میں پکڑے جانے والے مجرم کو کوتوال کے سامنے پیش کیا جاتا۔ ابتدائی جانچ پڑتال کے بعد جس نوعیت کا معاملہ ہوتا مقدمہ اس نوعیت کی عدالت میں بھیج دیتا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ 'کوتوال کا دفتر ایک طرح کی چوکی تھی جہاں وہ سزا دینے والے افسر کی حیثیت سے مقامی تنازعات ومقدموں کو فیصلہ کرتا۔'

9.4.9 دیگر انتظامی محکمہ جات (Other Administrative Departments)

اوپر زیر بحث آئے شعبوں اور عہدیداروں کے علاوہ کچھ دیگر اہلکار بھی ہوا کرتے تھے جو بالائی افسران کے معاون تھے۔

محتسب: ہر صوبے میں ایک محتسب ہوتا تھا اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔ یہ صدر الصدور کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس عہدے پر صوبائی صدر بھی کام کرتا تھا۔ محتسب کا کام عوام کے اخلاق وکردار کو بنائے رکھنا تھا۔ شریعت (اسلامی قوانین) کے متعلق مسلم عوام کو زندگی گزارنے کی تلقین کرنا اور ممنوع (حرام) چیزوں سے بچانا اس کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔

میر بحر: صوبے میں میر بحر کا کام فوج کو ندی پار کرنے کے لیے پل کی تعمیر اور کشتیوں کا انتظام کرنا تھا۔ بندرگاہوں اور ندیوں کی چنگی وغیرہ کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔

واقعہ نویس: ہر صوبہ میں ایک واقعہ نویس ہوا کرتا تھا۔ عموماً صوبہ کا بخشی ہی واقعہ نویس کی حیثیت سے کام کرتا تھا جو صوبہ کے تمام اہم واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ارسال کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ صوبے میں سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے بھی ہوتے تھے۔ سوانح نگار کا کام ریاسر کے افسروں ان کے عملہ اور دفاتر سے متعلق اطلاعات بھیجنا ہوتا تھا۔ خفیہ نویس اہم مقامات پر مقرر کیے جاتے تھے جو ریاست کا کام کرنے والے افراد اور رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع مرکزی سرکار کو بھیجتے تھے۔ ہرکارے صوبے کے چاروں اطراف کی خبریں اور اس کی تفصیلات صوبیدار کے حضور پیش کرتے تھے۔

9.5 مقامی نظم ونسق (Local Administration)

انتظامی امور کو بحسن وخوبی انجام دینے کی غرض سے صوبہ متعدد انتظامی اکائیوں میں تقسیم تھا۔ مقامی انتظامیہ کے لیے سرکار، پرگنہ اور گاؤں انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

9.5.1 سرکار

صوبہ کے بعد ایک انتظامی اکائی سرکار کہلاتی تھی۔ کئی پرگنہ کو ملا کر ایک سرکار بنتی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے متعدد سرکاروں کے لیے افسر مقرر کیے۔ سرکار میں ایک افسر دیوان کا ہوتا تھا جو مالگزاری کے بعض معاملات سے متعلق تھا مثلاً جاگیروں کی تفویض وغیرہ۔ سرکار کے انتظامی امور کے لیے درج ذیل افسران مقرر کیے جاتے تھے۔

1. **فوجدار:** ہر سرکار میں ایک فوجدار تعینات کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری سطح پر اہم افسر ہوتا تھا جس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ وہ سرکار میں صوبہ دار کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ابوالفضل اپنی کتاب آئین اکبری میں فوجدار کے فرائض منصبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'اسے تمام فوجیوں کے ساز وسامان کا معائنہ کرتے رہنا چاہیے۔ گھوڑوں کی فراہمی کرنی چاہیے مگر بغیر ضرورت باغی و سرکش زمین داروں اور کسانوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔' سرکار میں انتظام اور امن وامان کے لیے فوجدار جوابدہ تھا۔ وہ اپنی سرکار میں شامل احکام کا نفاذ کرتا تھا اور مالگزاری کی وصولی میں عمل گزار کا مددگار تھا۔ وہ سرکار کی فوج پر کنٹرول رکھتا تھا۔
2. **عمل گزار:** سرکار میں مالگزاری کا اعلیٰ افسر عمل گزار تھا جو مرکزی حکومت کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا اہم کام مالگزاری کی تعیین اور اس کی وصولی کرنا تھا۔ ساتھ ہی بدعنوان کسانوں کو سزا دینا تھا۔ سرکار کے ماتحت سیورغال زمین کی نگرانی کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ مالگزاری سے متعلق کاموں کے لیے اس کے ماتحت بہت سے مددگار افسر ہوتے تھے۔ عمل گزار سرکار کی زمین کی پیائش اور ٹیکس کی تفصیل مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا، بنکچی، خزانہ دار جیسے افسروں کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا معائنہ بھی کرتا تھا۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق عمل گزار و سرکار میں مالگزاری کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا۔
3. **قاضی:** ہر سرکار میں ایک قاضی ہوتا تھا جس کی تقرری صدر الصدور کرتا تھا۔ قاضی شریعت کے مطابق مذہبی مسائل کا حل پیش کرتا

تھا۔ قاضی کے تعاون کے لیے ایک مفتی ہوتا تھا جو اصول شریعت یعنی اسلامی قوانین کی وضاحت کرتا تھا۔

4. **تحصیلی:** عمل گزار کے بعد سرکار میں شعبہ مالگزاری میں اہم افسر تحصیلی ہوتا تھا۔ اسے مالگزاری سے متعلق پوری جانکاری ہوتی تھی۔ اس کے پاس زمین کی پیمائش، اس کی درجہ بندی، پیداوار وغیرہ کی تفصیل ہوتی تھی جس کی بنیاد پر عمل گزار مالگزاری کی تعیین کرتا تھا۔ اسے ہر موسم کی فصل اور اس کی مالگزاری کا پورا سالانہ تفصیل کے ساتھ عمل گزار کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔

5. **خزانہ دار:** ہر سرکار میں ایک خزانہ دار ہوتا تھا جو شاہی خزانہ کا انچارج ہوتا تھا۔ اس کے پاس مالگزاری کا روپیہ جمع کیا جاتا تھا جسے وہ مرکزی شاہی خزانے کو بھیج دیتا تھا۔ مگر بغیر صوبائی دیوان کی اجازت کے وہ روپیہ خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

9.5.2 پرگنہ

عام طور سے پرگنہ ایک انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ شیر شاہ کے پرگنہ میں اکبر نے کچھ اصلاحات کیں تھیں۔ پرگنے کا نظم و نسق درج ذیل افسروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔

1. **شقدار:** پرگنے کا اعلیٰ افسر شقدار کہلاتا تھا جو پرگنہ میں امن و امان اور حسن انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ فوجدار کے ماتحت ہوتا تھا۔ کسانوں سے مالگزاری کی وصولی میں وہ عامل کا تعاون بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شقدار پرگنہ میں ایک مصنف کی حیثیت سے فوجداری مقدمات کو فیصل کرتا تھا۔

2. **عامل:** پرگنہ میں انتظام مالگزاری کا بڑا حکمراں عامل ہوتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک بڑا عملہ ہوتا تھا جس میں سب سے زیادہ اہم تحصیلی ہوتا تھا۔ ہر پرگنے میں تخمینہ اور وصولی کا کام عامل انجام دیتا تھا۔ عامل پرگنہ سطح پر مقامی انتظام کا سربراہ ہوتا تھا۔ پرگنہ میں عامل کا وہی کام تھا جو سرکار میں عمل گزار کا ہوتا تھا۔ عامل کے ماتحت کارکن ہوتے تھے جو کلرک کی طرح اس کی مدد کرتے تھے۔ عامل ایک کام یہ بھی تھا کہ کاشت اراضی پر کاشت برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرے اور اس کی مالگزاری وصول کرائے۔

3. **خزانہ دار (فوطہ دار):** ہر پرگنے کا اپنا خزانہ ہوتا تھا جس کا انتظام خزانہ دار کی سربراہی میں متعدد افسران کے سپرد ہوتا تھا۔ خزانہ دار کو فوطہ دار بھی کہتے تھے۔ اکبر کے عہد میں عامل، کارکن اور شقدار پرگنے کے خزانے کی حفاظت اور رقم کی مناسب ادائیگی کے سلسلے میں مشترکہ طور سے ذمہ دار تھے۔ بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خزانے کے عملے میں داروغہ خزانہ کے عہدہ کا اضافہ کیا گیا۔ فوطہ دار مالگزاری کی شکل میں ہونے والی رقم کو جمع کر کے اسے مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا۔ فوطہ دار کے امور منصبی میں مالگزاری کی وصولیابی، نقد رسیدوں کی حفاظت، حسابات تیار کرنا اور خزانے میں جمع شدہ نقد رقم کی مناسب ادائیگی شامل تھی۔

4. **قانون گو:** ہر پرگنہ میں ایک قانون گو کی ڈگری ہوتی تھی۔ پرگنہ کی سطح پر تعینات قانون گو اپنے جملہ کاغذات تیار کرتا تھا۔ لہٰذا مقامی نظام مالگزاری میں عمل دخل کے اعتبار سے وہ ایک اہم افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ عام طور پر ایک پرگنہ میں ایک قانون گو ہوتا ہے۔ لیکن بعض پرگنوں میں ایک سے زیادہ قانون گو بھی ہوتے تھے۔ قانون گو سب سے اہم کام آراضی سے متعلق مختلف فریقین کے مفادات کے بارے میں مکمل اطلاع اور تخمینے کی شرحیں، طریق کار، رسومات اور قواعد کے بارے میں ضروری کاغذات محفوظ رکھتا تھا۔ اس کے پاس

کئی کتابچہ ہوتے تھے جس میں پرگنہ کی زراعت کے تمام احوال و کیفیات اور اس سلسلے کی تمام اطلاعات درج ہوتی تھی۔ قانون گو آراضی سے متعلق اندراج تیار کرتا تھا قانون گو کی مدد کے لیے بہت سے پٹواری ہوتے تھے۔

9.5.3 گاؤں

انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں ہوتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ گاؤں کے اعلیٰ افسر چودھری یا مقدم کہلاتے تھے۔ یہ گاؤں اور انتظامیہ کے بیچ کی کڑی کا کام کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں رائے یا راوت بھی گاؤں کے مکھیا کا کردار ادا کرتے تھے۔ گاؤں کے مکھیا کا کام عام نگرانی رکھنا، تنازعات کو ختم کرنا، پولیس کے فرائض نبھانا اور گاؤں کے کسانوں سے جو مالگزاری وصول کرتے تھے اس کے لیے انہیں گاؤں کی مالگزاری میں سے ڈھائی فیصد دستوری ملتی تھی۔ اس کا کام گاؤں میں امن وامان قائم کرنا اور نقادی کی تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں کا دوسرا اہم افسر پٹواری ہوتا تھا وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے لگان اور قابل کاشت زمین کی تفصیل رکھتا تھا اسے گاؤں کی لگان میں سے ایک فیصد دستوری ملتی تھی۔ پٹواری گاؤں کا سب سے کم تر درجہ کا افسر ہوتا تھا۔ لیکن گاؤں انتظامیہ میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ آج کے دور کے لیکھپاک کی طرح ہوتا تھا۔ ابو لفضل گاؤں انتظامیہ کے سلسلے میں کوئی جانکاری نہیں دیتا۔ البتہ شیر شاہ کے عہد میں گاؤں انتظامیہ کا بہترین تصور تھا جہاں مقدم، چودھری اور پٹواری وغیرہ گاؤں کے نظم و نسق کو چست رکھتے تھے اور ڈکیتی وزنا جیسی واردات اور جرائم کی روک تھام کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اکبر اور بعد کے مغل حکمرانوں نے شیر شاہ کے اسی نظم و نسق کا گاؤں کی سطح پر نافذ کیا۔ گاؤں کے دوسرے اہلکاروں میں چوکیدار، مذہبی رسم و روایت کو ادا کرنے کے لیے مولوی اور پروہت ہوا کرتے تھے۔

9.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

قانونی طور پر بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا تھا اور قانون الٰہی کے مطابق حکومت کرنا اس کا فرض تھا۔ آئین کے مطابق وہ مختار کل تھا۔ مغل انتظامیہ کی پوری مشین کی قوت کا مخرج بادشاہ ہوتا تھا۔ پوری انتظامیہ کو بحسن و خوبی سر گرم رکھنے کے لیے مرتبہ اور حیثیت رکھنے والے وزراء کی تقرری ہوئی تھی اور ان کے درمیان کاموں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح وکیل، دیوان، میر بخشی، میر ساماں، صدر الصدور جیسے محکموں کے علاوہ قاضی القضاۃ، محتسب، مستوفی، میر آتش، داروغہ ڈاک چوکی جیسے افسروں کا تقرر بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ناظر بیوتات، میر بر، میر بحر اور داروغہ ٹکسال نامی افسران بھی ہوتے تھے جن کی نگرانی میں مرکزی نظام حکومت پورا نظام متحرک تھا اور ہر شعبہ باقاعدگی سے کام کرتا تھا۔ اہل کار سے لیکر صدر محکمہ تک اپنے فرائض، حیثیت اور روزمرہ کے کام سے واقف تھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں بادشاہ انصاف پرور تھے۔ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ کسی کے ساتھ کسی کسی طرح کی رعایت نہیں ہوتی تھی اور قانون کی نگاہ میں سب برابر تھے۔ مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم، نوعیت، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔

مغل عہد میں نظم و نسق کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے سلطنت صوبوں میں تقسیم تھی۔ صوبوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اکبر

کے عہد پہلے 12 صوبے تھے بعد میں تین صوبوں کا اضافہ ہوا اس طرح کل 15 صوبے ہو گئے۔ جہانگیر کے عہد میں 17 جبکہ شاہجہاں کے عہد میں 22 اور اورنگ زیب کے عہد میں صوبوں کی تعداد 21 ہو گئی۔ صوبہ کا سب سے بڑا افسر صوبہ دار (سپہ سالار) ہوتا تھا وہ صوبہ میں بادشاہ کی طرح ہی کام کرتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے بہت سے عہدیدار ہوتے تھے۔ ان میں دیوان، بخشی، فوجدار، کوتوال، قاضی، صدر اور عامل وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ دیوان صوبے کے نظام مالگزاری سے متعلق کام دیکھتا تھا۔ صوبہ دار کو خفیہ اطلاعات، خفیہ نویس یا واقعہ نویس سے ملتی تھی۔ انتظامیہ کی چھوٹی اکائی سرکار تھی۔ ان کی تعداد بھی متعین نہیں تھی۔ سرکار میں اہم افسر فوجدار، عمل گزار، قاضی، کوتوال، بنکچی اور فوطہ دار ہوتے تھے۔ ان کا کام سرکار میں امن وامان برقرار رکھنا اور مالگزاری وصول کرانا تھا۔ ان کے کاموں کی نگرانی صوبیدار کرتا تھا۔ سرکار کئی پرگنوں کو ملا کر بنتی تھی۔ پرگنہ کا نظم ونسق شقدار، عامل، فوطہ دار، کارکن اور قانون گو دیکھتے تھے۔ انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تھی ۔ایک پرگنہ کئی گاؤں ملا کر بنتا تھا۔ گاؤں کی انتظامیہ مقامی لوگوں کے تعاون سے چلتی تھی۔ مقدم (مکھیا) پٹواری، چوکیدار وغیرہ گاؤں کی انتظامیہ کے اہم لوگ تھے۔

9.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

فرایزدی	:	خدا کا نور، آفتاب کی روشنی، پر عظمت حلقہ نور۔
مہرازک	:	شاہی مہر، مہر اعظم۔
تمن	:	دس ہزار سواروں کا دستہ۔
دبیر	:	چیف سکریٹری۔
میر بخشی/بخشی	:	فوجی محکمہ کا سربراہ اعلیٰ۔
دیوان	:	مالگزاری یا مالیات کا ذمہ دار۔
میر سامان	:	حکومت کے خار خانوں اور مال خانوں کی دیکھ بھال کرنے والا سب سے بڑا عہدیدار۔
صاحب توجہ	:	فوجی محاسب۔
یومیہ داران	:	روزانہ کا بھتہ پانے والا۔ اصطلاحاً وہ عہدیدار اور دوسرے افراد جو کسی منصب کے بغیر نقد تنخواہ یا بھتہ پاتے تھے۔
مشرف کل وجز	:	چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب۔
تقاوی	:	پیشگی قرض، جو کسانوں کو بیج اور جانور وغیرہ کے لیے دیا جاتا تھا
سیورغال	:	لگان سے مثتثنیٰ زمین
دستوری	:	کمیشن
مقدم	:	گاؤں کا مکھیا

کروڑی : مالگزاری وصول کرنے والا افسر

عامل : گاؤں سے لگان وصول کرنے والا روایتی کرمچاری

9.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل مرکزی انتظامیہ میں فوج کا سب سے بڑا عہدیدار کیا کہلاتا تھا؟

(الف) دیوان (ب) میر سامان (ج) میر بخشی (د) صدر الصدور

2. اکبر نے 1580 میں اپنی سلطنت کو کتنے صوبوں میں تقسیم کیا تھا؟

(الف) 10 (ب) 12 (ج) 15 (د) 21

3. شاہی کارخانوں اور فرنیچر کا نگران وزیر کیا کہلاتا تھا؟

(الف) وکیل (ب) دیوان بیوتات (ج) میر سامان (د) کوتوال

4. مغل صوبائی انتظامیہ میں امن وامان اور پولیس کا افسر کون ہوتا تھا؟

(الف) فوجدار (ب) کوتوال (ج) عامل (د) قاضی

5. گاؤں کی سطح پر مالگزاری وصول کرنے والا اور مکھیا کیا کہلاتا تھا؟

(الف) شقدار (ب) پٹواری (ج) مقدم/چودھری (د) قانون گو

9.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بخشی کے اختیارات پر روشنی ڈالیں۔
2. پرگنہ کے افسران پر مختصر نوٹ لکھیں۔
3. قانون گو کے امور واضح کریں۔

9.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. صوبہ کے صوبیدار کے فرائض منصبی واضح کریں۔
2. دیوان صوبہ کے امور اختیارات تحریر کریں۔

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(ج), 4-(ب), 5-(ج)

اکائی 10۔زرعی معیشت

(Agricultural Economy)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 زراعت کی وسعت

10.3 کاشت اور آبپاشی کے ذرائع

10.3.1 کاشتکاری کے ذائع اور طریقہ کار

10.3.2 آبپاشی کے ذرائع

10.4 زرعی پیداوار

10.4.1 غزائی فصلیں

10.4.2 نقد فصلیں

10.4.3 پھل، زسبزیاں اور مصالے

10.4.4 پیداواری صلاحیت اور پیداوار

10.5 پالتو مویشی

10.6 خلاصہ

10.7 کلیدی الفاظ

10.8 نمونہ امتحانی سوالات

10.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان ایک وسیع و عریض زمینی علاقے میں پھیلا ہوا ہے جو نہ صرف مختلف نسل، مذاہب اور ثقافت کے لوگوں کا مسکن ہے بلکہ اس میں مختلف موسم اور حلقیں بھی ہیں۔ اس ملک کی پوری تاریخ زراعت کے اہم پیداوری سرگرمیوں سے بھری پڑی ہے۔ مغل دور میں زمین کا ایک بڑا حصہ کھیتی کے ماتحت تھا۔ اس عہد کے ہندوستانی، بیرونی مصنفین اور سیاحوں نے اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں ہندوستانی مٹی کی زرخیزی کی جابجا تعریف کیا ہے۔ اس اکائی میں، زرعی معیشت سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی جس میں کاشتکاری کی حد یعنی جتنی زمینیں جوتی جاتی تھیں وہ بھی شامل ہیں۔ دور وسطی کے ہندوستان میں مختلف قسم کی غذائی فصلیں، پھل، سبزیاں اور نقد فصلوں کی کھیتی کی توسیع پر بھی بات کی جائے گی۔ اس کے علاوہ، ہم کاشت کے مختلف طریقوں کے ساتھ ساتھ کاشتکاری اور کھیتوں کی آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے آلات پر بی بحث کریں گے۔ مغل سلطنت کے زیر تسلط علاقے میں زرعی معیشت پر زور دیتے ہوئے اس کی سرحد سے باہر کے علاقوں پر گفتگو کرنا بھی اس اکائی کا حصہ ہے

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغل ہندوستان میں ہونے والی زرعی پیداور کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغلیہ عہد میں زرعی پیداور کی وسعت کو سمجھ سکیں گے۔
- زرعی پیداور کے طریقہ کار اور سینچائی کے ذرائعہ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اس زمانے کے اہم فصلوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مویشیوں اور مویشیوں کی افزائش کے بارے میں بھی کچھ اندازہ لگا سکیں گے۔

10.2 زراعت کی وسعت (Expansion of Agriculture)

مغل عہد میں کاشت کے ماتحت کتنا رقبہ تھا یا کتنی زمینوں پر کھیتی کی جاتی تھی، اس تعلق سے اعداد و شمار کے عدم موجودگی میں اسکا صحیح علم ہونا کافی مشکل ہے۔ پھر بھی دستیاب اعداد و شمار سے مغل دور میں قابل کاشت زمین کے رقبے کا اندازہ لگانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں بنگال، تھٹھتا اور کشمیر کے علاوہ تقریباً شمالی ہندوستان کے تمام صوبوں کے رقبے کے اعداد و شمار دیا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر صوبے جیسے دہلی، آگرہ، اودھ، لاہور، ملتان، الہ آباد اور اجمیر میں کچھ استثناء کے ساتھ تقریباً ہر صوبے کے پرگنہ کا الگ الگ اعداد و شمار دیا ہے۔ اعداد و شمار کے متعلق کچھ معلومات تو آئین اکبری کے اعداد و شمار سے ہوتا ہے، لیکن آئیں اکبری میں درج اعداد و شمار کا تعلق سال 1595ء سے ہے اسی لیے پورا علم نہیں ہوتا۔ حالانکہ کے مختلف خطوں کے رقبے کے اعداد و شمار کا علم سترہویں صدی کے رقبے کے اعداد و شمار سے ہوتا ہے جو 1686ء کے دفتر اندراجات میں دستیاب ہے۔ اسی اعداد و شمار کو چندر بھان کی تاریخی کتاب، چہار گلشن (40-1739)

میں دوبارہ پیش کیا گیا ہے۔اس دستور العمل سے ہر صوبے کے مساحت کردہ رقبہ کے اعداد و شمار علم ہوتا ہے۔ہر صوبے کے دیہاتوں (گاؤں) کے کل تعداد کے ساتھ ساتھ مساحت شدہ اور غیر مساحت شدہ دیہاتوں کا بھی ذکر ہے۔پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آئین اکبری میں زیادہ تر ہ پرگنہ کے رقبے کا اعداد و شمار دیا گیا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن پرگنوں کی کس حد تک صحیح مساحت کی گئی تھی۔ حالانکہ بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے کا دستیاب اعداد و شمار کا مجموعہ اس بارے میں ایک بہتر تصویر پیش کرتا ہے۔اس اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1686ء تک تقریباً پچاس فیصد گاؤں کی پیائش نہیں کی گئی تھی۔اورنگزیب کے دور حکومت کے اعداد و شمار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آئین اکبری میں دیے گئے رقبے کے مقابلہ سترہویں صدی کی پیائش کردہ رقبے میں اضافہ ہوا۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ پیائش کردہ رقبے میں اضافہ کی وجہ کاشت میں توسیع تھی۔ یہ اضافہ پیائش کردہ رقبے میں پہلے کے کچھ غیر پیائش علاقے کو شامل کرنے کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔مورخین کے درمیان ایک بحث یہ ہے کہ اس دور کے اعداد و شمار دراصل کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیا یہ اعداد و شمار اصل میں زیر فصل رقبے کے ہیں، یا پیائش کردہ رقبے کے۔ڈبلیو۔ایچ۔مورلینڈ (W. H. Moreland) کا خیال ہے کہ یہ اعداد و شمار کل فصلی رقبہ یعنی جس زمین پر فصل اُگائی جاتی تھی کی نمائندگی کرتا ہے۔

عرفان حبیب کا خیال ہے کہ اس اعداد و شمار میں قابل کاشت رقبہ جس میں کوئی فصل بوئی نہیں جاتی تھی کے علاوہ رہائشی علاقے، جھیل، حوض اور جنگلات وغیرہ بھی شامل تھے۔ شیرین موسوی عرفان حبیب سے اتفاق کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ قابل کاشت بیکار زمین بھی پیائش کردہ رقبے کا دس فیصد شامل تھی۔ لیکن وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اس دس فیصد کو کم کرنے کے بعد بھی باقی رقبہ کو خالص فصل شدہ رقبہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کاشت شدہ رقبہ کے بڑے حصے کی پیائش نہیں کی گئی تھی۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کئی مرتبہ خریف اور ربیع کی فصلوں کے ماتحت زمینوں کی الگ الگ پیائش کی گئی اور دونوں کو شامل کرنے کے بعد اسے پیائش شدہ رقبے کے طور پر درج کر دیا گیا۔ایسی صورت میں صرف مغلیہ دور کے پیائشی اعداد و شمار ہی کاشت کی حد یا وسعت کو معلوم کرنے میں زیادہ مددگار نہیں ہیں۔اس عہد میں زراعت کی وسعت کی علم کے لیے عرفان حبیب اور شیرین موسوی نے دیگر دستیاب شدہ اعداد و شمار کی بھی مدد لی ہے، مثلاً کچھ ریوینیو دستاویز جس میں کچھ علاقوں کے تفصیلی اعداد و شمار، جمع کے اعداد و شمار اور دستور کے نرخے وغیرہ دیے گئے ہیں۔ان کا موازنہ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اصل کاشت شدہ رقبے کے اعداد و شمار سے کیا ہے۔انکا یہ خیال ہے کہ سولہویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان کاشت شدہ رقبہ تقریباً دوگنا ہو گیا تھا۔ بہار، اودھ اور بنگال کے کچھ حصوں میں کاشت شدہ رقبے میں اضافہ کا بڑا سبب جنگلات کی صفائی تھی۔ جبکہ پنجاب اور سندھ جیسے علاقوں میں نہروں کے پھیلاؤ کاشت کی توسیع کی اہم وجہ تھی۔

10.3 کاشت اور آبپاشی کے ذرائع (Agriculture, and the Means of Irrigation)

زراعت کے تعلق سے ہندوستانی زراعت کی کچھ اہم خصوصیات ہیں۔ مغل عہد میں ہندوستانی کسان مٹی کی نوعیت اور فصلوں کی ضرورت کے لحاظ سے کھیتی کے لیے مختلف قسم کے آلات اور طریقہ کار کا استعمال کرتے تھے۔اسی طرح مختلف علاقوں میں آبپاشی کے لیے

مختلف ذرائع رائج تھے۔

10.3.1 کاشتکاری کے ذرائع اور طریقہ کار (Means and Methods of Cultivation)

اس عہد میں ہل اور بیل کا زراعتی معاملات میں ایک اہم کردار تھا۔ ہل اور بیلوں کے جوڑے کو استعمال کر کے کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ لوہے کی پھالی لکڑی کے ہل کے ساتھ جوڑ کر مکمل ہل بنایا جاتا تھا۔ یوروپ میں استعمال ہونے والے طریقہ کار کے برعکس ہندوستان میں نہ تو گھوڑا اور نہ ہی بیل کے ذریعہ کھینچے جانے والے پہیوں والا ہل اور نہ ہی مڑا ہوا بورڈ کا استعمال ہوتا تھا۔ علاقائی تغیرات کے ساتھ ساتھ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں ہلکے ہل سے لیکر جسے بآسانی کسان اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتا تھا سخت مٹی کو توڑنے کے لیے وزنی لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ نرم مٹی کے لیے لوہے کے ہل یا ہل کی پھالی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ حالانکہ کسانوں کے لیے لوہے والا ہل زیادہ مہنگا پڑتا تھا۔ کچھ ہمعصر یوروپی سیاحوں نے حیرت انگیز انداز میں ہندوستانی ہل کی خاصیت کا ذکر کیا ہے۔ انکے بیان کے مطابق ہندوستانی ہل نے صرف مٹی کا رخ کیا اور یہ کہ یہاں گہری کھدائی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا عمل یا طریقہ کار ہندوستانی ماحولیات کے مطابق تھا کیونکہ گہری کھدائی کی وجہ سے مٹی کی نمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صرف مٹی کا اوپری حصہ ہی زرخیز ہوتا تھا۔ جبکہ کھیت میں مٹی کی گانٹھوں اور ڈھیروں کو توڑنے کے لیے آلائی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں میں لکڑی کے تختوں کی مدد سے کیا جاتا تھا، جسے ٹپیلا کہا جاتا تھا۔ ٹپیلا کو بیلوں کے ذریعہ اس لکڑی کے پٹیلے کو میں کھینچا جاتا تھا۔ عام طور سے بیجوں کو ہاتھ سے بکھیر کر بویا جاتا تھا۔ حالانکہ سولہویں صدی میں بار بوسا نے دھان کی بوائی کے لیے بیج بونے والا ایک آلے کا کا ذکر کیا ہے، جسکا استعمال ساحلی علاقوں میں کیا جاتا تھا۔

زمین کی زرخیزی بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لیے مختلف مصنوعی طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ کھاد کے طور پر جنوبی ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ استعمال ہوتے تھے۔ عام طور سے ان مویشیوں کے ریوڑ کو کھیتوں میں چند راتیں باندھے جاتے تھے تاکہ ملبہ جمع ہو سکے، اس کے گودے کو بہترین کھاد سمجھا جاتا تھا۔ ایسا بھی مانا جاتا تھا کہ اگر ایک ایک ہزار مویشیوں کا ریوڑ ایک کنی زمین (1-132 یکڑ) میں پانچ یا چھ راتیں باندھ دیا جائے تو یہ عمل اس زمین کو چھ سے سات سالوں تک زرخیز رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر شمالی ہندوستان میں رائج تھا۔ حالانکہ ساحلی علاقوں میں مچھلی کا کھاد بھی استعمال ہوتا تھا۔ کھیت کی زرخیزی بڑھانے کے لیے اس کے علاوہ فصلوں کی گردش کا طریقہ بھی زمین پر پورے سال کھیتی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ مٹی کی پیداواری صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی کسانوں نے اپنے اجداد سے نسل در نسل اچھی کھیتی کے لیے فصلوں کی گردش کے طریقہ سے متعلق معلومات حاصل کر لیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کی زمین کی بہتر پیداوار کے لیے کس خاص فصل کو دوسری فصل سے بدلنا ہے۔

فصل کاٹنے کے لیے نیم دائرہ نما آلہ جسے درانتی کہا جاتا تھا، کا استعمال ہوتا تھا۔ بھوسا الگ کرنے کے لیے کٹی ہوئی فصلوں کو زمین پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ اس عہد کے ہمعصر ماخذ میں بھوسا الگ کرنے کے لیے دو طریقوں کے حوالے ملتے ہیں۔ پہلے طریقے میں فصل کو لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا، تاکہ اناج الگ ہو جائے جبکہ دوسرے طریقے میں پھیلی ہوئی فصل پر جانوروں کو جلایا جاتا تھا جس میں جانوروں کے وزن اور نقل و

حرکت سے اناج الگ ہو جاتا تھا۔ دوبارہ اناج کو ٹوکریوں میں رکھ کر آہستہ آہستہ پھینکا جاتا تھا اس عمل میں ہوا کی وجہ سے بھوسا اڑ جاتا تھا اور خالص اناج زمین پر گر جاتا تھا۔

10.3.2 آبپاشی کے ذرائع (Sources of Irrigation)

ہندوستانی زراعت آبپاشی کے لیے زیادہ تر بارش پر منحصر تھی۔ کچھ خاص فصلیں تو ایسے تھیں جنکی بوائی کے انتخاب کی بڑی وجہ کسی خاص علاقہ میں بارش کا پانی کی دستیابی تھی، یعنی جس علاقہ میں بارش کا پانی زیادہ دستیاب تھا انھیں علاقوں میں کچھ خاص فصلیں لاگئ جاتی تھی۔ بارش کے پانی جیسی قدرتی ذریعہ کے علاوہ، مصنوعی آبپاشی کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ حالانکہ کنووں سے آبپاشی کا طریقہ پورے ملک میں عام تھا۔ اس زمانے کے دستیاب ٹکنالوجی کے اعتبار سے کنووں سے پانی اٹھانے کے لیے مختلف طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں معیاری (اینٹ یا پتھر کے) پکے کنویں اور غیر معیاری (کچے) کنویں دونوں کھودے جاتے تھے۔ کچے کنویں پائدار نہیں ہوتے تھے اور ہر سال کچھ کدائی کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جبکہ پکے کنویں پائدار اور پانی اٹھانے کے بہتر آلات کو مستحکم کرنے کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ پکے کنووں میں دیواریں یا چبوترے بنائے جاتے تھے۔ کنویں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور پتھر دونوں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کنووں کے اندر سے عام طور سے ٹیرا کوٹا کے چھلّے لگائے جاتے تھے جسے انگوٹھی نما کنواں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کنووں سے پانی اٹھانے کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ پانی اٹھانے کے مندرجہ ذیل پانچ طریقہ کار عام تھے۔

1. بغیر کسی مشینی مدد کے ہاتھ سے رسّی اور بالٹی کے ذریعہ پانی کھینچنے کا طریقہ سب سے آسان تھا۔ لیکن اپنی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ آلہ بڑے کھیتوں کی سینچائی کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔
2. اس طریقہ میں کنووں کے اوپر گھرنی لگا کر رسی اور بالٹی سے پانی اوپر کھینچا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں گھرنی کی مدد سے کم محنت کے ساتھ بڑی مقدار میں کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مذکورہ بالا دونوں طریقہ کار اور آلات گھریلو استعمال میں پانی فراہمی یا چھوٹے کھیتوں کی سینچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔
3. اس طریقہ کار میں بیلوں کے جوڑے اور رسی گھرنی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ میں کار میں جانوروں کی طاقت کے استعمال سے بڑے کھیتوں کی سینچائی میں مدد ملتی تھی۔
4. یہ آلہ بیرمی اصول پر کام کرتا تھا۔ اس طریقہ کار میں ایک لمبی رسی کو ایک سیدھی شہتیر یا درخت کے تنے ایک سرے میں جھولنے کی حالت میں باندھ دیا جاتا تھا۔ بالٹی کو اسی رسّی میں باندھ دیا جاتا تھا، اور کمبھے کے دوسرے سرے پار بالٹی سے زیادہ وزنی چیز جیسے پتھر وغیرہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں آلہ کو چلانے کے لیے ایک شخص کا ہونا ضروری تھا۔
5. اس طریقہ میں پہیے کے استعمال کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طریقہ کار کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ برتنوں کو پہیوں کے کناروں سے جوڑا جاتا تھا۔ اس پہیے کو گھمانے کے لیے حیوانی طاقت کی مدد لی جاتی تھی۔ اس آلے کو اوپری سطح سے پانی اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کنووں کے لیے یہ بالکل بے معنی تھا۔ حالانکہ کنویں سے پانی اٹھانے کے لیے پہیے کا بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن تب طریقہ کار اور آلے میں تھوڑی

تبدیلی کی جاتھی تھی۔ جسمیں برتنوں کی لڑی سے تین پہیوں، ایک گیئر مکانزم اور جانوروں کی طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس آلے اور طریقہ کار کی مدد سے بڑے کھیتوں کی سینچائی کی جاتی تھی کیوں کہ اس میں ایک بڑی مقدار میں پانی فراہم کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ گہرے کنووں سے پانی اٹھانے کے لیے مناسب تھا۔ لیکن یہ طریقہ کار کی اپنی پیچیدگی اور جانوروں کی طاقت کے استعمال نے آلہ کو مہنگا بنا دیا تھا لہٰذا اس کی رسائی کسانوں تک مشکل سے ہی ہو پاتی تھی۔

مندرجہ بالا تمام طریقہ کار اور آلات کے علاوہ ہندوستان کے تمام حصوں میں جھیل، تالاب اور پانی کے ذخائر بھی سینچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ خاص طور سے جنوبی ہندوستان میں، آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والا سب سے زیادہ مروجہ طریقہ تھا۔ یہاں ندیوں پر باندھ (dam) بنائے گئے۔ ایسی آبی ذخائر کی تعمیر انفرادی طور سے کافی مشکل تھی۔ ایسی سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری خاص طور پر مقامی سربراہ، اور مندروں کے انتظامیہ کی تھی۔ اس ضمن میں ایک وسیع و عریض، مڈگ جھیل اس وقت کی فن تعمیر کی اہم مثال ہے جیسا کہ وجے نگر کے حکمرانوں نے تعمیر کی تھی۔ یہ تین زمینی پشتوں کے ساتھ تنگبھدرا ندی پر بنایا گیا تھا۔ تاکہ پہاڑیوں کے خلا کو پر کی جاسکے۔ جب بھر گیا تو یہ جھیل دس سے پندرہ میل لمبی تھی۔ تینوں پشتوں میں سے ہر ایک پر تراشے ہوئے پتھروں کے بڑے بڑے سلیبوں سے بنے ہوئے سلائس تھے۔ راجستھان ہندوستان کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں پانی کو جمع کرنے کے لیے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ سولہویں صدی کے مؤرخ ابوالفضل کے مطابق میواڑ کے ڈھبیر جھیل کا احاطہ تقریباً چھتّیس میل ہے۔ اُدیسا گر جھیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا احاطہ بارہ میل ہے۔ اس خطہ میں راجسَمند اور جَیسَمند وغیرہ دوسری اہم جھیلیں تھیں جسے سترہویں صدی میں بنائی گئی تھی۔ اسی طرح کے ذخائر جیسے مارواڑ میں اور بالسَن آمبیرم کے علاقوں میں باندھ کی مدد سے بنائے گئے تھے۔

اسی طرح گاؤں کے تقریباً ہر جھرمُٹ میں چھوٹے چھوٹے آبی ذخائر اور جھیلیں تھیں جہاں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ ہمعصر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1650 کے دہائی میں مغل سلطنت کے انتظامیہ نے کھیتوں کی سینچائی کے لیے خاندیش اور بیرار کے علاقوں میں باندھ بنانے کے لیے کاشتکاروں کو چالیس سے پچاس ہزار روپیہ دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ بھی کافی دلچسپ ہے کہ خاندیش میں اس طرح کے چھوٹے باندھوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جو اب بھی استعمال میں ہے، اوہ وہ تمام اس علاقے کے پانچ بڑی ندیوں جیسے موسم، گرنا، کین پنجبرا اور شیون کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں نہریں سینچائی کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔ دور وسطی میں نہروں کی تعمیر کا سلسلہ تغلق خاندان کے دور حکومت نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ یہی سلسلہ مغل عہد میں بھی جاری رہا۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور حکومت میں نہر فیض کی تعمیر ہوئی تھی جسکی لمبائی تقریباً ایک سَو پچاس میل تھی یہ جمنا ندی سے پانی کو ایک بڑے علاقے تک لے جاتا تھا۔ ایک اور نہر تقریباً سَو میل لمبی تھی جو لاہور کے قریب راوی ندی سے کاٹی گئی تھی۔ اسی طرح پورے سندھ کے ڈیلٹائی علاقے میں متعدد نہروں کے باقیات ملتے ہیں۔ مؤرخ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ مغل نہروں کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ زیادہ تر ادرگرد کے میدانوں سے اوپر نہیں بہتی تھیں۔ اس لیے ان نہروں سے جو پانی ملتا تھا وہ ان سے اٹھانے تک محدود تھا۔ ان علاقوں میں نہروں کے جال کا سلسلہ جاری رہا۔ جبکہ جنوبی ہندوستان میں نہروں کی تعمیر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے، کیوں کہ ان کا غلبہ صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود تھا۔

10.4 زرعی پیداوار (Agricultural Production)

ہندوستان ایک وسیع و عریض زمینی رقبہ ہے جہاں نہ صرف مختلف قسم کی نسلوں، مذاہب کے ماننے والوں کا گھر ہے بلکہ اس بڑے رقبہ میں مختلف قسم کی مٹی اور موسم بھی ہیں جہاں کئی اقسام کی پھلوں، سبزیاں اور فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں زرعی پیداوار پر ہندوستان کو فخر بھی ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے زرعی پیداوار کے تین اہم عنوانات جس میں غذائی فصلیں، نقدی فصلیں اور پھل، سبزیاں اور مصالحہ شامل ہیں، پر گفتگو کریں گے۔

10.4.1 غذائی فصلیں (Food Crops)

شمالی ہندوستان میں زیادہ تر موسمی فصلیں دو بڑے فصلی موسم خریف (خزاں) اور ربیع (بہار) میں اُگائی جاتی تھیں۔ حالانکہ کچھ علاقوں میں ہندوستانی کسان خریف اور ربیع کے درمیان قلیل مدت والی فصل پیدا کر کے تین فصلیں اُگانے کا رجحان بھی رکھتے تھے۔ چاول خریف کی سب سے اہم فصل تھی جبکہ ربیع کی اہم فصل گندُم تھی۔ جنوبی ہندوستان میں مختلف فصلوں کے لیے فصلوں کے بھی الگ الگ موسم نہیں تھے۔ کیوں کہ یہاں گیلی زمینوں پر دو بار دھان (چاول) کی فصل پیدا کی جاتی تھی۔ پہلی دھان کی فصل جون یا جولائی سے دسمبر یا جنوری کے دوران اور دوسری جنوری یا فروری سے اپریل یا مئی تک کھیتوں میں اُگائی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں خشک فصلیں جیسے (کمبو، سرخ چنا، اَرنڈ) مئی سے ستمبر یا اکتوبر تک بوئی جاتی تھیں اور اگست سے دسمبر۔ جنوری تک گیلی زمینوں پر اگست۔ ستمبر میں راگی اور چولم اور فروری ۔مارچ مین دھان کی فصل کاٹی جاتی تھیں۔ چاول اور گندُم دو بڑی غذائی فصلیں تھیں جنکی پیداوری پورے ہندوستان میں ہوتی تھیں۔ چاول کی پیداوار کا بڑا حصہ وہ علاقے تھے جہاں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ پورا شمال مشرق اور مشرقی ہندوستان (بہار، بنگال، اُڑیسہ، مشرقی اُترپردیش کا کچھ حصے)، گجرات کا جنوبی ساحل ور جنوبی ہندوستان چاول پیدا کرنے والے علاقے تھے۔ اوپر اوراق میں پہلے ہی یہ بتایا جاچکا ہے کہ جنوبی ہندوستان میں چاول کی کاشت کے دو اہم موسم تھے۔ ایک کدپاہ کار اور دوسرا سامب پیشم جنکا نام گرمیوں اور سردیوں کے موسم میں کاشت کی جانے والی چاول کے اقسام پر رکھے گئے تھے۔

پنجاب اور دکن کے سیرابی علاقوں سے بھی چاول کی کاشت کے حوالے ملتے ہیں۔ ہر علاقے میں موٹے سے لے کر عام اور وعمدہ قسم کے چاول کے اپنے اقسام تھے۔ بنگال اور بہر کے علاقوں میں بہترین قسم کے چاول پیدا ہوتے تھے۔ چاول کی طرح گیہوں کے بھی کچھ مخصوص علاقے تھے۔ پنجاب، سندھ، مغربی اُترپردیش اور وہ تمام خطے جہاں بارش کم ہوتی تھی وہاں گیہوں کی پیداوار ہوتی تھی۔ حالانکہ ہمعصر مآخذ میں گیہوں کی پیداوار کچھ حوالے ان علاقوں کے بھی ملتے ہیں جہاں چاول زیادہ اُگایا جاتا تھا، مثلاً بہار، بنگال، گجرات اور دکن کے کچھ حصوں میں اِسکی پیداوار کے حوالے ملتے ہیں۔ اِن دو بڑی فصلوں گیہوں اور چاول کے علاوہ جَو بھی بڑے پیمانے پر میدانی علاقوں میں اُگائے جاتے تھے۔ ابوالفضل کے آئین اکبری کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد، اَودھ، آگرہ، اَجمیر، دہلی، لاہور اور ملتان وغیرہ میں جَو کی کھیتی کی جاتی تھی۔ مختلف علاقوں میں دالوں کی کھیتی کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ دالوں کی اہم فصلوں میں اَرہر، چنے، مونگ، موٹھ، اُرد اور کھِساری شامل تھے۔

کھِساری کی بہار اور موجودہ مدھیہ پردیش کے علاقوں مین بڑے پیمانے پر اگائی جاتی تھی۔ کھِساری کے حوالے سے ابوالفضل کا ایک دلچسپ بیان بھی ہے۔ اس کے مطابق کھِساری کا استعمال صحت کے لیے نقصاندہ ہے۔ اس بات کی تصدیق جدید محققین بھی کرتے ہیں۔ جوار کی پیداوار کے حوالے کچھ استثناء کے ساتھ بنیادی طور پر ان علاقوں سے ملتے ہیں جہاں گیہوں اگائی جاتی تھی۔ ان میں جوار اور باجرہ دو اہم فصلیں تھیں۔ جہاں تک مکئی یا مکّا کی پیداوار کا سوال ہے۔ اس ضمن میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سترہویں صدی ہندوستان میں ایک طویل عرصے تک یہ فصل ناپید رہی۔ حالانکہ موجودہ کچھ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ راجستھان اور مہاراشٹرا اور ممکنہ طور پر دوسرے خطّوں میں بھی سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں مکئی کی کاشت یقینی طور پر ہوئی تھی۔

10.4.2 نقد فصلیں (Cash Crops)

بنیادی طور پر جن فصلوں کی اگائی منڈی کے لیے جاتی ہیں انھیں نقد فصل کہا جاتا ہے۔ ان فصلوں کو فارسی کے دستاویزوں میں جِنس کامل یا جِنس اعلی (یعنی اعلی درجے کی فصلیں) کہا جاتا تھا۔ موسمی غذائی فصلوں کے برعکس، یہ تقریباً پورا سال کھیتوں پر قابض رہتی تھیں۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں اہم نقدی فصلوں میں گنّا، کپاس، نیل اور افیوم تھے۔ یہ تمام فصلیں ہندوستان میں زمانہ قدیم سے ہی اگائی جاتی تھی۔ سترہویں صدی میں اس کی مانگ میں صنعتکاری اور تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ چونکہ اس صدی میں ان تمام اشیاء کی تجارت کے لیے بڑے بڑے غیر ملکی بازار بھی کھل گئے تھے۔ بازار میں ان اشیاء کے کثیر مطالبے پر ہندوستانی کسان نے اس پر فوری عمل کرتے ہوئے ان فصلوں کی کاشت میں اضافہ کیا۔

گنّا اس عہد میں سب سے زیادہ اگائی جانے والی نقد فصل تھی۔ ابوالفضل نے اپنے آئین اکبری میں اکو آگرہ، اودھ، لاہور، ملتان اور الہ آباد کے دستور حلقوں میں درج کیا ہے۔ حالانکہ بنگال کی چینی سب سے اچھی قسموں میں بہترین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ملتان، مالوا، سندھ، خاندیش، بیرار اور جنوبی ہندوستان کے تقریباً علاقے میں اسکی اگائی جانے کے حوالے ملتے ہیں۔ گنّے کے علاوہ کپاس دوسری نقد فصل تھی جسکی بڑے پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ موجودہ مہاراشٹر، گجرات اور بنگال کے حصے میں اسکی کھیتی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس عہد کے تاریخی مآخذ میں ذکر کیا گیا ہے کہ کپاس کی کھیتی اجمیر، الہ آباد، اودھ، بہار، ملتان، تھٹّا (سندھ) لاہور اور دہلی میں اسی کھیتی کی جاتی تھی۔ نیل ایک تیسری فصل تھی جسکی کھیتی مغل عہد میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ اس کے پودے سے نیلا رنگ نکلتا تھا جسکی ہندوستان اور یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ اس کی موجودگی کے حوالے اودھ، الہ آباد، اجمیر، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان اور سندھ کے دستور حلقوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اسکی کاشت گجرات، بہار، بنگال، مالوا اور جنوبی ہندوستان، دکن اور کورومنڈل میں کی جاتی تھی۔ بَیانہ اور سرکھیج نیل کی وہ اقسام تھے جن کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ بیانہ جو آگرہ کے قریب ایک جگہ ہے جسے نیل کی بہترین قسم کی پیداوار کے لیے جانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں کی نیل کی قیمت بھی تھی۔ اسی طرح احمد آباد کے قریب مقام سرکھیج کو معیار میں دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا تھا۔ اور اسکی قیمت بھی زیادہ تھی۔ اچھے قسم کے نیل کے دیگر مقامات اُترپردیش کے خُورجہ، علی گڑھ کے قریبی علاقے، سندھ کے سیہوان اور دکن کے تلنگانہ تھے۔

نقد فصل میں اَفیم یاافیون کا بھی شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اسکی کھیتی کی اطلاع کئی مقامات سے ملتے ہیں۔ مغل عہد میں بہار اور مالوہ کے صوبوں میں سب سے اچھی قسم کے افیون پیدا ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کی کاشت ہندوستان کے مختلف علاقے جیسے، اودھ، بہار، دہلی، آگرہ، ملتان، لاہور، بنگال، گجرات اور راجستھان کے مارواڑ اور میواڑ میں بھی کی جاتی تھی۔ جہاں تک تمباکو کی کاشت کا سوال ہے اسکی کھیتی ہندوستان میں کچھ کی عرصے پہلے پھیلی تھی۔ کیوں کی آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کا ذکر پر دستور حلقوں یا دوسرے خطوں میں فصل کے طور پر نہیں کیا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کی تمباکو کو ہندوستان میں پرتگالیوں نے سولہویں صدی کے دوران متعارف کرایا تھا۔ اسکی کاشت ملک کے تقریباً تمام حصوں میں اور خاص طور پر سورت اور بہار میں دیکھی گئی۔ جہاں تک کافی کی کھیتی کا سوال ہے مورخین کا یہ خیال ہے کہ اس کی کاشت ہندوستان میں سترہویں کے دوسرے نصف میں ابتداء ہوئی تھی جبکے مغل دور میں چائے کو ایک عام مشروبات مین شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اور سَن کی کھیتی مغل سلطنت کے تمام بنیادی صوبوں جیسے اودھ، الہ آباد، آگرہ، لاہور، اجمیر وغیرہ۔ میں کی جاتی تھی۔ حالانکہ شہتوت کے پودوں پر ریشم کے کی پرورش کے ذریعہ ریشم کی زراعت آسام، کشمیر، مغربی ساحل میں اور خاص طور سے بنگال میں کی جاتی تھی۔ دراصل بنگال ریشم کی پیداوار کا ایک اہم خطہ تھا۔ جن پودوں کے بیج تیل نکالنے کے لیے استعمال ہوتے تھے وہ خوراک کے ساتھ نقد فصلوں کے زمرے میں آتے تھے۔ تیل پیدا کرنے والی اہم فصلیں تِل، ارنڈی اور اَلسی (تیسی) تھیں۔ الہ آباد، ملتان اور بنگال میں بھی تَل کی کاشت کی اطلاع ملتی ہے۔ حالانکہ تل کے مقابلہ دیگر تیل کے بیجوں کے پودوں کی کاشت کم وسیع تھی۔

10.4.3 پھل، سبزیاں اور مصالحہ (Fruits, Vegetables, and Spices)

مغل عہد میں باغبانی کا عروج تھا۔ مغل بادشاہوں اور امراء نے بڑے تعداد میں باغات لگائے تھے۔ تقریباً ہر امیر کے باغات اُن شہروں کے مضافات میں تھے جہاں وہ رہتے تھے۔ باغات پورے منصوبہ بندی کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ موجودہ ہندوستان میں دستیاب مختلف پھل سولہویں اور سترہویں صدی میں متعارف کرائے گئے۔ اناناس ایک ایسا پھل ہے جو ہندوستان میں لاطینی امریکہ سے لایا گیا تھا جسکو بعد میں پرتگالیوں نے ہندوستان میں متعارف کرایا۔ تھوڑے ہی مدت میں یہ پھل اتنا مشہور ہوا کہ پورے ہندوستان میں اسکی کشت بڑے پیمانے ہونے لگی۔ پپیتا اور کاجو بھی اسی ذرائع سے ہندوستان میں متعارف کرایا گیا تھا، لیکن اسکی توسیع تھوڑی سست رہی۔ چیری کو کابل سے لاکر پیوند کاری (grafting) کے ذریعہ کشمیر میں اگایا گیا تھا۔ پیوندکاری کی مشق بہت سے پھلوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کی جاتی تھی۔ سنترے اور کھٹی پھلوں کے دیگر اقسام، خوبانی، آم اور دیگر پھلوں کی ایک بڑی تعداد کو پیوندکاری کے ذریعہ بہت بہتر بنایا گیا۔ ناریل نہ صرف ساحلی علاقے بلکہ اندرون ملکے میں بھی اگایا جاتا تھا۔ خربوزہ اور انگور کے مختلف اقسام کے بیج کابل سے لیے گئے شاہی باغات اور مغل امراء کے باغات میں بڑے سلیقے سے لگائے گئے۔ آم خربوزے کو تو کسان ندیوں کے کنارے ہر جگہ اگاتے تھے۔ جہاں تک سبزیوں کی کاشت کا سوال ہے تو پورے ملک میں مختلف قسم کی سبزیاں اُگائی جاتی تھی۔ آئین اکبری میں اس عہد میں کھائے جانے والی سبزیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ آلو اور ٹماٹر سترہویں صدی اور اسکے بعد ہندوستان میں متعارف کرائے گے تھے۔ ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی اپنے مصالوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں نے ایشیاء اور یوروپ کے مختلف خطوں میں ایک بڑے پیمانے پر مسالوں

کی برآمد کی گواہی دیتا ہے۔ کالی مرچ، لونگ، الائچی کی فراوانی تھی۔ ادرک اور ہلدی بڑے پیمانے پر اگائی جاتی تھی۔ ڈچ اور انگریز برآمد کے لیے بڑی مقدار میں سامان خریدا کرتے تھے۔ کشمیر میں کاشت کی جانے والی زعفران اپنے رنگ اور ذائقے کے لیے جانا جاتا تھا۔ پان بہت سے علاقوں میں اُگائے جاتے تھے۔ بہار کا مگھی پان اور بنگال کے دیگر مختلف قسم کے پان مشہور تھے۔ ساحلی علاقوں میں بھی سپاری پیدا کی جاتی تھی۔ حالانکہ بڑے جنگلی علاقے تجارتی لحاظ سے اہم مصنوعات فراہم کرتے تھے۔ طبّی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا لگنم اور لٹھ بڑی مقدار میں برآمد کی جاتی تھی۔

10.4.4 پیداواری صلاحیت اور پیداوار (Productivity and Production)

مغل ہندوستان میں فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پر بیگھا کی پیداوار پر شیرین موسوی نے کام کیا ہے۔ اس لیے اس موضوع سے متعلق معلومات کے لیے ان کی تحقیق پر انحصار ہے۔ اس سے متعلق آئین اکبری نے ضبطی صوبے جیسے لاہور، ملتان، آگرہ، الہ آباد، اودھ اور دہلی کے فصلوں کی پیداوار اور محصولات کی شرح کا نظام الاوقات دیا گیا ہے۔ ہر فصل کی پیداوار کی شرح اعلی، درمیانی، اور کم زمرے والی زمین کے مطابق دی گئی ہے۔ اسی بنیاد پر پیداوار کی اوسط تیار کی گئی ہے۔ حالانکہ ابوالفضل ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ ان تین اقسام کی بنیاد کیا تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ کم پیداوار ان زمینوں کی تھی جو غیر آبپاشی تھیں جبکہ باقی دوان کھیتوں کی ہیں جنکی سینچائی کی جاتی تھی۔ شیرین موسوی نے سولہویں صدی کے دستاویز سے دستیاب مختلف اعداد و شمار کی بنیاد پر زرعی پیداواری صلاحیت پر کام کیا ہے۔ اس کے اندازوں کے مطابق کچھ بڑی فصلوں کی پیداوار اوسط، درمیانی، اور کم پیداوار والی فصل مندرجہ ذیل کے مطابق تھی۔ شیرین موسوی نے آئین اکبری میں درج فصل کی پیداوار کا موازنہ انیسویں صدی کے آخر میں ہونے والی پیداوار سے بھی کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر دوادوار کے درمیان خوراک کی فصلوں کی پیداواری صلاحیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ پھر بھی نقد فصلوں کی صورت میں انیسویں صدی میں پیداواری کی صلاحیت میں ایک یقینی اضافہ دیکھا جاسکتا ہے۔

فصل کی اوسط پیداوار۔ (1595-96) (مَن اکبری فی بگھا الٰہی)

گیہوں	13.49	جَو	12.93	چَنا	9.71
باجرا	5.02	جَوار	7.57	کپاس	5.75
گنّا	11.75	سرسوں	5.13	تل	4.00

یہ اعداد شمار شرین موسوی کی کتاب، اکونومی آف دی مغل اَمپائر کے صفحہ نمبر 82 سے لی گئی ہے۔

10.5 پالتو مویشی (Domestic Animals)

مویشیوں خاص طور سے پالتو جانوروں کا مغل عہد کے زرعی پیداوار میں اہم کردار رہا ہے۔ ان مویشیوں سے ہل چلانے اور آبپاشی جیسے اہم زرعی کاموں میں کام لیا جاتا تھا۔ ان کے گوبَر کو کھاد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈیری مصنوعات زراعت سے متعلقہ

پیداوار میں خاطر خواہ تعاون لیا کرتا تھا۔ عام طور سے ہندوستان کے کسان کچھ مخصوص ذاتوں کے ساتھ مویشیوں کی پرورش میں شامل تھے۔ اس طرح کے زرعی کاموں میں مویشیوں کے بڑے پیمانے پر شمولیت ان کی بڑی آبادی کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چرنے والے کھیت وافر مقدار میں زمین اور آدمی کے اعلیٰ تناسب سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس عہد میں سیاحت کرنے والے یوروپ کے سیاحوں نے ہندوستانی کھیتوں میں مویشیوں کی بڑی تعداد میں موجودگی کا حوالہ دیتے ہیں۔ عرفان حبیب کا یہ تجویز ہے کہ مغل ہندوستان میں فس کس مویشیوں کی آبادی کا جدید اعداد و شمار کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے۔ مکھّن اور گھی کی کثرت استعمال کو عام لوگوں کی غذا کہا جاتا تھا۔ یہ بات بھی اس عہد میں مویشیوں کی ایک بڑی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بیلوں کو سامان کے نقل و حمل کے لیے بابیل گاڑیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بنجارے (جو ایک ہجرت کرنے والی تجارتی برادری تھی) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سیکڑے سے ہزار جانوروں کے ریوڑ پالتے تھے۔ ہزاروں بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ بھی پالے جاتے تھے۔

10.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس دور میں ہندوستان کی سیاحت کرنے والے غیر ملکی مبصرین نے زرعی آلات کی قدیمیت اور سادگی کے بارے میں تبصرہ کیا ہے، لیکن وہ تمام آلات ہندوستانی زراعت کی ضروریات کے مطابق تھے۔ اگرچہ زراعتی پیداوار کا انحصار بنیادی طور سے بارش کے پانی پر تھا، لیکن اس عہد میں مصنوعی آبپاشی کے ذرائع اور طریقہ کار بھی استعمال میں لائے جاتے تھے۔ پانی اٹھانے کے لیے مصنوعی آلات میں مختلف آلات جیسے ڈھینکلی، چرس، اور ساقیہ تھے جن کا استعمال کنوویں سے پانی اٹھانے اور آبپاشی کے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ حالانکہ ٹینکوں کے ذخائر اور ایک محدود حد تک نہریں سینچائی کے بنیادی ذرائع تھے۔ اس عہد کی زراعتکاری کے خصوصیات یہ بھی تھے کہ فصلوں کی گردش اور بازار کی ضروریات کے مطابق نقد فصلوں کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ اس عہد میں مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے پھلوں کی پیداوار ایک نئی بلندی تک پہنچ گئی تھی۔ اسی طرح فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پیداوار انیسویں صدی کے آخر کی جدید پیداواری صلاحیت اندپیداوار کے ساتھ اچھی طرح موازنہ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں مویشیوں کی فی کس آبادی زیادہ تھی۔

10.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

بیگہہ الہی : ساٹھ مربع گزِالہی کا رقبہ، گزِالہی کی لمبائی تقریباً بتّیس انچ تھی اور ایک بیگہہ الہی تقریباً ساٹھ ایکڑ تھی۔

حلقہ دستور : (Dastur Circle) اس علاقے کو کہا جاتا تھا جس کے اندر مختلف فصلوں کے لیے کچھ نقد محصول کی شرحیں نافذ کی گئی تھیں۔ پورا صوبہ بہت سے دستور حلقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جس میں ہر ایک حلقے کے لیے الگ الگ محصولات کی شرحیں ہوتی تھیں۔

شرح دستور : (Dastur Rate): مختلف فصلوں کے لیے نقد آمدنی کی شرح فی اکائی رقبہ۔

10.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل عہد میں کون سی فصل خریف کی اہم ترین فصل تھی؟

(الف) گیہوں (ب) جَو (ج) چاول (د) چنا

2. درج ذیل میں سے کون سی 'نقدی فصل' (Cash Crop) تھی؟

(الف) جوار (ب) گنّا (ج) باجرہ (د) دالیں

3. ہندوستان میں تمباکو کی کاشت کس نے متعارف کرائی تھی؟

(الف) انگریزوں نے (ب) مغلوں نے (ج) ڈچوں نے (د) پرتگالیوں نے

4. اناج اور سامان کی نقل و حمل کرنے والی مشہور تاجر برادری کیا کہلاتی تھی؟

(الف) بیوپاری (ب) بنجارے (ج) صراف (د) مہاجن

5. نیل کی پیداوار کے لیے کون سا مقام سب سے زیادہ مشہور تھا؟

(الف) بیانہ (آگرہ) (ب) سورت (ج) ڈھاکہ (د) ملتان

10.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دس اہم خوراک والے فصلوں کا نام بتائیں
2. مغل عہد میں خوراک والی، نقد اور تیل والی فصلیں کون کون سی تھیں۔
3. سینچائی کے مختلف ذرائع کے بارے میں ایک مضمون لکھئے۔

10.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل دور میں زراعت کی وسعت سے متعلق اعداد و شمار کے بارے میں مؤرخین کے درمیان کیا بحث ہے، بیان کیجئے۔
2. ربیع اور خریف کے فصلی موسم میں پیداوار پر ایک تفصیلی نوٹ لکھئے۔

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(د), 4-(ب), 5-(الف)

اکائی 11۔ غیر زرعی معیشت

(Non-Agricultural Economy)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 زراعت پر مبنی صنعت

11.2.1 ملبوسات

11.2.2 سوتی ملبوس

11.2.3 ریشمی ملبوس

11.2.4 اُونی ملبوس

11.2.5 نیل

11.2.6 چینی، تیل، تمباکو وغیرہ

11.3 معدنیات، کان کنی اور دھاتیں

11.3.1 معدنی پیداوار

11.3.2 دھات

11.3.3 ہیرے

11.4 لکڑی پر مبنی دستکاری

11.5 متفرقات

11.6 پیداوار کی تنظیمیں

11.6.1 گاؤں کے کاریگر اور رزق پر مبنی پیداواری نظام

11.6.2 بازار کے لیے پیداوار

11.6.3 دادنی

11.6.4 فیکٹری
11.6.5 کارخانے
11.7 خلاصہ
11.8 کلیدی الفاظ
11.9 نمونہ امتحانی سوالات

11.0 تمہید (Introduction)

دور وسطی کے ہندوستان میں اعلی قسم کی دستکاریاں موجود تھیں جو براہ راست تجارت و حرفت سے منسلک تھیں۔ ہمعصر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں دستکاری سرگرمیاں کچھ اہم تجارتی مراکز اور اس کے نزدیکی علاقوں میں کافی تیز تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دستکاری اور اس کو تیار کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں فارسی مآخذ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی۔ ہمیں اس کے بارے تفصیلی معلومات یوروپی سیاحوں کے دستاویزات اور مختلف غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے خط و کتابت سے ہوتی ہیں۔ حقیقت میں یہ کمپنیاں ہندوستانی دستکاروں کی پیداوار کے عمل اور معیار پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ حالانکہ دستکاری کی پیداوار مکمل طور سے گھریلو بازار میں اس کی مانگ اور کھپت پر منحصر تھی۔ دستکاری سرگرمیاں اس وقت کافی تیز ہو جاتی ہیں، جب ہندوستانی دستکاروں کی مانگ سترہویں صدی کے بیرون ملکوں میں زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی دستکاروں کی مانگ کے اس اضافہ نے پیداوری سرگرمیوں کو کافی حد تک متأثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس اکائی میں، ہم بڑے بڑے دستکاریوں، انکے اہم مراکز اس کو تیار کرنے میں استعمال ہونے والے کچّے مال اور طریقہ کار پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس کے علاوہ، ہم معدنیات کی دستیابی اور ان کی پیداوار کے ساتھ ساتھ کچھ منتخب دستکاریوں کی پیداواری تنظیموں پر بھی گفتگو کریں گے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- دور وسطی کے ہندوستان میں تیار کردہ مختلف قسم کی چیزوں، دستکاروں اور صنعتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- کچھ اہم اور مخصوص دستکاریوں اور دستکاری کے اہم مراکز کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جانے والی معدنیات کے بارے میں اندازہ لگا پائیں گے۔
- اس زمانے کے چند اشیاء کو تیار کرنے کے لیے استعمال ہونے والی تکنیک کے بارے میں جانیں گے۔
- دستکاروں کی تنظیموں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کریں گے۔

11.2 زراعت پر مبنی صنعت (Agro-Industry)

یہ واضح رہے کہ غیر زرعی معیشت میں وہ تمام صنعت بھی شامل ہیں جن میں زرعی پیداور کو سامان تیار کرنے کے لیے کچّے مال کے طور پر استعمال ہوا ہو، حالانکہ موجودہ دور میں زرعی صنعتوں کی اصطلاح مختلف قسم کی صنعتوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ دور وسطی کے ہندوستان میں صنعت کی وسیع پیمانے پر پیداور ایک ایسے شعبے میں تھی جہاں بنادی خام مال زرعی پیداور سے حاصل کیا جاتا تھا۔اکائی 16 میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس عہد میں نقدی فصلیں جیسے کپاس، گنے، نیل، تمباکو، وغیرہ کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔اس لیے یہ فطری بات ہے تھی کہ ان تمام نقدی فصلوں کی دستکاریوں کو بھی خوب فروغ ہوا ہوگا۔اس نہج سے ہم سب سے پہلے ان تمام دستکاریوں اور صنعتوں پر گفتگو کریں گے جنکا انحصار زرعی پیداوار پر تھی، مثلاً ملبوسات کے متعلق صنعت جن میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت اور دستکاریاں شامل تھیں۔اس کے علاوہ نیل، شکر اور مختلف قسم کے تیل کی صنعت پر بھی گفتگوں کریں گیں۔

11.2.1 ملبوسات (Clothing)

ملبوسات کے تعلق سے جس صنعت نے اس عہد میں سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا ان میں کپاس سے تیار کردہ سوتی ملبوسات کی صنعت تھی، جبکہ ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت کو بامقابل سوتی ملبوتات کے کم فروغ ملا۔

11.2.2 سوتی ملبوس (Cotton Clothes)

جہاں تک سوتی ملبوسات کا تعلق ہے تو دور وسطی کے ہندوستان میں یہ مشہور و معروف صنعت تھی جسے ممکنہ طور پر ملک کے تقریبا ہر حصے میں مقامی استعمال اور دور دراز کی منڈیوں کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ مشہور معاشی مؤرخ، تپن راے چودھوری کے مطابق، سوتی ملبوسات عملی طور پر پورے ملک میں تیار کیے جاتے تھے کیونکہ کے ہمالیہ کے ذیلی علاقوں کو چھوڑ کر کپاس کی کاشت تقریباً ہر جگہ ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ ہمعصر مأخذ میں ذکر کیے گے سوتی ملبوسات کے مراکز کی فہرست سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً صولہویں صدی کے مشہور مؤرخ، ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں سوتی ملبوسات کے اہم مراکز کی فہرست شامل کیا ہے۔اس فہرست یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات سوتی ملبوسات کا ملک میں سب سے اہم علاقہ تھا۔احمد آباد، بروچ، بڑودہ، کھمبات اور سورت وغیرہ بھی کو سوتی ملبوسات کے اہم مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ راجستھان کے شہروں میں اجمیر، سرونج، اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے کا ذکر سوتی کپڑوں کے مراکز کے طور پر کیا گیا ہے۔ جدید اترپردیش کے علاقوں میں لکھنؤ، اور اسکے ارد گرد کے چھوٹے شہر، بنارس، آگرہ، الہ آباد وغیرہ اسکے اہم اور نمایاں مراکز تھے۔ جبکہ شمال کے دیگر علاقوں میں دہلی، سرہند، سَمانا، لاہور، سیالکوٹ، ملتان اور تھٹّا جیسے شہر سوتی ملبوسات کے بہترین قسم کے اہم مراکز تھے۔ اسکے کچھ مراکز ہندوستان کے مشرقی حصوں میں بھی تھے۔ جن میں بنگال، بہار، اڑیسہ، سونار گاؤں، ڈھاکہ، راج محل، قاسم بازار اور اسکے ارد گرد کے کئی قصبوں کے علاوہ، بالاسور، پٹنہ اور اس سے ملحق علاقے شامل تھے۔ حالانکہ دکن، بُرہارپور، اور اورنگ آباد میں ایک عمدہ قسم کے سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ مہاراشٹرا کے علاقے بھی مشتنی نہیں تھے یہاں کے مغربی ساحل پر چول اور بھیونڈی میں بنائی گئی صنعت کو کافی فروغ ملا۔اسی طرح

قطب شاہی سلطنت اپنے کپڑوں کے لیے مشہور تھی۔ جنوبی علاقوں کے مسولی پٹنم اور کورومنڈل میں بھی سوتی کپڑے تیار کیے جاتے تھے۔ حالانکہ جنوبی علاقوں میں کوئمبٹور اور مالابار اچھے معیار کی کپاس کی کاشت کے لیے بھی مشہور تھے۔

ان تمام سوتی ملبوسات کے اہم مراکز کے علاوہ بہت سے علاقے ایسے بھی تھے جو صرف دھاگے تیار کرنے کے لیے مشہور تھے۔اِن تمام مراکز سے دھاگوں کو ان مقامات یا مراکز میں لے جایا جاتا تھا جہاں کپڑوں کی بنائی ہوتی تھی یہ وہی مراکز ہیں جنکا کا نام ہم پچھلے اقتباس میں ذکر چکے ہیں۔ تیار کردہ دھاگیں بیرونی ملکوں کو برآمد بھی کیا جاتا تھا۔ دھاگوں کی صنعت کے فروغ سے اس عہد میں سوت کاتنے کا کام باقاعدہ طور پر ایک خاص پیشہ بن گیا تھا جسے بڑے مراکز کے اندرونی اور آس پاس کے علاقے کے کسانوں اور عورتوں نے اپنی کمائی کا ایک اضافی ذریعہ کے طور پر اپنالیا تھا۔ جنکا اہم کردار بنکروں کو سوت فراہم کرنا تھا۔ میسور کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے خواتین ایک بڑی تعداد میں سوت کاتتی تھیں۔ حالانکہ وشاکھاپٹم، گنجام، بروچ، قاسم بازار اور بالاسور جیسے علاقوں میں سوت کی فروخت کے لیے مشہور بازار موجود تھے۔ جبکہ سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں گجرات بنگال کو سوت فراہم کرتا تھا۔ ڈھاکہ کے ململ کے لیے درکار ہونے والی باریک سوت کو وہاں کی نوجوان خواتین تکلی یا تکلے نامی اوزار کی مدد سے کاتتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی طرح کپڑوں کے مختلف معیار بھی تھے۔ جدید تحقیق میں مغلیہ سلطنت کے پانچ بڑے پیداواری مراکز میں تیار کیے جانے والے کپڑوں کی انتالیس اقسام کا ذکر یا ہے؛ حالانکہ یوروپی سیاحوں کے دستاویزوں میں کپڑوں کا ایک سو بیس سے زیادہ اقسام کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کی سوتی ملبوسات کے مختلف اقسام تھے اور علاقائی اعتبار سے ان کی خصوصیات بھی مختلف تھیں۔ جن میں بافتہ، سفید سوتی کپڑا (calico)، تفتہ، زرتری، چھینٹ، کھاسہ وغیرہ ایسے اقسام تھے جنکا یہاں ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ بافتہ کو ابوالفضل کی کتاب آئین اکبری میں سوتی کپڑے کی سب سے اعلی قسم کے طور پر ذکر ہوا ہے یہ کپڑے کی ایک قسم تھی جو عام طور پر سفید یا ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے۔ حالانکہ کَیلِکو (calico) کا لفظ یوروپین سیاحوں نے عام طور پر ہر قسم کے سوتی کپڑے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جبکہ کَیلِکو کا مطلب ایک موٹے قسم کا سفید کپڑا بھی ہوتا تھا۔ تافتہ ریشمی کپڑے کا ایک قسم تھا جسے کبھی کبھی سوتی دھاگے کے ساتھ بنا جاتا تھا۔ زَرتَری ایک ایسا کپڑا تھا جسے سونے اور چاندی کے دھاگے سے ملا کر بنا جاتا تھا۔ چھینٹ بھی ایک قسم کا سوتی کپڑا تھا جسے پھولوں یا دیگر طریقے سے رنگا جاتا تھا۔ کھاسہ ململ کی ایک قسم تھی جو کافی قیمتی اور اچھے قسم کا کپڑا تھا۔

اس عہد میں کچھ کپڑوں کے نام انکے تیار کردہ مقام کے نام پر ہی رکھ دیا گیا تھا، جن میں دریابادی (جدید اترپردیش کا ایک ضلع جو بارہ بنکی ضلع کے نزدیک ہے)، خیرآبادی (جدید اترپردیش کا ضلع سیتاپور میں ایک قصبہ)، سَمیان (سَمانا)، لکھواڑیا (موجودہ پٹنہ ضلع کا ایک مقام) وغیرہ شامل تھے۔ حالانکہ کچھ علاقے تو ایسے تھے جسے خاص قسم کے لیے جانا جاتا تھا، مثلاً گجرات بافتہ کے لیے، سونارگاؤں کا ململ اور بنگال کے ڈھاکہ سے ان کی تخصیص کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ لیکن سترہویں صدی میں یوروپین کمپنیوں کی تیز رفتار تجارتی سرگمیوں کی وجہ سے اس میں کچھ اہم تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جسکی تعداد میں انگریزی، ڈچ اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا جیسی کمپنیوں کی آمد کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جبکہ ان تمام کپڑوں میں سب سے زیادہ عام سوتی کپڑے کی مانگ تھی۔ اعلی قسم کا سفید کپڑا (calico) کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا، مثلاً بہار اور بنگال میں اسے اَمبرٹیز کہا جاتا تھا، تو گجرات میں بافتہ وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ حالانکہ سوتی کپڑوں کے دیگر مشہور اقسام میں بنگال

کی باریک ململ تھی جسے کھاسہ کہا جاتا تھا۔ جبکہ چھینٹ ایک چھاپ شدہ کپڑا تھا جسے ریشم کے دھاگے کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ گجرات کا شہر احمد آباد نے چھاپ شدہ کپڑے کی وجہ سے شہرت حاصل کر لیا تھا جسے چھینٹ کہا جاتا تھا۔

جہاں تک سوتی ملبوسات کو تیار کرنے کے طریقہ کا سوال ہے تو اسے تیار کرنے میں کئی مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، جیسے سوت کاتنا، لوم کے ذریعہ کپڑے تیار کرنا، رنگنا، رانگکاری اور پرنٹنگ وغیرہ کے مراحل شامل تھے۔ سب سے پہلے مرحلے میں زراعت پر مبنی نقدی فصل، کپاس سے بیج کو الگ کر کے سوت تیار کیا جاتا تھا۔ جس میں سب سے پہلے دُھنیا (روئی کو صاف کرنے والا پیشہ ور) اپنے کمان سے کپاس سے بیج نکال کر روئی کی صفائی کرتا تھا، اسکے بعد صاف روئی کو چرخی کے ذریعہ سوت تیار کیا جاتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں سوت یا دھاگے سے لوم پر کپڑا تیار ہوتا تھا، اس مرحلے میں ابھی تک کپڑا پوری طرح تیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ تیسرے مرحلے میں کپڑے کو استعمال کرنے سے پہلے اس کی بلیچ یا رنگا جاتا تھا، اس فعل کو لوگوں کے ایک الگ ہی گروہ کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ جنکے لیے عہد وسطی میں کچھ خاص مقامات تھے۔ گجرات کے بروچ کو وہاں کے پانی کی خاص معیار کی وجہ سے بلیچنگ کے لیے سب سے اچھا مقام میں شمار کیا جاتا تھا۔ ہمعصر مأخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی آگرہ اور لاہور میں خریدے گئے کپڑوں کو بیرونی ملکوں کو برآمد کرنے سے پہلے بروچ اور گجرات کا ایک خاص جگہ، نوساری میں بلیچنگ کے لیے بھیجتا تھا۔ گجرات کے ان دو مقامات کے علاوہ، احمد آباد، سورت، پٹنہ، سونار گاؤں، ڈھاکہ، مسولی پٹم وغیرہ دوسرے شہر بھی تھے جہاں بڑی مقدار میں کپڑوں کی بلیچنگ کی جاتی تھی۔ بلیچنگ کے وقت کپڑوں کو بھگونے (جیسا کہ باریک کپڑوں میں کیا جاتا تھا) یا اسے کسی خاص محلول میں ابالنے کا عمل بھی شامل تھا، اس کے بعد اسے اچھی طرح دھو کر خشک کر لیا جاتا تھا۔ حالانکہ نیل کو بلیچنگ میں کپڑوں کو سفید کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے آخر مرحلے میں کپڑوں پر رنگکاری اور پرنٹنگ کی جاتی تھی جو اس عہد میں ایک خاص پیشہ بن گیا تھا جسے رنگریز (کپڑوں کے رنگنے والا ایک طبقہ) کہا جاتا تھا۔ اس طبقے نے اس پیشہ میں اتنا مہارت حاصل کر لیا تھا کہ اسے ایک الگ ذات سمجھا جانے لگا۔ رنگکاری کے لیے عام طور سے سبزیوں سے نکلنے والے رنگ کا استعمال ہوتا تھا۔ سرخ رنگ چھائے یا لاکھ سے تیار کیا جاتا تھا، جبکہ نیلے رنگ کے لیے نیل کا استعمال کیا جاتا تھا۔

11.2.3 ریشمی ملبوس (Silk Clothes)

ملبوسات کو تیار کرنے کے لیے ریشم بھی ایک اہم چیز تھی۔ سولہویں صدی کے مشہور مؤرخ ابوالفضل نے کشمیر کا ذکر کیا ہے جہاں ریشمی کپڑے زیادہ تیار کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پٹنہ، احمد آباد، اور بنارس جیسے شہر بھی ریشمی کپڑوں کے لیے کافی مشہور تھے۔ معاشی مؤرخین کا معقول طور سے یقینی خیال یہ ہے کہ سترہویں صدی میں بنگال میں خاص طور سے ریشم کی پیداوار اور اس کی بیرون ملکوں کو برآمدگی میں کافی اضافہ ہوا۔ کیونکہ اس سے قبل، اگرچہ گجرات کے علاوہ جو تیار شدہ ریشم پیدا کرنے والا ایک اہم علاقہ تھا، کشمیر اور بنگال (بشمول مشرقی ضلع بکلا کے) میں بہت تھوڑی مقدار میں ریشم کی بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ یوروپین سیاحوں میںرق اور منوچی کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ کشمیر، گجرات اور بنگال ریشم کے اہم مراکز تھے لیکن آگرہ، لاہور، فتح پور اور غالباً پٹنہ اور تھٹّا جیسے شہر بھی اسکے دوسرے مراکز میں شامل تھے۔

جہاں تک ریشمی ملبوسات کی صنعت کا سوال ہے تو اس کے فروغ کا اندازہ ابوالفضل کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں اسنے ریشم کی پیداوار میں بادشاہ اکبر کی دلچسپی اور ریشم کی بنائی کی بہتری کے لیے غیر ملکی کاریگروں کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ گجرات ابتدا میں چینی خام مال پر بہت زیادہ منحصر تھا، کیونکہ اس علاقے میں ریشم کی پیداوار کا کبھی بھی فروغ نہیں ہو پایا۔ جبکہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں بنگال نے ریشم کی فراہمی کے ذریعہ چین کو مکمل طور پر ہندوستان سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ بنگال میں ریشم کی پیداوار میں ہونے والے اضافے سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بنگال کے صرف قاسم بازار نے تقریباً دو ملیَن پاؤنڈ سے زیادہ خام ریشم تیار کیا تھا، جس کی دو تہائی گجرات کو برآمد کی گئی اور باقی کے ایک تہائی ملک کے عوام کے پاس رہا۔ اس کے علاوہ، سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈچوں کو جاپان میں ہندوستانی ریشم کی ایک منڈی مل گئی تھی، اور اسی عہد میں انگریزوں نے بنگال کا خام ریشم یوروپ کو برآمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریشم سے تیار شدہ مصنوعات میں قالین، مخمل کے خیمے، سونے اور چاندی سے بنے ساٹن اور ریشمی چمکدار کپڑے، مختلف رنگوں سے سجے پٹولے وغیرہ شامل تھے۔ ہندوستانی ریشمی کپڑوں میں مشہور جڑی بوٹیوں کا کپڑا بھی شامل تھا، جسے آج کے زمانے میں تسَر اور آسام کا جنگلی ریشم (مونگا) کہا جاتا تھا، جسکا ذکر یقینی طور پر یوروپین سیاح ٹاورنیر (Tavernier) نے کیا ہے۔

11.2.4 اونی ملبوس (Woolen Clothes)

دور وسطی میں اون بھی ایک اہم مواد تھا جسکا استعمال ملبوسات بنانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن ہمعصر مأخذ سوت اور ریشم سے بنے ملبوسات کے مقابلے اون سے تیار ملبوسات کے بارے میں خاموش ہیں۔ اگرچہ ابوالفضل نے اونی کمبل کا ذکر تو کیا ہے، لیکن باقی تمام دستیاب حوالے سے شال اور قالین کے بارے میں ہی علم ہوتا ہے۔ اونی مصنوعات میں سب سے مشہور کشمیر کی شال تھی جو پوری دنیا میں کو برآمد کی جاتی تھی۔ فرانسیسی سیاح، برَنیر نے شال کا ذکر کشمیر کی سب سے اہم صنعت کے طور پر کیا ہے۔ حالانکہ کشمیری شال میں استعمال ہونے والی باریک اُون تبت سے درآمد کی جاتی تھی۔ اگرچہ بادشاہ اکبر نے لاہور میں اس صنعت کو فروغ دیا لیکن وہاں تیار کیے گئے شال کشمیری شالوں کے معیار سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ کشمیری شالوں کو تیار کرنے کی کوشش شمالی ہندوستان کے کئی شہروں، جیسے پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں کی گئی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس عہد میں اعلی طبقے کے لیے عمدہ قسم کے اونی لبوسات عام طور سے یوروپین تاجروں کے ذریعہ فراہم کیے جاتے تھے۔ جبکہ کمبل تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں اون سے تیار کیے جاتے تھے۔ دوسرے ملبوساتی اشیاء میں کپاس کی دَری، ریشم اور اون کی قالین، خیمے اور لحاف وغیرہ شامل تھا۔ ان تمام اشیاء میں قالین کی بنائی ملبوسی پیداوار کی ایک اہم شاخ تھی۔ شمالی ہندوستان کے کچھ علاقے قالین کے اہم مراکز تھے ان میں بہار کا داؤد نگر، اور رہا، دہلی، آگرہ، لاہور اور مرزاپور شامل تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں وارنگل قالین کے لیے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ قالین کی بنائی کا کام کورومنڈل کے ساحلی علاقوں کے ساتھ ساتھ مسولیپٹم میں بھی کیا جاتا تھا۔ دوسری صنعت کے مقابلے قالین کی بنائی کی پیداوار بہت زیادہ نہیں تھی اور اس عہد میں ایرانی قالین کا استعمال جاری تھا۔ بادشاہ اکبر نے شاہی کارخانوں میں ایرانی قسم کی قالین کے بعد ریشم کی قالین کی صنعت میں خاص دلچسپی لی۔ ایک معاشیاتی مؤرخ کا خیال ہے کہ 'اپنے کارخانوں مین فارسی قسم کی قالین بنانے کی اکبر کی کوششیں، زیادہ کامیاب تھیں۔' قالین کی صنعت کے علاوہ اس عہد میں خیمہ تیار کرنے کی صنعت بھی تھی، جسکا استعمال زیادہ تر شاہی

اداروں میں ہوتا تھا۔ ابوالفضل نے گیارہ قسم کے خیموں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ، سوتی، ریشم یا چاندی سونے کے دھاگے سے ہر قسم کے ملبوسات پر کڑھائی بھی ایک مربوط دستکاری تھی، جسمیں بڑی تعداد میں کاریگر شامل تھے۔

11.2.5 نیل (Indigo)

نیل کی مانگ نہ صرف ہندوستان میں تھی بلکہ اسے بیرونی ملکوں کو بھی بڑے پیمانے پر برآمد کیا جاتا تھا۔ دور وسطی میں نہ صرف اس کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھا بلکہ امانگ کے مطابق زیادہ وسیع پیمانے پر بنایا جاتا تھا۔ اس کی پیداوار اور صنعت کے اہم مراکز آگرہ کے علاقے میں واقع تھے، خاص طور سے بیانا کا علاقہ۔ اس کے علاوہ گجرات مین سرکھیج نامی مقام اور شمالی اور جنوبی کورومنڈل میں کئی مقامات تھے جو نیل بنانے کے اہم مراکز تھے۔ ان مقامات کے علاوہ، دیگر مقامات میں راجستھان کے جیپور ریاست میں ہندوان، بلند شہر اور مشرق میں خاندیش اور برہان پور تھے۔ بیانا کی نیل کو سب سے بہترین سمجھا جاتا تھا حالانکہ کی سرکھیج کی نیل کی قسم کی قیمت زیادہ تھی۔ عام طور سے رنگنے والی چیزین کسان خود ہی بناتے تھے۔ لیکن گجرات میں کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں نیل کے پتے ان لوگوں کو فروخت کر دیا جاتا تھا جو اس صنعت میں مہارت رکھتے تھے۔ جہاں تک اس کی کھپت کا سوال ہے تو تیار شدہ نیل کا ایک بڑا حصہ مقامی طور پر استعمال ہوتا تھا، لیکن جب یوروپ میں اس کی برآمد میں کافی اضافہ ہوا تو انگریزوں نے بیرون ملکوں کے برآمد کے لیے گجرات اور آگرہ پر اپنی توجہ مرکوز کیا۔ حالانکہ ڈچوں نے اس کی تجارت کے لیے کورومنڈل کی طرف توجہ کیا۔ دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ نیل کی صنعت کی تاریخ ہندوستان کی زرعی پیداوار کی قیمت کے جوابی کردار کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کردار کو کئی مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً 1630ء کے قحط کے بعد، اس کی پیداوار میں کمی آئی کیونکہ غذائی اجناس کی قیمتیں زیادہ ہو گئیں جس کی وجہ سے غیر غزائی فصلیں پیدا کرنے والے پہلے ہلاک ہوئے۔ کورومنڈل کے علاقے کے بارے میں تہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب بی نیل کی مانگ میں کمی آئی، تو اسے صنعت سے ملحق لوگ تیزی سے زرعی کاشت کی طرف منتقل ہوئے۔ نیل کے پودوں سے نیل نکالنے کا عمل کافی آسان تھا۔ اس عمل میں سب سے پہلے پودوں کی ڈنڈیاں پانی ڈال دیا جاتا تھا، جب رنگ پانی میں مل جاتا تھا تو اس پانی کو دوسرے حوض میں لے جایا جاتا تھا جہان نیل کو حوض کے نچلے حصے میں رہنے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسے چھان کر کیک کی شکل میں خشک کیا جاتا تھا۔ یہ عمل زیادہ تر گاؤں کے کسان کیا کرتے تھے۔

11.2.6 شکر، تیل، تمباکو، وغیرہ (Sugar, Oil, Tobacco, etc.)

آج کی طرح دور وسطی کے ہندوستان میں بھی گنے کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، جس سے پورے ملک لیے شکر تیار کی جاتی تھی۔ عام طور سے گنے سے تیار کردہ چینی تین قسم کی ہوتی تھی۔ گڑ، باریک دانے والی سفید شکر اور مہنگی کینڈی یا بڑے کرسٹل جو ملک کے کئی حصوں میں تیار کیے جاتے تھے۔ گڑ ان تمام علاقوں میں بنایا جاتا تھات جہاں گنے کی کاشت ہوتی تھی، اور اسے مقامی طور پر کھایا جاتا تھا۔ حالانکہ چینی کی بہترین اور سستی قسمیں بنگال سے آتی تھیں۔ آگرہ اور اسکے پڑوس کے علاقے، ملتان اور اڑیسہ چینی پیدا کرنے والے دیگر علاقوں میں سے تھے۔ سترہویں صدی میں دکن کے بارے میں لکھتے ہوئے، تھیونوٹ نے ذکر کیا ہے کہ ہر کسان جو گنا اگاتا ہے اس کی اپنی بھٹی ہوتی تھی۔

ابوالفضل نے ایک آدمی کی لیے باریک قسم کی چینی کی قیمت 128 دام بتایا ہے، جبکہ مہنگی کنڈی کی قیمات 220دام لکھا ہے۔ بنگال کے بارے میں تہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس صوبے نے یوروپین کمپنیوں کی تجارتی سر گرمیوں کے ذریعے یوروپ اور ایران میں اپنا منڈیان تلاش کر لیا تھا، یہ بات چینی کی پیداور میں ایک اضافے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ مثلاً1640 کی دہائی میں ڈچوں نے جو چینی ایران کو برآمد کیا تھا اس کی سالانہ کی اوسط 40000 سے 45000 تھی۔ گنے کا رس نکالنے کے طریقوں میں کولہو کا استعمال کیا جاتا تھا جسے ہاتھ کی مدد سے یا جانوروں کی طاقت کی مدد سے جلایا جاتا تھا۔ گڑ یا باریک قسم کی چینی کو کڑھاہی یا کھلی بھٹی میں ابال کر حاصل کیا جاتا تھا۔ گرنے کے رس کو ابالنے کے دوران ہی مختلف قسم کی چینی تیار کی جاتی تھی۔

دیگر زرعی پیداور پر مبنی غیر زرعی معیشت میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو گھریلو استعمال کے لیے خاص تھیں اور جسکی کبھی کبھی مقامی طور پر تجارت ہوتی تھیں۔ان چیزوں میں تیل، تمباکو، افیون، زعفران اور نشیلی مشروبات شامل تھیں۔اڑیسہ کے ساحلی علاقوں نے تو اپنا نام تیل کی بیجوں سے حاصل کیا تھا جو وہاں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ جبکہ بنگال کا مِدناپور کا علاقہ پھولوں اور دیگر خوشبودار مادوں سے قیمتی بدبودار تیل تیار کرتا تھا، جو ملک کے تمام دوسرے حصوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ جبکہ گوالیر اپنی چنبیلی تیل کے لیے مشہور تھا۔ تیل نکالنے کی صنعت میں بھی زیادہ تر گاؤں کے لوگ شامل تھے۔ تیل نکالنے کے عمل میں بھی گنے کی طرح دستی طور پر یا جانوروں کی طاقت سے چلنے والے بیج کو دبانے والے آلہ رکھا جاتا تھا۔اس پیشہ میں شامل ایک خاص ذات تھی جسے تیلی کہا جاتا تھا۔ تیل نکالنے کے بعد بقیہ مصنوعات جانوروں کے کھانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ تمباکو، ایک نئ تجارتی فصل تھی جو سترہویں صدی میں ہندوستان میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلے اسے اکبر کے دور میں پرتگالیوں نے لایا تھا۔ منوچی کے مطابق، اس وقت جب وہ ہندوستان میں تھا دہلی میں مشترکات پر روزانہ کی سیر ٹیکس 5000 تک پہنچ گئی تھی، جب کہ یہ گجرات، بنگال اور کورومنڈل مین پہلے سے ہی ایک برآمد ہونے والی مصنوعات تھی۔اس کے علاوہ مسولی پٹنم کے بوری کے قریب تین سے چار سال کے بچے بھی تمباکو پیتے ہوئے پائے گئے۔ حالانکہ مالوا اور بہار میں افیوں ایک قائم شدہ صنعت تھی۔ جہاں تک نشیلی مشروبات کا سوال ہے تو ہندوستان کے بہت سے حصوں مین تاڑی، مہوا اور گڑ کے تیار شدہ نشیلی مشروبات تھے۔

11.3 معدنیات، کان کنی اور دھاتیں (Minerals, Mining, and Metals)

ہندوستان میں سولہویں اور سترہویں صدیوں کے درمیان بہت گہری کان کنی نہیں کی جاتی تھی، لیکن معدنیات اور دھات کی ایک بڑی تعداد کے لیے سطح کی کان کنی کا راوج تھا۔ مؤرخین کے مطابق ہندوستان کی معیشت کے شعبوں میں سے ایک کمزور شعبہ معدانیات کی پیداوار تھی۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ اس کی کمزوری کی وجہ یہ تجویز کی ہے کہ بڑی حد تک معدنیات اور اندھن کے وسائل کے ناکافی جوڑ کا نتیجہ تھا۔اس کے علاوہ گہری کان کنی کی تکنیکیوں سے ناواقفیت بھی ایک وجہ رہی ہو گی۔

11.3.1 معدنی پیداوار (Mineral Production)

معدنی پیداور مین نمک ایک ضروری شے تھی جس میں ہندوستان خود کفیل نظر آتا ہے۔ نمک حاصل کرنے کے مختلف ذرائع تھے

جیسے راجپوتانا کی سمبھر جھیل، پنجاب میں موجود سیندھا نمک کی چٹّانوں کی کانیں، اور سمندری پانی سے حاصل ہونے والے ذرائع۔ سمندری نمک بنیادی طور پر سندھ، رن آف کچھ، گجرات کے دیگر ساحلوں، مالا بار، میسور اور بنگال وغیرہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ چونکہ نمک ہندوستان کے کچھ مخصوص علاقوں دستیاب تھا، اس لیے یہ علاقائی اور تجارتی لحاظ سے تجارت کی اہم چیزوں میں سے ایک تھا۔ شورہ ، معدنیات میں سے ایک اہم صنعت تھی جسکی یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ اس کا استعمال بارود کے اجزاء کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ابتدائی طور پر شورا احمد آباد کے برودم وغیرہ سے نکالا جاتا تھا۔ لیکن جونکہ اس کی کھپت کی مانگ پورا نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اس کو دہلی، آگرہ کے علاقے میں بھی بنایا جانے لگا۔ حالانکہ سترہویں صدی کے دوسرے نصف تک، بہار کا ضلع پٹنہ شورا کی خرید و فروخت کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ پٹنہ کے قریبی مقامات سے جمع کیے گئے شورا کو پھر کشتیوں کے ذریعہ گنگا کے نیچے ہگلی بھیجا جاتا تھا۔ اور وہاں سے یوروپ میں برآمد کیا جاتا تھا۔ ٹیورنیر کا بیان ہے کہ ہالینڈ سے درآمد شدہ برتن میں پانی ابالتے تھے۔ ایک مأخذ کے مطابق تو سال 1688 میں تقریباً دو لاکھ من کچے شورے کی پیداوار صرف بہار سے ہوی تھی۔ جب کہ دیگر معدنیات جیسے پھٹکری، اور ابرک چھوٹے پیمانے پر تیار کیا جاتا تھا۔

11.3.2 دھات (Metal)

در حقیقت ہندوستان میں سونے اور چاندی کے کانیں نہیں تھیں۔ سونے اور چاندی کی مقدار بہت کم تھی، کیوں کہ ان کی اقتصادی اہمیت بہت کم تھی۔ ابھی تک کولار کی مشہور سونے کی کانیں تھیں۔ ندیوں کی بستروں سے تھوڑے مقدار میں سونے کی ضرورت پوری کی جاتی تھی، لیکن یہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ یوروپی سیاح فچ نے بہار کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں ندیوں کی ریت کو دھو کر سونے کی دھول تلاش کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے کچھ دوسرے علاقوں میں بھی ندیوں کے بستروں میں سونا پایا جاتا تھا۔ چاندی کی زیادہ تر ضروریات باہر کے ملکوں سے درآمد کے ذریعہ پوری کی جاتی تھی۔ سونا اور چاندی سکوں کے ٹکسال کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اس کی ایک بڑی مقدار زیورات بنانے اور قیمتی دھات کے طور پر ذخیرہ اندوزی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جہاں تک تانبے کی بات ہے تو راجستھان تانبے کی پیداوار کا مرکزی علاقہ تھا، جہاں کھیتری نامی مقام میں تانبے کی کانیں موجود تھیں۔ اس دھات کا ایک بڑا مقدار تانبے کے سکوں کی ٹکسال کی لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کی چھوٹی بڑی چیزیں بھی اسی دھات سے بنائی جاتی تھیں۔

تمام دھاتوں میں لوہا سب سے زیادہ مقدار میں پائی جانے والی دھات تھی۔ اس کی کانیں ہندوستان کے شمالی، مشرقی، مغربی، وسطی اور جنوبی حصوں میں وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ دھات کی کانیں مغل سلطنت کے مختلف صوبوں جیسے، بنگال، بہار، الہ آباد، آگرہ، بیرار، گجرات، دہلی اور کشمیر میں پائی جاتی تھیں۔ اسکے علاوہ یہ دھات بہار میں چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ کے ملحقہ علاقوں مین بھی بڑے مقدار میں پایا جاتا تھا۔ حالانکہ جنوب میں پایا جانے والا لوہا فولاد میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے استعمال ہل، کلہاڑی، کیل، پینچ، تلوار، خنجر بنانے میں ہوتا تھا۔ جنوب میں خاص طور پر گولکنڈہ میں تیار کردہ اسٹیل کو دمشق کی تلواریں بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، جسکی دنیا بھر میں تعریف کی جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہتھیاروں کے بہت زیادہ مانگ کو دیکھتے ہوئے، ہندوستان لوہے میں خود کفیل تھا۔ ہندوستان می لوہے کی فراوانی اور اس کی بیرون ملکوں میں برآمد گی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1660 کی دہائی میں ڈچوں نے کورومنڈل سے بتاویہ تک لوہے کی

مصنوعات کو برآمد کرنا شروع کیا تھا۔ پیداوار کی مقدار اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1667 میں ہندوستان سے 105000 پاؤنڈ کیل، 188000 پاؤنڈ توپ کے گولے، 189000 پاؤنڈ لوہے کی سلاخیں اور 10000 پاؤنڈ لوہے کی بستر برآمد کیے گئے تھے۔ ان تمام دھاتوں کے علاوہ کچھ دوسرے دھاتیں، اگرچہ ان کی مقدار تھوڑی تھی، بھی بنایا جاتا تھا، جیسے سیسہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔

11.3.3 ہیرے (Diamonds)

ہندوستان کی ایک اور چیز جو تمام غیر ملکی مبصرین کے تصور سے باہر تھی وہ ہیرا تھا، حالانکہ ملکی معیشت میں اس کی اہمیت شاید زیادہ نہ تھی، لیکن یہ ایک ایسی صنعت تھی جس نے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف راغب رکھتا تھا۔ ہیروں کی کانوں میں سب سے اہم گولکونڈہ اور بیجاپور کی کانیں تھیں۔ حالانکہ چھوٹا ناگپور میں ہیرے کی ایک چھوٹی مقدار بھی ندیوں کے کنارے سے جمع کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات میں برار کے بیڑا گڑھ، مدھیہ پردیش کے پنّا میں بھی ہیرے کی کان کنی کی جاتی تھی۔

11.4 لکڑی پر مبنی دستکاری (Wooden Crafts)

لکڑی پر مبنی دستکاری نے ایک بڑی تعداد میں مختلف قسم کی دستکاری کی بنیاد رکھی۔ اس سے بنے والے سامان میں پالکیوں اور بیل گاڑیوں کے سطح شامل تھیں۔ یہ دونوں سامان مختلف انداز سے بنائے جاتے تھے جسے امیر طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ انہیں تراش کر سجایا جاتا تھا۔ لکڑی ایک بڑی تعداد میں کشتی اور سمندری جہازوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ اس کی اس لیے بھی ضرورت تھی کے ہندوستان ایک طویل ساحلی علاقے گھرا ہے اور شمالی ہندوستان بھی بڑی تعداد مین ندیوں سے گزرتا ہے۔

کشتیاں مختلف قسم کی بنائی جاتی تھیں۔ تفریحی سفر کے لیے چھوٹی کشتیوں سے لے کر بڑے سمندری جہاز جو ہزاروں کلو گرام سامان لے کر ایک طویل سفر پر جاتا تھا۔ بحرے عرب کے ساتھ ساتھ خلیج بنگال کی بدرگاہیں جیسے تھٹّا، سورت، بیسین، گوا، کرانور، کوچن، مسولی پٹنم اس کے پڑوس میں نورس پور، ہریہرپور، ستگاؤں اور چٹاگاؤں جہاز سازی کے اہم مراکز تھے۔ جب یوروپین تاجروں کی تجارتی سرگرمیاں تیز ہوئیں وہ لوگ انہیں مقامات پر اپنے جہاز کی مرمت کراتے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستانی بحری جہازوں کو مشرقی سمندری علاقوں کے لیے بہتر بنایا۔ اسی لیے وہ لوگ ہندوستان میں تیار کردہ جہاز خریدتے تھے۔ اس لیے سترہویں وار اٹھارویں صدی کے اوائل میں اس صنعت کو کافی فروغ ملا۔ لکڑی کے دیگر استعمال، دروازے، کھڑکیاں، اور گھریلو فرنیچر کی ایک بڑی تعداد جیسے بکس وغیرہ کو بنانے میں ہوتا تھا۔

11.5 متفرقات (Miscellaneous)

عہد وسطی کے ہندوستان میں دستکاریوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان تمام کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ ہر علاقے کی اپنی کچھ مخصوص دستکاری تھیں۔ یہاں صرف چند اہم دستکاریوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ان میں سے پتھر کاٹنے، کاغذ بنانے، برتن بنانے، شیشے وغیرہ سے سامان تیار کرنے کی دستکاریاں اہم تھیں۔ پتھر کاٹنے کی دستکاری کو ایک اہم ہنر سمجھا جاتا تھا کیونکہ پتھر کا

استعمال گھروں شاہی محلیں، قلعے، مندروں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر میں بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی معمار جن کا پیشہ پتھر کاٹنا یا تراشنا تھا، اپنی کاریگری میں مہارت کے لیے پورے دنیا میں مشہور تھے۔ اس کے علاوہ غیر زرعی پیداوار کی دیگر اشیاء میں چمڑے سے بنے سامان جیسے جوتے، چپل، کتاب کی جلد بندی وغیرہ ملک بھر میں بنائی جاتی تھی۔ کاغذ کی دستکاری بھی اس عہد میں ایک اہم صنعت تھی۔ ہندوستان کے مختلف علاقے اور شہر کاغذ بنانے کے اہم مراکز تھے، ان شہروں میں احمد آباد، دولت آباد، لاہور، سیال لکوٹ، بہار شریف شامل تھے۔ جبکہ احمد آباد میں کئی اقسام کے کاغذ تیار کیے جاتے تھے جسکو عرب، ترکی اور ایران کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کا کاغذ بھی کافی مشہور تھا۔ شمالی ہندوستان میں بھی کئی جگہوں پر کاغذ بنایا جاتا تھا جسکا مقامی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ جنوبی ہندوستان میں کاغذ بنانے کی صنعت بہت ہی محدود تھی۔ کاغذ کا زیادہ تر حصہ ہاتھ سے بنا ہوا اور موٹے قسم کا ہوتا تھا۔ ہمعصر مأخذ میں مٹی کے برتن بنانے کے حوالے ملتے ہیں، جسے لوگ کھانا پکانے، پانی اور اناج وغیرہ کو ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان کے ہر گاؤں میں کمہار ہوتے تھے۔ مٹی کے موٹے برتنوں کے علاوہ اچھے قسم کے ظروف بھی بنائے جاتے تھے۔ منوچی نے مٹی کے ایسے ظروف کا ذکر کیا ہے جو شیشے سے زیادہ باریک اور کاغذ سے ہلکے ہوتے تھے۔ مارشل نے بھی ہندوستان میں عمدہ قسم کے ظروف دیکھے تھے۔ مٹی سے بنے ٹائل (کھپریل) کا استعمال گھر کی چھتوں میں کیا جاتا تھا۔ ان تمام دستکاریوں کے علاوہ، ہندوستان کے کئی حصوں میں شیشے سے بنائے جانے والے سامان کی صنعت کا آغاز ہوا۔ ان تمام مصنوعات کے علاوہ، ہندوستانی کاریگر دیگر متفرق اشیاء جیسے صابن، ہاتھی دانت، خول اور سینگ سے بنے سامان بھی شامل تھے۔ کئی دستکاریوں کا انحصار جنگلات پر تھیں مثلاً چوڑیوں اور کھلونے لک سے بنائے جاتے تھے

11.6 پیداوار کی تنظیمیں (Production Organisations)

دور وسطی کے ہندوستان میں ایک عام اور آزاد کاریگر سے کارخانوں میں کام کرنے والے تمام دستکار کے کاریگر موجود تھے۔ حلانکہ دستکاریوں اور صنعتوں میں اس کی ضروریات کے مطابق مختلف ہوتی تھیں۔

11.6.1 گاؤں کے کاریگر اور گزارے پر مبنی پیداواری نظام

(Village Artisans and Subsistence-based Production System)

کاریگروں کی ایک قسم وہ تھی جو دیہی علاقوں مین روزمرہ استعمال ہونے والے سامان تیار کرتے تھے۔ یہ کریگر گاؤں کے ججمانی نظام کا باقاعدہ حصہ ہوتے تھے۔ گاؤں میں سب سے اہم خدمات لوہار، بڑھئی، کمہار اور جوتے بنانے والوں کی ہوتی تھی۔ عام طور سے ان تمام کریگروں کو بنیادی اوزار، زرعی آلات اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ادائگی کی جاتی تھی۔ یہی نظام دکن اور مہاراشٹر میں زیادہ منظم تھی جہاں گاؤں کے کاریگروں اور نوکروں کو بالوتیدار کہا جاتا تھا، دکن کے کچھ علاقوں میں محنت کشوں کا ایک اور گروہ تھا جسے آلوتیدار کہتے تھے۔ دیہی علاقوں میں کرنسی کی معیشت اور دستکاریوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے رزق پر مبنی اس نظام میں بھی تبدیلی شروع ہوگئی۔ تپن رائے چودھری کا خیال ہے کہ غالباً اٹھارویں صدی کے وسط تک طویل اور درمیانی دور کی تجارت کے لیے پوری پیداوار کا انحصار ان کاریگروں پر تھا جو

پہلے تو جمانی نظام سے ملحق تھے، لیکن اب وہ یہ لوگ پوری طرح سے آزاد تھے۔ ہندوستانی دستکاریوں کی مانگ میں اس طرح اضافہ ہوا کے دیہی کاریگر شہری بازاروں کی ضروریات کو بھی پورا کرنے لگے تھے۔ مؤرخین کا یہ بھی خیال ہے کہ گاؤں کے کاریگر اتنے متحرّک تھے کہ صرف پہلی کی طرح ایک ہی گاؤں میں نہیں رہتے تھی بلکہ ایک سے دوسرے گاؤں بھی جایا کرتے تھے۔

11.6.2 بازار کے لیے پیداوار (Production for Market)

جو سامان بازار کے لیے تیار کیا جاتا تھا اس کا انحصار بنیادی طور پر منحصر کاریگر پر تھا۔ تقریباً ہر ایک دستکاری میں کوئی خاص کریگر فروخت کے لیے سامان تیار کرتے تھے۔ ایک ڈچ سیاح، پیلسارٹ کا ذکر ہے کہ کاریگروں کی تقریباً سو خصوصی قسمیں مختلف دستکاریوں میں کام کرتی تھیں۔ اس طرح کی اعلی سطح کی خصوصیت ملبوسات کی صنعت میں زیادہ واضح دکھتا ہے۔ ہر عمل مختلف کاریگروں کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ مثلاً کارڈ بندی (اون یا ریشہ صاف کرنے کا عمل) سوت کاتنا، ریشم کے دھاگے کو سمیٹنا، کپڑے کی بنائی، بلیچنگ، رنگ کاری، کپڑے کی پرنٹنگ اور تصویر سازی وغیرہ کچھ ایسے کام تھے جسکے لیے اس کام لیے خاص کاریگر ہی کام کو انجام دیتے تھے۔ اس معاملے میں دیہات کے کسان مختلف پیداواری سرگرمیوں کے ذریعہ اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ تاقریباً زراعت پر مبنی تمام دستکار جیسے، نیل، چینی، سوتی دھاگے کی کتائی، بشمول نمک اور شورا کی پیداوار کے لیے گاؤں اہم مرکز تھے۔ دراصل دستکار تیار کرنے کی محل پزیری اس عہد کی معیشت کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ پہلے یہ ذکر ہوا ہے کہ مختلف علاقے کچھ دستکاریاں تیار کرنے کی لیے خاص تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یوروپین تاجروں کو مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا۔ مسولی پٹنم اور بنارس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں 7000 بُنکر تھے۔ اسی طرح قاسم بازار مین 2500 کے قریب ریشم کے بُنکر رہتے تھے۔ جب کاریگر انفرادی سطح پر سامان تیار کرتا تھا تو، انھیں خود ہی خام مال اور اوزار خریدتے، سامان تیار کرتے اور اسے فروخت کرتے تھے۔ ایسے معاملے میں دستر کاری تیار کرنے کی جگہ خود کاریگار کا گھر ہوتا تھا۔ چونکہ انفرادی کاریگروں کے پاس سامان تیار کرنے کے لیے بہت ہی کم سرمایہ ہوتا تھا، اس لیے انفرادی پیداوار کم تھی، جسکی وجہ سے تاجروں کو تیار شدہ سامان حاصل کرنے لیے کافی مشقت کرنی پڑتی تھی، اور سامان کا معیار بھی مختلف تھا۔

11.6.3 دادنی (Dadani)

فارسی میں لفظ 'دادن' کا مطلب دینا ہوتا ہے، اسی سے دادنی کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ مغل عہد میں اس کا مطلب رقم کی ادائگی تھی جسے تاجر کریگروں کو تیار شدہ دستکار سے پہلے سامان خریدنے لیے دیتا تھا۔ اور بدلے میں کاریگر تاجروں کو ایک مقررہ قت پر تیار شدہ سامان دینے کا وعدہ کرتا تھا۔ مؤرخین نے اسے انگریزی میں پُٹنگ آؤٹ سسٹم (putting-out-system) کی اصطلاح دیا ہے۔ دراصل یہ ایک معاشی نظم تھا جو جمانی نظم کے پیداواری مسائل کی وجہ سے وجود میں آیا۔ دادنی نظام میں تاجر اپنی تصریحات کا حکم دینے کی حالت میں نہیں ہوتا تھا۔ ملبوسات کے شعبے میں یہ نظام اس قدر پھیل گیا تھا کہ دستکاروں کو بغیر پیشگی رقم کی ادائگی کے کپڑا حاصل کرنا مشکل تھا۔ حالانکہ سترہویں صدی کے دکن میں بنائی کی صنعت پر تاجروں کا غلبہ تھا۔ الائیو کے مطابق، دستکاروں کے تجارتی سرمایہ کے تابع کرنے کا رواج کافی

وسیع تھا۔ جبکہ عملی طور سے کورومنڈل کے ساحل پر بسی کاریگروں کی تمام بستیاں کسی نہ کسی تاجر کے قبضے میں تھیں۔ سترہویں صدی میں ایسے بڑے تاجروں میں سے کاسی وِرنّا نامی ایک تاجر تھا، جس کے قبضے میں پُلِکٹ کو سوا مدراس سے اَرمگاؤں تک کا ساحلی علاقے تھے۔ اس علاقے کے بُنکروں کی بستیوں کو وِرنّاگاؤں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن دادنی کے نظام نے ایک طرف تو خریدار یا تاجروں کو سامان کا معیار اور مقدار تعین کرنے کا اختیار دے دیا تھا، تو دوسری طرف کاریگروں کو تیار کردہ سامان کی فروخت کی ضمانت کے ساتھ خام مال خریدنے کے لیے ضروری قم مل گیا تھا۔ لیکن اسی وجہ سے کریگروں کا سامان کے فروخت پر اپنا اختیار ختم ہو گیا تھا۔

11.6.4 فیکٹری (Factory)

جدید اصطلاح میں فیکٹری ایک ایسے خاص مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگ گروہ میں ایک جگہ جمع ہو کر بازار کے لیے سامان تیار کرتے ہیں۔ اس طرح کی کچھ مثالیں عہد وسطی کے ہندوستان میں بھی ملتیں ہیں۔ جو اس وقت کی ہندوستانی معیشت کی اہم خصوصیت تھی۔ فیکڑی کے قیام کی پہلی مثال 21-1620 میں انگریزوں کے ذریعہ بہار کے پٹنہ میں قائم کردہ فیکٹری سے دی جاتی ہے، جب انگریزوں نے ریشم کے دھاگے کو لپیٹنے کے لیے پٹنہ میں تقریباً سَو مزدوروں کو ملازمت دی تھی۔ اس طرح کی دوسری فیکٹری ڈچوں نے بھی قاسم بازار میں قائم کیا تھا جہاں ریشم کے کارخانے میں 800-700 بُنکروں کو ملازمت دی تھی۔ حالانکہ ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ان دو فیکٹری کے علاوہ جہاز سازی اور تعمیری کام ایسے شعبے تھے جہاں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو ایک جگہ پر کام کرنے کے لیے جمع کیا جاتا تھا۔ دکن اور جنوبی ہندوستان میں کاریگروں کی ایک بڑی تعداد تقریباً جہاز سازی کے تمام مراکز میں ہر جہاز پر ایک کی شخص کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ اسی طرح تعمیراتی کام میں بھی جہاز سازی جیسی کام کرنے کے لیے کاریگروں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہوتی تھی۔

اسی طرح کان کنی اور شورہ تیار کرنے کی صنعت بھی دو ایسے شعبے تھے جہاں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کام کرتی تھی۔ گولکنڈہ اور دکن کی ہیروں کی کانیں مثال کے حوالے ہمعصر مأخز میں ملتے ہیں، مثلاً گولکنڈہ اور دکن کی کانوں میں کان کنی کے موسم میں تقریباً تیس سے ساٹھ ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ ہیروں کے متلاشی اس زمین کے حصے کو حکمرانوں سے کرائے پر لے لیتے تھے، جو اس زمین کے حصوں پر کام کرنے کے لیے دو سے تین سَو کان کنوں کو ملازمت دیتا تھا۔ کان کنوں کو یومیہ مزدوری دی جاتی تھی۔ اسی طرح بہار میں دسمبر سے جنوری جو کان کنی کا موسم تھا تقریباً آٹھ ہزار لوگ ہیروں کی کانوں میں کام کرنے آتے تھے۔ یہ کان کن عموماً کسان اور مزدور ہوتے تھے جو اپنے کھیت بونے کے بعد ان کانوں میں کام کرنے آتے تھے۔ شورہ کی صنعت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے گروپ میں ایک ایک شخص کی نگرانی میں کام کرتے تھے، جسے بہار میں نوناس کہا جاتا تھا۔ شورہ کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے ڈچوں اور انگریزوں نے شورہ کی صفائی کے لیے اپنی اپنی اکائیاں قائم کر لیا تھا۔ ان اکائیوں میں مزدوروں کو کمپنیوں کے فراہم کردہ سامان کے ساتھ کام کرنا ہوتا تھا۔

11.6.5 کارخانہ (Karkhana)

کارخانہ دور وسطی کی پیداوار کی ایک منفرد خصوصیت تھی، جس کا سلسلہ چودھویں اور پندرہویں صدی سے چلا آرہا تھا۔ یہ کارخانے

کا نظام، طبقہ امراء کا اہم حصہ ہوا کرتا تھا۔ان کارخانوں میں شاہی گھرانے اور دربار میں استعمال ہونے والی چیزیں تیار کی جاتی تھی۔ حالانکہ بہت سے اعلی امراء کے ذاتی کارخانے بھی تھے۔ان کارخانوں میں عام طور سے قیمتی اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔کافی ماہر کاریگروں کو ضروریات کی چیزیں بنانے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ان کی نگرانی ریاستی آفسر کرتے تھے۔ان کارخانوں کے بارے میں یہ علم ہونا بھی ضروری ہے کہ ان کی ضرورت کیوں تھی۔ان کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ کریگر خود اس حالت میں نہیں تھے کہ وہ شاہی ضرورتوں کے لیے درکار موٹی رقم لگا سکے۔اس کے علاوہ قیمتی خام مال کی وجہ سے ریاست بھی انہیں کاریگروں کو ان کی اپنی جگہ پر کام کرنے لے لیے نہیں دینا چاہتی تھی۔ان شاہی کارخانوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کے ان میں تیار کیے جانے والے سامان بازار میں خرید و فروخت کے بجاے بادشاہوں اور امراء کے ذاتی استعمال کیے جاتے تھے۔

11.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دور وسطی میں زرعی معیشت کی طرح ہی غیر زرعی معیشت بھی کافی اہمیت کی حامل تھی۔اس اکائی میں ہم نے ہندوستان کی غیر زرعی معیشت کے ضمن میں مختلف خام مال پر مبنی دستکاروں اور صنعتوں کے مراکز انہیں تیار کرنے والے سماجی طبقات اور بنانے کے طریقہ کار کے ساتھ ساتھ ان دستکاروں سے ملحق تنظیموں پر گفتگو کیا ہے۔تاکہ قاری ان تمام دستکاروں کی اپنی خصوصیات اور کواہمیت اور انکے غیر ملکوں برآمدات کے بارے میں علم ہو سکے۔ مندرجہ بالا کے صفحات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں ملبوسات کی دستکاری اور صنعت کو خاص طور پر سوتی ملبوسات کو کافی وسیع پیمانے پر فروغ ملا تھا۔دیگر صنعت کو جسے سوتی ملبوسات کے بعد فروغ ملا ان میں زراعت پر مبنی صنعتیں جیسے نیل اور چینی یا شکر شامل تھیں۔ گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان صنعتوں کا اس عہد کی ہندوستانی معیشت میں کافی اہم کردار تھا۔غیر زرعی پیداوار میں نمک کی پیداوار گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی، جبکہ شورہ ایک اور اہم صنعت تھی جسے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں تیار کیا جاتا تھا۔اس نظریہ سے ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام چیزیں نتیجتاً برآمدات کے لیے کافی مقدار میں موجود تھی۔لوہے اور تانبے سے تیار کردہ سامان بھی کافی مقدار میں تیار کیے جاتے تھے۔، جبکہ انکے بالمقابل برار چاندی کی پیداور غائب تھی۔

اس عہد کی صنعتی معیشت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان میں جہاز سازی کی صنعت کی بھی بہت ترقی ہوئی۔چیزوں کو تیار کرنے کے ذرائع سے متعلق مندرجہ بالا گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غیر زرعی شعبے میں دستکاریوں کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ انفرادی کاریگر کے ذریعے کی جاتی تھی۔ حالانکہ کچھ شعبوں جیسے شورہ اور ہیرے کی کان کنی میں، ہیرے کی تلاش انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ کانوں میں کاریگروں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد نے مشترکہ نگرانی میں مشترکہ طور پر کام کرتے تھے۔اسی طرح موجودہ دور کی فیکٹری نظام کی بھی دور وسطی میں کچھ جھلکیاں ملتی ہیں، جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ریشم کو سمیٹنے کے لیے کارخانے قائم کرنے کی چند تجربات تو کیے گئے۔ لیکن انہیں بہت کم کامیابی ملی۔سامان تیار کرنے اور کاریگروں اور مزدوروں کو انکے کام کے بدلے رقم فراہم کرنے کا نظام اچھا تھا۔اس کے علاوہ شاہی کارخانے بھی تھے جہاں عیش و آرام کی کی قیمتی اشیاء بجاے بازار میں فروخت کے شاہی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔

11.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

دادنی : تاجروں کے ذریعہ کاریگروں کو سامان تیار کرنے کے لیے دی نانے والی پیشگی رقم جسے انگریزی میں Putting-Out-System کہتے ہیں۔

کارخانہ: بازار یا شاہی ضروریات کے استعمال کے لیے سامان تیار کرنے والی جگہ۔

11.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل دور میں کون سا خطہ 'ململ'(Muslin) کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا؟

(الف) گجرات (ب) کورومنڈل (ج) ڈھاکہ (بنگال) (د) لاہور

2. کاریگروں کو پیشگی رقم دے کر سامان تیار کرانے کا نظام کیا کہلاتا تھا؟

(الف) ججمانی نظام (ب) دادنی نظام (ج) جاگیرداری (د) منصب داری

3. ہیرے کی کانوں کے لیے کون سا مقام مشہور تھا؟

(الف) گولکنڈہ (ب) کھیتری (ج) مالوہ (د) کشمیر

4. جہاز سازی کی صنعت کے لیے کون سا شہر ایک اہم مرکز تھا؟

(الف) پٹنہ (ب) سورت (ج) بنارس (د) آگرہ

5. بارود میں استعمال ہونے والے 'شورہ'(Saltpetre) کا سب سے اہم تجارتی مرکز کون سا تھا؟

(الف) پٹنہ (بہار) (ب) سورت (ج) احمد آباد (د) مسولی پٹنم

11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تامبا پائے جانے والے مقامات اور اس سے تیار کردہ سامان پر کچھ جملے لکھیے۔
2. اونی دستکار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. دھاگا تیار کرنے کی صنعت پر کچھ جملے لکھیے۔
4. شورہ کی صنعت پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. شاہی کارخانے اور فیکٹری کے درمیان بنیادی فرق کیا تھا؟

11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سوتی ملبوس کی صنعت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. ہندوستان میں پائی جانے والی کچھ دھاتوں پر بحث کیجئے۔
3. سترہویں صدی میں دستکاریوں میں کس طرح کی تبدیلیاں آئیں تھیں، بیان کیجیے

جوابات:1-(ج),2-(ب),3-(الف),4-(ب),5-(الف)

اکائی 12۔ تجارت اور کاروبار: یورپی تجارتی کمپنیاں

(Trade and Commerce: The European Trading Companies)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 پرتگالی نوآبادیت

12.2.1 پرتگالی ہندوستان میں

12.2.2 پرتگالی بحری سلطنت

12.2.3 پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع

12.2.4 پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشوونما

12.3 ڈچ نوآبادیت

12.3.1 ڈچ تجارت کی نوعیت

12.3.2 ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق

12.3.3 ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'تجارتی سلطنت' کا اثر

12.4 ہندوستان میں فرانسیسی

12.4.1 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی

12.4.2 تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی

12.5 اکتسابی نتائج

12.6 کلیدی الفاظ

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.0 تمہید (Introduction)

پندرہویں صدی میں مشرق وسطیٰ میں بدلتے سیاسی منظر اور تجارتی راستوں میں خلل نے یورپی تاجروں کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کے لیے نئے تجارتی راستے تلاش کریں۔ کافی کوششوں کے بعد یورپی تاجر پندرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بحری ساحل پر پہلی بار وارد ہوئے۔ مئی 1498 میں واسکوڈگاما کا کالی کٹ پہنچنا، یورپ ایشیائی تجارت میں نئے دور کی ابتدا کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ سب سے پہلے پرتگالیوں نے ہی رأس امید (Cape of Good Hope) کے راستے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تھا، اس لیے ابتدائی طور پر ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارتی سرگرمیوں پر ان کی ہی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ تاہم پرتگال کے پاس ایک طاقتور تاجر طبقہ موجود نہیں تھا اور پرتگالی سمندر پار تجارتی مہم جوئی کی مالی اور سیاسی مدد پرتگالی بادشاہ ہی سے حاصل ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں ڈچ اور انگریز کارپوریٹ تجارتی کمپنیاں، مقابلے کے میدان میں داخل ہو گئیں اور اس سے پرتگالی اجارہ داری کو چنوتی ملنے کی شروعات ہوئی۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1600 میں ہوئی اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی 1602 میں وجود میں آئی۔ فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی 1664 میں اپنے قیام کے بعد اس دوڑ میں شامل ہو گئی۔ اگرچہ ان کے اپنے وطن میں بھی واحد بڑے تجارتی کارپوریشنوں کا غلبہ تھا لیکن نجی تاجروں نے بھی کسی حد تک یورپ ایشائی تجارت میں حصہ لیا۔ یہ تجارتی سلطنتیں اپنے ملکوں کی بحری برتری کے ذریعہ قائم رہیں اور تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوششیں کرتی تھیں۔ ان کی سرگرمیاں ہندوستان کے ساحلی بندرگاہ شہروں تک محدود تھیں اور بڑی حد تک مقامی ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ پر اثرانداز نہیں ہوئیں۔ انہوں نے حصولیابی اور تجارت کے مقامی نظام کے پہلے سے موجود نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ وہ عام طور پر ہندوستانی سامانوں کو چاندی سونے (Bullion) کے بدلے میں حاصل کرتی تھیں۔ اس سے غیر ملکی تجارت کا توازن ہندوستان کے حق میں ہو گیا اور یہ معاشی ترقی کا ذریعہ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے ہندوستانی حکمرانوں کا رویہ، نرمی اور رواداری پر مبنی تھا۔ تجارت اور بازار پر کنٹرول قائم کرنے سے جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے تھے لیکن عموماً مسلح جنگی حکمت عملیوں سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے ہندوستان میں ایک طرح سے بڑے پیمانے پر علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعد میں ان کی علاقائی توسیع کی پالیسی کو اپنایا، جس پر بعد میں ڈچوں نے بھی عمل کیا۔ تجارتی اجارہ داری اور علاقائی کنٹرول کے لیے ان یورپی طاقتوں کے درمیان جھگڑے بھی ہو جاتے تھے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کس طرح یورپی نوآبادیاتی طاقتیں، تاجروں کے طور پر ہندوستان پہنچی؟ اسے سمجھ سکیں گے۔
- یورپی تجارت کے ہندوستانی ریاست اور سماج پر پڑنے والے اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ابتدائی تجارتی سلطنتوں کے ذریعہ اپنائے گئے تسلط کے مختلف طریقوں کو جان سکیں گے۔

- ایشیااور ہندیورپی تجارت میں یورپی تاجروں کے کرداراوران کے انتظامی طریقہ کار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ان کے بحری تجارتی طاقتوں سے علاقائی طاقت بننے تک کے بارے میں پڑھیں گے۔
- ہندوستانی افواج میں یورپی فوجیوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

12.2 پرتگالی نوآبادیت (Portuguese Colonisation)

12.2.1 پرتگالی ہندوستان میں (The Portuguese in India)

واسکوڈی گاما کی مہم جورأس امید کا چکر لگانے کے بعد مئی 1948 میں کالی کٹ پہونچی، اسے کئی مقاصد کے ذریعہ ترغیب ملی تھی۔ پرتگالی بادشاہ ڈی۔ مینوئل (D. Manuel، 1495 تا 1521) کی خواہش تھی کہ ہندوستان تک سیدھا سمندری راستہ دریافت کیا جائے۔ یہ خواہش بنیادی طور پر تجارتی مقصد کے لیے تھی، اگرچہ کبھی کبھی یہ تبدیلی مذہب کے عیسائیت کے مشن کے بھیس میں چھپی ہوتی تھی۔ پرتگالیوں کا بنیادی مقصد ہندیورپی مسالوں کی تجارت (اس زمانے کی نفع بخش تجارت) پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ خود کو اور اپنی ریاست کو خوشحال بنانا تھا۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے فوجی طاقت کا بھی استعمال کرتے تھے اور کوچین (Cochin) اور کینور (Cannanore) میں قلعے بھی بنائے گئے۔ 1505 میں پہنچنے والا پہلا پرتگالی وائسرائے، فرانسسکوڈی المیڈا (Francisco d' Almeida) ہندوستان میں پرتگالیوں کے تجارتی اور علاقائی ڈھانچے کو مضبوط کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ یہ الفانسوڈی البقرق (Alfonso de Albuquerque) تھا جس نے (1509 تا 1515) پرتگالی علاقائی سیاسی ساخت کو ٹھوس شکل دی۔ اس نے ہندوستان میں متعدد بندرگاہ والے شہروں اور بحر ہند میں جزائر پر تیزی سے قبضہ کیا۔ 1510 میں گوا (Goa) پر اور اس کے بعد 1511 میں ملکا (Malacca) پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1515 میں ہرمز (خلیج فارس کے دہانے) بھی پرتگالی قبضے میں چلا گیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان قبضوں کے بعد پرتگالی نوآبادی میں کافی کم ہی علاقائی توسیع ہوئی لیکن ان کی دفاعی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ 1518ء میں سری لنکا میں کولمبو کا قلعہ تیار ہوا۔ 1530 میں 'گوا' ہندوستان میں پرتگالی تجارتی 'سلطنت' کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں اور بھی کئی علاقوں پر فتح حاصل کی گئی۔ پرتگالیوں نے دیو (Diu)، دمن (Daman) اور بیسین (Bassein) پر بھی قبضہ کر لیا، اس طرح گجرات سے ہونے والی تجارت پر ان کا تسلط قائم ہو گیا۔ انہوں نے مالابار سے تجارت پر کنٹرول کے لیے کونکن اور مالابار کے ساحل کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ سولہویں صدی کے آخر میں ان کے پاس تقریباً پچاس قلعوں اور سو جہازوں کا ایک طاقتور بحری بیڑہ تھا۔ تجارتی اور علاقائی 'سلطنت' کی تعمیر کے اس عمل میں بعض اوقات مقامی حکمرانوں نے بھی پرتگالیوں کی مدد کی۔ مثال کے طور پر، کوچین کا راجہ اپنے محض نام کے فرمانروا کالی کٹ کے زیمورین کے مقابلے اپنی طاقت بڑھانے کے چکر میں پرتگالیوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس پوری صدی میں پرتگالیوں کے تجارتی اور بحری جہازوں کو جزوی طور پر مقامی لوگوں سے بھرتی کیے گئے عملے اور سپاہیوں کے ذریعہ چلایا جاتا تھا۔

12.2.2 پرتگالی بحری سلطنت (The Portuguese Naval Empire, 1500–1640)

پرتگالیوں کی کوششوں سے بنائی گئی یہ سلطنت کوئی علاقائی سلطنت نہیں تھی، بلکہ ایشیااور مشرقی افریقہ کے درمیان یہ ایک سمندری نیٹ ورک تھا جس کے اندر علاقے، ادارے، جہاز، افراد اور انتظامی بندوبست، پرتگالی حکمرانی کے تحت رکھے گئے تھے۔ لسبن (Lisbon) میں 'Casa da India' نامی ایک شاہی تجارتی فرم اس بحری 'سلطنت' کی سربراہی کرتی تھی۔ بادشاہ کے علاوہ، یورپ کے مختلف ملکوں کے تاجر، مہاجن اور بینک کار اس 'کاسا دا انڈیا' سے وابستہ تھے جو ایشیا سے واپسی پر تجارتی سامان کے حصول اور نقل و حمل میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ایشیا میں کاروباری ادارہ جس انتظامی ساخت کے کنٹرول میں تھا اسے 'Estada da India' (ہندوستانی ریاست) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کی سربراہی گوا کا وائسرائے کرتا تھا جو مشرقی افریقہ سے لے کر ملکا اور مکاؤ (Macao) تک پوری بحری سلطنت کی شہری اور فوجی حکومت کا سربراہ تھا اور صرف بادشاہ کو جواب دہ تھا۔ غیر رسمی کونسلیں جو وائسرائے کی خواہش پر طلب کی جاتی تھی، ان سے وائسرائے کی مدد کے لیے صرف مخصوص، عموماً فوجی امور پر صلاح حاصل کی جاتی تھی۔ ابتدائی طور پر کوئی مقررہ رکنیت یا معاملات کو انجام دینے کے لیے طریقہ عمل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے یہ کونسلیں باقاعدہ اداروں میں تبدیل ہو گئیں۔ صدر کے طور پر وائسرائے کے علاوہ اس میں گوا کے آرک بشپ، محتسب اعلیٰ، گوا کے بعض اہم فڈالگو (fidalgos) یا معزز شہری، گوا شہر کے کپتان، ہائی کورٹ کے منصف اعلیٰ اور مالیاتی افسر اعلیٰ شامل ہوتے تھے۔ گوا کے نظم و نسق کے لیے ایک بلدیہ کونسل بھی تھی جس کا انتخاب پرتگالیوں اور یورپ ایشیائی آبادی کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ ماتحت قلعوں اور بستیوں میں گوا میں قائم انتظامی ساخت کی نقل کی گئی۔ قلعوں اور ان کے کپتان کا خاص مقصد یورپی مسالوں کی تجارت اور ایشیا میں مختلف مخصوص بندرگاہوں کے درمیان تجارت پر اجارہ داری (monopoly) کو یقینی بنانا تھا تاکہ اس کو محصول نظام کے تحت لایا جائے اور بحر ہند میں اس کے بہاؤ پر قابو رکھا جائے۔ کپتان اور دیگر پرتگالی باشندے اپنی خود کی ذاتی تجارت میں بھی مشغول رہتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی بحری سلطنت مقامی تاجروں کی بحری تجارت کو کنٹرول کرنے اور محصول عائد کرنے کے ذریعہ قائم رہی۔ سولہویں صدی میں درحقیقت کل سلطنت میں درآمد برآمد پر چنگی سے حاصل ہونے والی آمدنی کل محاصل کی تقریباً 60 تا 65 فیصد تھی۔ ہم اس میں محصولات کی دیگر مدوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو بحری تجارت پر نگرانی رکھنے کے ذریعہ مثلاً پکڑے گئے ایشیائی جہازوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کی جاتی تھی۔

ایشیاء میں پرتگالیوں کے ذریعہ جو اہم اشیا حاصل کی جاتی تھیں وہ مسالے خاص طور پر کالی مرچ ہوا کرتی تھیں۔ پرتگالی بڑی تعداد میں ان اشیا کو مالا بار علاقے سے اور بعد میں ہندوستان کے جنوب مغرب ساحل پر واقع کنارا سے حاصل کرتے تھے۔ پرتگال سے ہندوستان کو قیمتی دھاتوں کی تجارت اور ہندوستان سے پرتگال کو مسالے کی تجارت پر 1506 سے شاہی اجارہ داری قائم تھی۔ اجارہ داری والی اشیا میں نجی تجارت کی اجازت صرف بحری عہدیداروں اور شاہی لائسنس کے تحت مخصوص افراد کو ہوا کرتی تھی۔ شاہی گھرانے کو مالیات کی فراہمی کے ذریعہ نجی تاجر بالواسطہ طور پر اس میں شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی ریاست، ہندوستان سے کالی مرچ حاصل کرتی تھی اور سولہویں صدی کے وسط تک اسے انٹورپ اور اس کے بعد لزبن میں فروخت کرتی تھی۔ 1564 کے بعد بادشاہ کالی مرچ کی تجارت پر اپنی

اجارہ داری برقرار نہیں رکھ سکا اور اسے نجی تجارتی فرموں کو اس میں شریک کرنا پڑا۔ 1575 میں کالی مرچ کی تجارت کی شاہی اجارہ داری ،آگسبرگ کے تاجر کو نراڈ روٹ(Konrad Rott) اور ملان کے تاجر رووالیسکا (Rovalesca) کو 32 کروزادوس (Cruzados) فی کنٹل کی شرح پر سونپ دی گئی۔اس کے بعد بادشاہ نے دیگر تاجر گھرانوں کو بھی اس میں شریک کیا ساتھ ہی اس نفع بخش تجارت میں اپنا بھی کچھ حصہ برقرار رکھا۔اس معاہدے کا نظام 1598 تک چلا جب مسالے کی بحری تجارت میں برٹش اور ڈچ لوگوں سے ملنے والے زبردست چنوتی کے سبب کالی مرچ کے معاہدہ کاروں کے لیے تجارت غیر منفعت بخش ثابت ہونے لگی۔1628 میں پرتگالی انڈیا کمپنی کی تشکیل کا تجربہ بھی کامیاب نہیں ہوا اور 1633 میں یہ کمپنی بھی تحلیل کر دی گئی۔

کالی مرچ اور دیگر اشیاء کے حصول کے لیے پرتگال سے ایشیا بھیجے جانے والے سامان میں قیمتی دھاتیں (مغربی افریقی سونا اور امریکی چاندی کا ڈھلا ہوا ریال سکہ) غیر قیمتی دھاتیں جیسے تانبہ ،جستہ ،ٹن،سیال پارہ (Quicksilver)، پارہ اور کچھ مقدار میں مونگا،المونیم، زیتون کا تیل اور شراب بھی شامل تھے۔ غیر قیمتی دھاتوں میں تانبہ کو کچھ عرصے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔پرتگالی بین ایشیائی تجارت میں بھی شامل تھے،جو کہ قدر وقیمت کے لحاظ سے غالباً گوا اور لسبن کے درمیان تجارت کے مقابلے زیادہ بڑی اور منافع بخش تھی۔ حالانکہ نجی تاجروں نے اس بین ایشیائی تجارت سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔پرتگالی بین ایشائی تجارت کا ایک حصہ لزبن کو ملکائی مسالے کی برآمد کے ساتھ جاری رہا جو کہ ملکا کو خاص طور پر ہندوستانی کپڑے کی برآمد کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ابتداء ہی سے یہ بادشاہ کی ایک ڈھیلی ڈھالی اجارہ داری تھی جس میں شاہی جہازوں کے عملے کو تجارت میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ منتخب ریاستی عہدیداروں کو بھی کسی حد تک اس میں شامل ہونے کی منظوری دی گئی تھی۔ وسائل کی قلت کے چلتے نجی تاجروں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ جہاز کے کپتان اپنی خود کی تجارت کے لیے بھی شاہی جہازوں کا استعمال کرتے تھے، لہٰذا بادشاہ کی شرکت سامان کی ترسیل سے متعلق خدمات کو فراہم کرنے تک محدود تھی اس طرح اس سے شاہی منافع کم ہو رہا تھا۔ 1540 اور 1550 کے دوران ،پرتگالی ریاستی مالیات کی حالت مزید ابتر ہو گئی اور بادشاہ نے بین ایشیائی تجارت میں شرکت جاری رکھنے کو غیر نفع بخش پایا۔ بادشاہ کے لیے اس کی اجارہ داری قائم رکھنا مشکل تھا کیونکہ شاہی گھرانے کے پاس اس کے تحفظ کے لیے ضروری مالی وسائل نہیں تھے۔

12.2.3 پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع (Sources of the Portuguese Commercial Empire)

آپ جانتے کہ جیسے ہی پرتگالی ہندوستان پہنچے۔انہوں نے کامیابی کے ساتھ مسالوں کی تجارت کو اپنی اجارہ داری بنانے کی کوشش کی۔پوری سولہویں صدی میں لسبن اور گوا سے ملے احکامات اور ہدایات کے سلسلے نے یہ بات واضح کر دی کہ مسالوں کی تجارت پرتگالی بادشاہ اور اس کے گماشتوں کے لیے محفوظ تھی۔اس اجارہ داری کو سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا اور پرتگالیوں کی بحری برتری نے اس میں اہم کردار نبھایا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بحری تجارت کی ضابطہ بندی اور کنٹرول ضروری تھا۔ بادشاہ نے اجارہ دارانہ بنیادوں پر ایشیا میں مخصوص مقامات کے لیے مہمات کا انتظام کیا۔ صرف نامزد جہاز ہی کسی مخصوص سال میں مقررہ سمندری سفر کر سکتے تھے۔ شاہی جہازوں کے مال تجارت کی جگہوں کو ابتدائی سولہویں صدی میں اونچی شرح پر نجی تاجروں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے 1540 کے دہے کے بعد اس تجارتی

مہم کو مہنگا پایا کیونکہ جہازوں کی تعمیر کافی مہنگی ہو چکی تھی۔ پرتگالی ریاست نے نجی تاجروں اور افراد کو لائسنس (اجازت نامہ) جاری کرنے کی شروعات کی، تاکہ اس طرح کی تجارتی مہموں کو جاری رکھا جائے۔ یہ لائسنس مختلف بنیادوں پر دیے جاتے تھے جیسے فوجی خدمات کے صلے کے طور پر، ممتاز لیکن مفلس میڈائکو کی بیٹیوں کے لیے جہیز کے طور پر کسی مخصوص عہدے کی مطلوبہ شرائط کے طور پر۔ لیکن اکثر ان لاسینسوں کو اونچی بولی لگانے والے کو دیا جاتا تھا اور اس طرح حاصل کرنے والوں کے لیے یہ نہایت منافع بخش ثابت ہو سکتا تھا۔

پرتگالیوں نے بحر ہند میں دیگر تاجروں کے ذریعہ انجام دی جانے والی تجارت پر کنٹرول کرنے اور ٹیکس عائد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے خصوصی ذریعہ کرتاز (Cartaz) تھا۔ یہ ایک ایسا اجازت نامہ تھا جسے پرتگالی بحری بیڑے 'ارمدا' کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ایشیا میں بحری تجارت کو قابو کرنے کی کوششوں کے لیے پرتگالیوں کا جواز سمندروں کے مالک ہونے کے دعوے پر مبنی تھا۔ ایشیا میں تمام جہازوں کو یہ اجازت نامہ یا کرتاز حاصل کرنے کی ضرورت تھی جسے پرتگالی حکام کے ذریعہ جاری کیا جاتا تھا۔ اس میں جہاز کے کپتان کی شناخت، جہاز کا سائز اور اس کو لے جانے والے عملے کی تفصیلات ہوتی تھیں۔ ہتھیار گولہ بارود یا سامان جنگ لے جانے کی اجازت انتہائی محدود تھی۔ جہاز کو اس کی منزل پر روانہ ہونے سے قبل پرتگالی قلعے پر تجارتی محصول دینا دینی پڑتا تھا۔ کوئی بھی جہاز اگر بغیر اجازت نامے کے ہوتا تو اسے ضبط کر لیا جاتا اور اس کے عملے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ کرتاز جاری کرنے کے لیے بھی فیس عائد کی گئی تھی جو حالانکہ تھوڑی ہوتی تھی لیکن مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو پرتگالی بے حد فائدہ میں تھے۔ بعد میں سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے تجارت پر کنٹرول کا ایک نیا ذریعہ 'کیفیلا' (Cafila) ایجاد کیا۔ یہ چھوٹے مقامی تاجر جہازوں کا قافلہ تھا جس کی حفاظت پرتگالی بیڑے کیا کرتے تھے۔ کیفیلا اصول کی بنیاد دوہری تھی: ایک پرتگالی چنگی گھر کے لیے آمدنی اور دوسرے مقامی تاجروں کے لیے تحفظ۔ بعض کیفیلا، پرتگالی قلعوں اور بندرگاہوں کے لیے خوراک بھی لاتے تھے۔

12.2.4 پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشوونما (Growth of the Portuguese Commercial Empire)

پرتگالی اجارہ داری کا ابتدائی خراب اثر سولہویں صدی کے پہلے نصف میں بحر احمر سے بحیرہ روم تک کی تجارت میں محسوس کیا گیا۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں اس تجارت میں اس وقت نئی جان پڑی جب پرتگالیوں کا تسلط ڈھیلا ہوا۔ سترہویں صدی میں پرتگالیوں کی اجارہ داری نے زیادہ بہتر ڈچ اجارہ داری کا راستہ صاف کیا۔ مزید برآں، مسالے کی تجارت میں کتنا زیادہ منافع حقیقت میں تھا اس پر غور کیا جانے لگا۔ پرتگال کا ریاستی مالی نظام سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں ابتر ہو چکا تھا۔ قلعوں اور جنگی بیڑوں کی مرمت میں کافی رقم خرچ ہوتی تھی۔ ایشیائی تجارت کی اجارہ داری کو پروان چڑھانا اس طرح ایک مہنگا معاملہ ثابت ہو رہا تھا۔ دوسرے پرتگالی ریاست غیر ملکی تجارتی سرمایے، غیر ملکی مہارت اور غیر ملکی بازاروں پر منحصر تھی۔ پرتگالیوں کو ایشیائی تاجروں اور حکمرانوں کی مخالفت کے سبب مکمل طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں مشکلیں پیش آئی۔ اس نظام میں کافی نقائص تھے۔ گجراتی تاجروں نے خلیج بنگال میں 1540 اور 1500 کے دہے میں کالی مرچ کی کافی مقدار اکٹھا کی اور پورے ایشیا میں اس کی تجارت کی۔ پرتگالی عدن پر قبضہ کرنے ناکام رہے جس پر حریف سلطنت عثمانیہ نے 1538 میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے ان کی اجارہ داری کے ڈھانچے میں کافی بڑا خلارہ گیا۔ پرتگالی فارس کی کھاڑی کے راستے ایشیائی تاجروں

کی نجی تجارت کو بھی برداشت کرتے تھے کیونکہ وہ گھوڑوں کی فراہمی کے لیے ان تاجروں پر منحصر تھے۔ درحقیقت گجرات میں گھوڑے کی تجارت پر کنٹرول پر تگالیوں کے لیے بنیادی طور پر ایک غور طلب معاملہ تھا۔

کنارا اور مالابار میں بھی جو کہ کالی مرچ کی پیداوار کے علاقے تھے، پرتگالی موثر طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں ناکام رہے۔ مالابار میں کالی کٹ کے زمورن نے پرتگالی نظام کی مخالفت کی کیونکہ کوچین کا راجہ جن پر پرتگالیوں کا بھروسہ تھا وہ کالی کٹ کا سابق ماتحت تھا۔ تجارتی طور پر اس مزاحمت نے وہ شکل اختیار کی کہ مقامی تاجر کالی مرچ میں تجارت کرتے رہے۔ ان علاقوں پر جہاں کالی مرچ اگائی جاتی تھی پرتگالی کنٹرول میں کمزوری کے سبب ان کا کام آسان ہو گیا۔ چونکہ پرتگالیوں کا تسلط ساحلی علاقوں پر تھا جہاں وہ کالی مرچ لگانے والوں کو کم قیمت ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جب کہ 'غیر قانونی' مقامی تاجروں اس سامان کو زیادہ قیمت دے کر آسانی سے حاصل کر لیتے تھے۔ وہ اسے خشکی کے راستے کورومنڈل بھیج سکتے تھے جو پرتگالی مداخلت سے آزاد تھا یا سمندر کے راستے گجرات بھیجتے جو کافی جوکھم بھرا تھا۔ مزید برآں پرتگالی عہدیداروں کی نجی تجارت کے سبب اس اجارہ دارانہ تجارت میں کافی خلا پیدا ہو گئے۔

پرتگالیوں نے عرب اور ایران کی گھوڑے کی تجارت کو گوا کے راستے مرکوز کر کے اس تجارت کی بھی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جنوبی عرب یا ہرمز سے گھوڑوں کے ساتھ آنے والے سبھی جہاز صرف گوا آسکتے تھے۔ سیاسی اسباب کی بنا پر مقامی حکمرانوں سے خیر سگالی حاصل کرنے کی ضرورت تھی لیکن اس نظام میں اس کی کمی موجود تھی۔ پرتگالی مقامی حکمرانوں سے رعایتیں حاصل کر سکتے تھے اگر وہ بغیر کسی رکاوٹوں کے انہیں گھوڑوں کی فراہمی ہونے دیتے یا ان کے دشمنوں کو گھوڑے فراہم کرنے سے منع کر دیتے۔ پرتگال میں جو چرچ تھا وہ بھی لامذہبوں کو گھوڑے کی فروخت کا تصور پسند نہیں کرتا تھا۔

مقامی حکمرانوں اور تاجروں کی خدمات کے سلسلے میں پرتگالیوں اور طبقہ امراء کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ گجرات میں مقامی طاقتور گروہوں کا تجارتی مفادات کے سلسلے میں پرتگالیوں کے ساتھ اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ گجرات کے سلطان کے ایک غلام امیر نے ابتدائی سولہویں صدی میں ،دیو میں پرتگالیوں کے حملے کی مزاحمت کی، لیکن پرتگالیوں کی بحری سلطنت کے ذریعہ ہندوستانی حکمرانوں اور سلطنتوں کے معاشی وسائل کے لیے کبھی سنجیدہ خطرہ نہیں پیش آیا۔ ہندوستانی تاجروں کے جہاز جب کہ گوا میں چنگی کے واجبات ادا کرتے تھے ،وہ مقامی حکمرانوں کے زیر اہتمام بندرگاہوں پر درآمد برآمد محصول بھی ادا کیا کرتے تھے۔ بحری تجارت کے کنٹرول کو مقامی نظام حکومت کے ذریعہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ ان کا خشکی کے علاقوں پر پہلے ہی قبضہ تھا۔ زیادہ تر وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے محصولات پر منحصر رہتے تھے۔ لہٰذا یہ ان کے لیے پرتگالی تسلط کوئی مقامی چنوتی نہیں تھی۔ پرتگالیوں نے بحری تجارت اور سمندر پر اقتدار اعلیٰ کا اپنا تصور ایجاد کیا اور اپنی بحری برتری کے ساتھ اسے قائم رکھا۔ مقامی تاجر بھی پرتگالی تحفظ کے لیے تھوڑی رقم ادا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ساتھ ہی جب بھی ممکن ہوا وہ ان کے کنٹرول سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

پرتگالیوں کی بحری سلطنت ان علاقوں کے اعتبار سے بڑی تھی جس پر وہ کنٹرول کرنا چاہ رہے تھے۔ اس وسیع مہم کے لیے دستیاب

مالیاتی اور انسانی وسائل نسبتاً بہت کم تھے۔ اتنی بڑی مہم کے لیے دستیاب یورپیوں اور یوریشیوں کی کل تعداد کبھی بھی 15000 افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ پوری سلطنت میں فوجی خدمات کے اہل افراد کی کل تعداد تقریباً 10000 رہی ہوگی۔ پرتگالیوں کی بحری برتری کے باوجود اتنی قلیل افرادی قوت کے سبب پرتگالی تجارتی کنٹرول سے متعلق مناسب اقدامات میں ناکام رہے۔ اصلاً وہ صرف مقامی تاجروں سے خراج وصول کر رہے تھے۔ پرتگالیوں نے موجودہ طریقوں یا راستوں، اشیا یا تجارتی تکنیکیوں میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک طرح سے وسائل کی از سر نو تقسیم تھی جہاں پرتگالی اپنے لیے دوسروں کی بحری تجارتی سرگرمیوں سے حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ لینا چاہتے تھے۔

12.3 ڈچ نوآبادیت (Dutch Colonisation, 1600-1680)

ڈچ جمہوریہ کی قومی مجلس انتظامیہ، اسٹیٹس جنرل نے *'Verenigde Oost-Indische Compagnie'* نام سے ایک کمپنی قائم کی جسے عام طور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کہا جاتا ہے۔ کچھ کمپنیوں کو ملا کر اس جوائنٹ کمپنی کی تشکیل کی گئی تھی۔ ایمسٹرڈم (Amsterdam)، روٹرڈم (Rotterdam) اور زی لینڈ (Zeeland) کے دولت مند تاجروں نے اس طرح کمپنی کے سرمایہ وسائل کی بنیاد میں اضافہ کیا۔ اسٹیٹس جنرل کے منشور میں کمپنی کو مشرق میں تجارت کے لیے 21 سال کی مدت کے اجارہ داری حقوق دیے گئے۔ اس کے بعد ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کورومنڈل ساحل پر اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ کورومنڈل، جنوب ایشیائی بازاروں بشمول مسالے کی پیداوار والے جزائر جیسے ملکا، باندا اور سیلیباس (Celebas) اور یورپی ممالک کو بھیجے جانے والے کپڑوں کا اہم مقام تھا۔ کورومنڈل ساحل پر کمپنی کی تجارت میں پوری سترہویں صدی کے دوران نمایاں اضافہ درج کیا گیا۔ اس کی خاص وجہ جنوبِ مشرقی ایشیائی بازاروں میں کپڑے کی مانگ میں اضافہ ہونا تھا۔ 1980 تک ڈچ اور انگریز کمپنیاں عملاً پوری تجارت پر چھا چکی تھیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اس تجارت پر غلبہ تھا جب کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی 1680 سے خاص طور پر یورپ ایشیائی بازاروں میں اس کی برابری کو پہنچ رہی تھی۔ تاہم ڈچوں نے بین ایشیائی تجارت میں بالخصوص کورومنڈل ساحل اور جنوب مشرقی ایشیائی منڈیوں کے درمیان اپنی مجموعی بالادستی برقرار رکھی، جب کہ پرتگالی بنیادی طور پر سولہویں صدی میں ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل تک محدود تھے۔ ڈچوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے جلد ہی اپنے تجارتی نیٹ ورک کی توسیع کی اور اب اس میں کورومنڈل ساحل بنگال اور گجرات شامل ہو چکے تھے۔ یہ نئی نوآبادیاتی طاقتیں پہلے ہی ساحلی علاقوں تک محدود تھیں لیکن انہوں نے اندرونی علاقوں جیسے احمد آباد اور آگرہ میں بھی تجارتی مراکز قائم کیے۔

1.3.1 ڈچ تجارت کی نوعیت (Nature of the Dutch Trade)

حالانکہ سترہویں صدی میں ڈچوں کا عروج، بازار میں ان کی مسابقتی اہلیت پر مبنی تھا لیکن وہ پھر بھی مسالوں کے جزائر میں پیدا کاروں کو کم شرح پر ادائیگی کرنے میں اپنی اجارہ داری کا استعمال کرتے تھے۔ مقامی تاجروں سے مسابقت کو کم کرنے اور مخصوص اشیا اور بازاروں میں خصوصی حقوق حاصل کرنے کے لیے وہ طاقت اور تشدد کا استعمال بھی کرتے تھے۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالیوں کے ذریعہ

فروغ دیے گئے کرتاز نظام سے اس لیے بھی فائدہ اٹھایا تاکہ ایشیائی مسابقت کاروں کو اجارہ دارانہ اشیاء کی تجارت سے باہر رکھا جاسکے۔ سترہویں صدی کے درمیان یورپ ایشیائی تجارت کے حجم اور قدر میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا۔ اس تجارت کی ساخت میں بھی تنوع تھا۔ ڈچ کمپنی کی بین ایشیائی تجارت میں اپنے کردار کے سبب ہندوستان ڈچوں کے لیے ایک اہم فراہم کار بنا رہا۔ کورومنڈل اور گجرات سے کپڑوں کا انڈونیشیائی جزائر میں کالی مرچ اور دیگر مسالوں سے مبادلہ کیا جاتا تھا۔ کمپنی کچے ریشم اور افیون کو بنگال سے برآمد کرتی تھی۔ یورپ ہندوستانی تجارت کی ساخت تبدیل ہو چکی تھی۔ ہندوستان سے یورپ جانے والے اہم درآمدی مال کے طور پر کالی مرچ اور مسالے کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ کپڑے اور کچے ریشم کا حصہ سترہویں صدی کی ابتداء میں یورپ میں کل درآمد کے 16 فیصد سے بڑھ کر صدی کے آخر میں 55 فیصد ہو گیا۔ کورومنڈل کے علاوہ بنگال جہاں کچے ریشم اور کپڑے کی پیداوار ہوا کرتی تھی وہ بھی ڈچوں کے لیے تجارت کا اہم مرکز بن چکا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ ڈچ تجارت کی دوسری اہم خصوصیت ہندوستانی اشیاء کے لیے قیمتی دھاتوں میں ادائیگی، ڈچوں کے لیے لازمی تھی۔ یہ ایشیا میں یورپی اشیا کی ان قیمتوں پر فراہمی میں جن کی بنیاد پر مانگ پیدا کی جاسکتی تھی، یورپ کی نااہلیت ثابت کرتی ہے۔ اس کا ایک اہم پہلو، یورپ ایشیائی تجارت کے لیے 'اشیا کے بدلے بلین (سونا چاندی) کا یورپی ماڈل' یہ تھا کہ تجارت سے ہونے والا منافع، ایشیا میں یورپی اشیا کی فروخت کے بجائے پوری طرح یورپ میں ایشیائی اشیا کی فروخت سے اخذ کیا جاتا تھا۔ بلین یا قیمتی دھاتوں کے علاوہ ڈچ ہندوستان کو اون، ریشم اور دیگر کپڑے بالخصوص جولیڈن (Leiden) میں تیار ہوتے تھے اور شراب اور بیر کے علاوہ غیر قیمتی دھاتیں جیسے کہ سیسہ، لوہا اور پارہ برآمد کرتے تھے۔

1663 میں کوچین کے راجا نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے پرتگالیوں کو اپنے علاقے سے باہر کرنے میں کامیابی حاصل کی اور پرتگالیوں کو اجارہ داری کی جو رعایتیں حاصل تھیں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئیں۔ ابتدا میں ڈچ کمپنی نے انڈونیشیا کے جزایر میں حکام کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ مسالوں جیسے لونگ، جائفل اور جاوتری جیسے مسالوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپنی کو اجارہ داری حقوق دینے کو منظوری دیں۔ برصغیر ہند میں بھی ڈچ کمپنی اور مقامی حکمراں ارباب اقتدار نے ان رشتوں کو باہمی طور پر مفید پایا۔ مقامی حکام نے کمپنی کی تجارت کو اپنی آمدنی اور معاشی وسائل میں خالص اضافے کے طور پر دیکھا۔ اس کا فوری فائدہ چنگی محصولات تھے جو کہ مغل خزانے کے لیے وصول کی جانے والی مالگزاری میں اضافے کا سبب تھے۔ مزید برآں، کمپنی ہندوستان سے اشیا کے حصول کے لیے سونا چاندی یا قیمتی دھات لاتی تھی۔ ان دھاتوں کی مقامی گھریلو پیداوار برائے نام تھی اس لیے ہندوستانی نظام زر کے لیے قیمتی دھاتوں کا آتے رہنا ضروری تھا۔ عام طور پر مغل ارباب اقتدار اور دیگر علاقائی طاقتوں کے ذریعہ لگائے جانے والی درآمد برآمد محصولات وہی تھے جو ہندوستانی تاجروں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ تاہم مغل انتظامیہ نے ڈچ اور انگلش کمپنیوں کو ہندوستانی عبوری (راہداری) محصول کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جس سے ان کو ہندوستانی تاجروں کے مقابلے تھوڑی برتری حاصل ہو گئی۔ اس کے علاوہ وہ علاقائی راہداری محصول ادا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ڈچ اور انگریزی کمپنیاں ہندوستانی بازار میں ہندوستانی تاجروں کے دیگر گروہوں کی طرح عمل کرتی تھیں۔ ان کو نہ تو کوئی خاصی رعایت تھی اور نہ ہی ان کی سرگرمیوں پر کسی طرح کی بندش تھی۔

12.3.2 ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق (Management of the Dutch Factories)

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری شمالی کورومنڈل ساحل پر پیتاپولی(Petapuli)میں1606 میں قائم کی تھی۔ دوسری فیکٹری اسی سال مسولی پٹنم کی بندرگاہ پر قائم کی گئی تھی۔1610 میں پولی کٹ (Pulicat) میں ایک فیکٹری قائم کی گئی تھی جو کورومنڈل کے ڈچ انتظامیہ کا ہیڈ کوارٹر بھی بنا۔1613 میں پولی کٹ میں گیلڈریا(Geldria) قلعے کی تعمیر کی گئی تھی۔ کورومنڈل فیکٹریوں کا مجموعی کنٹرول گورنر کو دیا گیا تھا۔ مسولی پٹنم فیکٹری کا سربراہ انتظامیہ میں دوسرے درجے پر تھا اور اسے 1621 میں صدر بنایا گیا۔1690 میں کورومنڈل حکومت کا صدر مقام جنوبی کورومنڈل ساحل میں پولی کٹ سے ناگاپتنم(Nagapattinam)منتقل کر دیا گیا۔1680 میں کورومنڈل ساحل کے ان تجارتی اداروں میں صرف 441افراد کا عملہ تھا جن میں سے مختلف کام انجام دے رہے 233افراد ہندوستانی تھے۔ 208 یورپی کارکنان میں صرف 128 فوجی تھے جس میں ایک لفٹنٹ 5 سارجنٹ اور 7کارپورل شامل تھے۔ان میں سے زیادہ تر فورٹ گلیڈریا میں مقیم تھے۔ باقی شہری انتظامیہ کمپنی کے تجارتی کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور یہ صدر کاروباری گماشتے، گماشتے، ماتحت گماشتے اور معاون کلرک پر مشتمل تھا۔ فصیل بند فیکٹری احاطہ لوگوں کے رہنے کے لیے کوارٹر اور قیمتی اشیا کے لیے اسٹور ہاؤس دونوں کا کام کرتا تھا۔اسی طرح کے ادارے مالابار اور گجرات میں بھی قائم کئے گئے۔بنگال اور گجرات میں فیکٹریوں کی نمایاں خصوصیت(بحیثیت ملازم)فوجی عملے کا نہ ہونا تھا۔اسی لیے بنگال اور گجرات میں ڈچ اور یورپی عہدیدار تجارتی فرائض کو ہی زیادہ تر انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہگلی میں قانون نافذ کرنے والے افسر (مالیات) کا خاص کام کمپنی کے گماشتوں کے ذریعہ غیر قانونی طور پر کی جانے والی نجی تجارت کو روکنا تھا۔ 1665 میں بنگال فیکٹریوں کو آزاد نظامت کے تحت منظم کیا گیا تھا جو کہ پولی کٹ حکومت کے کنٹرول سے آزاد تھی۔

ہگلی میں بنیادی فیکٹری بنگال کی ڈچ انتظامیہ کا صدر مقام بنی۔اس فیکٹری میں خاص انتظامی کونسل تھی جس کا سربراہ گورنر یا ڈائرکٹر ہوا کرتا تھا۔ ہگلی کونسل میں ڈائرکٹر کے علاوہ، کمپنی کے حساب کتاب کے انچارج صدر فیکٹر (گماشتہ)، قانون نافذ کرنے والے افسر، فیکٹری کے گوداموں کا انچارج فیکٹر اور بعض دیگر گماشتے یا عوامل پر شامل تھے۔ایک کونسل جو کہ صدر فیکٹر کے ماتحت تھی ہر ماتحت فیکٹری کی نگراں تھی۔ صدر منتظم کا دفتر جو بٹاویہ(Batavia) بھیجے جانے سے قبل کورومنڈل ساحل پر سبھی فیکٹریوں کے حسابات کی دیکھ بھال کرتا تھا، وہ کورومنڈل کی فیکٹریوں کی نگرانی کرتا تھا۔ کورومنڈل ساحل کے لیے ایک عدالتی کونسل بھی تھی جس کو ساحل پر فیکٹریوں کے ڈچ ملازمین کا فیصلہ کرنے اور انہیں سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ جاوا میں بٹاویہ کے مقام پر گورنر جنرل اور اس کی کونسل ایک بڑے ادارے کے ساتھ پوری تجارتی سلطنت کو منظم کرتی تھی۔ یہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس جسے *Heren XVII* کے طور پر جانا جاتا تھا اور ایشیا میں کمپنی کے مفاد کے درمیان وسطی انتظامی ادارہ تھا۔ابتدائی طور پر یہ وسطی انتظامی ادارہ بانتم (Bantam) میں واقع تھا لیکن بعد میں 1619 میں بٹاویہ میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کمپنی کا مشرقی ہیڈ کوارٹر بنا اور صدر فیکٹری اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کے درمیان اہم کڑی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ پورے ایشیا سے سامان ہالینڈ بھیجے جانے سے قبل بٹاویہ میں اکٹھا کیا جاتا تھا۔ بین ایشیائی تجارت میں ڈچ کمپنی کی وسیع طور پر شرکت (جو کہ اسے انگلش اور فرانسیسی کمپنیوں سے منفرد کرتی تھی) بٹاویہ سے دی جانے والی ہدایات کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ڈچ ایسٹ کمپنی نے اپنی بحری برتری کا استعمال

کرتے ہوئے، ہندوستانی تجارت پر کنٹرول کرنے کے لیے پرتگالیوں کے ذریعہ فروغ دیے گئے ادارہ جاتی ذرائع جیسے کرتاز اور کیفیلا کو اختیار کیا۔ ہندوستانی جہاز جو اپنے تختوں کو صحیح جگہ پر گرفت میں رکھنے کے لیے رسی اور سخت چوبی کیل پر منحصر تھے، اس میں اندر سے بھاری توپ سے بمباری برداشت کرنے کی نہ تو مضبوطی تھی اور نہ ہی بڑی توپوں کے پیچھے کی طرف دھکے کو برداشت کرنے کی صلاحیت۔ اعلیٰ ترین بحری قوت کے باوجود ڈچ، اجازت نامہ یا پاس نظام کو موثر طور پر نافذ کرنے کے ہمیشہ اہل نہیں ہو پائے تھے۔ مثال کے طور پر ڈچ کمپنی نے 1641 میں ملکا کی اپنی فتح کے بعد ہندوستانی جہازوں کے ملکا کے شمال میں ٹن بندرگاہوں تک پہنچنے پر پابندی لگانے اور بعد میں جزیرہ نما ملایہ میں بنیادی ٹن پیداکار خطے کے ساتھ ایک اجارہ داری معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستانی جہاز آسانی سے ڈچ کنٹرل سے بچ نکلتے تھے کیونکہ وہ شمالی سماترہ میں خلیج بنگال کی بندرگاہ آچیہ (Acheh) جو خطے کا بہت بڑا عبوری مال گودام تھا، تک آزادانہ رسائی رکھتے تھے۔ مزید برآں ڈچ کمپنی کو گجرات میں جوابی کارروائی کی شکل میں ہونے والے نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

12.3.3 ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'تجارتی سلطنت' کا اثر

(Impact of the Dutch 'Commercial Empire' on Indian Society and State)

ہندوستان کے مشرقی اور مغربی دونوں ساحلوں پر بندرگاہ شہروں کی بڑھتی تعداد، یورپی تجارتی کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ ابتدائی دور میں، بندرگاہ، تاجروں اور اندرون ملک واقع مضافاتی علاقوں کی بحری تجارتی سرگرمیوں کے درمیان محض ایک کڑی تھے۔ یہ بندرگاہ یورپی کمپنیوں (اقتدار کے خود مختار مقامات) کے ماتحت آچکے تھے۔ چونکہ وہ ایک اجنبی ملک اور بھرپور مخالف ماحول میں کام کر رہے تھے اس لیے انہوں نے فوری طور پر دفاعی مورچہ بندی کی کوشش کی تاکہ وہ خود کا دفاع کر سکیں۔ پولی کٹ کی ڈچ بندرگاہ قلعہ گیلڈریہ میں بندوقوں کے ذریعہ تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ڈچوں نے ہندوستان میں علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، تاہم انہوں نے جاوا اور مسالوں کے جزائر میں ایک مضبوط علاقائی بنیاد قائم کرنے کے ذریعہ فرانسیسی اور انگریز کمپنیوں کے لیے پہلے ہی مثال قائم کر دی تھی۔

بندرگاہ شہروں میں مختصر یورپی برادری، ہندوستان میں ریاست اور سماج کی ساخت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکی۔ کمپنیوں نے قابل برآمد اشیا حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں دستیاب پیداوار اور حصولیابی کے موجودہ نیٹ ورک کو ہی استعمال کیا، اگرچہ رفتہ رفتہ انہوں نے بعض مخصوص مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں کچھ اصلاحات بھی شروع کیں۔ یورپیوں نے دلالوں (یعنی وہ ہندوستان ملازم جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات میں مددگار اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے) کی خدمات سے بھی استفادہ کیا۔ اگرچہ بعض مواقع پر ہندوستانی حکمرانوں اور ڈچ لوگوں کے درمیان جھگڑے بھی ہوئے لیکن ڈچ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ وہ حکمرانوں کو اپنے تابعدار بناتے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے ڈچ کمپنی کی تجارت کو فائدہ مند پایا۔ ہندوستان میں سونا اور چاندی درآمد ہونے سے سونا چاندی اور قیمتی دھاتوں کی فراہمی میں کافی اضافہ ہوا۔ معیشت میں بڑھتے زر کے چلن (monestisation) کے سبب زمینی محاصل کے نقد مطالبے سے لین دین میں بھی سہولت پیدا ہوئی۔ اس سے مبادلہ بازار اور تجارت میں مزید اضافہ ہوا۔ بینکنگ فرموں کے اضافے میں بھی مدد ملی جو کہ تجارت کے

پھیلاؤ کے لئے نہایت اہم تھیں۔ اسی سیاق و سباق میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو پولی کٹ میں فورٹ گیلڈریا میں ٹکسال چلانے کی اجازت ملی اور 1658 میں انہیں ناگاپٹنم کی ٹکسال سے پگوڈا جاری کرنے کی رعایت بھی حاصل ہوئی۔

12.4 فرانسیسی نوآبادیت (The French Colonisation)

فرانسیسیوں نے 1668 میں سورت کے مقام پر ہندوستان میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد فرانکوئس مارٹن (Francois Martin) نے 1674 میں پانڈیچری (Pondicherry) میں فیکٹری قائم کی جو ہندوستان میں فرانسیسیوں کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر ابھری۔ دیگر یورپی تجارتی کمپنیوں کی طرح فرانس نے بھی بالاسور، مسولی پتنم، چندر ناگور، تیلی چیری اور کالی کٹ میں دیگر فیکٹریاں قائم کیں۔ زیادہ تر تجارتی مراکز ستر ہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہار اور بنگال میں قائم کیے گئے۔

12.4.1 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی (The French East India Company)

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا اصل نام 'Campaignie des Indes Orientales' تھا، ریاست کی مالی امداد سے 1664 میں شروع کی گئی تھی۔ کمپنی کی تشکیل میں بنیادی تحریک، فرانس کے تجارتی مفکر، جے۔ بی کولبرٹ کے خیالات سے حاصل ہوئی۔ 1644 میں اس کا سرمایہ ڈچ کمپنی کا صرف نصف ہی تھا۔ کمپنی کا ابتدائی سرمایہ 1665 میں 8 ملین لیورس (Livers) تھا جو کہ 1670 میں بڑھ کر 12 ملین لیورس ہو گیا۔ ریاستی مالیات اور انتظامیہ نے اس عمل میں اپنی جواب دہی اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ صرف 16 فیصد حصہ کے حاملین (stockholders) جہاز کے مالک تاجر اور 8 فیصد کے سرمایہ فراہم کار تھے جب کہ بقیہ حصے پر شاہی خاندان اور طبقہ امراء کا قبضہ تھا۔ کمپنی کی قسمت یورپی جنگوں کی غیر یقینی صورتحال پر منحصر تھی۔ 1675 کے بعد کمپنی بحیرہ ہند میں سال میں صرف چار جہاز چلایا کرتی تھی اور 1680 میں اس نے اپنے شیئر مالکوں کو منافع ادا کرنا بھی روک دیا۔ اس نے اب اپنے تجارتی حقوق کی نمائندگی ایک نجی کاروباری ادارے 'Messieurs de saint Malo' کو سونپ رکھی تھی جس کے زیر انتظام اس نے پھر منافع کمانا شروع کیا۔ تاہم فرانسیسی ریاست نے اس کے تجارتی حقوق 1719 میں واپس لے لیے اور ایک نئی کمپنی 'Compaignie Perpetuelle des Orientales' قائم کی جس کا سرمایہ 300 ملین لیورس تھے۔ اس کمپنی نے 1769 تک کام کیا۔ اس کے بحری بیڑے کی طاقت 10 سے بڑھ کر 75 جہاز ہو گئی۔ نئی کمپنی نے بین ایشیائی تجارت میں بھی حصہ لیا، اگرچہ یورپ ایشیائی تجارت اب بھی اہم بنی رہی۔ فرانس کے ذریعہ ہندوستان سے برآمد کیے جانے والے اہم سامانوں میں سفید سوتی کپڑے، ململ، رنگین کپڑے، کالی مرچ، شورہ، سرخ لکڑی اور صدف (سیپی و کوڑی) شامل تھے۔ وہ ہندوستان میں الکوحل، شراب، مونگا، سونے کے دھاگے اور لوہے کی اشیا بھیجا کرتے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت ہندوستان کو درآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی یہ گھاٹا، درآمد کی گئی اشیا کے 75 فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی ہندوستان درآمد سے اس گھاٹے کا بڑا حصہ ہوتی تھی۔ فرانسیسی کمپنی ہمسر ڈچ اور انگلش کمپنیوں کی طرح ہندوستانی تاجروں کی خدمات کا استعمال گماشتوں کی طرح کرتی تھی۔ وہ ہندوستانی دستکاروں سے اشیا کو حاصل کرنے کے

لیے پیشگیوں کے نظام کا بھی استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسی اپنے مالی بحران پر قابو پانے کے لیے کبھی کبھی ٹیکسوں کے نام پر ہندوستانی تاجروں سے خراج وصول کرتے تھے۔ چیٹی (Chetti)، مڈلیر (Mudaliar) اور پلئی (Pillai) ذاتوں کے ہندوستانی تاجر فرانسیسیوں کو ادھار دیتے تھے اور ادھار پر اشیا فراہم کرتے تھے۔ یہ ہندوستانی تاجر تنازع کی صورت میں مقامی حکمرانوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صلح بھی کراتے تھے۔

12.4.2 تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی

(Transition from Commercial Empire to a Territorial Empire)

فرانسیسیوں کا ابتدائی قبضہ پرتگالیوں اور ڈچ جیسا ہی تھا۔ فرانسیسی کمپنی نے 1721 میں مالابار ساحل میں ماہے پر قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد 1731 میں ینام اور 1758 میں کرائی کل پر قبضہ کر لیا۔ پانڈیچری فرانسیسیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا جہاں 1700 تا 1707 میں فورٹ لوئس بھی تعمیر کر لیا گیا تھا۔ 1741 تک 1,20,000 کی آبادی کے ساتھ یہ ایک بڑا بندرگاہ شہر بن چکا تھا۔ یہ سبھی کوششیں کمپنی کے آسانی کے ساتھ کام کرنے کے لیے مطلوبہ تجارتی نیٹ ورک قائم کرنے کا حصہ تھیں۔ فرانسیسی گورنر ڈیومس (Dumas) اور جوسف فرکونکوئس ڈپلیکس (Joseph Francois Dupleix) ہندوستان میں ایک علاقائی نوآبادی قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طرح کی علاقائی سلطنت سے محصولات اکٹھا کیا جا سکے جس سے ہندوستان میں تجارتی اشیا خریدنے کے لیے قیمتی دھاتوں کو لانے کی ضرورت نہ رہے۔ تاہم، کمپنی کے فرانسیسی حصص مالکوں کو ایسی نوآبادیاتی مہم جوئی کے لیے بھاری لاگت ادا کرنے میں کوئی لچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں کے اس طرح کی سامراجی عزائم کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے مخالفت، ڈپلیکس کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ تاہم اس کے کمانڈروں کو اس وقت کچھ عارضی کامیابی ملی جب لابور ڈونیس نے 1746 میں مدراس پر قبضہ کر لیا اور 1750 میں جنجی پر بسی نے فتح حاصل کی۔ مارکیس دی بسی (The Marquis de Bussy) جو ڈپلیکس کے ماتحت رہا تھا، دکن میں فرانسیسی عملداری قائم کرنے میں زیادہ کامیاب تھا۔ نظام الملک کی موت کے بعد جانشینی کی جنگ نے دکن کی سیاست میں فرانسیسیوں کو مداخلت کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا۔ انہوں نے نظام کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ جسے انگریزوں نے تسلیم کیا تھا، کے مقابلے نظام کے پوتے مظفر جنگ کی حمایت کی۔ مظفر جنگ امبور 1749 کی جنگ میں فاتح بن کر ابھرا اور کرشنا ندی کے جنوب کے سبھی علاقوں کے لئے اس نے ڈوپلیکس کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس نے فرانسیسیوں کے حمایت یافتہ چاند صاحب کو ارکاٹ کا حکمراں تسلیم کیا۔ مسولی پٹنم کی سرکار (Sarkar) کو فرانسیسیوں کو ہدیہ کر دیا گیا اور انہیں کرناٹک کے تمام مالگذاری وسائل عطا کئے گئے۔ فرانسیسی افواج کا ایک مستقل دستہ نئے نظام کے زیر انتظام رکھا گیا تھا۔ مظفر جنگ کی موت کے بعد صلابت خاں تخت نشین ہوا تب اس نے فرانسیسیوں کو کچھ مزید سرکاریں عطا کیں۔ اس سے تقریباً پورا کورومنڈل ساحل فرانسیسی عملداری کے تحت آ گیا۔ فرانسیسی دستے کے نفری بڑھ کر 2000 ہو گئی۔ نظام کے دربار اور انتظامیہ میں بسی کو زبردست اختیارات حاصل تھے۔ فرانسیسی علاقائی سلطنت کے خواب کو پورا کرنے کے بالکل قریب ہی تھے۔ لیکن ڈپلیکس کو 1754 میں کرناٹک میں اس کے تباہ کن تجربے کے بعد بلا لیا گیا۔ گوڈے ہیو (Godeheu)، اس کا جانشین تھا جو انگریزوں کے خلاف فرانسیسی موقف کے دفاع میں ناکام

رہا۔ اگرچہ ہندوستان میں فرانسیسی فوجی مہم کے کمانڈر کومٹے ڈی لیلی (Comte de Lally) نے 1758 میں کڈالور پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کے موقع ناشناس ہونے کے سبب پانڈیچیری اور چندر ناگور پر انگریزوں کا قبضے ہو گیا۔ فرانسیسیوں کو چندر وتی اور ونڈی وش میں بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس طرح وہ علاقائی حکومت قائم رکھنے میں اہل نہیں ہو پائے، بلکہ پیرس معاہدہ (1763) کے اختتام کے بعد جس کے تحت برطانیہ اور فرانس کے درمیان سات سال کی جنگ ختم ہوئی تھی، فرانسیسی طاقت مغلوب ہو گئی۔

پیرس کے معاہدے (1763) کے بعد ہندوستان کے فوجی اور سیاسی معاملوں میں فرانسیسی جو اہم کردار ادا کرتے تھے اس سے دست بردار ہو گئے۔ تاہم فرانسیسیوں نے انگریزوں کو راستہ دکھا دیا کہ علاقائی سلطنت قائم کرنے کے طریقے اور ذرائع کیا تھے۔ فرانسیسی ایک معنی میں نو آبادیت کے پیش رو تھے۔ 1762 میں بیجاپور کے سلطان سے پانڈیچیری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسے بندرگاہ شہر کے طور پر فروغ دیا۔ فرانسیسی کوارٹروں میں ہندوستانی تعمیراتی تکنیکوں کی بعض خصوصیات کو شامل کرتے ہوئے اونچی دیواروں اور علاحدہ باغیچوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کی۔ بعد میں برطانوی نو آبادکاروں نے برادریوں اور مذہب کی علاحدگی کی بنیاد پر اپنی بستیوں کو فروغ دیا۔

12.4.3 ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کا کردار

(Role of the French Professional Soldiers in Indian States)

ہندوستانی حکمرانوں کی ملازمت میں پیشہ ور فوجیوں کے طور پر فرانسیسیوں کا کردار کافی اہم رہا تھا۔ ہندوستانی مسلح دستوں کی تنظیم اور کمان میں فرانسیسیوں کو مہارت حاصل تھی۔ ان فوجیوں کو فرانس میں اتنی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی اور عام فوجی، افسران کے عہدے کی خواہش نہیں رکھ پاتے تھے کیونکہ اس پر طبقہ امراء کا غلبہ تھا۔ ہندوستانی حکمراں فرانسیسی سپاہیوں کو فراخدلانہ تنخواہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور اگر کوئی فوجی باصلاحیت ہوتا تو اس کے لئے اس کی عہدے اور حیثیت میں ترقی کے بھی بھرپور مواقع تھے۔ لہٰذا، فرانسیسی کرائے کے فوجیوں یا پیشہ ور سپاہیوں کی بڑی تعداد ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں کام کرتی تھی۔ 1764 کی بالکل ابتدا میں یوسف خاں نے مدورائی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کی مدد سے دو طویل محاصروں کے ساتھ مزاحمت کی۔ فرانسیسی تربیت یافتہ ہندوستانی فوجیوں نے ہندوستانی حکمرانوں کے سامنے کئی طرح سے اپنی برتری ثابت کی۔ انہوں نے جنگ کے دوران کنٹرول قائم رکھنے کے لئے کمان کا نظام مراتب فراہم کیا۔ فوج کی نئی تنظیم میں حسب معمول ڈرل (مشق) کی ضرورت رہتی تھی اس طرح وہ صف آرائی یا لام بند ہونے کی ایک بڑی تربیت کے ساتھ بہتر طور پر بندوقوں (تفنگ) سے لیس ہوتے تھے اور ان کو پیچھے سے تیز فائر کرنے والی توپوں کا سہارا ملتا تھا جس سے وہ ہلاکت خیز اثر ڈال سکتے تھے۔ اس سے گھڑ سواروں کے رسالے کے امدادی کردار اور حیثیت میں کمی آئی اور جنگوں میں پیادہ فوج خاص سہارا بن کر ابھری۔ لیکن ان کی صلاحیت اور ڈسپلن میں اضافے کے لئے باقاعدگی کے ساتھ ان کی تربیت ضروری بن گئی۔ ہندوستانی حکمراں اپنے فوجیوں کی از سر نو تنظیم، نئے سرے سے لیس کرنے اور تربیت دینے کے لئے فرانسیسیوں کی خدمات کا استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسیوں نے فوجی انجینیرنگ جیسے قلعہ بندی اور بندوقوں کے استعمال سے متعلق معاملوں میں کافی مدد کی۔ سری رنگاپٹنم، پال گھاٹ، ادے گری اور علی

گڑھ کی قلعہ بندی فرانسیسی فوجی تعمیر کی بعض اہم مثالیں ہیں۔

مشیل جوکم میری ریمنڈ (Michel Joachim Marie Raymond) میسور فوج کی کمان سنبھالنے میں خود کی پہچان قائم کر لینے کے بعد 1786 میں نظام کی خدمت میں آیا۔ اس نے اپنے ماتحت فوجی دستے کارپس فرینکوئس ڈی ریمنڈ (Corps Francois de Raymond) کی تنظیم کی جس کی تعداد 11,000 تک پہنچ چکی تھی۔ وہ 'امین جنسی' (توپ خانے کا نگراں) بنا اور توپوں کو تیار کرنے کے لئے ایک بندوق کارگاہ قائم کی۔ نظام نے اسے بہت سے خطابات سے نوازا اور اس کے علاوہ سات لاکھ کی نجی جاگیر عطا کی۔ دوسرا ممتاز فرانسیسی کمانڈر ڈی بوئیگن (De Boigne) تھا جس نے مہادجی سندھیا کے ماتحت کام کیا، اس نے فرانسیسی نمونے پر فوجی دستوں کی تنظیم کی جن کی قوت 50,000 افراد تک پہنچ گئی تھی۔ اسے ہندوستان کے وائسرائے کا خطاب، کافی تنخواہ اور زرخیز جمنا دوآب میں اپنی افواج کی دیکھ بھال کے لئے جاگیر دی گئی۔ اس کے مشہور دستے کی ترکیب بعد کی برٹش انڈین فوج سے مشابہ تھی جس میں جاٹوں، سکھوں، افغانوں اور راجپوتوں وغیرہ سے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے۔ اسی طرح استاچ ڈیلانوئے (Eustachius De Lannoy) ایک ادنی حیثیت سے تراونکور کے حکمراں رام ورما کی 50,000 مضبوط فوج کا کمانڈر بنا۔ اس نے ادے گری قلعہ کی قلعہ بندی کرائی اور ایک بندوق کارگاہ اور بارود کا کارخانہ بھی قائم کروایا۔ اگرچہ میسور کی فوجی تنظیم میں فرانسیسی افسروں کی کمان میں کوئی علاحدہ اکائی نہیں تھی لیکن فرانسیسی کمانڈر، سپاہیوں اور انجینیروں نے میسور فوج میں ایک اہم کردار نبھایا۔ اسی طرح الارڈ (Allard) اور وینٹورا (Ventura) نے رنجیت سنگھ کی خاص فوج کو منظم کیا جو کہ گھڑ سواروں کے دو دستوں، پیادہ فوج کی چار پلٹنوں اور اعلیٰ ترین فرانسیسی کمان کے تحت 24 توپوں کے توپخانے پر مشتمل سبھی بازوؤں کی مربوط تشکیل تھی۔ درحقیقت رنجیت سنگھ کی فوج کی تقریباً ایک تہائی فوج کی تربیت یورپی انداز سے ہوئی تھی اور قابلیت کی بنیاد پر ترقی کے اصول پر مبنی تھی۔ سماج میں یہ فوج ایک طرح کی بے قاعدگی پر مبنی تھی جہاں فرد کی حیثیت اور درجہ اس کی پیدائش پر منحصر تھا۔ فرانسیسیوں نے نہ صرف ایسے ہندوستانی نظام ریاست میں اپنی جاگیروں میں مالیاتی اور عدالتی اختیارات استعمال کیے بلکہ انہوں نے ان میں نمایاں اثر ورسوخ بھی قائم کیا۔

12.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے ابتدائی یورپی تجارتی کمپنیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پڑھا۔ یورپی تجارتی کمپنیوں نے بحری تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ اپنی 'تجارتی سلطنتیں' قائم کیں۔ سمندر پر یورپیوں کی مکمل برتری اس طرح کی سلطنتوں کے قیام میں کافی اہم تھی۔ ان سلطنتوں کی سرگرمیاں اکثر برصغیر ہند کے ساحلی علاقوں تک محدود رہیں اور انہوں نے حصولیابی، تجارت اور مالیات کے موجودہ نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ یورپ اور ہندوستانی تجارت کا توازن، ہندوستان کے لئے موافق تھا اور ہندوستان اپنے برآمدات سے 'بلین' (سونا چاندی) کی کثیر مقدار کماتا تھا۔ اس طرح یورپی تجارتی کارپوریٹ گھرانوں کی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی معیشت کو کافی فائدہ پہنچا۔ اگرچہ یورپی کمپنیوں اور ہندوستانی حکمرانوں میں تجارت کے کنٹرول کو لے کر کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے لیکن بڑے پیمانے پر طاقت کا

استعمال کبھی نہیں ہوا۔ یورپی کمپنیوں کی دستیاب افرادی قوت محدود تھی اور وہ مقامی حکمرانوں کو چنوتی دینے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ فرانسیسیوں نے نئے قسم کی پیشہ ورانہ تربیت یافتہ پیادہ فوج، جسے بڑے پیمانے پر مربوط حملوں کے لئے لام بند کیا جاسکتا تھا، کی طاقت کی بنیاد پر سب سے پہلے علاقائی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی تجربہ ناکام ہوا لیکن بعد میں انگریزوں نے سلطنت کی تعمیر میں فرانسیسی نمونے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

12.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

بلین	:	سونا چاندی یا قیمتی دھات وغیرہ۔
کرتاز	:	پرتگالی بحری تجارتی اجازت نامہ یا لائسنس۔
راس امید	:	راس امید (Cape of Good Hope) جنوبی افریقہ کا ایک ساحلی شہر
کیفیلا	:	مقامی تجارتی جہاز۔
دلال	:	وہ ہندوستان ملازم جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے۔
پگوڈا	:	کرنسی کی اکائی، سونے سے بنا سکہ جو ہندوستانی خاندانوں کے ساتھ ساتھ یورپینوں نے اپنایا تھا۔
لیور	:	781 سے 1794 تک مملکت فرانس اور اس کی پیشرو ریاست مغربی فرانسیا کی کرنسی۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. واسکوڈی گاما 1498 میں ہندوستان کی کس بندرگاہ پر پہنچا؟

(الف) کوچین (ب) سورت (ج) کالی کٹ (د) گوا

2. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کس سال قائم ہوئی؟

(الف) 1600 (ب) 1602 (ج) 1664 (د) 1668

3. پرتگالیوں کے ذریعے ہندوستانی بحری جہازوں کے لیے جاری کردہ اجازت نامہ کیا کہلاتا تھا؟

(الف) کیفیلا (ب) کرتاز (Cartaz) (ج) فرمان (د) پٹہ

4. ہندوستان میں فرانسیسیوں کا ہیڈ کوارٹر (صدر مقام) کہاں تھا؟

(الف) مدراس (ب) سورت (ج) پانڈیچری (د) گوا

5. کس فرانسیسی گورنر نے سب سے پہلے ہندوستان میں علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی؟

(الف) ڈوپلیکس (Dupleix) (ب) کولبرٹ (ج) مارٹن (د) لالی

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں کے ہندوستان آمد پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. پرتگالیوں کے تجارتی ذرائع پر نوٹ لکھیے۔
3. ڈچ تجارت کی کیا نوعیت تھی ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
4. ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ سلطنت کا کیا اثر تھا نوٹ لکھیے۔
5. فرانسیسی کمپنی تجارتی کمپنی سے علاقائی سلطنت میں کیسے تبدیل ہوئی؟ ایک نوٹ لکھیے۔

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں نے تجارت کو کس طرح مضبوط کیا؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. ڈچ فیکٹریوں کے نظم و نسق پر مفصل لکھیے۔
3. ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کے کردار پہ روشنی ڈالیے

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(ب), 4-(ج), 5-(الف)

اکائی 13۔ سماجی تشکیل: امراء، زمیندار، علماءاور خواتین

(Social Composition: Nobility, Zamindars, Ulama, and Women)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 دیہی زرعی معاشرہ

13.2.1 کسان طبقہ: خود کاشت اور پاہی کاشت

13.2.2 حکمران طبقہ: زمیندار

13.2.3 زمین کی ملکیت کا سوال

13.3 شہری معاشرہ

13.4 خواتین

13.5 ذات کا عنصر

13.6 درباری معاشرہ اور ثقافت

13.7 اکتسابی نتائج

13.8 کلیدی الفاظ

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.0 تمہید (Introduction)

سلطنت دور کا سماجی ڈھانچہ مغل دور میں بھی جاری رہا حالانکہ اس کے عناصر میں کچھ حد تک تسلسل اور کچھ تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے اہم تبدیلیاں دیہی سماج کی مزید تفریق اور مختلف طبقوں میں درجہ بندی، ایک ملے جلے حکمران طبقے کا ظہور، شہر کاری کا فروغ، دستکارانہ سرگرمیوں اور پیشوں کی ترقی اور توسیع، حرم کے اندر اور باہر سیاسی سرگرمیوں میں خواتین کی شرکت، ذات پات کے نظام میں شدت اور ساتھ ہی کچھ نرمی اور ایک اعلیٰ درجہ بند درباری معاشرہ تھیں۔ اس اکائی میں ہم سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے درمیان رائج سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بات کریں گے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دیہی معاشرے کی ساخت اور شہری ڈھانچہ کی ترتیب سمجھ سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے شمالی ہندوستان میں زمین کی ملکیت کے مسئلہ کو سمجھ سکیں گے۔
- سیاست اور معاشرے میں خواتین کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- ذات پات کے نظام کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مغل دربار کے معاشرہ اور ثقافت کا جائزہ لے سکیں گے۔

13.2 دیہی زرعی معاشرہ (Rural Agrarian Society)

13.2.1 کسان: خود کاشت اور پاہی کاشت (The Peasantry: Khud-kasht and Pahi-kasht)

مغل دور کے دوران، دیہی معاشرہ بڑے پیمانے پر دو کاشت کرنے والے گروہوں میں تقسیم تھا: خود کاشت اور پاہی کاشت۔ خود کاشت (یا رعیتی) وہ کاشتکار تھے جو ان زمینوں کے مالک تھے جنہیں وہ بیلوں اور کاشت کے دیگر ذرائع کی مدد سے کاشت کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ بنیادی کاشتکار تھے جنہیں اپنی کاشت کردہ زمین کے موروثی ملکیت کے حقوق حاصل تھے، جن میں زمین کو الگ کرنے، بیچنے یا منتقل کرنے کے حقوق شامل تھے۔ ان کے مزدور یا تو خاندانی مزدور یا کرائے کی مزدوروں کی شکل میں ہوتے تھے اور بعض اوقات بانٹ کر بھی فصل کی کاشت کی جاتی تھی۔ خود کاشت کا حق ایک قیمتی حق تھا نہ صرف اس لیے کہ اس سے معاشی فائدہ ہوتا تھا بلکہ اس لیے کہ اسے ایک خاص سماجی حیثیت حاصل تھی۔ رہائشی کاشتکاروں نے گاؤں کی برادری کی گورننگ باڈی بنائی۔ یہ بھدرلوک یا معزز طبقہ تھا۔ جب تک وہ زمین کا محصول ادا کرتے رہتے تب تک خود کاشت کو زمین سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ اورنگزیب کے ایک فرمان میں، انہیں 'مالکِ زمین' کہا گیا تھا۔ وہ مراعات یافتہ رہائشی کاشتکار تھے جنہیں مہاراشٹر میں تھانی یا میراثی، راجستھان میں تھیکانہ یا گروہالا کہا جاتا تھا۔ انہیں عام کاشتکاروں،

رعیتی یا پالتیوں سے ممیز کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس زمین کے مالک یا کرایہ دار ہو سکتے تھے۔

ولسن (1795) کے مطابق پاہی کاشت نقل مکانی کرنے والے یا غیر رہائشی کاشتکار ہوتے تھے جو ایک ایسے گاؤں میں زمین کی کاشت کرتے تھے جس سے ان کا پیدائشی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر پڑوسی دیہاتوں یا پرگنوں سے اضافی زمین پر کاشت کرنے یا کسی تباہ شدہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے یا نئے گاؤں کو آباد کرنے کے لیے آتے تھے۔ ان کا زمین پر کوئی موروثی حق نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک یا مالکِ زمین کی خوشی سے وہاں رہتے تھے۔ اس طرح وہ باہر کے لوگ تھے جو اپنی ذات، قبیلہ یا قبائلی بستیوں سے باہر زمینوں کی کاشت یا زمینداری کرتے تھے۔ جب کبھی پاہیوں کے پاس اپنا کوئی سامان نہیں ہوتا تو انہیں زمینداروں، مقدم، مہاجنوں یا گاؤں کے کسی دوسرے اعلیٰ زمیندار کی طرف سے بیل، ہل، بیج اور کھاد فراہم کیے جاتے تھے۔ زراعت کے لیے درکار آلات کے بغیر، پاہیاں حرکت میں رہتے اور بہتر مواقع کی تلاش میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانے کے لیے بے تاب رہتے۔ کاریگر اور دستکار (جن کے بارے میں ہم بعد کے حصے میں بات کریں گے) اور قبائل بھی دیہی سیٹ اپ کے لازمی اجزاء ہوتے تھے۔

13.2.2 حکمران طبقہ: زمیندار (The Ruling Class: Zamindars)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں حکمران طبقے بڑے پیمانے پر دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے: وہ امرا جو شاہی طاقت اور مرکزی اقتدار کی نمائندگی کرتے تھے اور زمیندار یا مقامی زمیندار اشرافیہ جن کی مقامی جڑیں گہرائی تک پیوست تھیں۔ زمیندار ایک عام اصطلاح تھی جو مغل ہندوستان میں کسانوں سے برتر دیہی سرداروں کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ زمیندار دیہی/مقامی سطح پر سب سے زیادہ بااثر گروہ تھے جو زمین اور اس کی پیداوار کے حقوق رکھتے تھے۔ اپنی متعینہ زمینداری جاگیروں کے اندر، زمینداروں کے پاس تقریباً تمام کاشت شدہ زمینوں اور بنجر زمینوں کے وسیع رقبے یا غیر کاشت شدہ جنگلوں اور گھاس کے میدانوں پر قانونی ملکیت کا حق تھا۔ ان کی بنیادیں اور طاقت مغل ریاست سے آزاد تھی۔ لیکن ریاست ہمیشہ ان کو ریاستی نظام کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس عمل میں، انہوں نے اپنے علاقوں اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر اضافی حقوق حاصل کر کے اپنی حیثیت کو بڑھایا۔ موروثی مقامی قوت ہونے کے ناطے، وہ اپنے موجودہ علاقوں میں مقامی برادریوں کے رہنما تھے، وہ اپنے آپ میں ذات، قبیلے اور علاقائی خطوط پر کافی حد تک تقسیم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم رہتے تھے۔ سلطنت میں بھی وہ مکمل طور پر جذب نہیں ہو سکے تھے۔ چونکہ ان کی طاقت کی شناخت عام طور پر علاقوں کے لحاظ سے کی جاتی تھی، اس لیے ریاست کے ساتھ ان کے تعلقات ان کی مقامی برادری اور ان کے تسلط والے علاقے کی طاقت اور کمزوری پر منحصر ہوتے تھے۔ تعاون کے رشتے کے باوجود، زمینداروں اور ریاست کے درمیان قوت و اقتدار کی بنیادی رسہ کشی جاری رہتی تھی۔ ریاست کو زمینی محصول کی ادائیگی میں ان کی جانب مسلسل مزاحمت کی بنا پر انہیں مقامی علاقے اور مقامی برادریوں کا اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ بہت سے علاقے 'زور طلب' بن جاتے تھے جہاں طاقت کا استعمال ہونے پر ہی ادائیگی کی جاتی تھی۔

مغل دور میں زمینداروں کا دور دورہ تھا اور آئین اکبری اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ حکومت کے ہر صوبے میں زمیندار

پائے جاتے تھے۔ پھر بھی ان کا اثر اتنا نہیں تھا کہ وہ پورے دیہی معاشرے پر چھا جائیں۔ ان کے ساتھ کسان بھی موجود تھے، خاص طور پر خود کاشت کسان جو نا قابل تسخیر موروثی ملکیتی حقوق کے مالک تھے۔ دونوں کے درمیان فرق شاید ان کے زیر قبضہ زمینی رقبہ کا تھا۔ زمینداری کے تحت رقبہ عام طور پر ایک گاؤں یا اس کا ایک مخصوص ٹکڑا ہوتا تھا اور یہ شاذ و نادر ہی چند بیگھہ زمین یا چند اکائی زمین پر مشتمل ہوتا تھا۔ زمینداری کے حقوق کی ترقی بھی ناہموار تھی جیسا کہ اسی ضلع کے اندر کچھ دیہات مکمل طور پر زمینداری کے تحت ہو سکتے تھے جبکہ باقی دیگر گاؤں کسانوں کے زیر قبضہ یا رعیتی ہو سکتے تھے جن میں کوئی قابل لحاظ زمیندار نہیں ہوتا تھا۔ زمینداروں اور کسانوں کے حقوق کی حدیں متعین نہیں تھیں۔ کسان زمینداری کے حق میں راہ ہموار کرنے کے لیے زمین کے اپنے ملکیتی حقوق بیچ سکتے تھے یا انہیں اس بات پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ یہاں تک کہ حکومت زمینداروں کو بدل سکتی تھی اور کسانوں کے زیر قبضہ دیہاتوں پر نئے زمیندار مقرر کر سکتی تھی۔ تاہم، زمیندار مغل ریاست کے لیے ایک قابل قدر ادارے کے طور پر ابھرے۔ ان کی غیر مستحکم نوعیت کے باوجود، ریاست زمین کے سروے، وصولی اور محصول کی ادائیگی اور مختلف قسم کے انتظامی کاموں اور مقامی لوگوں کے ساتھ روابط برقرار رکھنے کے لیے ان پر انحصار کرتی تھی۔ ان میں سے کئی منصب دار بھی بن گئے۔

زمینداروں کی بھی مختلف قسمیں تھیں، یعنی خود مختار سردار، مال گزار/بنیادی زمیندار اور خدمت گزار/درمیانی زمیندار۔ خود مختار سردار وہ تھے جو ریاست کو ایک مقررہ خراج ادا کرتے تھے اور اپنے علاقوں میں تمام کارناموں اور مقاصد کو انجام دینے کے لیے آزاد رہتے تھے۔ وہ عام طور پر راجے رجواڑے تھے جن کی حیثیت زمینداروں کے عہدے تک گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بنیادی زمیندار زرعی اور رہائشی زمینوں پر ملکیتی، موروثی اور منتقلی کے قابل حقوق کے حامل تھے۔ انہوں نے یہ حقوق مغل ریاست کو یہ یقین دہانی کراتے ہوئے حاصل کیے کہ وہ غیر کاشت شدہ اور بنجر زمین پر زراعت کو بڑھائیں گے اور ریاست کی طرف سے مقرر کردہ شرح پر خراج یا مال ادائیگی کو برقرار رکھیں گے۔ وہ یا تو خود اپنے طور پر زمینوں پر کاشت کر سکتے تھے، یعنی خود کاشت یا اپنی زمین کاشت کرنے کے لیے کرایہ دار رکھ سکتے تھے۔ وہ اکثر اپنے کرایہ داروں کو زمینیں لیز پر دیتے تھے جو ایک پٹہ کے پابند تھے کہ وہ مقررہ نرخوں پر باقاعدگی سے خراج ادا کریں گے۔ پٹہ داروں کو مدت ملازمت کے دوران موروثی حقوق کا تحفظ بھی فراہم کیا گیا۔ انسان اور زمین کے تناسب کو دیکھتے ہوئے، پٹہ داروں کو زمین سے باندھنا اور انہیں تمام قابل کاشت زمینوں پر کاشت کرنے پر مجبور کرنا دانش مندی کا کام تھا۔ مالگزاروں کو مال گزار اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ریاست کی جانب سے زمینی محصول کا تخمینہ لگائیں۔ انہیں کسانوں سے خراج جمع کرنا تھا اور اسے مغل ریاست اور ریاست کی جانب سے تفویض کردہ لوگوں کو ان کا حصہ دینا تھا۔ یہ مالیاتی دعویٰ، جسے مالکانہ بھی کہا جاتا تھا ایک زمیندار کا حق تھا جیسا کہ وہ زمین کا مالک ہوتا تھا۔ مالکانہ یا تو کل محصول ادا کرنے والی اراضی کا کچھ حصہ محصول سے پاک اراضی کی شکل میں یا پھر کل محصول کی وصولی کے 10 فیصد کے برابر نقد رقم کی ادائیگی ہوتا تھا۔

زمیندار، مال گزار اور خدمت گزار دونوں تھے۔ خدمت گزاری، خدمت کرنے کا حق تھا۔ خدمت گزاروں میں مقدم، چودھری، قانون گو، دیشمکھ، تعلقدار شامل ہوتے تھے، جو سترہویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سامنے آئے۔ وہ سلطنت کے ساتھ ایک معاہدہ

کرتے تھے تاکہ کسی مخصوص علاقے کی آمدنی حاصل کی جاسکے اور زیادہ تر موروثی حقوق سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ ریاست کے لیے محصولات کے تخمینے کی تفصیلات تیار کریں، زراعت کی توسیع میں سہولت فراہم کریں، امن وامان کی بحالی میں مدد دیں اور اگر ضروری ہو تو ریاست کو فوج فراہم کریں۔ان کی خدمت کے بدلے، انہیں 'نانکار' کے نام سے جانا جانے والا بھتہ ادا کیا جاتا تھا جو، یا تو محصول سے پاک زمینوں کی صورت میں یا کل محصول کی وصولی کے 10 فیصد کے برابر نقد رقم کی ادائیگی ہوتا تھا۔

13.2.3 زمین کی ملکیت کا مسئلہ (The Question of Land Ownership)

16 ویں اور 17 ویں صدی میں ہندوستان کا دورہ کرنے والے کئی غیر ملکی سیاحوں جیسے برنئیر، ٹراونئیر، مانکوشائی اور دیگر نے اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں بادشاہ کو زمین پر ملکیت کے حقوق حاصل تھے۔انہوں نے جاگیرداروں کو یورپی جاگیرداروں کے مساوی قرار دیا اور چونکہ بادشاہ جاگیرداروں کو اکثر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کر سکتا تھا، اس لیے یہ اصل بادشاہ ہے جس کے پاس ملکیت کے حقوق ہیں نہ کہ جاگیردار۔ مغل سرکاری دستاویزات میں اس نوعیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا ہے۔نہ ہی قدیم ہندوستانی قانون یا اسلامی قانون میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار مغل دور میں ہندوستان میں زمینوں کی ملکیت کے بارے میں متذبذب تھے۔ بادشاہ کے تمام زمینوں کے مالک ہونے کے بارے میں یورپی مسافروں کی تحریروں کو بنیاد بناتے ہوئے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں کی وراثت کے طور پر ان کے زیر تسلط تمام زمینوں پر دعویٰ کیا۔

سولہویں صدی کی دستاویزات، خاص طور پر ابوالفضل کی آئین اکبری میں، کسان کے مستقل حق اور اس کی کاشت کی گئی زمین پر موروثی قبضے کے حقوق، اور ان حقوق کے ناقابل تنسیخ ہونے اور قابل فروخت ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔ سترہویں صدیوں کے کسانوں کو مالک یا 'ارباب زمین' کہا جاتا تھا۔اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کی دستاویزات میں بتایا گیا ہے کہ کسانوں کو اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ اس زمین کی کاشت کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے رہیں جس پر انہوں نے اپنا دعویٰ کیا تھا یا جس زمین کا انہوں نے باقاعدگی سے محصول ادا کیا تھا۔ چنانچہ زمین پر کسانوں کے قبضے کے حقوق قائم رہے۔ زمین پر کسان کا حق اس کا انفرادی حق تھا۔تاہم، زمینداروں، کسانوں، کاریگروں، زرعی مزدوروں اور دیگر کی شکل میں پیداوار میں حصہ لینے والے کئی دعویدار تھے اور اسے اجتماعی طور پر استعمال کیا جاتا تھا، جو کہ مخصوص کنٹرول کے سرمایہ دارانہ تصور کے لیے ایک اجنبی عمل تھا۔ لہٰذا، عہد وسطیٰ کے دور میں ضروری سوال یہ نہیں تھا کہ زمین کس کی ملکیت تھی بلکہ سوال یہ تھا کہ پیداوار پر دعویٰ کس کا تھا۔مزید یہ کہ کسانوں کی انفرادی پیداوار مساوی نہیں تھی، کسانوں کی مختلف قسمیں تھیں۔اسی طرح ہندوستانی دیہات بھی چھوٹی دیہاتی جمہوریہ یا پرانے طرز کے نہیں تھے۔ وہ الگ تھلگ نہیں تھے بلکہ شہروں یا دوسرے دیہاتوں سے ان کے روابط تھے۔ گاؤں کی برادری کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ گاؤں کے ارکان کی جانب سے زمین کی مالک ہے۔ زمین کی اجتماعی یا طبقہ واری ملکیت یا کسانوں کے درمیان زمین کی متواتر تقسیم در تقسیم کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مغل زرعی نظام کی تشکیل ،اضافی زرعی پیداوار، زمینداروں اور ریاست کی طرف سے اس کی تخصیص، اور جاگیرداروں، مدد معاش کے مستحق اور دیگر پر مشتمل حکمران طبقے کے حصے میں اس کی تقسیم سے ہوئی تھی۔اہمیت زمین کی پیداوار/آمدنی کو دی گئی نہ کہ خود زمین کو۔

13.3 شہری معاشرہ (The Urban Society)

جاگیر دار، بادشاہ کے بعد طاقت اور قوت کے لحاظ سے شہری معاشرے کا سب سے اہم جزو تھے۔ مغل دربار میں منصب یا عہدہ کی بنیاد پر جاگیر یا جاگیر کے برابر آمدنی پیدا کرنے والی زمین نوابوں/اشرافیہ کو دی جاتی تھی۔ وہ شہری شعبے میں اشیا کے اہم صارفین تھے اور اشیاء کی طلب پیدا کرنے کا باعث بنتے تھے۔ بابر کے ماتحت اشرافیہ بنیادی طور پر وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے تورانی تھے۔ ہمایوں نے بعد میں اس میں ایرانی عنصر کو بھی شامل کر لیا۔ اکبر نے خاص طور پر تورانی پر انحصار کو کم کر کے اور ایرانیوں یا فارسیوں کو اس زمرہ میں شامل کر کے ایک اور تبدیلی لائی۔ تاہم اشرافیہ بنیاد کو مزید وسیع کرتے ہوئے، اس نے ہندوستانی مسلمانوں (شیخ زادوں) اور راجپوتوں کو بھرتی کیا اور اس طرح نسلی، مذہبی یا قومی بنیادوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ڈھانچے میں مزید توازن پیدا کیا۔ شاہجہاں کے دور اور اورنگ زیب کے پہلے دور میں راجپوتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور بعد کے دور میں مرزا راجہ جئے سنگھ اور مہاراجا جسونت سنگھ 7000 سوار کے عہدے پر فائز ہوئے جو کہ اعلیٰ ترین منصب تھا۔ سترہویں صدی میں، خاص طور پر جہانگیر کے دور میں، حکیموں، یعنی پیشہ ور افراد اور پہلوانوں کو ان اشرافیہ میں شامل کیا گیا۔ اگرچہ افغانی، شیخ زادوں کا حصہ تھے لیکن مسلسل مزاحمت کی وجہ سے ان کو شامل کرنا مناسب نہ تھا۔ تاہم، جہانگیر کے دور میں ان کی حیثیت میں ایک بہتری نظر آتی ہے۔ بعد میں سترہویں صدی میں، اورنگ زیب نے دکن میں توسیع کی اور، بیجاپوریوں اور گولکنڈہ کے ساتھ ساتھ مراٹھوں کو بھی اشرافیہ میں شامل کیا۔

سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی کے آخر میں کاروبار اور تجارت کی زبردست ترقی نے تاجروں اور سوداگروں اور کاریگروں و دستکاروں کے گروہوں کو واضح طور پر نمایاں کیا۔ اس دور کے ابتدائی جدید ہندوستان میں دیہی شہری معیشتیں الگ یا جدا جدا نہیں تھیں بلکہ مربوط مغل معیشت کے فعال اجزاء کے طور پر وجود رکھتی تھیں۔ یہ تقسیم سخت سے زیادہ لچکدار تھی کیونکہ ایک شہری مرکز کو زرعی علاقے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک قصبے نے اپنے ارد گرد موجود گاؤں کو متعدد سیاسی، علامتی اور تجارتی نیٹ ورکس کے ذریعے منظم کیا۔ لہذا، سماجی زمرے بھی ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی نقد معیشت نے مقامی زمینداروں اور دیہی اشرافیہ کو دولت جمع کرنے میں سہولت فراہم کی۔ اس کی وجہ سے قصبوں کے نام سے جانے جانے والے کئی چھوٹے گاؤں کی ترقی ہوئی جس میں دیہاتوں کی دولت تیزی سے شامل ہوتی رہی جس سے وہ پیداوار اور تبدیلی کے مراکز بن گئے۔ یہ شہروں کو دیہی علاقوں سے جوڑتے ہیں اور دیہاتوں سے شہروں تک سپلائی کے بہاؤ کو ممکن بناتے ہیں۔ کاریگروں نے کاروبار و تجارت میں اضافے اور منڈیوں کی توسیع میں گراں قدر تعاون کیا۔ ان کا تعلق دیہی اور شہری دونوں جگہوں سے تھا۔ دیہی پیداوار کا بڑا حصہ موروثی کاریگروں کی ذاتیں تیار کرتی تھیں۔ تمام دیہاتیوں کو روایتی گاہک کے طور پر مخصوص گاؤں کے کاریگروں سے جوڑا گیا تھا جو کاریگروں کو فصلوں میں سے روایتی حصہ فراہم کرتے تھے تاکہ بدلے میں ان سے دستکاری کی کچھ خدمات حاصل کر سکیں۔ ان کی کمائی زیادہ تر پیداوار کے مقررہ حصے سے حاصل ہوتی تھی، جس کے علاوہ انہیں غیر محصولی زمینیں یا نقد ادائیگیاں کی جاتی تھیں۔

تاہم، شہروں اور دیہاتوں میں بازار کے لیے کاریگروں کی طرف سے تیار کردہ دستکاری مصنوعات موجود تھیں۔ اس طرح کی فنکارانہ پیداوار میں ایک بڑا حصہ پارچہ (ٹیکسٹائل) کا تھا۔ جیسے جیسے کاروبار و تجارت میں اضافہ ہوا، تاجروں نے آہستہ آہستہ کاریگروں کو اشیا کی پیداوار کے لیے پیشگی دینا شروع کیا۔ مینا بھار گوا لکھتی ہیں کہ پیشگی ادائیگی اور اشیا کے حصول کا نظام، 'دادنی نظام' کے ارتقا کا باعث بنا۔ اس نظام کے تحت اشیاء کی خریداری یا تو فوری جگہ پر معاملات یا پھر پیشگی ادائیگی کے ذریعے کی جاتی تھی۔ بڑی مارکیٹوں اور چھوٹی منڈیوں میں جگہ پر خریداری براہ راست اس سوداگر کے دلال کے ذریعہ کی جاسکتی تھی۔ تجارتی سامان کا ایک حصہ اس کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی کے نصف اواخر سے شروع ہونے والی، طویل فاصلے کی تجارت کے لیے اشیا پیشگی معاہدے کے ذریعے حاصل کیے جانے کی شروعات ہوئی۔ یہ اُن بُنکروں کے لیے ایک ضمانت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تصریحات کے مطابق اپنے کرگھے (لوم) کو تبدیل کرنے میں ہچکچا رہے تھے کہ کہیں آخر میں کمپنی انہیں مسترد نہ کردے۔ کاریگروں کو اجرت کمانے والے میں تبدیل کرنے کے خطرے کے باوجود، دادنی نے کاریگروں کی پیداوار کو مارکیٹ پر مبنی پیداوار میں تبدیل کر دیا۔

کاریگروں کی پیداوار میں اضافہ شہری شعبہ کو وسعت دینے میں کامیاب ہوا جیسا کہ تاجروں، امراء اور یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد کی جانب سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ٹیکسٹائل کی تجارت نے موجودہ ہندوستانی تجارتی برادری کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھادیا۔ اس میں سیٹھ، بوہرا یا مودی شامل تھے جو طویل فاصلے کی اور بین علاقائی تجارت میں مہارت رکھتے تھے جبکہ بیوپاری یا بانِک مقامی، خوردہ (ریٹیل) تجارت کرتے تھے۔ اشیاء کی خوردہ فروشی کے علاوہ، بیوپاریوں نے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے اناج اور نقد فصلیں خریدیں۔ 'بنجارہ' ایک اور تجارتی برادری تھی۔ عام طور پر چھوٹے تاجر ہونے کی بناپر وہ، وہ تجارتی سامان، خاص طور پر اناج کا نقل و حمل کرتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں اناج اور نمک کی تجارت کے لیے معروف بنجاروں کو ٹیکسٹائل صنعت کے لیے دکن کپاس کی تجارت اور کورومنڈل اور دکن میں عام تبادلے کے لیے جانا جاتا تھا۔ اگرچہ انہیں اکثر دوسرے لوگ اجناس کو دور دراز مقامات پر لے جانے کے لیے کرائے پر ان کی خدمات حاصل کرتے تھے، لیکن وہ خود بھی سوداگر تھے جو سستے داموں اناج لاتے تھے اور اسے منافع بخش قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔

طلب، اخراجات کی نوعیت اور آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر سولہویں اور سترہویں صدی میں ایک بڑا شہری طبقہ موجود تھا۔ کل آبادی کا کم از کم 15 فیصد قصبوں میں رہتا تھا جس کی مجموعی شہری آبادی کل برصغیر کا تقریباً 20 فیصد تھی۔ چنانچہ مغل ہندوستان میں ایک قابل قدر متوسط طبقہ موجود تھا جس میں بیوروکریسی کے نچلے درجوں، حکیموں، ڈاکٹروں، معماروں، فنکاروں، دانشوران، کاتبوں اور مدد معاش کے حامل پیشہ ور افراد شامل تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ، سوداگروں، مہاجنوں، صرافوں اور دلالوں کی شکل میں تجارتی اور مالیاتی گروہوں نے پیسہ کمانے اور اس طرح شہر کاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے لازمی عناصر تھے۔ پیلساریٹ (Pelsaert) نے کئی دستکاری اور خدماتی پیشوں کا ذکر کیا ہے جن میں جولاہا، درزی، حجام، بڑھئی، دھات ساز، معمار اور سنگتراش شامل ہیں جن کے گاہکوں اور خدمات حاصل کرنے والوں میں متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ قصبے کی آبادی میں مزدوروں اور خادمین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی جو حکمران طبقے کی ضرورت سے زیادہ بڑے عملے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گھریلو غلام بھی موجود تھے تاہم ہمیں تیرہویں اور چودھویں

صدی کی طرح کھلے غلام بازاروں یا غلام مزدوروں کے بارے میں سننے کو نہیں ملتا۔

معاشرے کا ایک بڑا حصہ جس میں دیہی اور شہری عناصر پائے جاتے تھے وہ فوج تھی۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ آئین اکبری میں زمینداروں کے خادمین کا تفصیلی بیان ملتا ہے جن کی تعداد 384,558 گھڑ سوار اور 4,277,057 پیادہ تھی۔ یہ دستے عملاً مکمل طور پر دیہی تھے۔ پیدل سپاہی صرف مسلح کسان ہی ہو سکتے تھے۔ لیکن گھڑ سوار فوج اعلیٰ طبقہ سے آئی ہو گی، شاید بنیادی طور پر سرداروں اور چھوٹے زمینداروں سے ان کا تعلق ہوتا ہو گا۔ 47-1646ء میں بشمول منصب دار شاہی فوج، کا تخمینہ سرکاری طور پر 2 لاکھ لگایا گیا تھا۔ عرفان حبیب کے مطابق، وہ بالکل مختلف طبقوں سے آئے تھے جیسے وسطی ایشیا اور ایران سے آنے والے تارکین وطن، افغان اور ہندوستانی پیشہ ور گھڑ سوار اور زمیندار قبیلوں کے راجپوت۔ وہ بنیادی طور پر مغل سلطنت کی کامیابی کے ذمہ دار تھے۔ دیہی علاقوں سے نکل کر شاہی فوج کے بہت سے دستے قصبوں میں تعینات کر دیئے جاتے تھے، اس طرح کے قصبے بعض اوقات فوجی کیمپوں کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔

13.4 خواتین کی حیثیت (Position of Women)

خواتین کسی بھی معاشرے کا لازمی حصہ ہیں۔ عہد وسطیٰ کے دربار اور معاشرے میں ان کے بارے میں معلومات نسبتاً ان مردوں کے مقابلے میں کم ہیں جو طاقت و قوت رکھتے تھے۔ دوسرے طبقے کی عام خواتین کے مقابلے اعلیٰ مغل خواتین کے بارے میں زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ مغل خواتین نے دربار اور سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ مغل نسل کو برقرار رکھنے والوں میں سے تھیں اور مستقبل کے بادشاہ کی پرورش میں شامل تھیں۔ لہٰذا، وہ صحیح آداب و رسوم کو برقرار رکھتیں اور حرم کے اندر اس کے نفاذ کو یقینی بناتی تھیں۔ ہندل کی ماں، دلدار بیگم نے اپنے ہی بیٹے کو اس وقت مار ڈالا جب اس نے اپنے سوتیلے بھائی ہمایوں کے خلاف بغاوت کی۔ مغل خواتین نے بعض انتہائی اہم لمحات میں امن قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب سلیم نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور اس کے نتیجے میں شہنشاہ کے چہیتے ابوالفضل کو قتل کر دیا تو اکبر نے اسے معاف نہ کرنے کا عہد کیا۔ اس موقع پر اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم، اس کی خالہ گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطانہ بیگم نے مداخلت کی اور شہزادے کو معافی دلوائی۔ اس واقعہ نے باپ بیٹے کے تعلقات کو بہتر کیا۔ خواتین نے رضاعی ماؤں کی شکل میں اضافی رشتہ داری کو فروغ دیا۔ اکبر کے جیجی انگا کے خاندان سے قریبی تعلقات تھے، جنہوں نے اسے کھلایا پلایا اور جن کے خاندان کے افراد اس کے دور حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ماہم انگا کی بہت عزت کرتا تھا جو رضاعی ماؤں کی سرپرست تھی۔ اس کے دور میں خواتین کو کچھ انتظامی فرائض بھی سونپے گئے تھے۔ ہمیں اکبر کی سوتیلی بہن بخت النساء کے کابل کے گورنر کا چارج سنبھالنے کی مثال ملتی ہے جب اس کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم نے ان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ مغل خواتین تجارتی سرگرمیوں میں بھی شامل رہیں۔ نور جہاں کے پاس تجارت کے لیے اپنا جہاز تھا اور وہ یورپی تاجروں کے ساتھ تجارت کرتی تھی۔ اس نے حرم کے اندر جدید ترین فیشن کو رائج کیا اور اس کی ماں نے عطر ایجاد کیا۔ اس نے تعمیراتی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لی اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کے مقبرے کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔ یہ مقبرہ تعمیری مواد کی سرخ ریت کے پتھر سے مکمل سفید سنگ مرمر کی عمارتوں میں منتقلی کے لیے مشہور ہے۔ یہ پچی کاری طرز (Pietra-dura style) کے تعارف کے لیے بھی

جاناجاتاہے جس میں کندہ کاری میں قیمتی پتھر اور ہیرے شامل تھے۔اسی طرح، شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بھی اپنی تعمیراتی سر گرمیوں کے لیے مشہور تھی۔ شاہجہان آباد میں مینا بازار سمیت مسجد اور دیگر عمارتوں کی تعمیر انہوں نے کروائی۔ وہ شاعرہ اور عالم بھی تھیں۔اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا شاعری کرتی تھیں اور ان کا تخلص 'مخفی' تھا۔ روبی لال کا ماننا ہے کہ اکبر سے پہلے مغل دربار درست طور پر منظم نہیں تھا اور یہی معاملہ حرم کا بھی تھا اور اسی لیے سرکاری اور نجی معاملات کے درمیان موجود حدیں زیادہ سخت نہیں تھیں۔ تاہم اکبر کے دور سے سلطنت کو جو استحکام حاصل ہوا تھا اسی کے ساتھ دربار اور حرم دونوں ہی کی حدود متعین ہو گئیں۔ حرم کنکریٹ سے گھری جگہ بن گئی جس کی وجہ سے یہ نجی جگہ بن گئی۔ تاہم، روبی لال کہتی ہیں کہ ایک بند جگہ ہونے کے باوجود، حرم بیرونی دنیا سے منقطع نہیں تھا۔ وہ اپنے استدلال کی تائید میں اس بات کی مثال دیتی ہیں کہ حرم کے پیچھے سے بھی خواتین نے سیاست میں فعال کردار ادا کیا۔ انہوں نے اس بات کو بھی پیش کیا کہ کیسے گلبدن بیگم نے اکبر کے دور حکومت میں 1574 میں مکہ کو جانے والے حج کے ایک قافلے کی قیادت کی تھی۔

تاہم، عام خواتین کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ مغل تصاویر میں آگرہ اور فتح پور سیکری میں تعمیراتی سر گرمیوں میں شامل خواتین کو دکھایا گیا ہے۔ خواتین پانی بھرتیں، سوت کاتا کرتیں، چکی میں مکئی پیستیں اور زراعت میں مدد کرتی تھیں، تاہم وہ کچھ ہمالیائی برادریوں کی طرح مٹی کو جوتنے کا کام نہیں کرتی تھیں۔ بنگال میں عورتیں باریک دھاگہ بناتی تھیں جس سے ململ بُنی جاتی تھی۔ عورتوں کی شادیاں اکثر بچپن میں کر دی جاتی تھیں۔ شادیاں بلوغت سے پہلے ہی انجام دے دی جاتی تھیں۔ نچلی ذاتوں میں بیٹیوں کے والدین کو دلہن کی قیمت ملتی تھی جبکہ اعلیٰ ذاتوں میں، دولہے کے والدین کو عام طور پر دلہن کے والدین سے جہیز ملتا تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں بیوہ کی دوبارہ شادی ممنوع تھی۔ لیکن بہت سے کسانوں اور چرواہا ذاتوں، جیسے جاٹ، آہیر اور میواتی میں، بیواؤں کی اپنے شوہروں کے بھائیوں یا اجنبیوں سے کی دوبارہ شادی کی جاسکتی تھی۔

13.5 ذات کا عنصر (Caste System)

عرفان حبیب کے مطابق ذات، ایک واضح طور پر علیحدہ برادری ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے شادی (marriage) کے ذریعے اور اکثر و بیشتر ایک مشترکہ حقیقی یا مفروضہ موروثی پیشے کی وجہ سے بندھے ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ اس میں مراتب کے تصور کو بھی شامل کرتے ہیں، جس میں اپنی ذات کے لحاظ سے کچھ ذاتیں پاک اور کچھ ذاتیں ناپاک قرار پاتیں۔

لوئی ڈیومونٹ (Louis Dumont) ہوموہائرارشیکس (*Homo Hierarchicus*) میں مراتب کے اس اصول کو ذات پات کے نظام کی اصل خصوصیت سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ذات پات کے نظام کو مذہبی نظریے کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ اس کے لیے مراتب اصل میں، اقتدار یا دولت کی تقسیم سے نہیں ابھرتی بلکہ پاکیزگی اور ناپاکی کے بنیادی اصول سے پیدا ہوتی ہے، مراتب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ برہمنوں کا ہے جو خالص ترین ہیں اور رسوم و رواج کے ماہر ہیں۔ لہٰذا، لوئی ڈومونٹ کے نزدیک، ذات نہ تو طبقات کی انتہائی شکل تھی اور نہ ہی سماجی مراتب کا نظام تھا اور نہ ہی یہ دولت یا اقتدار کی تقسیم سے مطابقت رکھتی تھی۔ یہ سماجی تنظیم کی ایک شکل ہے اور

اسے کل کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ یہ درجہ بندی، اضافی پاکیزگی کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی اور اس میں معیشت کا کوئی کردار نہیں تھا جس کا یقینی طور پر مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے کے اندر معاشی تحریک اثر بہت کمزور تھا۔ مزید برآں، یہ ہندوستان کے ناقابل تبدیل طبقاتی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عرفان حبیب نے ڈومونٹ پر تنقید کی اور کہا کہ معاشی اثرات، ذات پات کی تشکیل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں محنت کی موروثی تقسیم بہت زیادہ تغیر پذیر ہے۔ تاہم، مذہبی پہلو اہم ہے اور معاشی پہلوؤں کو ثانوی سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈی ڈی کوشامبی کی رائے کے مطابق، ذات کو درجہ بند طور پر مختلف سماجی ساختوں کے تناظر میں اس کے کردار میں دیکھنا ہوگا۔ محنت و مزدوری کے عمل پر مبنی ایک سماجی تشکیل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ معاشرے کو اضافی پیداوار فراہم کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ رگ وید میں راجنیہ جو اشرافیہ، برہمن پجاریوں، بڑے لوگوں اور شودروں کی خدمت کرنے والی برادریاں ہیں، کے مقابلے 'پُرُش سوکت' سماجی طبقات کی زیادہ وضاحت آئی ہے۔ پیشے یا صرف اپنی ذات میں شادی کی موروثی تقسیم کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ڈی ڈی کوشامبی کا ماننا تھا کہ قبائلی عناصر کا عام سماج میں داخل ہونے کا تاریخی عمل ذات پات کی بنیادوں میں پوشیدہ ہے۔ قبائل میں اکثر صرف اپنے قبیلے کے اندر ہی شادی کرنے کا رواج تھا۔ بہت سے لوگوں نے غیر فعال طرز زندگی اختیار کی۔ لیکن قدیم شکار یا خوراک جمع کرنے والے بہت سے قبائل ایسے تھے جو ترقی کرنے والی کسان برادریوں جیسے ساکیوں، کولی، ناگاؤں کے زیر تسلط آنے پر عام معاشرے میں داخل ہوئے۔ جیسا کہ غذا اکٹھا کرنے والوں کو محکوم بنایا گیا اور انہیں سب سے نچلی ذات مختص کر دی گئی، انہیں اتنا نیچ بنا دیا گیا کہ وہ چاروں ورنوں سے بھی باہر ہو گئے۔ یہ اصل اچھوت ذاتیں تھیں۔ عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ چونکہ انہیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے سے روک دیا گیا تھا، اور ان کے اپنے پیشے معمولی تھے یا وہ موسمی لحاظ کے تھے، اس لیے وہ بے روزگار اور بے زمین مزدوروں کا ایک جتھہ بن گئے جو کسانوں اور اعلیٰ زمینداروں کو کام کے لیے ارزاں طور پر دستیاب تھا۔ دونوں گروہوں کے درمیان تلخ دشمنی کی بنیاد دراصل مفادات کا ٹکراؤ تھا۔ پاکی اور ناپاکی کے تصورات اس بنیادی معاشی حقیقت کی ایک توجیہہ تھے۔

تاہم، کسانوں اور غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کی یہ علیحدگی ایک عمومی نوعیت کی تھی۔ عرفان حبیب نے آر ایس شرما کے دوسری شہری کاری (second urbanisation) کے خیال کے بارے میں کہا کہ یہ اس وقت ہوئی ہوگی جب پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ محنت (دھندوں) کی تقسیم کے دباؤ میں قبائل مختلف پیشوں کی بنیاد پر تقسیم ہو گئے ہوں۔ اصل قبیلے سے الگ ہونے والے مختلف کاریگروں کو مخصوص ذاتوں میں تشکیل دے دیا گیا۔ تجارت پر مبنی تفریق کا ایک ایسا ہی عمل تجارتی ذات کی نمو کا باعث بنا جس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے 'ویشیا' ورن کو تشکیل دے لیا۔ ذات پات کے دائرہ میں برہمن کو ان کا مقام ان کے پجاری کردار کی وجہ سے اور ڈی ڈی کوشامبی کے مطابق کیلنڈر پر ان کی گرفت کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جو کہ زرعی کاموں کے نظم کے لیے بہت ضروری تھا۔ وہ طبقہ جو تبدیلی کا سب سے زیادہ شکار ہو سکتا تھا وہ حکمران اور جنگجو طبقہ، شتریہ تھا۔ حملوں اور بغاوتوں نے اقتدار کی موروثی اجارہ داری کو انتہائی مشکل بنا دیا تھا۔

عرفان حبیب کے نزدیک، ذات پات کے نظام کو رواج دینے کے لیے برہمن ذمہ دار تھے اور اسے مذہب سے جوڑ کر، برہمنوں نے ذات پات کے نظام اور برہمن مت سے جوڑ دیا۔ یہاں تک کہ بدھ مت کے کرم اور اہنسا کے نظریہ نے کسانوں اور غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کے لیے منفی طور پر کام کیا جیسا کہ یہ خوراک اکٹھا کرنے اور جانوروں کا شکار کرنے والی ذاتوں کو محکوم بنانے اور انہیں ذلیل کرنے کا باعث بنا۔ عرفان حبیب کے مطابق ذات پات کا نظریہ اپنے نقطہ نظر میں خصوصی طور پر برہمنی نہیں رہا۔ وہ بدھ مت کے عروج (500 قبل مسیح) سے لے کر گپتا دور تک کے دور کو ذات پات کے نظام اور اس کے حمایتی نظریے کی تشکیل کا دور مانتے ہیں۔ محنت (دھندوں) کی تقسیم کی شکل نسبتاً سخت ہونے کی وجہ سے ذات پات کا نظام پیداواری تعلقات کا حصہ بنا۔ ذات پات کا نظام محنت (پیشوں) کی دو مختلف دنیاؤں میں بھی کام کرتا ہے۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والا کاریگر جس کی نگرانی اور پرورش گاؤں کے ذمہ ہے اور قصبے کا کاریگر جس کا مکمل انحصار بازار کے اتار چڑھاؤ پر ہے۔ مارکس (Marx) گاؤں کے کاریگروں اور خاص ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہنر مند افراد کے بارے میں بات کرتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر پورے گاؤں کے خدمت گزار تھے اور انہیں کسی قسم روایتی ادائیگی کے ذریعے یا زمین مختص کر کے یا اشیا کے تبادلے کے ذریعہ پالا جاتا تھا۔ موروثی کاریگر اور دستکار، گاؤں کی خود کفالت کو برقرار رکھنے میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے اور انہیں اس قابل بنایا جاتا تھا کہ وہ اپنے آقاؤں کو اضافی اشیا کا ایک بڑا حصہ فراہم کر سکیں کیونکہ سامان کی درآمد کی ضرورت بہت کم ہو گئی تھی۔ گاؤں کے باہر کاریگر صرف ایک شخص دکھائی دیتا ہے جو اپنا سامان بازار میں بیچ رہا ہے۔ ذات کی طرف سے موروثی پیشہ انہیں مخصوص مہارتوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ موروثی پیشہ افقی حرکت کو چھوڑ کر مہارت کو برقرار رکھتا ہے۔ کاریگروں کو پست درجہ یا ذات دینے سے اعلیٰ ذات کے حکمران طبقے کو اضافی فوائد حاصل ہوتے تھے۔ منوسمرتی میں وہ مخلوط جاتی (ذات) کے طور پر نمودار ہوئے۔ گیارہویں صدی میں البیرونی نے پیشوں کے آٹھ درجے بتائے ہیں جن میں انتیاجاؤں (اچھوت ذاتوں) میں کے بنکر (weaver) اور چمار بھی شامل ہیں۔ ان کی کم حیثیت کی بنا پر ان کی اجرت کم رہتی تھی جس نے ان کی مزاحمت کی طاقت کو کم کیا ہو گا۔ ذات پات کے نظام نے قدرتی اور بازار پر مبنی معیشت دونوں میں سہولت سے کام کیا۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ اس نے تصوراتی پاکیزگی کے تانے بانے کو نہیں بلکہ طبقاتی استحصال کے نظام کو برقرار رکھا ہے۔

عرفان حبیب کے نزدیک تیرھویں صدی میں کئی تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سب سے پہلے، اس میں سابقہ جاگیردارانہ حکومت کے برعکس مارکس کی مشرقی استبداد (Oriental Despotism) کی تعریف کے مطابق ایک سماج تشکیل ہوا۔ دیہاتوں اور قصبوں دونوں میں ذات پات کا ڈھانچہ بنیادی طور پر پہلے کے دور کی طرح ہی رہا۔ ذات پات کے تئیں مسلمانوں کا رویہ اسے مسترد کرنے کا نہیں تھا۔ جب عربوں نے 12-711ء میں سندھ کو فتح کیا تو انہوں نے سابقہ دور حکومت میں جاٹوں پر عائد پابندیوں کو جاری رکھا جس میں ایک پابندی یہ بھی تھی کہ انہیں اپنے پنچ کردار کی علامت کے طور پر اپنے ساتھ ایک کتا لے کر چلنا پڑتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے دوران فارسی تحریروں میں توحید کی بات کی گئی ہے اور بت پرستی کی مذمت کی گئی ہے لیکن انہوں نے درجہ بندی یا امتیاز پر کبھی سوال نہیں اٹھایا، بلکہ درحقیقت انہوں نے اسے فروغ دیا۔ برنی ہمیشہ اصیل ترکوں (Blue-blooded Turks) کے اقتدار کے حقدار ہونے پر زور دیتے ہیں۔ نیز، ذات پات کے

نظام نے کم لاگت میں زیادہ آمدنی اور اشیائے صرف پیدا کرنے میں مدد دی اور اس طرح یہ نظام حکمران طبقے کے لیے فائدہ مند رہا۔

عرفان حبیب کے نزدیک، ترک اپنی آمد کے ساتھ ساتھ بہت سی نئی دستکاری کی ٹیکنالوجیوں کے علاوہ بہت سی نئی قسم کی مصنوعات اور خدمات کے مطالبات بھی لائے اور قصبوں اور شہروں میں رہنے والے حکمران اشرافیہ کا ظہور ہوا اور ایک ریاست ابھری جو شہری نوعیت کی تھی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں آنے والے تکنیکی آلات میں دائیں زاویہ والے ایرانی گیئر، چرخی، کاغذ سازی، قوسی چھتوں کی تعمیر، بٹومین اور چونے کے سیمنٹ کا استعمال، گھوڑے کی نعلیں وغیرہ شامل تھے۔ اس سے نئے پیشوں کی تخلیق ہوئی اور بہت سے لوگوں نے ان ہنروں کو سیکھا جس کی بنا پر کاریگر گروہ کے لوگوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جسے عرفان حبیب نے تیسرا انقلاب قرار دیا۔ نئے حالات کے دباؤ کی بنا پر ابتدا میں بڑے پیمانے پر غلاموں کی تجارت شروع ہوئی اور غلام خدمت گزاروں کا ظہور ہوا جو شہری مزدوری کا ایک اہم حصہ تھے۔ غلاموں کو ذات پات سے محروم کر کے اسلام قبول کروالیا گیا جس کی بنا پر انہیں کسی بھی کام پر لگایا جا سکتا تھا اور وہ کوئی بھی ہنر سیکھ سکتے تھے۔ غلامی سے آزاد ہو کر، انہوں نے تارکین وطن کاریگروں کے ساتھ مل کر غالباً مسلم کاریگروں کا بڑا حصہ تشکیل دیا۔ علاوہ ازیں اب وہ ان پیشوں کو بھی اختیار کر رہے تھے جن کی پہلے اجازت نہیں تھی۔ ذات پات کے قوانین بلاشبہ ان برادریوں کو متاثر کرتے رہے۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ، انیسویں صدی کے ریکارڈوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنکر، قصاب، حجام اور دیگر افراد میں اپنی ذات میں شادی کا شدید رجحان تھا۔ غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کو 'کمین' سمجھا جاتا تھا، جو اچھوت تو نہیں تھے لیکن پھر بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ تاہم، مسلمانوں میں، ذات پات کا ڈھانچہ کمزور رہا کیونکہ سماجی نقل و حرکت اور اپنی ذات میں شادی سے انحراف ہوتا رہا۔

اگرچہ ایک بڑی آزاد آبادی نے ذاتوں کے موجودہ ڈھانچے میں خلل ڈالے بغیر نئے پیشوں کے لیے اضافی مزدور فراہم کر کے ذات پات کے نظام کو تقویت بخشی، عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ذات پات کے نظام کی مکمل برقراری جیسا کہ میکس ویبر نے فرض کیا ہے، مشکوک ہے۔ انہوں نے مورس ڈی مورس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اصل میں ذات پات کا نظام اس سے بالکل مختلف تھا کہ اسے قانون کی کتابوں یا نظریے کے مطابق چلایا جائے۔ ایک طبقہ کو ایک خاص کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے ذاتوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر، 18 ویں صدی میں مہاراشٹر میں، درزیوں کا ایک حصہ رنگنے اور دوسرے نے نیل رنگنے کا کام لیا۔ عرفان حبیب نے سندھ کے جاٹوں کی جانب توجہ مبذول کروائی جو 7 ویں صدی میں چنڈال برادری تھے اور 11 ویں صدی میں شودر ہو گئے اور ثقافت کاری کے عمل کے ساتھ ساتھ 17 ویں صدی کسان (ویشیہ حیثیت والے) بن گئے۔ تاہم، ایسے شعبے بھی تھے جہاں ثقافت کاری (Sanskritisation) کے عمل کا وجود ہی نہیں رہا یا بہت سست تھا، اس نے ذات پات کے نظام پر تنقید کرنے والی وحدانی تحریکوں کو جنم دیا۔

توحید پرست تحریکوں کے زیادہ تر سنتوں کا تعلق پیشہ ورانہ یا غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں سے تھا۔ کبیر ایک بُنکر تھے۔ نام دیو سوتی کپڑے پر چھپائی کرتے تھے؛ رائے داس، ایک خاکروب تھے؛ دادو، کپاس دھنتے تھے۔ ان توحید پرست سنت تحریکوں کو نئے ابھرتے ہوئے کاریگر اور پیشہ ور گروہ کی حمایت حاصل ہوئی جن کے معاشی حالات بہتر ہو رہے تھے لیکن درجہ بندی یا مراتب کے ڈھانچے میں ان

سماجی شناخت وہی رہی تھی۔ سولہویں ستر ہویں صدی میں ان تحریکوں میں سے کچھ نے مذہبی برادری کی شکل اختیار کی۔ سولہویں اور ستر ہویں صدی کی زیادہ تر تحریکوں نے ذات پات کے نظام کو توڑے بغیر اس کے اندر ضروری انتظامات کیے۔ چنانچہ ذات پات کا نظام عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں استحصال کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جس سے فائدہ اٹھانے والے، بنیادی طور پر، حکمران طبقہ اور زمیندار تھے، جس کے بعد بڑے تاجر اور سوداگر تھے۔ ذات کے غلبے اور فوجی طاقت کے درمیان ایک واضح تعلق تھا۔

13.6 درباری معاشرہ اور ثقافت (Court Society, and Culture)

1980 کی دہائی سے سے قبل، تاریخ نویسی میں سیاسی اور معاشی معاملات غالب تھے۔ تاہم، 1980 اور 1990 کی دہائیوں تک، نئے ماخذ، نئی تفتیش اور تحقیق کے ذریعے تلاش کیے گئے، نئے ذرائع کا پتہ لگایا گیا۔ ماضی کی سماجی اور ثقافتی تاریخ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً جذبات کی تاریخ (History of Emotions)، کھانے پینے، لباس اور عادات کی تاریخ وغیرہ۔ حال ہی میں مانسون کی تاریخ پر بھی کام کیا گیا۔ 'درباری معاشرے' کے بارے میں نوبرٹ ایلیا (Norbert Elias) کا تصور کسی بھی دربار کے مطالعہ میں ایک دلچسپ نقطہ نظر فراہم کرتا ہے اور اس کا یہ تصور کہ ثقافتی عظمت (cultural grandeur) کسی بھی ریاست کے وجود کا قانونی جواز ہوتی ہے، بصیرت انگیز ہے۔ دربار ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہر سرگرمی، چاہے وہ غیر معمولی ہو یا روزمرہ کی ہو، باہر کے لوگوں کے لیے تماشہ گاہ کی طرح اثر رکھتا ہے۔ یہ اس کے قانونی جواز کا ذریعہ بھی تھا۔ تماشہ گاہ کی طرح مغل دربار، سماجی نظام کا ایک نظریہ رکھتا تھا جس میں اسے مثالی کردار ادا کرنا ہوتا تھا۔ آداب واخلاق کے لحاظ سے، ہندوستان اور ایران میں اس ادب کو کافی فروغ ملا ہوگا جو کہ زیادہ تر 'اخلاق ناصری' سے متاثر تھا جسے نصیرالدین طوسی نے 13 ویں صدی میں لکھا تھا۔ یہ اکبر کے سامنے پڑھی جانے والی کتابوں میں سے تھی اور جہانگیر کے دور اور اس کے بعد بھی ہمیں بہت سی تصنیفات ملتی ہیں جن کا موضوع طوسی کی تحریروں میں کی طرز پر تھا۔ اخلاقی ادب، دربار کے اندر اور باہر درباری آداب سے متعلق ہے۔

ہربنس مکھیا کے مطابق، اخلاق درباری لوگوں کی عام لوگوں پر فوقیت پر زور دینے کے لیے نہیں تھے بلکہ اس کا مقصد اشرافیہ گروہ کے افراد کو ایک طرز میں ڈھالنا تھا، دربار میں اشرافیہ کے درمیان ایک درجہ بندی پیدا کرنا تھا۔ اس میں شاہی طبقے کے سماجی آداب واخلاق کی بات کی گئی ہے۔ لیکن دیگر لوگوں کے لیے، مراعات کے درجات کے درمیان امتیاز ایک بڑا قابل توجہ معاملہ تھا، جو مراتب یا درجوں کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً جہاں بادشاہ مرکز و محور ہو، اس سے فاصلہ بھی درباریوں کے سماجی درجہ/رتبہ کی عکاسی کرتا تھا۔ مکھیا نے اپنی تصنیف دی مغل آف انڈیا (*The Mughals of India*) میں مغلوں کے درباری آداب کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مغل ہندوستان میں دولت کے بجائے سماجی حیثیت پر زور دیا جاتا تھا۔ ایسے سماجی ماحول میں، درباری آداب نے درجہ بندی کو تقویت دی۔ مغل امراء دولت سے زیادہ اقتدار کو ترجیح دیتے تھے۔ جہانگیر کے امیر محمد باقر کے مطابق دولت کا دروازہ اپنے حصول میں بے شمار مصائب لائے بغیر کبھی نہیں کھلتا۔ بے تعلقی کا یہ رویہ عہد وسطیٰ کو جدید دور سے الگ کرتا ہے۔ امرا، درجہ اور آداب کا زیادہ

خیال رکھتے تھے۔ مغل دربار کے آداب کے پیچھے ایک لمبا سلسلہ ملتا ہے، تاہم ایسا لگتا ہے کہ یہ ایرانی نمونہ سے کافی متاثر تھے۔ بہت سی مغل درباری رسومات اور طرز عمل خاص طور پر شاہی عظمت اور شان و شوکت کا تصور ساسانیوں کے درباری طریقوں سے متاثر ہیں۔ درباری تقاریب جیسے شہنشاہ کے یا اس کے تخت کے سامنے ماتھا ٹیکنا، اس کے ہاتھوں یا پاؤں کو چومنا، کمر سے نیچے جھک کر سلام کرنے کے طریقے، تہواروں یا شاہی سالگرہ جیسے خاص مواقع پر تحائف، خطابات اور عہدوں کی تقسیم کے رواج کی بنیادیں ساسانی طریقوں میں ملتی ہیں۔

دربار کے اندر آداب کی پابندی کے کئی درجے تھے جن سے انحراف سخت سزا کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ شاہی خاندان کے اندر بھی یہی معاملہ تھا جہاں عمر، رشتہ اور جنس اہم عوامل تھے۔ خاندان کے اندر، ماؤں اور پھوپھیوں کو سب سے زیادہ تعظیم دی جاتی، بابر بالعموم اپنی پھوپھیوں اور اپنے خاندان کی دیگر بزرگ خواتین سے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر ملتا جو کہ حیثیت میں برابری کا علامتی اشارہ تھا۔ 1519 میں جب بابر اپنی بڑی بہن سے ملنے گیا تو اس نے احترام اور تعظیم میں اپنے گھٹنے ٹیک دیے اور بہن نے بھی گھٹنے ٹیکے۔ بابر لکھتا ہے کہ اس نے بعد میں یہی طریقہ اپنائے رکھا۔ اکبر اپنی والدہ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا اور اس کی وہی تعظیم کرتا جو بحیثیت شہنشاہ اسے دربار میں ملتی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ ایک بار وہ اپنی والدہ سے ملنے گیا تو اس نے احتراماً سجدہ کیا اور کورنش بجالایا اور بعد میں واپسی کی اجازت حاصل کی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ چنگیزی رواج اور تیموری اصولوں کے مطابق چھوٹے سے لے کر بوڑھے تک سب کا احترام کیا جاتا تھا۔

تاہم برابری کے لوگوں میں عمر کے فرق کی بنا پر آداب کے تقاضوں کی شدت میں کمی آئی۔ بابر لکھتا ہے کہ جب وہ اپنے ماموں سلطان محمود خان سے ملنے فرغانہ گیا تو اس نے خان کے سامنے تین بار گھٹنے ٹیکے اور خان اس سے ملنے کے لیے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب بدخشاں کا حکمران مرزا سلیمان اور مغل خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے تو اکبر ان کے استقبال کے لیے نکلا، جب وہ دو بدو ہوئے تو مرزا گھوڑے سے اترا اور سلام کرنے کے لیے آگے آیا۔ اکبر نے اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے اس رسمی کام سے مستثنیٰ قرار دیا اور اس کے بجائے اسے گلے لگالیا۔ تاہم، عمر اور حیثیت سے کم تر مرد رشتہ دار کے لیے کوئی عام رعایت نہیں دی گئی تھی۔ اعتماد الدولہ، آصف خان، شائستہ خان کو آداب کے اصولوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ نیز عہد وسطیٰ کے سماج میں عوامی اور نجی حلقوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ افراد کو دونوں جگہوں پر رسومات ادا کرنی پڑتی تھی۔

اکبر نے اپنے دربار میں درباریوں کے لیے واضح حد بندی بنا رکھی تھی۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ جب وہ تخت پر بیٹھا تو باقی سب نے کورنش بجالایا اور اپنے اپنے رتبہ کے مطابق ہاتھ باندھے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ شہزادے اپنی پیدائش کی ترتیب کے لحاظ سے تخت 4-1 اور 6-1/2 گز کی دوری پر ہوتے تھے، پھر ان کے بعد دین الٰہی (15-3 گز) کا نمبر آتا۔ ان کے بعد بزرگ درباری ہوتے اور پھر امراء تخت سے 12-10 گز کی دوری پر ٹھہرتے۔ مغل دور میں دربار کو ایک مقدس مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حرمت شہنشاہ کی موجودگی سے ہوتی۔ لہٰذا دربار میں داخل ہونے پر جوتے مرکزی دروازے پر چھوڑنے پڑتے تھے، جیسے کہ وہ مسجد یا مندر یا مقبرے کے باہر چھوڑے جاتے تھے۔ کسی کو یہاں تک کہ شہزادوں کو بھی شہنشاہ کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی الّا یہ کہ ایسا کرنے کی ہدایت دی جائے۔ ایک بار شہزادہ اعظم

نے بے خیالی میں تخت کو اپنے پاؤں سے چھوا، جس پر اورنگزیب اتنا ناراض ہوا کہ اس نے دربار کو دن بھر کے لیے برخاست کر دیا۔ دربار کا تقدس خاموش رہ کر بھی برقرار رکھا گیا۔ شہنشاہ کی موجودگی میں کسی کو بھی بولنے کی اجازت نہیں تھی جب تک کہ ایسا کرنے کو نہ کہا جائے۔ دربار میں شراب پینے پر سخت پابندی تھی اور اس کی خلاف ورزی پر سخت سزا دی جاتی۔ شہنشاہ کی موجودگی میں حقیقت میں بولنے کا شرف بہت کم لوگوں کو دیا گیا تھا اور اسی وجہ سے اسے اعلیٰ حیثیت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ درباریوں کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر شہنشاہ کسی درباری سے خوش ہوتا تو اس کی طرف ابرو اٹھا کر دیکھتا۔

سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) اور منوچی (Manucci) نے درباری ترتیب اور اس کے آداب کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ دربار کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہوتا تھا۔ تخت کے قریب ترین سطح کی حد بندی سونے سے، اس سے تھوڑا نیچے کی چاندی سے، اور اس سے نیچے تیسری سطح پر لکڑی کی باڑ ہوتی۔ پہلا حصہ شاہی شہزادوں کے لیے تھا، دوسرا عالی مرتبت شخصیات کے لیے اور تیسرا نچلے درجے کے امراء اور افسروں کے لیے مخصوص تھا۔ کوئی بھی اپنی تفویض کردہ جگہ سے ہٹ نہیں سکتا تھا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک دفتر قائم کیا گیا تھا۔ شہنشاہ اپنے خصوصی اختیارات جیسے شیروں اور ببروں کے شکار، خاص قسم کی چھتری کے استعمال، مخصوص رنگوں بالخصوص سرخ رنگ کے استعمال، تخت اور اس سے مشابہ چیزوں پر بیٹھتے وقت باجا بجانے، جھروکہ میں بیٹھنے، مینا بازار کا دورہ کرنے، سکے جاری کرنے، خطبہ پڑھنے، موت کی سزا سنانے وغیرہ کی انتہائی غیرت حمیت کے ساتھ حفاظت کرتا تھا۔

دربار میں حاضری دینے والے شرفا و نوابوں کو بادشاہ کی کے تئیں تابعداری کو ظاہر کرنے کے لیے کورنش، یا تسلیم بجالانی پڑتی یا پائے بوس یا زمین بوس ہونا پڑتا یا پھر سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ کورنش کا مطلب ہے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھنا اور سر کو نیچے کی طرف موڑنا۔ تسلیم بجالانے کا مطلب ہے دائیں ہاتھ ہتھیلی کو زمین پر رکھنا اور پھر اسے آہستہ سے اٹھانا۔ جب وہ شخص کھڑا ہوتا تو، وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے سر کی پیشانی پر رکھتا۔ پائے بوسی کو بلبن نے متعارف کرایا تھا اور مغلوں نے اپنایا تھا۔ دربار میں ہر کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اس کے لیے حکمران سے قربت کی ضرورت ہوتی تھی جو اسے ایک نادر استحقاق دیتی۔ اکبر نے زمیں بوس متعارف کرایا۔ اکبر نے اسے زمین بوسی کہا۔ دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملنا ایک خاص اعزاز تھا۔ بابر کے امراء میں سے صرف دو کو اس کی موجودگی میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو اس قالین پر بیٹھنے نہیں دیا تھا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ عدالت میں پیشی کے لیے ڈریس کوڈ بھی سخت تھا۔ کچھ رنگ جیسے سرخ مخملی یا پیلے رنگ بادشاہ کے استعمال کے لیے مخصوص تھے۔ سر پر پگڑی باندھنے اور پاؤں ننگے رکھنے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ داڑھی اور پاجامے کی لمبائی بھی متعین تھے۔

اپنی حیثیت کے فرق کی علامت کے طور پر تحائف دینا بھی آہستہ آہستہ مغل دربار میں آداب کا حصہ بن گیا۔ نہ دہلی کی سلطنت میں اور نہ ہی بابر اور ہمایوں کے دور میں حکمران کو تحفے دینا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ رواج بنایا تھا کہ جو کوئی درخواست لے کر دربار میں آئے تو اس کے ساتھ مناسب تحفہ منسلک کرے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر نے عام حکم جاری کیا کہ جب بادشاہ کسی امیر کی رہائش گاہ کا دورہ کرے تو اعلیٰ

سے ادنی تک ہر شخص اسے تحائف پیش کرے۔ مارچ میں نوروز کے تہوار کے دوران، امرا کے لیے یہ رواج بن گیا کہ وہ اسے اپنے گھروں میں مدعو کرتے اور اسے بہترین تحائف پیش کرتے۔ اکبر جو کچھ بھی پسند کرتا اسے قبول کر لیتا اور باقی میزبان کو واپس کر دیتا، اس کے جانشینوں نے اس عمل کو جاری رکھا۔ جہانگیر نے بالعموم اسے دیا گیا تحفہ واپس کر دیا لیکن اپنے قریبی امراء سے کچھ چیزیں رکھ بھی لیتا تھا۔ مغل خاندان کے اندر عمر کے لحاظ سے ارکان کو تحائف دیے جاتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے دیے جانے والے تمام تحائف خلعت یا اعزاز کا لباس تھے جو وہ شہزادوں اور اہلکاروں کو دیا کرتا تھا۔ خلعت یا سر و پا بادشاہوں کے افراد سے وابستہ شان و شوکت، وقار اور اختیار کی توسیع کی علامت تھی۔ خلعت کو پہلے شہنشاہ نے اپنی ہتھیلی سے چھوتا یا پھر وصول کنندہ کو دینے سے قبل اس خلعت کو بادشاہ کے کندھے سے ہلکے سے رگڑا جاتا۔ بادشاہ کی الماری سے کسی شخص کو دیئے جانے والے لباس کو سلطنت کے لیے ایک غیر معمولی خدمت کے اعتراف کا ایک غیر معمولی عمل سمجھا جاتا تھا۔ مغل دربار کے آداب کی صوبوں میں گورنر نقل کرتے تھے جو اکثر شہزادے اور اعلیٰ سطح کے امراء ہوتے تھے۔

18 ویں صدی میں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ آداب کو نافذ کرنے والے اصول و ضوابط درباری شاعروں اور مورخین کے درمیان نوحہ خوانی کا موضوع بن گئے۔ درحقیقت اس دور میں اردو ادب کی ایک پوری صنف پروان چڑھی جسے شہر آشوب کہا جاتا ہے۔ یہ 18 ویں اور 19 ویں صدی میں مغلوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان اختلافی مسئلہ بن گیا۔ برطانوی گورنر جنرل لارڈ منٹو، لارڈ ہیسٹنگز نے آداب کے اصولوں کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ مغل چاہتے تھے کہ وہ اس کی پیروی کریں جس میں دربار میں بادشاہ کو نذرانہ (تحائف) دینا بھی شامل ہے جو بادشاہ کی اعلیٰ حیثیت اور انگریزوں کے ماتحت ہونے کی علامت ہوتی۔ 1826 میں جب لارڈ ایمہرسٹ نے دہلی کا دورہ کیا تو وہ بیٹھے رہے اور کوئی تحفہ نہیں لائے۔ 1851 میں، آخری مغل بہادر شاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ 'نذر' کے مساوی ایک ماہانہ رقم پر اکتفا کریں۔ دربار، سماج کا چھوٹا نمونہ (microcosm) ہونے اور عدالت عالیہ ہونے کی وجہ سے خود کو منضبط کر کے سماجی تنظیم کی عکاسی کرتا تھا اور سماج کو نچلے درجے تک منظم کرتا تھا۔

13.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں 16 ویں صدی سے 18 ویں صدی کے درمیان سماجی زندگی کے مختلف پہلو، سماج کے مختلف طبقے، ذات پات اور دیگر درجہ بندی کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس دور کے سماج کو درپیش مختلف مسائل، حکمراں طبقے اور درباری زندگی کے متعدد پہلوؤں کو جاننے کا موقع فراہم ہوا۔

13.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

خود کاشت	:	وہ جو اپنی زمین خود کاشت کرتا ہے۔
پاہی کاشت	:	وہ جو دوسروں کی زمین کاشت کرتا ہے۔
دادنی	:	اشیائے صرف کے حصول اور آگے بڑھانے کا نظام

13.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 'خود کاشت' کسانوں سے کیا مراد ہے؟

(الف) جو دوسروں کی زمین پر کام کرتے تھے (ب) جو اپنے گاؤں میں اپنی زمین کے خود مالک تھے

(ج) جن کے پاس زمین نہیں تھی (د) جو صرف نقدی فصل اگاتے تھے

2. 'ہوموہائرارکس' (Homo Hierarchicus) نامی کتاب کس نے لکھی ہے جو ذات پات کے نظام پر ہے؟

(الف) عرفان حبیب (ب) لوئی ڈومونٹ (ج) ڈی ڈی کوشامبی (د) برنیئر

3. مغل شہزادی جس نے 'مخفی' کے تخلص سے شاعری کی؟

(الف) جہاں آرا (ب) روشن آرا (ج) زیب النساء (د) گلبدن بیگم

4. اکبر کے دربار میں زمین کو چھوم کر سلام کرنے کے طریقے کو کیا کہا جاتا تھا؟

(الف) پائے بوسی (ب) زمین بوس (ج) تسلیم (د) کورنش

5. وہ کسان جو اپنے گاؤں کے بجائے دوسرے گاؤں جا کر کھیتی کرتے تھے؟

(الف) پاہی کاشت (ب) خود کاشت (ج) موروثی (د) تھانی

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خود کاشت اور پاہی کاشت میں کیا فرق تھا؟
2. دربار اور سیاست میں مغل خواتین کے کردار پر بحث کیجیے۔
3. مغلوں کے درباری کلچر پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. زمینداروں کی مختلف اقسام پر بحث کریں۔ ان کے حقوق و فرائض کیا تھے؟
2. کیا درباری ثقافت مغل سلطنت کی درجہ بندی کی عکاسی کرتی ہے

جوابات: 1-(ب), 2-(ب), 3-(ج), 4-(ب), 5-(الف)

اکائی 14۔ فن تعمیر اور مصوری

(Architecture and Painting)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 مغل فن تعمیر

14.2.1 بابر

14.2.2 ہمایوں

14.2.3 شیر شاہ سوری

14.2.4 اکبر

14.2.5 جہانگیر

14.2.6 شاہ جہاں

14.2.7 اورنگ زیب

14.3 مغل مصوری

14.4 زبان و ادب

14.5 اکتسابی نتائج

14.6 کلیدی الفاظ

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.0 تمہید (Introduction)

کہا جاتا ہے کہ مغل ریاست اپنے جواز اور استحکام کے حصول کے لیے اپنے سیاسی اور سماجی و اقتصادی عمل کے باوجود بنیادی طور پر ایک ثقافتی ریاست تھی۔ اس کی ثقافتی عظمت اور شان و شوکت اپنے آپ میں جواز کا ذریعہ تھی۔ مغلیہ سلطنت کا انجذابی کردار اور اس کا جذب و قبولیت اور موافقت کا عمل ایک ایسی ثقافت کی تعمیر میں قابل ذکر تھا جس نے اس اجنبیت کو کم کیا، اسے غیر معمولی استحکام بخشا اور قانونی جواز فراہم کیا۔ یہ مرکزی ایشیا اور ایران سے لائی گئی اور مروجہ تکنیکوں اور طرز تعمیر کے امتزاج پر منتج ہوا۔ مختلف تصنیفات کے ترجمے اور مقامی زبانوں کی ترقی کی بنا پر ادبی میدان نے بھی علمی فروغ کے ساتھ زرخیز تخلیقی فکری سرگرمی کی فضا کا بھی مشاہدہ کیا۔ مغل سلطنت کے باہر، مقامی سلطنتوں کے زیر انتظام علاقوں میں ادبی میدان میں اسی طرح کی ترقی دیکھنے میں آئی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغل فن تعمیر میں استعمال ہونے والی نئی ساختی شکلوں اور تکنیک کو سمجھ سکیں گے۔
- مغل آرٹ کے مخلوط یا ہم آہنگ عناصر کو جان سکیں گے۔
- 16ویں صدی سے 18ویں صدی کے درمیان درباری اور مقامی زبانوں میں ادبی تنوع اور بڑے سرمایہ پر توجہ مرکوز کر سکیں گے۔

14.2 مغل فن تعمیر (Mughal Architecture)

مغل ریاست فن تعمیر، مصوری، موسیقی، زبان اور ادب سمیت جمالیات کی اہم سرپرست تھی۔ آرٹ کے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ مغلوں کی حکومت ہندوستانی فن تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ تھا۔ اس کی وجوہات بھی ہیں۔ مغل بادشاہوں کو حاصل وسائل نے انہیں تعمیراتی منصوبوں پر بہت زیادہ سرمایہ کاری کرنے کے قابل بنایا۔ مغل دور میں خصوصاً اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا جس نے ایسے ماحول کو فروغ دیا جس میں فن تعمیر کی ترقی ممکن ہوئی۔ سب سے اہم وجہ مغل بادشاہوں کا گہرا جمالیاتی ذوق تھا۔ یہ تمام آرٹ اور فن تعمیر کے عظیم سرپرست تھے۔ درحقیقت دنیا کی تاریخ میں کسی بھی خاندان نے چھ ایسے عظیم شہنشاہ پیدا نہیں کیے جنہیں آرٹ کا گہرا ذوق ہو۔ انہوں نے اپنے جدامجد تیمور کی وضع کردہ روایت کو جاری رکھا۔

14.2.1 بابر (Babur)

درحقیقت مغل فن تعمیر کا فروغ اکبر کے دور میں ہوا اور شاہ جہاں کے دور میں یہ پختہ ہو کر اپنے عروج کو پہنچا۔ مغلیہ سلطنت کے ابتدائی حکمرانوں کو سیاسی غیر یقینی صورتحال اور سلطنت کو لاحق خطرات کی وجہ سے اس پہلو پر توجہ دینے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔ اس معاملے میں جہاں تک فن تعمیر کا تعلق ہے بابر اور ہمایوں دونوں زیادہ کردار ادا نہیں کر سکے۔ بابر نامہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے کارکنان

کی تعمیر میں کافی دلچسپی لی۔ بابر نامہ میں وہ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی اور آگرہ میں 1491 سنگتراشوں کو ملازمت دی۔
بنیادی طور پر ہندوستان میں دو طرح کی تعمیرات کا آغاز ہوا۔ بابر کو باغات کا شوق تھا اور اسے آگرہ میں بہت سے باغات لگانے میں دلچسپی تھی جیسا کہ وہ لوگ سرد مقامات کے رہنے والے تھے۔ اس طرح چار باغ کا تصور سامنے آیا۔ آگرہ کے قریب دھول پور میں واقع کنول کا باغ اب جزوی طور پر باقی ہے جو بابر کی سرپرستی کی عکاسی کرتا ہے۔ آگرہ جیسے شہروں میں، باغات اور ان کے محل وقوع کا نام وسطی ایشیا کے مقامات کے نام پر رکھا گیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کا مقصد ہندوستان میں اپنے آبائی مقام جیسا گھر بنانا تھا۔ بابر کا نام تین مساجد کی تعمیر سے بھی وابستہ ہے، ان میں سے ایک 8-1527 میں پانی پت میں واقع کابلی باغ، دوسری بابری مسجد اور تیسری سنبھل میں واقع مسجد تھی۔

14.2.2 ہمایوں (Humayun)

بابر کا جانشین ہمایوں کا ابتدائی سیاسی سفر مشکلوں میں گزرا۔ اس کے اقتدار سنبھالنے کے ایک دہائی کے اندر، اسے تخت سے ہٹا دیا گیا، 1540 میں ہندوستان سے نکال دیا گیا اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنے مختصر اور ابتدائی دور حکومت میں، اس نے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب رہائشی محل تعمیر کیا جسے دین پناہ (جو آج پرانا قلعہ کے نام سے جانا جاتا ہے) کہا جاتا ہے لیکن عمارت جلد بازی میں تعمیر ہونے کی وجہ سے برقرار نہیں رہ سکی۔ اس کے ایک حصے کا نام شاہ منڈل رکھا گیا جسے لائبریری کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمایوں کی موت اسی لائبریری کی سیڑھیوں سے گرنے سے ہوئی۔

14.2.3 شیر شاہ سوری (Sher Shah Suri)

ہمایوں کی ہندوستان سے بے دخلی کے بعد، سوری خاندان نے 1556-1540 تک ہندوستان پر حکومت کی۔ سوری خاندان کا بانی شیر شاہ سوری تھا، جو اپنی شاندار اور وسیع تعمیراتی سرپرستی کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس نے بالکل ایسی ہی عمارات تعمیر کروائیں جو شاہی سرپرستی کی آئینہ دار ہیں جیسے سڑکیں، مساجد، قلعے۔ شیر شاہ نے ہریانہ کے نارنول میں اپنے طویل عرصہ قبل فوت ہونے والے دادا اور ساسارام میں اپنے والد کے لیے مقبرے بنوائے۔ پہلا مربعی اور دوسرا ہشت پہلو تھا۔ اس نے اپنے لیے، اس نے ساسارام میں ایک بڑا ہشت پہلو مقبرہ بنایا۔

14.2.4 اکبر (Akbar)

اکبر کے دور حکومت میں مغل فن تعمیر اپنے انتہائی متحرک مرحلے کو پہنچا۔ یہ سلطنت کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ اپنی حکمرانی کے دوران، اس نے ایک مخلوط طرز تعمیر کی حوصلہ افزائی کی، جس میں غیر ملکی اور مقامی دونوں عناصر شامل تھے۔ اکبر کی تعمیرات اپنی مضبوطی اور پائیداری کے لیے مشہور تھیں کیونکہ یہ سرخ ریت کے پتھر کے سلیب سے بنی تھیں اور اکبر کے کردار کی مضبوطی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اکبر نے ہندوستانی فن تعمیر کے آرائشی مقصد کا آزادانہ اور بڑے پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ لہٰذا، اس کی تعمیرات بھی اس کی مذہبی رواداری کی پالیسی اور ہر قسم کے لوگوں کے لیے اس کے آزاد خیال رویے کی عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر کی رہنمائی میں فروغ پانے والی یکساں جمالیات، تیموری اور ہندی نمونوں کے امتزاج پر مشتمل تھی۔ اکبر کا طرز تعمیر، فن تعمیر کا ایک فعال نمونہ تھا جو اس دیرینہ اسلامی تصور پر مبنی تھا کہ فن تعمیر کسی بھی خاندانی

حکمرانوں کے اقتدار کا براہ راست بصری عکاس ہوتا ہے۔

اس کا پہلا تعمیراتی منصوبہ، ہمایوں کا مقبرہ تھا جس کی تعمیر 1556 میں ہمایوں کی موت کے فوراً بعد شروع ہوئی اور جو 1564 میں مکمل ہوا۔ یہ دہلی میں دین پناہ کے قریب اور چشتی صوفی نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے اس پار واقع ہے۔ اس طرح، سلطنت کے جواز کے دوہری مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اکبر آگرہ منتقل ہو چکا تھا، لیکن دہلی مسلم ہندوستان کا روایتی مرکز بن گیا تھا۔ اسے محمد میرک نے ڈیزائن کیا تھا جس کا تعلق تیموری طرز تعمیر کے معماروں کے خاندان سے تھا، ہمایوں کی اہلیہ حاجی بیگم نے اس میں اہم تعاون کیا اور ہمایوں کی بیوہ حمیدہ بانو بیگم نے اس کی تعمیر کی سرپرستی کی۔ اس کا منصوبہ اور اٹھان تیموری روایت میں ڈیزائن کی گئی تھی اور اس کا مقصد خاندانی حسب نسب کا بصری اظہار تھا سنگ مرمر سے مزین اس کا سرخ ریت کا پتھر ہندوستانی روایت سے تعلق رکھتا ہے۔ چار باغ کے بیچ میں واقع یہ مقبرہ زمین پر جنت کی تشکیل ہے۔ یہ مقبرہ ہشت (آٹھ) ضلعی ہے اور اس پر اونچے دوہرے گنبد بنے ہیں۔

اکبر کا ایک اور اہم تعمیراتی کارنامہ قلعوں (یا قلعہ بند محلات) کی تعمیر تھی جو اس نے موجودہ پاکستان میں اٹک سے الہ آباد تک اپنے بڑھتے ہوئے علاقوں کی حفاظت کے لیے بنائے تھے۔ ان سب میں سب سے اہم آگرہ کا قلعہ ہے جو 1565 میں لودی دور کے آگرہ کے مٹی کے قلعے کو سرخ ریت کے پتھر سے بدلنے کے لیے شروع ہوا تھا۔ آگرہ میں اکبر کے تعمیر کردہ تقریباً پانچ سو اندرونی عمارتوں (پویلین) میں سے چند ہی بچ پائی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جہانگیری محل ہے جو زنانہ گاہ کا حصہ ہے۔ ہمایوں کے مقبرے کی طرح اس کا بھی بیرونی حصہ سفید سنگ مرمر کے ساتھ سرخ ریت کے پتھروں سے بنا ہے۔ باب الداخلہ ہندوستانی اور وسطی ایشیائی دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر، کھلے صحن، گوالیار میں طویل عرصے قبل تعمیر کیے گئے محلوں کی یاد دلاتے ہیں جبکہ ستونوں پر مشتمل کچھ اندرونی حصے تیموری عمارتوں میں استعمال ہونے والے ستونوں کی قسم کے سنگی نمونے ہیں۔ دیگر صحنوں میں قوس دار موڑ نمایاں ہیں جو مغربی ہندوستان کی یاد لاتے ہیں اور آگرہ میں اکبر کے قلعہ بند محل، جہانگیر محل کی سجاوٹ میں ہندوستانی اور تیموری روایات کا امتزاج نظر آتا ہے جو کہ ابوالفضل کے نزدیک ہندوستان کا مرکز تھا۔ اکبر نے سیاست کے میدان میں جن وسطی ایشیائی اور ہندوستانی ثقافتوں کو ملایا اس کی عکاسی اس کے فن تعمیر، مصوری اور دیگر فنون میں ہوتی ہے۔ دیگر قلعوں میں لاہور کا قلعہ (70-1560)، الہ آباد کا قلعہ (1574)، اجمیر کا قلعہ (1570)، صوبہ سرحد میں اٹک کا قلعہ (1581) شامل ہیں۔

اکبر کا سب سے بڑا اور اہم تعمیراتی شاہکار وہ شہر اور محل ہے جسے اس نے اپنی دوسری راجدھانی فتح پور سیکری (آگرہ سے 26 میل دور) میں قائم کیا تھا۔ یہ آگرہ کے قریب واقع ہے۔ اکبر نے 1571 میں فتح پور سیکری کی تعمیر مشہور صوفی شیخ سلیم چشتی کے احترام میں کی، جنہوں نے اکبر کے بیٹے اور وارث کی پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی۔ فتح پور سیکری 1585 میں اس وقت تک اس کا سرکاری دارالحکومت رہا جب شمال مغرب میں شورش نے دربار کو لاہور منتقل کرنے پر مجبور کر دیا۔ فتح پور سیکری کے نو دروازے ہیں اور چوتھی جانب ایک مصنوعی جھیل ہے (الف) پانی فراہم کرنے کے لیے (ب) دفاع کے لیے۔ قلعے کی عمارتوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1. غیر مذہبی نوعیت کی عمارات (محلات، انتظامی اور متفرق قسم کی عمارت)۔
2. مذہبی نوعیت کی عمارات (مسجد، مقبرہ)

مرکزی محل میں فتح پور سیکری کا ایک اہم مقام شیخ سلیم چشتی کے لیے تعمیر کردہ خانقاہ ہے۔ جنوب کی جانب سے داخل ہونے پر ایک بہت بڑی کمان آتی ہے جسے بلند دروازہ کہتے ہیں (یہ دروازہ گجرات میں اکبر کی فتح کے موقع پر بنایا گیا تھا)۔ اس کی اونچائی چون 54 میٹر ہے اور اونچائی کے معاملے میں اس نے ازبکستان میں موجود تیمور کے اپنے محل کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اکبر کی ہندوستان میں یہ مسجد سب سے بڑی تھی جس کا بیرونی اور اندرونی حصہ تیموری اور ہندوستانی عناصر کا مجموعہ ہے۔ تاہم، صحن کا اصل مرکز شیخ سلیم چشتی (وفات 1572) کا سنگ مرمر کا مقبرہ ہے جو 81-1580 میں مکمل ہوا۔ کیتھرین ایشر (Catherine B. Asher) کہتی ہیں کہ فتح پور سیکری میں محل کے احاطہ کے رہائشی اور انتظامی حصے کا مرکزی دروازہ ہتھیا پول (Hathiya Pol) یا ہاتھی کا جھولا ہے۔ کسی وقت محل کے اندر سرخ ریت کے پتھر پر مشتمل متعدد ستونوں پر مشتمل عمارات تھیں جن میں سے زیادہ تر ایک کے بعد ایک مڑی ہوئی تھیں۔ اس طرز کے ستون اور دیواروں کی نوعیت ہندوستانی ہے لیکن اس پر موجود نقاشی ہندوستانی اور تیموری شکل سے ماخوذ ہے۔ ہاتھی دروازے کے مشرق میں ایک بڑا مستطیلی صحن ہے۔ مغربی دیوار میں موجود اکبر کے تخت کے سامنے دیوان عام (عوامی سامعین کے ہال) ہے۔ اس طرح جب اکبر عوام کی جانب رخ کرتا تو عوام کی سمت قبلہ کی طرف ہوتی جو اس ارتقاپذیر سامراجی نظریہ کے عین مطابق ہے جس میں بادشاہ کو خدا کا نائب (نیم الٰہی) کہا جاتا ہے۔

ایک اور عمارت دیوان خاص/ نجی سامعین کا ہال ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جسکا، مرکزی ہال مربع نما ہے۔ کمرے کے درمیان میں سنگ مرمر کا ستون نمایاں طور پر خم دار ہے جو بالکونی سے متصل کمرے کی کل اونچائی کے نصف تک پھیلا ہوا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چبوترہ اکبر کا تخت تھا۔ دیگر عمارات میں محلات جیسے مریم الزمانی، ترکی سلطانہ وغیرہ کے محلات شامل ہیں۔ ایک علاحدہ عمارت پنچ محل ہے (یہ ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جس کے ستونوں کو گھنٹیوں سے سجایا گیا ہے، یہ ہر طرف سے کھلا ہوا ہے اور مربعی تالاب کے کنارے پر واقع ہے۔) فتح پور سیکری ہمایوں کے مقبرے یا یہاں تک کہ جہانگیری محل سے بھی زیادہ ہندوستانی طرز کا ہے۔ پرسی براؤن کا خیال ہے کہ کچھ محلات گجرات کے کاریگروں نے بنائے تھے۔ 1570 میں اکبر غالب وسطی ایشیائی اور ایرانی امرا کی طاقت کو کم کرنے اور اپنے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندو امرا کی طاقت کو بڑانے کے بارے میں فکر مند تھا۔ یہ سیاسی طور پر لیے گئے اقدامات فتح پور سیکری میں استعمال ہونے والے فن تعمیر اسیاسی سوچ کی عکاسی ہیں۔ اکبر کی شاہی سرپرستی میں فن تعمیر اس کے نظریاتی مفادات کی عکاسی کرتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے غیر مسلم پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کا سبب بنتا ہے۔ تاہم، 1580 کے بعد جس طرح سے وہ سخت گیر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، اسی طرح روایتی شاہی تعمراتی سوچ سے دوری اختیار کی۔ اکبر نے فن تعمیر کا ایک طرز کو فروغ دیا جس میں تیموری اور شمالی ہند کے طرز کو ایک خوشگوار توازن میں رکھا گیا تھا۔ اکبر کے فن تعمیر کی مختلف خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1. سجاوٹ کے لیے سفید سنگ مرمر کے ساتھ سرخ ریتیلے پتھر کا استعمال۔
2. لودی طرز پر دوہرے گنبد (Double Dome)۔

3. افقی ستونوں کی تعمیر کا وسیع استعمال

4. شاندار سجاوٹ۔

(a) جانوروں، پرندوں، پتوں، پھولوں کی کندہ کاری (b) جیومیٹرک اشکال (c) رنگین ٹائلیں (d) دیواری مصوری/مٹی کی پینٹنگ (e) سجاوٹ کے مقصد کے لیے سیاہ/سفید سنگ مرمر کا استعمال۔

14.2.5 جہانگیر (Jahangir)

جہانگیر کا دور سنگ مرمر اور پر پچی کاری یا سنگی نقاشی (Pietra dura style) کے استعمال کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس نے شہنشاہ بننے سے پہلے اور بعد میں بڑی تعداد میں عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کی تعمیر کردہ اہم عمارتوں میں آگرہ سے چھ کلومیٹر مغرب میں سکندرا میں واقع اکبر کا مقبرہ بھی تھا۔ اس کی تعمیر 1605 میں شروع ہوئی جس میں جہانگیر نے ذاتی دلچسپی لی۔ یہ ایک بہت ہی غیر روایتی بنا گنبد والی عمارت ہے، یہ پانچ منزلہ عمارت روایتی انداز سے کافی ہٹ کر ہے جس کی اوپری چھت چپٹی ہے۔ یہ پہلا مقبرہ ہے جس میں مینار تعمیر کیے گئے جو کہ مسجد کے ڈھانچہ کا ایک حصہ ہے۔ باغ کے بیچ میں واقع، ان پانچ منزلوں میں، ہر منزل نیچے کی منزل سے چھوٹی ہے جو بدھ مت وہار کا تاثر دیتی ہے۔ اس کی انفرادیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ نہ مکمل طور پر اسلامی ہے اور نہ ہی ہندو یا بدھ مت بلکہ سب کا ایک شاندار امتزاج ہے اور شاید اکبر کی مذہبی رواداری کے لیے موزوں ترین ہے۔ ایک اور تعمیر اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ آگرہ میں جمنا کے کنارے واقع اس مقبرے کو مغل فن تعمیر کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ یہ سرخ ریت کے پتھر سے سفید سنگ مرمر میں منتقلی کی ایک نشانی ہے۔ سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا، تدفین کا کمرہ متوازی الاضلاع کی شکل کا ہے۔ اٹلی سے شروع ہونے والی پر پچی کاری (سنگی نقاشی طرز) کا استعمال اس کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت ہے۔ ہندوستان میں، یہ انداز سب سے پہلے اس مخصوص مقبرے میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرز میں پرندوں اور پھولوں کے مشکل قسم کے ڈیزائن پتھروں کو کاٹ کر کندہ کیے گئے ہیں اور رنگوں کے بجائے ہیرے اور قیمتی پتھروں کو جڑ دیا گیا ہے۔ یہ بہت مہنگا انداز ہے جو صرف حکمران ہی برداشت کر سکتے تھے۔ اسے 1626 میں نور جہاں نے اپنے والد کے لیے بنوایا تھا۔

14.2.6 شاہجہاں (Shah Jahan)

شاہجہاں مغل دور کے فن تعمیر کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ شاہجہاں کے پاس فن تعمیر پر خرچ کرنے کے لیے کافی وسائل تھے۔ اس نے عمارتیں خالص سفید سنگ مرمر سے بنائیں۔ تعمیراتی مواد میں تبدیلی کے ساتھ فن تعمیر کے انداز میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ ان میں سے ایک تبدیلی یہ تھی کہ، شاہجہاں کی عمارتوں میں محراب کی شکل، بنیادی طور پر اس کے منحنی خطوط پر بنی ہوئی تھی۔ دوسرا، بصلی نما (bulbous) گنبدوں کا استعمال، اور تیسرا (پتے دار گول) foliated curves تعمیر کیے گئے تھے۔ 17 ویں صدی کے وسط میں باغات ہر ایک مغل بادشاہ کے لیے بنائے گئے عظیم شاہی مقبرے کا حصہ رہے ہیں۔ باغوں والے ان مقبروں میں سب سے مشہور آگرہ کا تاج محل ہے جسے روضہ منور یا روشن مقبرہ کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر 47-1632 کے درمیان ہوئی۔ یہ مقبرہ ممتاز محل کے لیے بنایا گیا تھا جو

1631 میں بچہ کی ولادت کے وقت فوت ہو گئی، در حقیقت اسے شہنشاہ کی اپنی قبر کے طور پر بنایا گیا تھا۔ کیتھرین ایشر کہتی ہیں کہ روضہ منور، مدینہ میں موجود پیغمبر حضرت محمدؐ کے روضہ مبارک سے ملتا جلتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ جہاں جو اپنے آپ کو حضرت محمدؐ جیسا کامل انسان سمجھتا تھا، ہمیشہ تاج محل کو خود کا مقبرہ بنانا چاہتا تھا۔ 1666 میں اس کی موت کے بعد اسے وہیں دفن کیا گیا۔ اس کے مقبرے کی ساخت سے متعلق کوئی تحریری مواد موجود نہیں ہے۔ تاریخی معلومات ہیں لیکن مورخین اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ تاج محل کس کی علامت ہے۔ ایک اسکالر کا ماننا ہے کہ یہ قیامت کے دن خدا کے تخت کی تصویری نمائندگی تھی جبکہ دوسرے اس تعبیر سے شدید اختلاف کرتے ہیں۔

یہ عمارت شاہ جہاں کے چیف انجینئر استاد عیسٰی اور احمد لاہوری نے بنوائی تھی جسے نادر العصر (اپنے زمانے کا منفرد معمار) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہمایوں کی قبر کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ عمارت کے لوازمات جیسے باب الداخلہ، اکبر کے مزار سے متاثر ہو کر اور باغ اور اعتماد الدولہ کے مقبرے کی طرز کا بنایا گیا۔ یہ ایک مستطیلی عمارت (1900 x 1000 فٹ) ہے جس کا گنبد بصلی نما، مینار تین منزلہ اور تدفین والا کمرہ ہشت پہلو ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت مختلف حصوں میں انضمام اور ہم آہنگی ہے جس نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ راجستھان میں مکرانہ سے اعلیٰ معیار کا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے جو رنگ بدلتا ہے: یہ دوپہر میں چمکدار سفید، غروب آفتاب کے وقت ہلکا پیلا اور رات کے وقت سبز نظر آتا ہے۔ جیسا کہ مغل شہنشاہوں نے تمام میدانوں میں متعدد مقامات پر تعمیرات کیے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کے درمیان کثرت سے نقل مکانی کرتے رہے۔ ان میں سے بہت سے قلعہ بند تھے اور ان کی تعمیر اکبر کے ذریعہ شروع کی گئی تھی اور بعد کے حکمرانوں نے ان کو دوبارہ بنوایا۔ ابتدائی طور پر شاہ جہاں کی اہم رہائش گاہ آگرہ کا قلعہ تھا، جسے سب سے پہلے اکبر نے تعمیر کیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی تجدید کی اور اس میں شاہی استعمال کے لیے متعدد سفید سنگ مرمر کی عمارتیں شامل کیں جن میں دیوانِ عام، دیوانِ خاص شامل ہیں۔ ان میں سے ایک موتی مسجد (سفید سنگ مرمر سے بنی) ہے جس میں ایک صحن اور ایک فوارہ ایک ہی مواد کے بنائے گئے ہیں، مسجد کے دونوں جانب سیڑھیاں ہیں جو شاہی خواتین کی رہائش گاہوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرف سے مسجد میں داخل ہوتے تھے اور ان کے لیے علاحدہ تعمیر شدہ حجرے میں نماز ادا کرتے تھے۔ بڑی بیٹی جہاں آرا کے اعزاز میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی تھی جو سرخ ریت کے پتھر کی ایک عمارت تھی جو تین گنبدوں سے گھری تھی۔

کیتھرین ایشر بتاتی ہیں کہ شاہ جہاں کو محسوس ہوا کہ آگرہ کی گلیاں شاہی جلوس کے لیے بہت تنگ ہیں۔ اس نے دہلی میں ایک نیا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا جو کہ شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کی روایتی جگہ تھی جسے اس نے شاہجہان آباد کا نام دیا۔ اس میں اس نے کئی عمارتیں تعمیر کیں جن میں محل کے قلعے کو لال قلعہ اور جامع مسجد کہا جاتا ہے۔ آج شاہجہان آباد قومی دارالحکومت کا علاقہ ہے جسے پرانی دہلی کے نام سے جانا جاتا ہے، جو ابتدائی مغل شہر دین پناہ کے شمال میں واقع ہے۔ شاہ جہاں کے فصیل والے شہر پر کام 1639 میں شروع ہوا اور 1648 میں اس کا افتتاح ہوا۔ 17 ویں صدی میں، دو بازاروں نے شہر کو زینت بخشی۔ ان میں سے ایک سب سے اہم شہر کے مغرب میں واقع تھا جسے چاندنی چوک کے نام سے جانا جاتا ہے جو درختوں سے گھرا ہوا ہے، اس کے مرکز میں سے ایک نہر گزرتی ہے جو غالباً اصفہان کی نہر سے متاثر لگتی ہے جو 40 سال پہلے صفوی ایران میں بنائی گئی تھی۔ شہر کی تزئین و آرائش میں سرکردہ خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ شاہ جہاں کی دو

بیویوں نے مساجد تعمیر کروائیں، جہاں آرا نے چاندنی چوک میں سرائے بنوائی۔ شہر بھر میں اشرافیہ کی کوٹھیاں اور چار باغ بنوائے گئے۔ فرانسیسی شہری فرانکوئس برنیئر نے اس کا موازنہ اس کی خوبصورتی، وسعت اور باشندوں کی تعداد کے لحاظ سے پیرس سے کیا ہے۔

شاہ جہاں نے شاہجہاں آباد میں لال قلعہ کے قریب ایک بہت بڑی جامع مسجد بنوائی جس کی تعمیر کا آغاز 1650 میں ہوا اور یہ 1656 میں مکمل ہوئی۔ یہ مغل علاقے کی سب سے بڑی مسجد تھی، جسے دنیا کی شکل کی والی مسجد (مسجدِ جہاں نما) کہا جاتا ہے، یہ شہر کے سب سے اونچے مقام پر واقع ہے اور اسے دور دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ شاہ جہاں نے دعویٰ کیا کہ اس نے اسے فتح پور سیکری کی اکبر جامع مسجد کے نمونے پر بنوایا تھا۔ دونوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں میں اونچی سیڑھیوں والے باب الداخلہ، داخلی دروازے، اندرونی صحن اور مسجد کا احاطہ شامل ہے۔ کیتھرین ایشر لکھتی ہیں کہ بڑی عظیم الشان مساجد دو حریفوں - عثمانیوں اور صفیوں نے پہلے اور اس وقت کے آس پاس تعمیر کی تھیں جن سے شہنشاہ بلاشبہ واقف تھا۔ جامع مسجد کو ان کے تعمیراتی اظہار اور بڑی اسلامی دنیا میں مغلوں کی عظمت کے اشارے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ جامع مسجد کی دیواروں پر منفرد انداز میں لکھے ہوئے کتبے ہیں جو کہ فارسی میں ہیں نہ کہ عربی میں۔ نیز ان کا مواد بھی مذہبی نہیں ہے۔ بلکہ ان میں شاہ جہاں اور اس کی منصفانہ حکمرانی کی تعریف کی گئی ہے۔

مسجد کا مقصد شہنشاہ کو سخت گیر اسلام کے حامی کے طور پر ظاہر کرنا تھا۔ شہر کی بڑی سڑک کی بنا پر وہاں اس کی خواہش کے مطابق پریڈ (Parade) کا انعقاد ممکن ہوا۔ محل تک صرف امرا کے لیے قابل رسائی تھی۔ مغلوں نے اپنے قلعوں کے مختلف حصوں کو باغیچے اور صحنوں میں تقسیم کیا تھا جنہیں 1857 کی بغاوت کے دوران منہدم کیا گیا۔ ستونوں والا دیوانِ عام دربار کی تقریب کا ایک اہم مقام تھا جہاں پرسیپولیس (Persepolis) کے عظیم دیوان عام کو ابھارنے کی کوششیں کی گئیں جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سلیمان نے رکھی تھی اور جو کہ انصاف کی حتمی علامت مانی جاتی ہے۔ اس ہال میں سنگ مرمر کی سجاوٹ کو مسلح چھت (جسے بنگلہ طرز کی بنا پر بنگلہ کے نام سے جانا جاتا ہے) کے اوپر بنے ہوئے اونچے چبوترے کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے، بصری طور پر یہ حکمران کو نیم الٰہی کے طور پر دکھاتے ہیں۔ پچھلی دیوار کی اندرونی جانب بنے پینل میں بھی آرفیئس (Orpheus) کو جنگلی جانوروں کو پکڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ آرفیئس انصاف کا ایک استعارہ ہے۔ دیوان عام کے علاوہ، اس کے قریب شاہی ایوان ہیں جن میں شاہ جہاں، جہاں آرا کے ایوان، دیوانِ خاص، وغیرہ شامل ہیں۔ شاہ جہاں کی جنت کی منظر کشی کے بارے میں دلچسپی محل کے اس حصے میں جھلکتی ہے۔ دیوان خاص میں، دیواروں پر امیر خسرو کے اشعار پینٹ کیے گئے ہیں، جو اس عمارت کو زمین پر جنت قرار دیتے ہیں۔ شاہ جہاں کے محل کو مغل حکمران کی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے فنی طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ شاہجہان آباد کا محل 17 ویں صدی کے وسط کے مغل دربار کی انتہائی مراتب (درجہ بندی) کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

14.2.7 اورنگ زیب (Aurangzeb)

فن تعمیر کی اصطلاح میں اورنگ زیب کے دور کو زوال کا دور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اب بھی اس کے دور میں تعمیر کی گئی

کچھ عمارتیں موجود ہیں۔ مہاراشٹر کے اورنگ آباد میں رابعہ دُرّانی کا مقبرہ جسے بی بی کا مقبرہ بھی کہا جاتا ہے، 1679 میں تاج محل کی طرز پر بنایا گیا لیکن جسامت میں یہ تقریباً نصف چھوٹا ہے۔ اسے تاج محل کی ایک عام نقل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے جنوبی ہندوستان میں مغلوں کی بہترین اور باوقار عمارت قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ اختراعات بھی ہیں جیسے لوہے کا باب الداخلہ وغیرہ۔ باقی تمام مقبروں میں مرکزی دروازہ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ دھاتی سلاخوں پر پھولوں کے ڈیزائن اس دور میں دھاتی کاریگری میں ہندوستان کی ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1674 میں لاہور کی جامع مسجد جسے جامع مسجد پر بادشاہی مسجد کے نمونہ کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن یہ زیادہ کشادہ اور سرخ ریت کے پتھر سے بنی ہے۔ بادشاہی مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ چار میناروں کی بجائے آٹھ مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ آرٹ کے جامد نہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ لال قلعہ کی مسجد کو موتی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ شاہ جہاں کی مسجد کے مقابلے میں یہ مسجد جسامت میں چھوٹی ہے لیکن مکمل طور پر سفید سنگ مرمر کے استعمال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فن تعمیر مکمل طور پر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس دور میں بنارس میں دو مسجدیں اور دیگر متھرا میں تعمیر کی گئیں۔ اورنگ زیب کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور معاشی ذرائع سکڑ گئے۔ آخری مغلوں کے پاس عمارتوں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے وسائل نہیں تھے چنانچہ بعد کے مغل بادشاہوں کے دور میں فن تعمیر زوال پذیر ہو گیا۔

14.3 فن مصوری (Painting)

مغل اپنے ساتھ ایرانی مصوری کا ایک مخصوص انداز لے کر آئے۔ ایرانی مصوری خود منگول آرٹ سے بہت متاثر تھی۔ ایرانی مصوری کا بہترین نمونہ یا عظیم فارسی مصور بہزاد تھا، جس نے آرٹ کی ان دو روایتوں کی ترکیب پیدا کی۔ ہندوستان میں مغلوں کی سرپرستی میں تیار ہونے والا مصوری کا مکتب فکر بہزاد کی روایت سے متاثر تھا۔ بابر کو اس فن کی طرف توجہ دینے کے لیے وقت نہیں مل سکا، کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنی سلطنت کے قیام و استحکام میں مصروف تھا۔ تاہم اس کی یادداشتیں ایرانی مصوری میں اس کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔

بہزاد کے کچھ کاموں پر تنقید کرتے ہوئے بابر کہتے ہے کہ اس کا کام خوبصورت تھا لیکن وہ بغیر داڑھی والے چہرے اچھی طرح نہیں بنا سکتا تھا۔ بابر کی اپنی شاہی لائبریری میں باتصویر مخطوطات موجود تھے۔ بابر کے ذخیرہ میں شاہنامہ اور ظفر نامہ کی بہزاد کی مصوری والی تصویری نقول موجود تھیں۔ تاہم، ہندوستان میں اس کے دربار میں مصوری یا مصوروں کی ترقی میں کوئی تعاون نظر نہیں آتا حالانکہ اس کے بیٹے مرزا کامران نے ممکنہ طور اپنے مصور رکھے تھے۔ جب ہمایوں نے کامران سے مقابلہ کیا تو اسے کامران کا مصوری ورکشاپ بھی وراثت میں ملا جس میں بہت زیادہ ایرانی مصوری تیار ہوتی تھی۔ ہمایوں نے دراصل ہندوستان میں مصوری کے نئے انداز کو متعارف کرایا۔ شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد اس نے ایران میں پناہ لی۔ جب وہ ایران پہنچا تو بہزاد مر چکا تھا لیکن اس کی جگہ اس کے شاگرد میر مصور بدخشی نے لے لی جس کی حقیقت سے قریب مصوری نے ہمایوں کو بہت متاثر کیا۔ وہ منصور کے بیٹے میر سید علی تبریزی اور عبدالصمد شیرازی سے بھی متاثر ہوا اور ان دونوں مصوروں کو اپنی ماتحتی میں لے کر ہندوستان لے آیا۔ میر سید علی اور عباس صمد کو مغل طرز کی مصوری کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ ہمایوں نے انہیں مشہور تصنیف 'داستانِ امیر حمزہ' کی تصویر کشی کا کام سونپا۔ یہ کام ہمایوں کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا اور اکبر کی سرپرستی میں

1582 میں جا کر مکمل ہوا۔ 12 جلدوں پر مشتمل یہ منفرد پروجیکٹ تقریباً 2000 تصاویر/تصاویر پر مشتمل ہے جس کا ہر صفحہ تقریباً 20x27 انچ کا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے کئی مصور اس پراجیکٹ میں شامل ہوئے۔ ابتدائی تصویروں میں فارسی انداز کو تقریباً مکمل طور پر برقرار رکھا گیا ہے لیکن ہندوستانی مناظر کو بعد کی ساخت میں ضرور متعارف کروایا گیا۔ مثال کے طور پر، ہندوستانی درخت برگد، آم، کھجور کے درختوں کو اکثر پینٹ کیا گیا ہے۔ ہندوستانی کردار اور ملبوسات بھی متعارف کروائے گئے۔ اس طرح دیسی روایت اپنے آپ کو مضبوط کرنے لگی۔ امتزاج کے اس عمل کو اکبر اور جہانگیر کے مصوروں نے مزید فروغ دیا۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ان تصاویر پر اپنی ذہنی وژن کو پیش کیا جن پر انہوں نے کام کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ایرانی طرز مکمل طور پر ہندوستانی روایت اور مصوری کے ایک نئے مکتب کے ساتھ ضم ہو گیا جسے شاہی قلم یا مصوری کا مغل مکتب فکر کہا جاتا ہے۔

مصوری کا مغلیہ طرز، اکبر کے دور میں اپنے عروج پر پہنچا۔ اکبر مصوری کا بہت بڑا مداح تھا۔ اس نے مصوری کا ایک الگ شعبہ مصوری کا کارخانہ بھی قائم کیا تھا اور خواجہ عباس صمد کو اس کارخانہ کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اکبر کے دور میں شہنشاہ کی سرپرستی حاصل کرنے والے مصوروں کی تعداد 150 سے تجاوز کر گئی تھی۔ ان میں سے بہت سے ہندو تھے۔ ان میں سب سے اہم دسوانت، بسوان، کیسوا، لال مکند، مہیش، منوہر وغیرہ تھے۔ ہندو فنکار ایرانی/فارسی تکنیک پر اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ انہیں مختلف فارسی خواندگی کی عکاسی کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ چنگیز خان کے خاندان کی تاریخ 'جامع التواریخ' میں چھوٹی چھوٹی تصویریں بساواں، لال بھیم، دھرم داس وغیرہ کی دستکاری تھے۔ امیر خسرو کی نظموں کو بساواں، منوہر، دھرم داس اور دیگر نے باتصویر کیا تھا۔ 'اکبر نامہ' کو تصویری شکل بساواں، کیسو وغیرہ نے دی تھی۔ ان تصاویر میں ایرانی طرز کے اثرات کا ذکر کیا گیا تھا۔ ولکنسن (Wilkinson) کا مشاہدہ یہ ہے کہ، 'اکبر کے دور کی تصاویر اجتماعی طور پر ایرانی طرز مصوری کی مرہون منت ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ایرانی طرز مصوری کا اثر دھیرے دھیرے کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں یہ مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

یورپی مصوری کے برخلاف، مغل مصوری مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایک ماہر نے خاکہ تیار کیا، دوسرے نے رنگوں سے بھرا، تیسرے نے اپنے دماغ کو پرچھائی اور پس منظر پر لگایا، ایک اور نے سنہری رنگ کے پتوں، موتیوں کی دھول اور انتہائی قیمتی پتھروں کی عمدہ پینٹنگ بنائی۔ اس مجموعی کام کے لیے زیادہ تر مصور ذمہ دار تھا جس کا نام تصویر اور مصوری میں دیا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں رنگے گئے موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے، عملی طور پر تمام ذاتوں اور طبقات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ہمیں شہزادے اور شہزادی، شاہی وفد، رئیس و نواب، کمانڈروں، معماروں، بڑھئیوں، کسانوں، موسیقاروں، رقاصوں، سپاہیوں اور ہندو اور مسلمان سنتوں کی، ان کے شاگردوں یا پیروکاروں کی تصویریں ملتی ہیں۔ درحقیقت زندگی کا کوئی کام یا پیشہ ایسا نہیں ہے جسے نظرانداز کیا گیا ہو۔

اکبر کے دور میں ایک اور اہم ترقی فریسکو پینٹنگ تھی۔ سیکری کے فریسکو (Fresco) طرز مصوری اس فن کی ترقی میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ فریسکو مصوری زیادہ تر اکبر اور مریم سلطانہ کے گھروں کی خواب گاہ میں کی گئی ہے۔ اکبر کے خواب گاہ میں پینٹ کیے گئے مناظر میں

گھروں کو دکھایا گیا ہے جیسے کشتی رانی کے مناظر، پھول اور پتے، ہاتھیوں کی لڑائی، جنگ کے مناظر میں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سنہری مکان میں جس کے چاروں طرف فریسکو سے پلاستر کیا گیا ہے میں ہاتھیوں کی لڑائی کی پینٹنگ، ایک قلعہ اور اس میں محروس قیدی، شاخوں والا بڑا درخت، شیر کا شکار، ایک ہشت پہلو تخت جس میں ایک شخص تاج پہنے ہوئے ہے، وغیرہ پر مختلف موضوعات اور خیالات کو پینٹ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ فنکاروں کے پورے گروہ کا کام ہے۔

اکبر کے تخت پر فائز ہونے کے فوراً بعد یورپی مصوری کے عنصر کو شامل کیا۔ حجم کی نشاندہی کرنے کے لیے پرکشش سایہ، یورپی میں فطرت پسندی کا عنصر اور پس منظر میں دور دراز کے مناظر کو مصوری میں اپنایا گیا۔ اکبر مصوری پر یورپی فن کا اثر روشنی اور سایہ کے فریب کے ساتھ ساتھ عیسائیت اور اسلام میں مشترک موضوعات جیسے کنواری مریم، فرشتے وغیرہ کی تصویر کشی میں واضح ہے۔ اکبر کے دور حکومت کے دو ابتدائی منصوبے طوطی نامہ اور داستان امیر حمزہ تھے جسے 14 ویں صدی کے ہندوستانی شاعر ضیاءالدین نخشابی نے فارسی میں مرتب کیا تھا۔ یہ ایک خاتون کے بارے میں کہانیوں در کہانیوں کا ایک سلسلہ تھا جس کا شوہر ایک طویل عرصے تک ان سے دور رہتا تھا۔ اس کی عفت کو برقرار رکھنے کے لیے طوطا ہر رات ایک کہانی سناتا ہے تاکہ اسے اپنے عاشق سے ملنے سے روکا جا سکے۔ اس میں اکبر کی دلچسپی ضرور ہو گی، جو اچھی کہانیوں کا شوق رکھتا تھا۔ لیکن زیادہ امکان ہے کہ یہ حرم کے لیے تھیں جو متنوع پس منظر اور مختلف حیثیتوں کی خواتین سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ اشر اور تلبوت (C.B. Asher and C. Talbot) لکھتے ہیں کہ 'طوطی نامہ' کے پیغام، عورتوں پر کنٹرول کو طاقتور عمر رسیدہ خواتین کے تناظر میں سمجھنا چاہیے جن کا اس وقت کے معاملات پر اس وقت تک غلبہ تھا جب تک کہ اکبر نے اقتدار سنبھال نہ لیا اور بالادستی حاصل نہ کر لی۔ ایسی خواتین نہ صرف اقتدار ساز اور اقتدار شکن تھیں بلکہ اکثر اہم مشیر بھی تھیں جیسا کہ حمیدہ بانو بیگم کے معاملے میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یورپی طباعت نے ابتدائی طوطی نامہ اور داستان امیر حمزہ کی کہانیوں پر اثر ڈالا۔ تاہم، 1580 میں Father Jesuits نے اکبر کو بائبل کی تصویری نقل پیش کی۔ فنکاروں نے اس کا مطالعہ کیا جس نے مصوری/تصاویر میں یورپی اثر کو تیز کیا۔

1580 میں، اکبر نے اسلام کی تاریخ اور اپنے نسب پر تصویری کام شروع کیا۔ 'اکبر نامہ' کی تصویری کاپی 116 تصویروں/تمثیلوں کے ساتھ تیار کی گئی تھی۔ ان میں سے تقریباً نصف اکبر پر مشتمل ہے۔ ایک میں، اکبر کو ایک پاگل ہاتھی پر سوار دکھایا گیا ہے جس میں وہ پاگل ہاتھی ایک کمزور پل کو توڑ رہا ہے اور جہاں دوسرے گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں، وہیں اس مشکل صورتحال میں اکبر پرسکون نظر آتا ہے۔ کیتھرین ایشر کی رائے ہے کہ اکبر نے خدا پر اپنے ایمان کو جانچنے کے لیے اس ہاتھی پر سواری کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں کہ اکبر نے خود کو ہاتھی کے کنٹرولر کے طور پر دیکھا، جو کہ حکمرانی کرنے کی صلاحیت کا ایک استعارہ ہے۔ اکبر اس اور دیگر تصاویر میں ایک سفید کپڑے میں نظر آتا جبکہ دیگر چمکدار کپڑوں میں ہیں، یہاں سفید رنگ کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ خاص طور پر ان مناظر میں جہاں اکبر چشتی صوفیوں سے وابستہ تھا، جیسے کہ وہ مناظر جہاں اکبر پیدل چل کر اجمیر کے مزار پر بیٹے کی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سفید لباس زیب تن کرتا ہے جو کہ ایک شعوری انتخاب لگتا ہے۔

مغل مصوری جہانگیر کے دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ وہ فن کا بڑے مداح تھا۔ وہ اپنے والد سے زیادہ فن کا ماہر تو نہیں لیکن عظیم ضرور تھا۔ مثال کے طور پر جہانگیر نے مصوری میں ذاتی دلچسپی لی، وہ آگرہ اور لاہور میں مصوری کے تمام پہلوؤں سے وابستہ رہا۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ آگرہ میں Father Jesuits کے گھر پر عیسائی پینٹنگ کا معائنہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ فتح پور سیکری کی دیواروں میں تمام فریسکو پینٹنگ کا مشاہد تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ مصوری کا بڑا علم رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ان کے پاس کوئی ایسی پینٹنگ لائی جائے جو مشترکہ طور پر بنائی گئی ہو تو وہ یہ پہچان سکتا ہے کہ پینٹنگ کا کون سا حصہ کس نے پینٹ کیا ہے۔ وہ قدرتی حسن کا دلدادہ اور عاشق تھا جو اس کے زمانے کی تصاویر میں جھلکتا ہے۔ منصور اس کے دور میں فطرت کا سب سے بڑا مصور تھا۔

جہانگیر کے دور سے مصوری میں 'چہرے کے گرد ایک روشن ہالہ' (Nimbused Head) کو اپنایا گیا۔ دوہرے صفحے کے ایک پورٹریٹ (portrait) میں معین الدین چشتی کو جہانگیر کو ایک گلوب سونپتے ہوئے دکھایا گیا تھا جس کے اوپر تیموری تاج نظر آتا ہے، جو بادشاہ کے حق حکمرانی کی علامت تھا۔ کیتھرین ایشر (Catherine Asher) اور سنتھیا ٹالبوٹ Cynthia Talbot لکھتے ہیں کہ ہالہ پہننا نیم الٰہی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہانگیر کو یہ نشان معین الدین چشتی سے ملا تھا جو اب تک مغل گھرانہ کے روحانی سرپرست کے طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ جہانگیر اپنی خود نشت میں ذکر کرتا ہے کہ بچپن میں سلیم چستی نے اپنی پگڑی نوجوان شہزادے کے سر پر رکھ کر کہا کہ شہزادہ روحانی جانشین ہو گا۔ اسی سوچ کی وجہ سے مغلوں نے زیارت کے موقع پر یا فوجی فتح کے شکرانے کے طور پر چشتی مزارات کو عطیات دیے۔ اس طرح کی سرپرستی کو مغل کی طرف سے دنیاوی حکمرانی کو روحانی امور سے جوڑنے کی کوشش کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ذاتی پرہیزگاری بھی اس کا محرک ہے۔ ولی اور بادشاہ دونوں سفید لباس سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں حالانکہ جہانگیر کے وسیع زیورات حکمران کے طور پر اس کے دنیاوی اور روحانی کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تصاویر (paintings) میں مختلف سیاسی طاقتوں کی دشمنی کو بھی دکھایا گیا ہے اور بادشاہ خود کو دوسرے کے تناظر میں کیسے دیکھتا ہے۔ جہانگیر کی ایک پینٹنگ میں اسے صفوی شہنشاہ شاہ عباس کو گلے لگاتے دکھایا گیا ہے۔ شیر پر کھڑا جہانگیر استعاراتی طور پر شاہ عباس پر غلبہ رکھتا ہے جو غیر فعال مینے پر کھڑا تھا اور جہانگیر، عباس کو سمندر میں دھکیل رہا ہے۔ وہ دونوں گلوب پر کھڑے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقشہ سازی میں یورپی ترقی، مغل ہندوستان میں تیزی سے منتقل ہو چکی تھی۔ ایک اور پورٹریٹ میں جہانگیر دیوان عام میں نوابوں کے سامنے اور سفید سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے اوپر کنواری مریم کی پینٹ شدہ تصویر ہے، جو اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ شہنشاہ جہانگیر منگول شہزادی 'ایلن قوئی' (Alanquwa) سے پیدا ہونے والے نامور بادشاہوں کے سلسلے سے تھا، جو معجزانہ طور پر روشنی کی کرن سے حاملہ ہوئی تھی۔

شاہ جہاں نے اپنے والد اور دادا کی روایت کو جاری رکھا اور مغل دربار میں مصوری کا فن فروغ پاتا رہا۔ جہانگیر کے زمانے کے کچھ مشہور مصور شاہ جہاں کے ملازم تھے۔ جسکے دور کی پورٹریٹ پینٹنگ (portrait painting) بہت مشہور تھی۔ بادشاہ اور اس کے بزرگوں کے کئی پورٹریٹ پینٹ کیے گئے تھے۔ پورٹریٹ پر تفصیلی اور باریک بینی سے کام کیا گیا ہے۔ ہر چہرے کے تاثرات، داڑھی کے ہر بال، پگڑی کی ہر تہہ، لباس کا، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی صاف اور واضح طور پر نشان زد ہے۔ شاہ جہاں کے دور حکومت کی کچھ تصاویر مغل

دربار کی شان کو ظاہر کرتی ہیں یا شہنشاہ کی بیرونی سرگرمیوں جیسے شکار یا درویشوں سے ملاقات کی عکاسی کرتی ہیں۔ایک پینٹنگ میں شہزادے دارا شکوہ کی شادی کے جلوس کو دکھایا گیا ہے۔ شاہ جہان کے دربار کی ایک پینٹنگ دستیاب ہے جہاں 44 انفرادی چہروں کو پینٹ کیا گیا ہے۔ پینٹنگ نامکمل ہے لیکن اعلیٰ حکام اور درباریوں کے چہرے اور چہروں کے تاثرات مکمل ہیں اور تین کے علاوہ باقی سب کے نام ہیں۔

شاہی خواتین کے پورٹریٹ بھی بنائے گئے۔ نور جہاں اور ممتاز محل کی تصویر دستیاب ہے۔ پورٹریٹ کی صداقت مشکوک ہے۔ چونکہ کسی بھی مرد فنکار کو حرم تک رسائی حاصل نہیں تھی یہ پورٹریٹ فنکاروں کے تخیل کی بہترین پرواز ہے یا ہو سکتا ہے کہ تصاویر خواتین فن کاروں یا کچھ بہت پرانے مصوروں نے بنائی تھیں جنہیں حرم تک رسائی حاصل تھی۔ان تصاویر پر باریک طریقہ کار سے کام کیا گیا ہے، جوانی کی خوبصورتی کی شاندار زینت کو ڈرائنگ میں اضافی نزاکت کے ساتھ خوشی سے پینٹ کیا گیا ہے۔اس طرح شاہ جہاں کے دور حکومت میں پورٹریٹ پینٹنگ کمال کے قریب پہنچ گئی تھی جو کہ ترکیب (کمپوزیشن) میں شاندار مہارت اور عملدرآمد میں باریک بینی اور نفاست سے ظاہر ہوتی ہے۔اس دور کی پینٹنگ میں گرافک رنگ اور آرائشی حاشیہ بھی نمایاں ہیں۔ سونے کا بے جا استعمال بھی مجموعی خوش حالی کے احساس کی عکاسی کرتا ہے۔اس طرح مصوری کا فن شاہ جہاں کے زمانے میں ترقی کے عروج پر پہنچا اور اس کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔ تصورات پرانے اور دقیانوسی رہ گئے، نئے موضوعات مزید نہیں آرہے تھے اب نیے پن میں کمی آءی۔مزید یہ کہ فن تعمیر شاہ جہاں کی پہلی محبت تھی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں مصوری کے فن نے جو رفتار حاصل کی تھی وہ اورنگ زیب کے دور میں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، عام تصور کے برخلاف، فن معمولی پیمانے پر ہی صحیح ترقی کرتا رہا۔ ہمارے پاس شہنشاہ کی ادھیڑ عمری اور بڑھاپے اور آخری ایام کی زندگی خمیدہ اور جھکتی ہوئی تصویریں ہیں۔ تصاویر اس کے تمام بیٹوں کی، اس کے دربار اور شہزادیوں کے پورٹریٹ اور دیگر مناظر کی ہیں۔ یہ وہ مشہور تصاویر ہیں جن میں وہ 1687 میں گولکنڈہ کے محاصرے کی ہدایت دیتا نظر آتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شہنشاہ نے اپنے بڑے بیٹے معظم سلطان کی قید کے دوران اس کی تصویر بنانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ جیل میں اس کی حالت دیکھیں۔اس لیے اس بات سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ اورنگ زیب کی سرد مہری کی وجہ سے آرٹ اور زندگی منجمد ہو گئے تھے اور مغل 'شاہی قلم' اس کے دور حکومت میں زوال پذیر ہوا۔ یہ وہ مصیبت تھی جسے سلطنت کو اس کے زوال کے بعد برداشت کرنا پڑا جس کا خاتمہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے میں ہوا جو مغل فن کی اعلیٰ ترین شکلوں کی موت ثابت ہوئی۔

14.4 زبان اور ادب (Language and Literature)

جیسا کہ ستیش چندر نے بیان کیا ہیں کہ فارسی اور سنسکرت دونوں نے کل ہند سطح پر فکر کے تبادلہ خیال میں اہم رول ادا کیا ہے اور اس دور میں علاقائی زبانوں کی ترقی بہت حد تک بھکتی تحریک کی ترقی کے نتیجے میں ہوئی۔ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے کے ناطے، مغلوں نے فطری طور پر ثقافت اور انتظامیہ کی ایک بڑی زبان کے طور پر فارسی کی سرپرستی کی۔ تاہم، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغلوں نے سنسکرت جیسی دوسری بڑی زبانوں کو نظر انداز کیا۔ آڈری ٹرشکے (Audrey Truschke) نے اپنی کتاب *Culture of*

Encounters: Sanskrit at the Mughal Court میں اس بات کو موضوع بنایا ہے کہ سنسکرت کس طرح مغلوں کے دور میں ترقی کرتی گئی۔

فارسی

ابتدائی مغلوں کے دربار میں فارسی ایک ممتاز زبان کے طور پر ارتقا پذیر نہیں ہوئی تھی۔ بابر کو چغتائی ترکی کا ورثہ ملا تھا اور ترک اس کی مادری زبان ہونے کی وجہ سے اس نے اسی زبان میں اپنی خود نشت قلم بند کی۔ ہمایوں نے بھی ترک زبان کی سرپرستی کی اور جہانگیر آخری حکمران تھا جو آسانی سے ترک زبان میں لکھ سکتا تھا۔ سولہویں صدی کے وسط سے مغل بادشاہوں نے ادب اور فنون کی شاندار سرپرستی کی اور اپنے مرکزی دربار کو ایک 'ثقافتی مکہ '(اس اصطلاح کو آڈری ٹرشکے نے استعمال کیا ہے) بنایا، جس نے پورے ایشیا کے فارسی شاعروں، مفکرین، فنکاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اکبر کے زمانے میں فارسی زبان اس قدر پھیل چکی تھی کہ اس نے 1582 میں فارسی کو انتظامیہ کی سرکاری زبان قرار دیا اور مقامی زبان (ہندوی) میں محصول ریکارڈ رکھنے کی روایت کو ختم کر دیا لیکن دکنی ریاستوں میں سترہویں صدی کی آخری سہ ماہی میں اپنے معدوم ہونے تک علاقائی زبانوں میں ریکارڈ رکھنے کی یہ روایت جاری رہی۔ اکبر کے دور میں فارسی نثر اور شاعری اپنے عروج کو پہنچی۔ ابوالفضل فارسی کے عظیم اسکالر اور معروف مورخ تھے جنہوں نے 'آئین اکبری' لکھی۔ دوسرے فارسی اسکالر جیسے عتبی اور نظیری فارسی کے سرکردہ شاعر تھے۔ ابوالفضل اکبر کے شعبہ ترجمہ سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور زیادہ تر ہندو فنکاروں نے ان کی عکاسی کی۔ ان کاموں میں مہابھارت (رزم نامہ)، پنچ تنتر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کا خیال تھا کہ اس طرح کے تراجم ملک میں بڑے مذاہب اور سماجی نظام کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے میں مدد کریں گے۔ بہت سی ہندو برادریاں، خاص طور پر کائستھ اور کھتری، جو پہلے ہندی یا اس کی کسی مقامی زبان سے واقفیت رکھتے تھے، اگر وہ شاہی خدمات میں بطور کلرک، کاتب اور متعمد شامل ہونا چاہتے تو فارسی زبان کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے کے لیے مدرسوں میں جانے کے پابند تھے۔ اس طرح فارسی مغل دور میں ابلاغ کا سب سے زیادہ فعال اور عملی ذریعہ اور اکتساب، علم اور اعلیٰ ثقافت کی زبان بن گئی۔ یہ 19 ویں صدی کے اوائل تک حاوی رہی جب تک کہ انگریزوں نے انگریزی اور دیگر مقامی زبانوں کی سرپرستی شروع نہ کر دی۔

سنسکرت

جیسا کہ مینا بھار گوا نے بحث کی ہے کہ سنسکرت زبان میں مغل سلطنت کی سرکاری زبان بننے کی صلاحیت موجود تھی، لیکن اس کی مقدس نوعیت اور اونچی ذات کی محدود زبان اور کسی ملیچا (Mlecha) کو اس زبان کو استعمال کرنے کی شکل میں آلودہ کرنے کی نہیں دی جا سکتی تھی جس کی وجہ سے یہ روزمرہ کے استعمال کا ذریعہ نہیں بن پائی۔ دوسری ممکنہ وجہ یہ ہے کہ مغل جن کا تعلق فارسی بولنے والوں کی دنیا سے تھا، انہوں نے فارسی کو انتظامیہ کی زبان کے طور پر منتخب کرنے اور اسے سیاسی سرپرستی دینے کا فیصلہ کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس دور میں سنسکرت میں زیادہ اصلی تصنیفات تخلیق نہیں ہوئیں لیکن پھر بھی ان کی تعداد کافی متاثر کن ہے۔ مغل دربار میں برہمن علماء کی

سرپرستی 1560 کی دہائی سے اکبر کی تخت نشینی اور مشرقی ہندوستان میں اس کی علاقائی توسیع کے ساتھ شروع ہوئی۔ سنسکرت کے اسکالر مہاپاترا اڑیسہ کے کرشنادیوا اور نرسمہا ان لوگوں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے مغل سرپرستی حاصل ہوئی۔ سنسکرت کے دانشور اور اسکالر جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں میں نہ صرف ہندوستانی روایت کے مبلغین یا معلم کے طور پر یا سنسکرت کاموں کے مترجم کے طور پر تعینات تھے بلکہ مغل بادشاہ کے نجومی اور بعض اوقات سیاسی گفت وشنید کے لیے اسٹریجسٹ کے طور پر بھی سرگرم تھے۔

1575 میں اکبر کی جانب سے مکتب خانہ (Bureau of Translation) کے قیام کے ساتھ ہی، اس نے ہندوستانی مذہبی علوم اور دیگر مقامی روایات کو فارسی سے واقفیت رکھنے والے لوگوں تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ رزم نامہ کے طور پر کیا گیا۔ فارسی میں دیگر تراجم میں رامائن، اتھروید، سنگھاسن بتیسی، پنچ تنتر، کتھاسرت ساگر، یوگا وسیشٹھا، اور ہری ومسا شامل ہیں۔ بھگوت پران کا ترجمہ ٹوڈر مل نے کیا تھا۔ بعد ازاں سترھویں صدی میں، دارا شکوہ نے فلسفیانہ متون جیسے کہ اپنشد (سرِ اکبر) اور بھگود گیتا کے ترجمے کا آغاز 'آبِ زندگی' کے عنوان سے کیا۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب، قانون، اخلاقیات، ریاضی، طب، فلکیات، رومانس، اخلاقی کہانیوں اور موسیقی سے متعلق متعدد دیگر کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، یہ سلسلہ اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔

ہندی اور علاقائی زبانیں

برج کی شکل میں، عہد وسطیٰ کی ہندی کو بھی مغلوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اکبر کے زمانے سے ہی ہندی شاعر دربار میں ملازم ہونے لگے تھے۔ عبدالرحیم خان خانان نے بگھتی سے متاثر ہو کر فارسی میں بگھتی شاعری کی۔ اس طرح فارسی اور ہندی دونوں ادبی روایات ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ بااثر ہندی شاعر تلسی داس تھے جن کے ہیرو 'رام' تھے۔

اس عرصے کے دوران، علاقائی زبانوں نے استحکام اور پختگی حاصل کی جس کے نتیجے میں کچھ بہترین شاعری وجود میں آئی۔ دونوں بھکتی اور صوفی تحریک نے اس زمن میں اہم رول ادا کیا۔ اس عرصے کے دوران رادھا کے ساتھ کرشن اور گوالنوں کا میل جول اور بھگوت پران کی کہانیاں بنگالی، اڑیہ، ہندی، راجستھانی اور گجراتی میں شاعری کا موضوع بنی۔ رام کے لیے بہت سے بھجن بھی ترتیب دیے گئے اور رامائن اور مہابھارت کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں شیخ بدھن سہروردی کے شاگرد ملک محمد جائسی نے اودھی بولی میں پدماوت (1540) لکھی جس میں انہوں نے چتور پر علاؤالدین خلجی کے حملے کو مایا اور روح اور خدا کے درمیان تعلق کے پس منظر میں صوفی انداز میں بیان کیا ہے۔۔ صوفیانہ شاعری کی ایک شکل جسے پریما اکھیان یا پریم کہانی کے نام سے جانا جاتا ہے کو صوفی شاعروں نے 14 ویں سے 16 ویں صدی کے شمالی ہندوستان میں اودھی یا مشرقی ہندوی میں تحریر کیا۔ بنگال میں، ہندو اور مسلم دونوں دانشوروں نے اپنی بنگالی علاقائی زبان میں لکھا اور فارسی اور عربی متن کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ بنگالی شاعروں سے متاثر ہو کر، جنہوں نے اپنی تخلیقات کا ایک بڑا حصہ کرشنا کے لیے وقف کیا، مسلم شاعر سید سلطان نے نبی ومشا (پیغمبر اسلامؐ کا نسب) تشکیل دیا جس میں کرشنا بھی شامل تھے۔ اس سے پرامن بقائے باہمی اور بنا کسی اختلاف کے ہندو دیوتاؤں اور اللہ یا رسول اللہ کو پوجنے کی راہ ہموار ہوئی۔ کشمیر میں نندر شی (رشی سلسلہ کے بانی) جن کے کلام کو شروخ کہا جاتا

ہے اور چودھویں صدی کی کشمیر کی مشہور خاتون لال دید کے کلام کو لل وکھ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے اقوال کافی مشہور ہیں اور لوک ثقافت کے اہم اجزا بن گئے۔ بعد میں ان کے کلام نے کشمیری زبان کے پھیلاؤ میں ایک عامل کا کام کیا۔

جزیرہ نما جنوب، شمال کے مقابلے میں، مقامی زبان کی ترقی میں زیادہ جوش و جذبہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی دکن پر مقامی حکمرانوں کی حکومت تھی جو مقامی بولی مراٹھی، کنڑ اور تیلگو بولتے تھے اور سپاہیوں کی شکل میں مقامی لوگوں کا اور ریاستی نظام میں برہمنوں کا زیادہ عمل دخل تھا۔ دکنی سلاطین نے نہ صرف تیلگو اور مراٹھی بلکہ دکنی کو بھی پروان چڑھایا جو فارسی اور مقامی زبانوں خاص کر مراٹھی کا مرکب تھی لوگوں سے بات چیت کرنے کے لیے اسکا استعمال کیا۔ جگت گرو یا بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ دوم نے تصوف اور موسیقی کے شوق کی جانب مائل ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب نورس میں نظمیں اور گیت لکھے۔ اس کا متن، علم کی ہندو دیوی سرسوتی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، جس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صوفی سنت گیسودراز کی تعریف کی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات بھی جو کہ بھکتی سے متاثر نظموں کا مجموعہ ہے دکنی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ اس دور میں ایک اور ادبی ترقی اردو زبان کی شکل میں تھی۔ اس زبان کی ابتدا کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک یہ زبان مغل فوجی خیمے میں وجود میں آئی۔ دوسری طرف شمس الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ اس کی جڑیں مقامی ہیں، اور یہ کہ اس کی پرورش صوفیوں اور دوسرے گروہوں نے کی۔ 1721 میں دہلی میں ولی دکنی کی آمد کے ساتھ ہی اردو نے ایک متعین شکل اور اسلوب حاصل کر لیا لیکن یہ میر، درد اور سودا ہی تھے جنہوں نے اردو کو فارسی کے برابر درجہ دیا۔ بتدریج اردو شہر کے اشرافیہ کی ادبی زبان بن گئی اور ہندو اور مسلمان دونوں نے یکساں طور پر اس کی نشو و نما کی۔ وجئے نگر سلطنت نے سنسکرت کے ساتھ ساتھ کنڑ اور تلگو ادب کی بھی سرپرستی کی۔ کرشنا دیوارایا سنسکرت اور تلگو کے ایک ماہر اسکالر تھے اور انگتا ملیادا کے لیے مشہور تھے۔ ایکناتھ اور تکارام کے ہاتھوں مراٹھی نے اپنا عروج حاصل کیا اور ملیالم نے ایک علاحدہ زبان کے طور پر اپنا ادبی سفر شروع کیا۔

14.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ: مغلوں نے اپنے دور حکومت میں فن اور تعمیراتی تکنیک کی مختلف شکلوں کی سرپرستی کی اور اس دور میں مغلوں اور علاقائی حکمرانوں نے ہندوستان میں مختلف زبانوں میں ادب کا ایک بھرپور ذخیرہ تیار کیا۔

14.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

پیٹرا ڈیورا	:	نیم قیمتی پتھروں کا استعمال کرتے ہوئے تصویری جالیوں کا کام۔
پریم اکھیان	:	صوفیانہ شاعری کی ایک شکل۔
کلیات	:	نظموں کا مجموعہ
سرِ اکبر	:	اپنشدوں کا فارسی ترجمہ

رزم نامہ : مہابھارت کا فارسی ترجمہ۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 'دین پناہ' نامی عمارت کس نے تعمیر کرائی تھی؟

(الف) بابر (ب) ہمایوں (ج) اکبر (د) شیر شاہ

2. فتح پور سیکری کا بلند دروازہ اکبر نے کس فتح کی یاد میں بنوایا تھا؟

(الف) بنگال (ب) دکن (ج) گجرات (د) کابل

3. سنگ مرمر پر قیمتی پتھر جڑنے کا فن (پچی کاری/Pietra Dura) کس مقبرے میں پہلی بار نمایاں طور پر استعمال ہوا؟

(الف) ہمایوں کا مقبرہ (ب) اکبر کا مقبرہ (ج) اعتماد الدولہ کا مقبرہ (د) تاج محل

4. 'جامع التواریخ' اور 'طوطی نامہ' کی تصویر کشی کس مغل بادشاہ کے دور میں ہوئی؟

(الف) بابر (ب) ہمایوں (ج) اکبر (د) شاہجہاں

5. لال قلعہ اور جامع مسجد (دہلی) کا معمار کون سا مغل بادشاہ تھا؟

(الف) اکبر (ب) جہانگیر (ج) شاہجہاں (د) اورنگزیب

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ادب کے فروغ کو بھکتی اور صوفی تحریک سے کیسے جوڑا جاتا ہے۔
2. شاہ جہاں کے دور میں تعمیر ہونے والی اہم عمارتوں کو ان کی خصوصیات کے ساتھ بتائیں۔
3. 16-18ویں صدی کے دوران مقامی ادب کی ترقی پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل فن تعمیر کی اہم خصوصیات پر بحث کریں۔
2. 16-18ویں صدی کے دوران زبان و ادب کی ترقی پر بحث کریں۔

جوابات: 1-(ب), 2-(ج), 3-(ج), 4-(ج), 5-(ج)

اکائی 15۔زبان،ادب اور مخلوط ثقافت

(Language, Literature and Composite Culture)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 زبان وادب

15.2.1 فارسی

15.2.2 ترکی

15.2.3 عربی

15.2.4 سنسکرت

15.2.5 ہندی

15.2.5 اردو

15.3 تعلیمی مراکز

15.3.1 دہلی

15.3.2 پنجاب/لاہور

15.3.3 نارنول

15.3.4 آگرہ

15.3.5 اودھ

15.3.6 لکھنؤ (فرنگی محل)

15.3.7 جون پور

15.3.8 گجرات/سورت

15.4 مخلوط ثقافت

15.5 اکتسابی نتائج
15.6 کلیدی الفاظ
15.7 نمونہ امتحانی سوالات

15.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں زبان وادب، تعلیمی مراکز اور مشترکہ ثقافت یعنی تاریخ کے تین اہم پہلو پر بحث ہو گی۔ سب سے پہلے ہم زبان وادب سے متعلق گفتگو کریں گے۔ مغل عہد میں ادب سے تعلق رکھنے والی تمام قسمیں پھلی پھولیں اور پروان چڑھیں۔ مغلوں نے اس کی سرپرستی کی اور خود بھی زبان وادب کے فروغ میں دلچسپی دکھائی یہی وجہ ہے کہ نثر و نظم، شاعری اور مقبول عام منظوم صوفیانہ شاعری سے لیکر علمی نثر نگاری اور تاریخ نویسی کے پروان چڑھانے اور رواج دینے میں مغل بادشاہوں اور شہزادے و شہزادیوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ فارسی زبان نہ صرف مغل حکومت اور دکن کی ریاستوں میں اعلیٰ سطح کی ثقافتی زبان تھی بلکہ اونچی سطح کے دفاتر میں بھی رائج تھی۔ یہاں تک کہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر راجپوت ریاستوں کے دربار تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اس کے طرز بیان اور لغت نے دفاتر میں استعمال ہونے والی زبان کو بہت گہرے طور پر متاثر کیا تھا۔ اس صورت حال کا ستر ہویں صدی کے راجستھانی اور مرہٹی دستاویزوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی کے علاوہ ادب دوسری زبانوں میں بھی تھا جس کا بہت کچھ حصہ اکبر کے وقت ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ عربی زبان قرآن، حدیث اور دینیات کی زبان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اہم کردار ادا کرتی رہی۔ عربی میں اچھی نثر و نظم ہندوستان کے شمال اور جنوب دونوں میں تصنیف کی گئی۔ ترکی (چغتائی) زبان بابر کی مادری زبان تھی جو انیسویں صدی کے ابتداء تک حکمراں کے محلوں میں کسی حد تک بولی جارہی تھی اور بہت سے امراء بھی بول رہے تھے۔ سولہویں صدی میں علاقائی زبانیں ادب میں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ صوفیانہ تحریریں اور غیر مذہبی تحریریں وجود میں آئیں۔ فارسی کے ہندی بولیوں کے ساتھ تفاعل کے نتیجہ میں ایک نئی زبان اردو وجود میں آئی۔ سنسکرت جو پہلے سے ہی یہاں کے اعلیٰ طبقہ کی زبان تھی جس کا رواج مسلم عہد میں بھی کم نہیں ہوا۔ اکبر اور دارا شکوہ نے سنسکرت سے فارسی میں تراجم کرائے۔ اس طرح مغل سلطنت میں سنسکرت کی اہمیت برقرار رہی۔ علاقائی زبانوں میں سندھی، پنجابی اور پشتو کو شہرت ملی اور بنگالی و کشمیری زبان بھی جو پہلے سے ہی ادبی زبانیں تھیں لائق توجہ رہیں۔ ہندی نے مع اپنی مختلف بولیوں (برج وغیرہ) کے جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھی اہم کردار ادا کیا۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں اردو ہندوستانی مسلمانوں کی اعلیٰ درجے کی ادبی زبان بن گئی۔ آگے ان زبانوں کا عمومی جائزہ لیا جائے گا۔

تعلیمی مراکز: ہندوستان کے مغل فرمانروا علم دوست اور علم پرور تھے۔ تعلیم و تعلم کے لیے بہت سے مدارس انہوں نے قائم کیے۔ بابر علمی ذوق رکھتا تھا اور علمی اشخاص کی ہمت افزائی بھی کرتا تھا اس کے منصوبے میں اسکول اور کالج کی تعمیر بھی شامل تھی لیکن اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اکبر نے بھی متعدد مدارس قائم کیے آگرہ اور فتح پور سیکری میں اس نے مدارس قائم کیے۔ ماہم بیگ نے پرانے قلعہ کے پاس ایک مدرسہ بنوایا جس کا نام خیر المنازل تھا۔ فتح پور سیکری میں ابو لفضل نے بھی ایک مدرسہ بنوایا تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں کے مدارس مختلف مقامات پر تھے۔ مسجدیں اور خانقاہیں بھی علمی مراکز کے بطور استعمال ہوتے تھے۔ جہانگیر نے بھی مدارس کے قیام میں دلچسپی لی اور نئے مدارس کے قیام کے ساتھ ہی ویران اور بند پڑے مدرسہ کو دوبارہ زندگی بخشی۔ شاہجہاں نے پہلے سے چلے آرہے مدارس کو بدستور قائم رکھا اور جامع مسجد دہلی کے جوار میں دارالبقاء نامی مدرسہ قائم کیا۔ اورنگ زیب نے تعلیم میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے عہد میں دہلی کے علاوہ مختلف صوبوں اور قصبوں میں مدارس قائم ہوئے۔ یہی مدارس تعلیم کے مرکز تھے۔

مخلوط ثقافت: ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو ان کی ہم مذہب نہ تھی۔ دونوں کا مذہب، تہذیب و تمدن اور رہن سہن الگ الگ تھا پھر بھی مسلمانوں نے اسی سرزمین کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ یہاں کی آب و ہوا اور تہذیب انہیں ایسی بھائی کہ کچھ دنوں کے بعد دونوں قوموں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے اور اسی کے نتیجہ میں وہ مشترک تہذیب وجود میں آئی جو ہندوستان کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ تمام مسلم حکمرانوں اور خاندانوں کے عہد میں مشترکہ تہذیب کو فروغ ملا لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ دانستہ اور شعوری کوششیں مغل عہد میں ہوئیں۔ آج ہمارے علم و فن کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس پر مسلم عہد کی مشترکہ تہذیب کی گہری چھاپ نہ ہو۔ اس اکائی میں مغل حکمرانوں کی کوششوں سے جو مشترکہ تہذیب و تمدن کی تشکیل ہوئی اور فروغ ملا اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل عہد میں فروغ پانے والے زبان و ادب سے واقف ہو جائیں گے۔
- عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو کے علاوہ دوسری صوبائی زبان کا ادب کیسا تھا اور ان زبانوں میں مختلف موضوعات پر کون کون سے کتابیں لکھی گئیں اور کن کتابوں کا دوسری زبان میں ترجمہ ہوا، جان سکیں گے۔
- مختلف زبانوں کے اہم شاعر اور مصنفین کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- مغلوں نے ہندوستان میں کہاں کہاں مدارس قائم کیے اور مغلوں کے عہد میں تعلیم کے اہم مراکز معلوم کر پائیں گے۔
- مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- مشترکہ ثقافت کسے کہتے ہیں اور یہ کس طرح وجود میں آئی اور مغلوں کے عہد میں کس طرح پروان چڑھی، یہ جان پائیں گے۔

15.2 زبان و ادب (Language and Literature)

زبان و ادب کے تحت یہاں فارسی، ترکی، عربی، سنسکرت، ہندی اور اردو زبانوں اور ان کے ادب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زیر مطالعہ عہد میں پشتو، کشمیری، سندھی، بنگالی، آسامی، اڑیہ، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، کنڑ، تامل اور ملیالم جیسی علاقائی زبانوں میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن طوالت کے باعث ان کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔

15.2.1 فارسی (Persian)

گیارہویں صدی کی ابتداء میں فارسی ہندوستانی مسلمانوں کے ادب کی زبان بن گئی اور بعد میں انتظامیہ کی بھی زبان بن گئی۔ پہلا فارسی شاعر لاہور میں مسعود سعد سلمان ہوا جبکہ ہندوستان کے فارسی زبان ادب کا سب سے بڑا مصنف امیر خسرو تھا۔ مغل عہد میں ایسے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے اچھی فارسی لکھی۔ 1526ء میں جب بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی تو اس وقت فارسی زبان اپنے عروج پر تھی۔ بابر نے اپنی ترکی نظموں کے ساتھ معتدل قسم کے اچھے فارسی شعر خود کہے اور اس کے بیٹے ہمایوں کی نظموں اور بیٹی گلبدن بانو بیگم کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی زبان کا عام چلن تھا۔ ہمایوں نے اپنے عہد میں فارسی زبان کے مصنفین کی سرپرستی کی۔ وہ شعراء کو اپنی مجلسوں میں شریک رکھتا تھا۔ اس کے دربار سے جواد باء و شعراء منسلک تھے ان میں بیرم خان، نادری سمرقندلی، خوندمیر، جواہر آفتابچی، بایزید بیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اکبر (1556-1605) کے عہد میں مغل سلطنت میں ہر طرح کے مصنفین اور مترجمین تھے جنہوں نے ہر فن میں اپنی تخلیقات پیش کیں اور سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم بھی کیے۔ خان خانان نے فارسی شعر و ادب کے فروغ میں بڑا کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں فارسی زبان کے 104 شاعروں کی سرپرستی کی۔ اکبر کے عہد میں تصنیف و تراجم کا بہت کام ہوا جن کتابوں کے سنسکرت سے فارسی تراجم ہوئے ان میں مہابھارت، رامائن، لیلاوتی، کلیلہ ودمنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ترکی سے فارسی میں تزک بابری کا ترجمہ ہوا جس کے مترجم عبدالرحیم خان خاں ہیں۔ اکبر کے عہد میں جو کتابیں تالیف ہوئیں ان میں تاریخ الفی، اکبر نامہ، آئین اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اکبر کے عہد کے نثر نگاروں میں ابوالفضل کو (1551-1602) سب سے نمایاں مقام حاصل ہے وہ نہایت آراستہ نثر لکھتا تھا جس میں اس کی دوررس خیال آرائی، تازگی کی کمی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ نثر نگاری میں اس کی مثال دی جاتی تھی۔ اس کی کتابوں میں اکبر نامہ اور آئین اکبری ہے۔ ان میں مغلوں کے انتظام حکومت اور صوبوں کے نظم و نسق کے ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب و تمدن اور علوم کا ذکر ملتا ہے۔ ابوالفضل کا بھائی فیضی دربار اکبری کا ملک الشعرا تھا۔ اکبر نامہ کی طرح کئی کتابیں سترھویں صدی میں لکھی گئیں جن میں عبدالحمید لاہوری اور محمد حارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں جو "بادشاہ نامہ" کے نام سے ہیں۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی محمد کاظم کی عالمگیر نامہ ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں غیر سرکاری طور پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جس کے مصنفین میں ہندو مسلم دونوں ہیں۔

تاریخ نویسی کے میدان میں بابر (1526-1530) کی تزک بابری کے ساتھ ایک نئی صنف وجود میں آئی۔ اس کے بعد جہانگیر کی تزک جہانگیری جو بابر نامہ کی طرح سادہ طرز میں لکھی گئی ہے، اس میں آرٹ اور قدرتی مناظر کی عکاسی بہت ہی سلیقے سے کی گئی ہے۔ مختلف علاقوں کی تفصیلی تاریخیں لکھی گئیں مثلاً میر معصوم کی لکھی ہوئی سندھ کی تاریخ اور علی محمد کی مراۃ محمدی قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کی عام تاریخ بھی لکھی گئی اس میں نظام الدین احمد کی طبقات اکبری اور مرزا محمد قاسم فرشتہ کی "تاریخ فرشتہ" اہم ہیں۔ عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کو بھی مجموعی تاریخ کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مغل عہد میں ہم کو ایسے تذکرے بھی ملتے ہیں جن میں امراء، علماء، شعراء اور مذہبی سربراہوں کی سوانح ملتی ہیں۔ اس قسم کا سب سے اہم تذکرہ شاہنواز خان کا "مآثر الامراء"

ہے۔اس میں مغل امراء کی سوانح درج ہے۔فارسی لغت نگاری میں جمال الدین حسین انجونی کی "فرہنگ جہانگیری"،اور عبدالرحمان ٹھٹوی کی "فرہنگ رشیدی" اور ٹیک چند بہادر کی 'بہار عجم' اہم ہیں۔ مغل ہندوستان میں لکھی گئی فارسی کتب کا واحد حصہ مذہبی تحریروں پر مشتمل تھا۔مذاہب سے متعلق لکھی گئی کتاب جو بہت مشہور ہوئی "دبستان مذاہب" ہے لیکن اس کے مصنف کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کون ہے؟

کچھ لوگ اس کا مصنف محسن فانی کو مانتے ہیں۔اس کتاب میں مختلف مذاہب کی تعلیمات اور رواجوں کو غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔فارسی ادب میں قابل قدر اضافہ سنسکرت کتابوں کے ترجموں کے ذریعہ ہوا جو زیادہ تر اکبر کے زیر سرپرستی ہوا،داراشکوہ نے "اپنشدوں" کا ترجمہ "اکبر" کے نام سے کیا۔اسی طرح اس نے "مجمع البحرین" کے نام سے جو کتاب لکھی وہ بھی قابل قدر ہے۔یہ کتاب ہندو اور اسلامی تصوف کے تقابلی مطالعہ پر لکھی گئی ہے۔اس کے علاوہ تاریخ نگاری سے متعلق مذکورہ کتابوں کے علاوہ غیرت خان کی مآثر جہاگیری، عنایت خان کا شاہجہاں نامہ، محمد صالح کی عمل صالح اور خافی خاں کی منتخب اللباب کے علاوہ بندرابن داس کی لب التواریخ۔ سجان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ،چندربھان برہمن کی چہار چمن، بھیم سین کی تاریخ دلکشا اور ایشر داس ناگر کی فتوحات عالمگیری مغلیہ عہد کی اہم ترین فارسی میں لکھی گئی کتابیں ہیں۔فارسی شاعری میں ہندؤں کا حصہ کچھ کم نہیں۔مرزا منوہر،چندربھان برہمن،سالم کشمیری (نومسلم) ،بنوالی داس وغیرہ نے شاعری کی۔ گوکہ ان کا مقابلہ مسلم شاعروں سے نہیں کیا جاسکتا پھر بھی عام مسلم شاعروں سے کم نہیں تھے۔عرفی اور فیضی کو خاصی شہرت ملی۔عرفی کے اشعار اور اس کی مثنوی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔عبدالقادر بیدل کی شاعری جس پر تصوف کی چھاپ نظر آتی ہے وسط ایشیاء میں خاصی مقبول ہوئی۔مذکورہ سطور میں جن چیزوں کا ذکر ہوا ہے اس کی بنیاد پر یہ کہنا بجا ہے کہ مغل عہد میں فارسی زبان وادب کو خوب فروغ ملا اور بہت سے ہندؤں نے بھی فارسی زبان میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔

15.2.2 ترکی (Turkish)

ترکی زبان بابر کے آباءواجداد کی زبان تھی۔یہ زبان ہندوستان میں مغلوں سے قبل بولی جاتی تھی کیونکہ ہندوستان کے بہت سے اعلیٰ خاندان خصوصاً صوفیاء کا تعلق وسط ایشیاء کے اس علاقے سے تھا جسے آج ازبکستان کہا جاتا ہے۔ایسے خاندان اپنے گھروں پر ترکی بولا کرتے تھے۔ بابر (1530-1526) نے اپنی خود نوشت ترکی میں لکھی جو ترکی ادب کا شاہکار ہے۔بابر کے عہد سے ہندوستان میں ترکی الفاظ کا استعمال وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔فوجی اور شکاری بولی ترکی تھی۔خاندانی القاب وآداب کے الفاظ بھی ترکی تھے۔ترکی الفاظ بتدریج ہندوستانی زبان میں اپنی جگہ بنالئے جیسے اردو خود ترکی لفظ ہے۔خاندانی نام جیسے آپا (بڑی بہن)،اتا (والد) کوکا (رضاعی بھائی) بینگا (بھاوج) سلج (بیگ) بے (محترم) اور خان (جناب) سب ترکی ہیں۔زنانہ ناموں میں بیگم آج بھی مستعمل ہے۔بابر ترکی کی زبان روانی سے لکھتا اور بولتا تھا اس نے تزک بابری کے علاوہ بہت سی نظمیں بھی ترکی میں لکھی۔بابر کا بیٹا کامران مرزا ترکی کا اعلیٰ شاعر تھا۔کامران کی شادی سندھ کے ارغون سلطان حسین کی لڑکی سے ہوئی تھی، ٹھٹہ،سندھ کے ارغون دربار میں ترکی بولی جاتی تھی۔ترکی زبان فوج میں مقبول تھی۔فوجی سالار بیرم خان نے ایک عمدہ دیوان ترکی اور فارسی میں منظوم کیا اور بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں نے تزک بابری کا ترکی میں ترجمہ کیا اور بہت سی

نظمیں ترکی زبان میں کہیں۔ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ہمایوں نے اپنے ایک ملازم سے ترکی میں بات کی اس سے یہ نتیجہ اخذ کیاجاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے آباواجداد کی زبان دربار میں زندہ رکھی۔ جہانگیر نے بڑے فخر کے ساتھ کہاکہ میری پرورش ہندوستان میں ہوئی لیکن میں ترکی سے نابلد نہیں ہوں اور اس نے بابر کی تزک کے ایک نامکمل مسودے کو ترکی میں مکمل کیا۔ مغل عہد میں عثمانی ترکوں سے تعلق کا مطلب تھا کہ دونوں مملکتوں کے تعلیم یافتہ لوگ ایک دوسرے کی ادبی روایتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ خرم (شاہجہاں) ترکی زبان جانتا تھا۔ شاہجہاں کے ایک قریبی دوست نے عثمانی سلطان مراد چہارم کو اپنی بات ترکی میں سمجھائی۔ ترکی سندھ اور دلی ہی میں نہیں بلکہ دکن میں بھی شاہی گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔اورنگ زیب کے عہد میں لغت نامہ ترکی اور فرہنگ تیار کی گئی اور بعد میں اسی طرح کی دوسری کتابیں لکھی گئیں۔ازفری گرگانی جو 1758ء میں دہلی کے لال قلعہ میں پیدا ہوا تھا اس نے اودھ (لکھنؤ) کے دربار میں رہ کر ایک ترکی لغت "فرہنگ ازفری" کے نام سے تیار کی۔ازفری نے ترکی لوگوں کو سکھائی بھی۔خان عالم بہادر فاروق میسور کے فرمانروا(1792-1854) نے ازفری سے ترکی سیکھی۔مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ مغل عہد میں ترکی زبان پڑھنے، لکھنے اور سیکھنے کا رواج تھا۔

15.2.3 عربی (Arabic)

عربی ابتداء ہی سے اسلام اور مسلمانوں کی زبان رہی ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے ہی علم دین، فقہ، حدیث اور تفسیر و فلسفہ پر وافر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ حدیث کا علم ہندوستان میں خوب فروغ پایا۔اسی طرح عربی نحو و صرف یا مدرسوں میں نصاب میں شامل عربی کتابیں لکھی اور پڑھی جاتی رہی ہیں۔ عربی کی درسی کتابیں اکثر سلیس عربی میں ہوتی تھیں۔الغزالی کی کتابیں یا پھر صوفی ازم سے تعلق رکھنے والی کتاب آداب المریدین بہت مقبول ہوئیں۔اسی طرح ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم نے ہندوستان میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔اسی طرح غوث گوالیاری کی کتاب 'جواہر خمسہ' (پانچ جواہر) عربی اور فارسی دونوں زبان میں تھی۔ مغل عہد میں گو کہ فارسی کا عام چلن تھا پھر بھی علماء دین عربی میں کتابیں لکھتے رہے۔ برہان پور کے علی متقی کا اہم مجموعہ احادیث "کنز العمال" بہت مشہور ہوا۔ مغل عہد میں یہ مقبول ترین کتاب تھی۔ مغل امراء شیخ احمد سرہندی نے جو خطوط لکھے ان میں بعض خطوط عربی میں تھے۔ محدث عبدالحق دہلی جن کی وفات 1642ء میں ہوئی عربی میں بھی لکھا کرتے تھے۔ عہد اکبر میں بہت سی عربی کتابوں کے فارسی تراجم بھی ہوئے جس میں دمیری کی شہرہ آفاق کتاب 'حیٰوۃ الحیوان' کا ترجمہ شیخ مبارک ناگوری نے فارسی زبان میں کیا۔ عربی کی ضخیم کتاب 'جامع رشیدی' کا ترجمہ بدایونی نے کیا۔شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی کی کتاب 'معجم البلدان' کا فارسی ترجمہ ملا احمد ٹھٹوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور دوسرے علماء نے کیا۔اکبر نے خاص طور سے شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لئے "تاریخ الحکماء" کا فارسی ترجمہ مقصود علی تبریزی سے کرایا اور اس نام کا نزھۃ الارواح و نزھۃ الافراح" رکھا۔ شیخ الاسلام عبداللہ سلطان پوری جو اکبر کے عہد کے عالم تھے انہوں نے عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں جن میں "عصمۃ الانبیاء" کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ شیخ عبدالنبی کی عربی زبان پر اچھی گرفت تھی انہوں نے بھی بہت سی کتابیں لکھیں جن "رسالۃ فی حرمۃ السماع" ہے اس کا قلمی نسخہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ملک الشعراء فیضی کو عربی زبان وادب پر پوری قدرت حاصل تھی۔اس نے عربی نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ عربی میں کچھ اشعار بھی ہیں اور ایک تفسیر "سواطع الالہام" کے نام سے ہے

۔ یہ نہایت مشکل تفسیر ہے۔ یہ بے لفظ لکھی گئی۔ علم اخلاق سے متعلق اس کی ایک کتاب "مورد الکلم وسلک الدرر الحکم" عربی میں ہے۔ اس کا مآخذ قرآن وحدیث ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی سواطع الالہام کے بارے میں کہتے ہیں۔ 'تفسیر سواطع الالہام فیضی کی قدرت، زبان وندرت کا فکر کا شاہکار ہے۔ بعض جگہ مطلب معموں میں بیان کیا گیا ہے جس نے کتاب کی افادیت کو کم کر دیا ہے اور ذہن پر بیجا زور پڑتا ہے۔'

اکبر کے عہد کے عربی دان علماء میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابوں میں عربی میں حاشیہ لکھا مشہور ہے کہ شرح جامی سے لیکر تفسیر بیضادی تک کل تیس کتابوں کے شروح وحواشی انہوں نے عربی میں لکھے۔ اور یہ سب کتابیں زیادہ تر فقہ، تفسیر اور حدیث کے ساتھ منطق، فلسفہ، کلام وتصوف حتیٰ کہ ریاضی وہیت کے فنون پر مشتمل ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو اپنے وقت میں نصاب تعلیم کی ضرورتیں پوری کرتی تھیں۔ اکبری عہد کے نامور عالم محمد طاہر پٹنی نے عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے مشہور "مجمع بحار الانوار" ہے۔ اس میں ان لغات ومحاورات کی تشریح ہے جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ جہانگیر کے عہد کے علماء میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی، مولانا تقی شوستری، مرزا قاسم گیلانی، ملا جوہر ناتھ کشمیری، شیخ یعقوب صرفی کشمیری عربی کے مایہ ناز عالم ومصنف تھے۔ ان لوگوں نے حدیث وفقہ، منطق اور تصوف پر عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ عہد شاہجہانی کے علماء میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی جو معقولات ومنقولات کے درس میں مہارت رکھتے تھے ان کی تصانیف میں، حاشیہ، تفسیر بیضادی، حاشیہ خیالی، حاشیہ بر شرح شمسیہ وغیرہ ہیں۔ ملا محمد جونپوری ایک متکلم اور مناظر کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ ان کی کتاب "الفرائد فی شرح الفوائد" علم معانی وبیان میں ایک شاندار کتاب ہے جو اصل میں فوائد غوثیہ کی شرح ہے۔ لیکن جس کتاب نے ملا محمود کو حیات جاوید بخشا وہ کتاب "شمس بازغہ" ہے۔ ملا محمود کو ہیئت ونجوم پر بھی پوری مہارت تھی۔ دیوان عبد الرشید جونپوری مایہ ناز مصنف تھے۔ جونپور سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی تخلیقات فکر وفلسفہ، اخلاق وتصوف پر مشتمل ہیں۔ فن مناظرہ میں الرشیدیہ کے علاوہ شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح زاد السالکین، مقصود الطالبین ان کی اہم کتابیں ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں عربی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں جیسے ملا جیون نے "التفسیرات الاحمدیہ فی آیات القرآنیہ" لکھی۔ ملا عبد السلام دیوی نے بہت سی کتابیں لکھیں جن "حاشیہ علیٰ شرح العقائد، شرح منار الاصول، حاشیہ علیٰ الہدایہ" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ حافظ محب اللہ بہاری فقہ، اصول فقہ اور منطق کے نکتہ شناس تھے۔ ان کی تصانیف میں "سلم العلوم"، "مسلم الثبوت" بالترتیب فن منطق اور اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ فن فلسفہ میں "جواہر الفرد" جزء لایتجزیٰ کے مسئلہ سے متعلق اہم کتاب ہے۔ ان کی سب کتابیں عربی درسگاہوں میں مشہور ومقبول ہوئیں اور نصاب تعلیم کا حصہ بنیں۔

شیخ غلام نقش بندی لکھنوی کی تفسیر پر کتاب "انوار الفرقان واز ھار القرآن" ہے۔ فقہ حنفی سے متعلق فتاویٰ کا مجموعہ فتاویٰ عالمگیری بھی لائق توجہ ہے اسے اورنگ زیب نے علماء کی ایک جماعت سے تیار کرایا تھا۔ یہ کتاب سترھویں صدی کے اواخر میں مسلم قانون پر اہم کتاب ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں قرآن کی سورتوں کی فہرست "نجوم القرآن" کے نام سے 1691ء میں تیار ہوئی۔ عربی میں دینیاتی اور مذہبی ادب پر 18ویں صدی کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" بہت ہی مشہور ہوئی اس کے مصنف شاہ ولی اللہ دہلوی (1762-1702) ہیں۔ یہ

کتاب اسلامی مسائل اور ان کے امکانی حل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی اور ہندوستان کے بعض عربی مدارس میں آج بھی داخل نصاب ہے۔ عبدالعزیز بلگرامی جن کا انتقال 1726ء میں ہوا۔ انہوں نے محمد صلعم کی تعریف میں نعتیں لکھیں اور ان کے بھتیجے آزاد بلگرامی نے "سبحۃ المرجان" لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان پیغمبر کا اصل وطن ہے۔ عربی اور سنسکرت میں تعلق ہے۔ شاہ ولی اللہ کے ایک شاگرد سید مرتضیٰ نے عربی کی زبردست لغت "تاج العروس" کے نام سے لکھی ہے۔ سید مرتضیٰ نے غزالی کی "احیاء علوم الدین" پر دس جلدوں میں توضیحی حواشی لکھے۔ سترھویں صدی میں گولکنڈہ کے دربار میں عربی شاعروں اور مصنفوں کا اجتماع حد کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اسی طرح دہلی کے اجڑنے کے بعد اودھ بھی تہذیب کا مرکز بنا۔ اودھ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص احمد ابن محمد الیمنی الشروانی نے مقامات حریری کے انداز پر ایک کتاب "مناقب الحیدریہ" لکھی۔ یہ کتاب لکھنؤ کے حکمراں غازی الدین حیدر کے نام معنون تھی۔ مذکورہ علماء اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت ہے کہ مسلم ہندوستان میں عربی سے دلچسپی برقرار تھی اور آج بھی ہندوستان کے مدارس اور جامعات میں عربی کی تعلیم کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

15.2.4 سنسکرت (Sanskrit)

مغل حکومت میں سنسکرت ادب کی ترویج واشاعت اور آبیاری مسلسل ہوتی رہی۔ مغل عہد میں سنسکرت کی زیادہ تر کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ یہ کتابیں زیادہ تر مذہبی امور سے متعلق تھیں۔ خصوصاً یہ کتابیں مذہب، فلسفہ اور قانون سے تعلق رکھتی تھیں۔ "امر تاکنڈ" بہت پہلے عربی رسم الخط میں "بحر الحیات" کے نام سے لکھی جاچکی تھی۔ اکبر کے عہد میں سنسکرت خاص توجہ کا مرکز بنی اور سنسکرت کی بہت سی کتابیں ہندو مورخین اور مصنفوں نے دربار میں تخلیق کیں۔ ایک جین سمیاس مدار جی 1592ء میں اکبر کو سنسکرت میں لکھی اپنی کتاب پیش کرنے لاہور آیا۔ اکبر نے اس سے خوش ہو کر "اپادھیائے" کا لقب دیا۔ اکبر کے عہد میں ایک جین شاعر نے 128 سنسکرت نظمیں لکھیں۔ "رودر کوی" نے سنسکرت میں عبدالرحیم خان خاناں کی تعریف میں، اور اکبر کے بیٹے دانیال، جہانگیر کے بیٹے خرم (شاہجہاں) کی تعریف میں گانے گائے۔ بنارس کے ایک پنڈت نے اس توقع سے شاہجہاں کی تعریف میں گانے گائے کہ اس کو سن کر بادشاہ تیرتھ یاترا پر لگنے والا محصول منسوخ کردے گا۔ فلکیات، نجوم اور طب پر کتابیں سنسکرت میں لکھی گئیں۔ اکبر کو ہندوؤں کے قانونی مسائل پر ہدایتیں سنسکرت کے دانشوروں سے ملتی تھیں۔ وزیر مالیات ٹوڈر مل نے ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا سنسکرت میں تدوین کیا اور سنسکرت ادب اور تہذیبی کردار پر لکھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ایک سنسکرت قواعد لکھی گئی۔ شاہجہاں کے عہد میں عربی سنسکرت لغت 1648ء میں تیار کی گئی تھی۔ اسے کسی ودوان گرایا (Vadangaraya) نے تیار کیا تھا۔ اس کا سارا زور فلکیات کی اصطلاحوں پر تھا۔

کہانیاں، افسانے اور روایات سنسکرت میں برابر قلم بند ہوتے رہے۔ بلال سین نے 16 ویں صدی میں راجہ بھوج کے دربار کے بارے میں پر لطف روایتیں اپنی کتاب بھوج پربندھ (Bhojaprabandh) میں یکجا کی تھی۔ سترھویں صدی میں نرائن (Narayana) نے مقفع نثر میں اگنی دیوتا کی بیوی سواہا (Suaha) اور چندرما کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ کام سوتر (Kamasutra) سے ملتا جلتا عشق کے فن کا بیان کلیان مل (Kalyanmala) کی انگ رنگ (Anangaranga) میں ملتا ہے جو سولھویں صدی کی

تصنیف ہے۔ سنسکرت کے سائنٹفک ادب میں قابل قدر اضافہ ان تحریروں کے ذریعہ بھی ہوا جن میں یونانی اور عرب علوم کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ان میں سب سے اہم اکبر کے دربار کے منجم نیل کنٹھ کی کتاب تاجک نیل کنٹھی تھی۔1643ء میں ویدا نگارایا (Vedangaraya)نے اپنی کتاب 'پارسی پرکاش' تصنیف کی جو علم فلکیات سے تعلق رکھنے والے الفاظ کی فارسی - سنسکرت فرہنگ ہے۔ 18ویں صدی کے اوائل میں سمراٹ جگن ناتھ نے جنہیں جے سنگ سوائی کی سرپرستی حاصل تھی، بطلیموس کی کتاب المجسطی (Almagist)اور اقلیدس کی جیومیٹری کی بعض تحریروں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مغل عہد میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ نگاری کا طریقہ یہ تھا کہ ایک صاحب علم برہمن پہلے فارسی یا ہندی میں ترجمہ کرتے پھر مسلم مترجمین اس کو نفیس فارسی میں بدلتے۔

15.2.5 ہندی (Hindi)

مغل حکمراں نے ترکی اور فارسی کے علاوہ ہندی اور اس سے تعلق رکھنے والی نئی ہندوستانی زبانوں میں دلچسپی لی۔ ہندی کی پہلی رزمیہ نظموں مولانا داؤد کی "لورچندا" کے بعد جو چھودھویں صدی میں تصنیف کی گئی تھی، مشہور رزمیہ نظم "پدماوت" لکھی گئی۔ اکبر فارسی کے علاوہ ہندی گیتوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ تھوڑی ہندی بول لیتا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ برہان الدین جو کالپی کے رہنے والے تھے انہوں نے اپنی صوفیانہ ہندی شاعری 1559ء میں چنار میں سنائی تھی۔ اکبر کے عہد میں تلسی داس نے اودھی میں "رام چرت مانس" تصنیف کی۔ سورداس (1550) کے نغمے جن میں کرشن کے ناز و نیاز کا ذکر ہے بڑی اہم کتاب ہے۔ بہاری لال (1662ء) کی "ست سائی" بھی بہت مقبول ہوئی۔ اکبر کا سب سے چھوٹا بیٹا دانیال ہندی شاعری کا دلدادہ تھا اور اس نے خود بھی ہندی میں کچھ شعر کہے تھے۔ ایک مسلم شاعرہ "تاج" تھی اس نے بھی ہندی میں نظمیں تصنیف کی۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں بہت سے امیروں نے ہندی زبان سے اپنے لگاؤ کا دعویٰ کیا تھا ان میں صوفی شاعر "خوب محمد چشتی" تھے جو اکبر کے وقت میں گجرات میں رہتے تھے جو بہت سی گجراتی اور ہندی تحریروں کے مصنف تھے۔ ہندی شاعری سے دلچسپی عہد شاہجہاں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ہندی کوی پنڈت رسا گنگا دھر کو شاہجہاں کا "مہا کوی رائے" درباری کوی کا نام دیا گیا تھا۔ بہت سی کتابیں ہندی میں علم نجوم پر بھی لکھی گئیں تھیں۔ برج کے ایک شاعر بنارسی داس نے نظم میں اپنی سوانح بیان کی جو اردھ کتھانک کے نام سے 1641 میں منظر عام پر آئی۔ جدید ہندی میں لکھنے والے سدا سکھ لال اور انشاء اللہ خان انشاء تھے۔ انشاء اردو کے مشہور شاعر اور ہندوستانی بولیوں کے عالم تھے۔ انہوں نے ہندی نثر میں غیر مذہبی موضوعات پر نہایت پر اثر مضامین لکھے۔

15.2.5 اردو (Urdu)

اردو ایک مخلوط زبان وجود میں آئی جو صوفی خانقاہوں میں بولی جاتی تھی۔ امیر خسرو نے سلطنت عہد میں اسکے احیاء کے لئے اہم کام کیے۔ اس زبان کو "اردو" کا نام دیا گیا۔ 15ویں صدی کے اختتام پر اردو دکن میں ایک ادبی زبان کی صورت میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے اطراف کے علاقوں میں استعمال ہو رہی تھی۔ صوفیانہ اور غیر مذہبی شاعری میں اس کا استعمال ہو رہا تھا۔ دکن میں یہ زبان خسروی کے نام سے مشہور تھی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہ (1580-1612) اور بیجاپور کے علی عادل شاہ (1580-1627) کی شاعری اور اچھی نظموں میں اردو کا استعمال ہوتا تھا۔ 1700ء کے قریب کچھ مصنفوں نے اردو کو باضابطہ ہندوستانی بنانے میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ ولی دکنی (اردو کے شاعر)

جنوب چھوڑ کر دہلی چلے آئے جہاں انہوں نے اپنی شاعرانہ زبان کا مظاہرہ کیا۔اس کا اثر ہوا کہ دہلی کے چند ایک شاعروں نے اردوئے معلیٰ کی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔یہ زبان "ریختہ" کہلائی جس میں ہندوستانی، ترکی اور فارسی عناصر کا اضافہ کیا گیا تھا۔دہلی کا پہلا ریختہ شاعر "جعفر زٹلی" تھا۔اٹھارویں صدی کے اردو کے چار شاعر بہت مقبول ہوئے۔ان میں خواجہ میر درد، مرزا سودا، مرزا مظہر جاناں اور میر حسن ہیں۔ان کی مثنوی "قصہ بے نظیر" بہت مشہور ہے۔ان کی مثنوی باغوں، محلوں، کپڑوں اور عاشقوں کے رواجوں کے بارے میں روداد پیش کرتی ہے۔میر تقی میر غزل گو شاعر تھے۔اپنی نثری تحریر کے لیے "میر نے فارسی استعمال کی۔درد نے اردو میں شاعری کی جن میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔سودا نے بڑی تعداد میں مرثیے لکھے۔اردو زبان مذکورہ شاعروں کے عہد میں خوب پھلی پھولی ان شعراء نے جہاں ایک طرف فارسی ادب کے تمام تر تصورات اور اسالیب کو اپنایا وہاں اس میں جاری وساری تشکیک کی روایت کو بھی قبول کیا۔انہوں نے اردو کو نئے طرز فکر اور محاوروں سے روشناس کیا۔وقت گذرنے کے ساتھ ایک نئی مشترکہ بولی (ہندوستانی) وجود میں آئی جو مختلف ہندوستانی بولیوں سے ایک علاحدہ قسم کی چیز بھی جس نے ادبی ہندی اور اردو دونوں سے بہت کچھ حاصل کیا اور جس کی دونوں کے ساتھ بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

1000ء میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج بنایا اور یہاں سے اردو پھلی پھولی۔ مغل مملکت کی آخری دہائیوں میں اردو کی عملی کام کے زبان کے طور پر نشو ونما کی شروعات ہوگئی۔ مغل سلطنت کے آخری ایام عظیم ادبی پیداوار کے ایام تھے۔لکھنؤ میں اردو فصاحت کی نئی بلندیوں تک پہنچ گئی۔دہلی میں اردو کی روایتی شکل پھل پھول رہی تھی۔البتہ مرزا اسد اللہ خان غالب جو فارسی اور اردو دونوں میں لکھتے تھے عظیم شاعر کی شکل میں جانے پہچانے گئے۔غالب کے اردو خطوط اردو ادب کے شاہکار ہیں۔بہادر شاہ ظفر کا شمار چند بہترین اردو کے شاعروں میں تھا۔جن کی غزلیں آج تک موسیقی کی مجلسوں میں پڑھی جاتی ہیں۔اردو زبان نے اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ مغل سلطنت کے زوال کیا بعد کی جو آج پاکستان اور شمالی ہندوستان کے زیادہ تر حصے کی زبان ہے۔مذکورہ زبانوں کے ساتھ ہی علاقائی سطح پر بھی بہت سی زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں اور ان میں سے بہت سی زبانوں میں اچھے ادب بھی تخلیق ہوئے۔ان میں قابل ذکر پشتو، کشمیری، پنجابی ،سندھی، بنگالی، آسامی، اڑیہ، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، کنڑ، تامل اور ملیالم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

15.3 تعلیمی مراکز (Learning Centres)

ہندوستان میں مغلوں کے عہد سے تعلیم میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔تعلیم کی سرپرستی میں مغل بادشاہ اپنی پیشرو حکمرانوں سے کہیں آگے تھے۔تعلیمی اداروں کا قیام بابر کے انتظامی کاموں کا اہم جز تھا۔ہمایوں کے عہد میں علم ہئیت اور علم جغرافیہ نے ترقی کی۔شیر شاہ کے تعلیمی اداروں میں نارنول کا مدرسہ شیر شاہی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔یہ بہت عظیم الشان مدرسہ تھا۔یہ 1520ء میں اس کی تخت نشینی سے پہلے قائم ہوا تھا۔اسی طرح اکبر سے لیکر آخری مغل بادشاہ تک باستثناء چند سب علم پرور اور علم پرست تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں دہلی ،لاہور، آگرہ، اودھ، گجرات وغیرہ تعلیم کے مرکز تھے۔ان مقامات پر بہت سے مدارس قائم تھے۔جن کی سرپرستی شاہان وقت کیا کرتے تھے ۔اس کے علاوہ گاؤں اور قصبات میں بھی تعلیم کے لیے مدارس قائم تھے جو یا تو کسی فرد واحد کی نگرانی میں چلتے تھے یا چند لوگ مل کر چلاتے

تھے۔مذکورہ تعلیم کے مراکز میں سے آئندہ سطور میں ہم صرف مغل عہد کے تعلیمی مراکز کا ذکر کریں گے۔

15.3.1 دہلی (Delhi)

ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے۔ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر جو ایک چھت تھی وہ دراصل ایک مدرسہ تھا جس میں بڑے بڑے اساتذہ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبہ کی اقامت کے لئے بنے ہوئے تھے۔عہد اکبری میں ماہم بیگم نے پرانے قلعہ کے پاس ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا اور مدرسہ کا نام خیر المنازل رکھا گیا۔شیخ عبد الحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی تھی۔دلی کی جامع مسجد کے جنوبی رخ پر شاہی مدرسہ تھا جسے شاہجہاں کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔اس مدرسہ کا نام دار البقاء تھا۔بہادر شاہ کے عہد میں ایک نیا مدرسہ دلی میں قائم ہوا اس کے بانی غازی الدین خان فیروز جنگ تھے۔دلی کا کثیر المنافع مدرسہ شاہ عبد الرحیم دہلوی کا مدرسہ رحیمیہ ہے۔اس کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبد الرحیم نے رکھی اور اسی میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔اسی درسگاہ سے ان کے فرزند شاہ ولی اللہ نے تعلیم پائی اور پھر وہیں درس بھی دیا اور شاہ عبد العزیز نے بھی یہیں تعلیم پائی اور یہیں درس بھی دیتے رہے۔یہی وہ مدرسہ تھا جس میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ اسمٰعیل، شاہ اسحٰق اور شاہ عبد القادر وغیرہ کی تعلیم ہوئی تھی۔

15.3.2 پنجاب/لاہور (Punjab/Lahore)

پنجاب کا پایہ تخت لاہور تھا۔لاہور میں وزیر خان کی مسجد مدرسہ کا بھی کام دیتی تھی۔اورنگ زیب کے عہد میں سیالکوٹ کے علمی شان وشکوہ کا پتہ چلتا ہے۔اس شہر نے علمی مرکزیت حاصل کرلی تھی۔یہاں بڑے بڑے علماء تھے۔ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور ان کے صاحبزادے ملا عبد اللہ اس مدرسہ کے ناظم رہے۔سیالکوٹ کی علمی مرکزیت کا نشان اکبر کے عہد کے بعد سے ملتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں علم وفضل کا چرچا پہلے سے تھا۔خلاصۃ التواریخ کے مصنف نے بھی سیالکوٹ کے علمی وادبی مرکز ہونے کی بات اپنی کتاب میں لکھی ۔لاہور علمی شخصیت کا گہوارہ تھا۔یہیں پر تاریخ الفی کی تصنیف ہوئی، مہابھارت، راج ترنگنی کے فارسی ترجمے ہوئے:

15.3.3 نارنول (Narnaul)

شیر شاہ نے ایک مدرسہ نارنول میں قائم کیا تھا۔مدرسہ کی عمارت بہت بڑی اور شاندار تھی۔یہ مدرسہ شیر شاہ نے اپنے عہد حکومت سے پہلے دادا کے انتقال کے موقع پر بطور کار خیر بنوایا تھا۔

15.3.4 آگرہ (Agra)

یہ شہر تعلیمی حیثیت سے ایک مدت تک فخر روزگار رہا۔یہاں متعدد مدارس قائم تھے۔یہاں کی تعلیم گاہوں کے لئے شیراز سے علماء بلائے جاتے تھے۔لالہ سیل چند اپنی کتاب تفریح العمارات میں لکھتے ہیں کہ ان کے عہد میں (انیسویں صدی کے نصف آخر) آگرہ میں ایک بڑا مدرسہ موجود تھا۔اب اس مدرسہ کے آثار مٹ چکے ہیں یہاں ایک بڑا محلہ آباد ہوگیا ہے۔اکبر نے اس مدرسہ کے لیے چلپی بیگ نامی ایک

شیرازی کو بلایا تھا۔ شیخ زین الدین نے آگرہ میں اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا جس کے مصارف کا تعلق ان کی ذات سے تھا۔ آگرہ نے عہد اکبر میں عروج و ترقی حاصل کی وہ جہانگیر کے عہد تک باقی رہی۔ مولانا علاء الدین لاری آگرہ میں درس دیا کرتے تھے یہاں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جو اس کے نام سے مشہور ہوا۔ آگرہ کی جامع مسجد کی تعمیر جہاں آرا بیگم نے کرائی تھی اسی کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جو بہت دنوں تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا آگرہ میں ایک مدرسہ جمنا کے مقابل بھی قائم ہوا تھا۔ آگرہ اکبر کے عہد میں علوم و فنون کا ملجاء و ماویٰ اور تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا۔

15.3.5 اودھ (Awadh)

اودھ اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ اس صوبہ میں بہت سے ممتاز علماء و فضلاء تھے جو درس و تدریس میں لگے رہتے تھے اور دور دراز کے طلبہ تحصیل علوم کیا کرتے تھے۔ یہاں کے قصبوں میں ایک قصبہ سہالی تھا جو لکھنؤ سے 22 میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس قصبہ میں شیخ نظام الدین انصاری مشہور عالم دین تھے جو درس و تدریس میں مشغول تھے۔ جب اکبر کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے لیے جاگیر مقرر ہوئی تاکہ وہ سکون کے ساتھ مشغلہ درس و تدریس میں مصروف رہیں۔ ان کی درسگاہ میں طلباء کی سکونت کا انتظام بھی تھا۔ ملا قطب الدین شہید نظام الدین کی نسل کے تھے۔ انہوں نے بھی سہالی میں سلسلہ درس جاری کیا۔ ان کی وفات کے بعد سہالی کی بزم علمی فرنگی محل (لکھنؤ) کو منتقل ہو گئی۔

15.3.6 لکھنؤ (فرنگی محل) (Lucknow/Firangi Mahal)

یہ عظیم الشان مدرسہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں قائم ہوا اور اپنے وجود کے لئے اورنگ زیب کی سرپرستی کا ممنون ہے۔ ملا قطب الدین سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین کے فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دارالعلم والعمل بنا دیا۔ یہ 24 برس کی عمر میں مسند پر بیٹھے اور سہالی کا چراغ علم و فضل فرنگی محل میں روشن ہوا۔ فرنگی محل کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلہ میں تجارت کے تعلق سے رہتا تھا جب وہ وطن چلا گیا تو اس کا مکان سرکاری قبضہ میں آگیا اور وہی اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گیا اور اس سے ہزاروں علماء فیض یاب ہو کر نکلے۔ ان میں مولانا عبدالعلی بحر العلوم اور مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

15.3.7 جون پور (Jaunpur)

مسلمانوں کے عہد میں جونپور کی تعلیمی و علمی اہمیت اس درجہ ممتاز تھی کہ اس کو شیراز ہند کا لقب دیا گیا۔ شاہجہاں فخریہ کہا کرتا تھا کہ ''جونپور شیراز ماست'' اور خاص جونپور کو اس نے شیراز ہند کا خطاب دیا تھا۔ شیر شاہ نے اسی سرزمین پر تعلیم پائی۔ شاہجہاں نے حکام جونپور کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر مدرسہ کے حالات لکھیں، جب شاہجہاں کو کسی نئے مدرسے کے قیام اور استحقاق اعانت کی خبر ملتی تھی تو فوراً اس کے لیے وظائف مقرر کرتا تھا۔ جونپور میں شاہان شرقی کے عہد میں بہت سے مدارس قائم ہوئے جو عہد مغلیہ میں بھی درس و تدریس میں مشغول رہے ان میں سے کچھ آج بھی زندہ ہیں۔ یہاں پر اٹالہ مسجد اور راجی بی بی مسجد کا مدرسہ آج بھی چل رہا ہے۔ بنارس، اعظم گڑھ، غازی پور سب اس زمانے میں جونپور کا حصہ تھے اور ان تمام جگہوں پر علماء و فضلاء کا جمگھٹ تھا اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا۔

15.3.8 گجرات/سورت (Gujrat/Surat)

مغل حکومت اور نگ زیب کے عہد میں وسعت کے لحاظ سے اوج کمال پر پہنچی تو اشاعت تعلیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔اور نگ زیب کے عہد میں بہت سے مدارس قائم تھے جو اس عہد کے شاندار تعلیمی مرکز تھے۔

مدرسہ فیض صفا:۔ نہروالا پٹن میں ایک مدرسہ عالیہ کی بنیاد اور نگ زیب کے عہد میں رکھی گئی جس کا نام فیض صفاء تھا اس میں ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم ہوتی تھی۔اس کے ساتھ مسجد اور دارالاقامہ بھی تھا۔احاطہ مسجد و مدرسہ کے باہر طلباء کے غسل کے لیے قدیم طرز کا حمام بھی تھا اور طلباء کو وظائف بھی ملتے تھے۔

مدرسہ شجاعت خان:۔ اور نگ زیب کے عہد میں شجاعت خان ایک بڑا بیدار مغز گجرات کا صوبہ دار تھا۔اس نے اپنے مقبرہ کے ساتھ ایک عالیشان مدرسہ کی بنیاد رکھی جو 1692ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔اس مدرسہ میں ہر قسم کی تعلیم ہوتی تھی۔دارالاقامہ بھی تھا۔طلباء کے اخراجات کا معقول بندوبست تھا۔مسلم عہد حکومت میں گجرات کی علمی ترقیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔یہاں مدارس اور تعلیم گاہیں بہ کثرت تھیں انہیں میں مدرسہ ہدایت بخش یا مدرسہ شیخ الاسلام بہت مشہور ہے۔

مدرسہ ہدایت بخش:۔ محمد اکرام الدین خان شیخ الاسلام نے بہ مقام احمد آباد محلہ اسٹوریہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام مدرسہ ہدایت بخش رکھا۔1697ء میں اسی کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی۔1690 میں ان عمارتوں کی ابتداء ہوئی اور 1699ء میں مدرسہ، مسجد اور دارالاقامہ بن کر تیار ہو گیا۔مدرسہ کے طلباء کے وظائف اور اخراجات کے لیے متعدد گاؤں وقف تھے۔اس مدرسہ کے مشہور مدرس مولانا نورالدین گجراتی تھے۔مدرسہ ہدایت بخش میں دینی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا۔اس مدرسہ کے سالانہ اخراجات کا کوئی مستقل بندوبست نہ تھا۔طالب علموں نے عہد عالم گیری کے منصب دار شیخ غلام محمد کے توسط سے ایک درخواست برائے تعاون بادشاہ کے حضور ارسال کی جس پر مدرسہ کے مدرسین کے نوٹ کے ساتھ دستخط تھے۔شیخ نورالدین اس مدرسہ کے افسر اعلیٰ تھے۔ملا عبدالنبی جو اس مدرسہ کے استاذ تھے اس درخواست میں لکھا کہ "یہ شاندار مدرسہ تنگ دست معلمین اور نادار طلباء سے بھرا ہوا ہے اور خلیفہ کی امداد واعانت کا مستحق ہے۔اس مدرسے میں غیر ملکی طلباء بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ان غیر ملکی طلباء نے بھی اعانت کے لیے بادشاہ کو ایک درخواست لکھی تھی جن کا مضمون درج ذیل ہے۔

"احمد آباد کے مدرسہ ہدایت بخش کے ہم طلباء عرض پرداز ہیں کہ بادشاہ کے مبارک عہد میں صدر صوبہ شیخ اکرام الدین کی سعی وکوشش سے مدرسہ، مسجد، دارالاقامہ وغیرہ بڑے وسیع پیمانے پر تعمیر ہوئے۔جہاں طلباء دینی علوم حاصل کرتے ہیں اور علماء روحانی مسائل حل کرتے ہیں۔بڑے بڑے علماء مدرسہ سے فارغ اسی مدرسہ میں تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔مدرسہ احمد آباد اور دوسرے مقامات کے طلباء سے بھر گیا ہے جن کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔صدر مذکور ان تمام طلباء کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے، اس لئے ہم لوگ بڑی تنگی اور عسرت کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں۔ہم لوگ امیدوار ہیں کہ کچھ بقدر کفاف طلباء اور مدرسہ کے اخراجات کے

لیے مرحمت ہو تاکہ فراغ بالی کے ساتھ ہم لوگ کسب کمال میں مشغول اور دعائے خیر کرتے رہیں اور ابدالآباد تک یہ مدرسہ جاری رہے اور دین داری قائم رہے"۔ مذکورہ درخواست پر عمل درآمد ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتاالبتہ مرآۃ احمدی میں تین گاؤں کے وقف کا ذکر ہے جن میں ایک میلاد مبارک کے اخراجات کے لئے اور دوسرا تیسرا طلباء و مدرسہ کے اخراجات کے لئے جو دو روپیہ روزانہ تھا۔

مدرسہ بیانہ:۔ مدرسہ بیانہ کو قاضی رفیع الدین نے قاضیوں کی مسجد سے متصل قائم کیا تھا۔ مدرسہ کی عمارت پر جو کتبہ ہے اس سے مدرسہ کی سال بناء 1670ء معلوم ہوتی ہے۔ عہد اورنگ زیب کے کئی پروانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ دور دراز کے علاقوں اور صوبوں میں اورنگ زیب کے حکم سے امراء نے تعلیم کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اورنگ زیب نے مدارس کے قیام اور رکھ رکھاؤ کے علاوہ معلمین اور علماء کے لئے بکثرت مدد معاش کی رقمیں بطور وظائف تعلیمی مقرر کیں۔ اس نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لیے تعلیم کو لازمی و جبری قرار دیا اور اس کے لئے بہترین اساتذہ مقرر کیے۔

15.4 مشترکہ ثقافت (Composite Culture)

ہندوستان میں مسلم تہذیب اور ہندو تہذیب کا سابقہ اور باہمی میل ملاپ او رتاثیر وتاثر کا سلسلہ سندھ میں مسلمانوں کی آمد (712ء) سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ سندھی، گجراتی اور دراوڑی زبانوں میں عربی لفظ بڑی تعداد میں موجود ہیں جو اسی ابتدائی زمانے میں آئے۔ معاشرت اور رسم ورواج وغیرہ میں عرب مسلمانوں اور سندھ سے مدراس تک کے ساحلی علاقوں کے ہندؤں نے ایک دوسرے پر جو اثر ڈالا اس سے مشترکہ ثقافت پروان چڑھی۔ مسلم اور ہندو تہذیب کا سابقہ اصل میں گیارھویں صدی عیسوی میں غزنیوں کے پنجاب اور ملتان پر قبضہ کرنے سے شروع ہو گیا تھا لیکن اسے دراصل تیرھویں صدیء کے شروع میں سلطنت دہلی کے قیام سے سمجھنا چاہیے۔ مغلوں سے پہلے ہندو مسلم منافرت دور کرنے اور انہیں قریب تر لانے میں خود مختار مسلمان حکمرانوں کی خصوصاً بہمنی سلطنت اور اس کی جانشین دکنی ریاستیں اور بنگال و کشمیر کی بادشاہتیں جو دہلی سلطنت (مسلمانوں کے مرکز) سے دور تھیں کا کردار رہا ہے۔ ان کی صلح کل کی پالیسی ہندؤں میں مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں صوفیوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ سب سے اہم جس نے ہندؤں اور مسلمانوں میں ہم آہنگی کی ایک فضا پیدا کر دی وہ بھکتی تحریک تھی۔ دلی سلطنت کے آخری دور میں سکندر لودھی اور بعد میں شیر شاہ جیسے بادشاہوں نے ہندؤں کے ساتھ نرمی اور رواداری برتنے کی پالیسی اختیار کر لی تھی لیکن ابھی اس کی رفتار بہت سست تھی۔ اکبر نے اس رفتار کو تیز کر دیا اور اس ذہنی جمود کو جو اب تک چھایا ہوا تھا اسے اکبر اور اس کے جانشینوں کی علمی و مذہبی رواداری نے دور کر دیا اور اس طرح ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جسے ہم انڈو مسلم کلچر کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ ہندو مسلم تہذیب ہے جو اکبر اور دوسرے مغل بادشاہوں کے دربار میں پرورش پاتی رہی۔ مغل بادشاہوں کی ہمت افزائی سے تصنیف وتالیف اور ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی زبان پر پورا عبور حاصل کر لیا تھا اور نئی مشترکہ تعلیم و تہذیب کو پوری طرح اپنا لیا تھا۔

رامائن اور اتھر وید کے پہلے فارسی تراجم میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ساتھ ایک پنڈت شریک تھے۔اس کے بعد رامائن کے کئی ترجمے ہندؤں نے فارسی نظم و نثر میں کیے، مہابھارت کا ترجمہ ملا عبدالقادر کے علاوہ کئی اور ہندو مسلمان عالموں کا مشترکہ کارنامہ ہے۔ بھگوت پران اور دوسری سنسکرت کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا کام زیادہ تر ہندؤں ہی نے انجام دیا۔ قصے کہانیوں کے علاوہ ہندؤں کی مذہبی کتابیں بھی فارسی میں آگئیں۔دارا شکوہ نے جو ہندو فلسفہ اور تصوف کا دل سے معتقد تھا اپنشدوں، بھگوت گیتا اور یوگ وششٹ کا ترجمہ کرایا اور خود مجمع البحرین کے نام سے ایک کتاب ہندو اور اسلامی تصوف کے تقابلی مطالعہ پر لکھی۔ جہاں ایک طرف مسلم مورخین نے مغل تاریخ پر گرانمایہ کتابیں لکھیں وہیں دوسری طرف ہندو مورخین بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے۔ بندرابن داس کی لب التواریخ، سجان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ اور چندر بھان برہمن کی چہار چمن، بھیم سین کی تاریخ دلکشا اور ایشر داس ناگر کی فتوحات عالمگیری جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ان کتابوں کے پڑھنے سے یہ تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ شخصی اور انفرادی اختلافات سے قطع نظر اس عہد کے ہندو اور مسلم مورخین کا طرز تاریخ نگاری اور زاویہ نگاہ ایک ہی ہے۔ یہ سب لوگ مغلیہ ریاست سے یکساں وابستگی رکھتے ہیں اور تمام واقعات کم و بیش معروضی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

فارسی شاعری، انشاء، خطوط نویسی میں بھی ہندؤں کا حصہ کچھ کم نہیں ہے۔ مرزا منوہر، چندر بھان برہمن، سالم کشمیری، بنوالی داس، وغیرہ اچھے شاعر تھے۔انشاء یعنی خطوط نویسی کو تو ہندؤں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ابوالفضل اور عالمگیر کو چھوڑ کر انشاء کے فن میں کوئی مسلمان منشی ہرکرن، چندر بھان برہمن، منشی مادھورام، منشی لال اور منشی اودھے راج کے مقابلے میں نہیں تھا۔اکبر کے عہد میں ہندی زبان بھی ہندؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے لگی۔اکبر کے دربار کا مغنی سور داس ہندی کا خوش گو شاعر تھا۔ عبدالرحیم خان خانان خود ہندی کا اچھا کوی اور ہندی کویتا کا بڑا قدر دان تھا۔اکبر کے دربار میں ہندی شاعروں میں گنگا نرہری اور بیربل بھی تھا۔اسی طرح کیشو داس، بہاری دیو اور رسکھان چوٹی کے کوی تھے۔ رسکھان مسلمان تھا۔اسی طرح اردو زبان مغلیہ عہد کے آخر میں ہندوستان کی مشترکہ زبان بن گئی۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس میں ایک لسانیاتی امتزاج رونما ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی ترکی اور فارسی چھوڑ دیتے ہیں اور ہندؤں کی زبان اپناتے ہیں۔ فن معماری اور مصوری کی طرح وہ اپنی ضروریات کے مطابق اس میں بھی ترمیم کرتے ہیں اور اس سے ایک نئے ادبی واسطے کا ظہور ہوتا ہے۔ یعنی (اردو) ہندو اور مسلمان ان دونوں کو اپنا سمجھ کر اپناتے ہیں اور ایک انوکھا منظر رونما ہوتا ہے کہ ایک طرف ہندی بھاشا کو ایک طرح کے ادبی اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اردو کو دوسری طرح اظہار کے لئے، اور اس طرح جب کبھی ہندؤں اور مسلمانوں کا تخلیقی شعور ایک نہج پر کام کرتا ہے تو وہ ہندی استعمال کرتے ہیں اور جب دوسرے راستے پر انہیں لے جاتا ہے تو وہ اردو استعمال کرتے ہیں۔

فن تعمیر میں ہندو مسلم عناصر کے امتزاج کا عمل دلی سلطنت ہی میں شروع ہو چکا تھا اور مغل عہد میں یہ عمل تیز ہو گیا۔ فتح پور سیکری کی بنی عمارتوں میں ہندو مسلم طرز کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جہانگیر کے عہد کی عمارتیں ہندو مسلم عناصر کی ہم آہنگ ترکیب کو ظاہر کرتی ہیں۔ سکندرا میں اکبر کا مقبرہ بعض مصوروں کے نزدیک اسلامی محرابوں اور گنبدوں کے باوجود مجموعی نقشے کے لحاظ سے بودھ

وہاروں کا نمونہ نظر آتا ہے اور اعتماد الدولہ کے مقبرے میں وسطی عمارت کی چھت ہندوستانی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ شاہجہاں کے عہد میں ایرانی اور ہندوستانی ذہن نے مل کر ایک نیا طرز تعمیر نکالا جس کے اجزائے ترکیبی وحدت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ ان میں دیسی اور بدیسی کی تفریق کرنا بے معنی تھا۔ فن تعمیر کی طرح مصوری میں بھی قدیم ہندو طرز اور ترکی ایرانی طرز کے میل سے ایک نیا طرز پیدا ہوا جس میں دونوں کی خوبیاں موجود تھیں۔ اکبر نے ایرانی اور ہندوستانی مصوروں کو اپنے دربار میں جمع کر کے اکیڈمی کی بنیاد ڈالی۔ استاذ سید علی اور عبدالصمد نوجوان شاگردوں کو جن میں اکثر ہندو تھے، ایرانی طرز کی فنی باریکیاں اور رنگ کاری کے گر سکھاتے تھے۔ اس دبستان سے جو مصور نکلے ان میں فرخ بیگ، دسونت، بساون، سانولا خاص طور پر مشہور ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں فن مصوری ترقی کے انتہائی درجے پر تھا۔ فرخ بیگ، نادر، محمد مراد، ابوالحسن، استاذ منصور، بشن دیو، منوہر اور دولت اس عہد کے ممتاز مصور ہیں۔ اسی طرح شاہجہاں کے عہد کے اہم مصور انوپ، چترچترامنی، محمد فقیراللہ اور ہاشم علی اس عہد کے مشہور مصور ہیں۔

فن موسیقی کے دیسی بدیسی طرز اس طرح گھل مل کر ایک ہو گئے کہ مختلف طرزوں میں فرق کرنا ناممکن ہو گیا۔ بابر سے شاہجہاں تک تمام مغل حکمراں موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اکبر نے موسیقی کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تان سین اس کے دربار کا سنگیت سمراٹ تھا اس کے علاوہ اس کے درباری موسیقاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں ہری داس، رام داس، اور چاند خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مختلف سازندوں میں شہاب خان، بہرام قلی، بیر منڈل، سید عبداللہ اور قاسم وغیرہ مشہور ہیں۔ جہانگیر نے اپنے زمانے میں سنگیت کاروں کی غیر معمولی سرپرستی کی۔ شاہجہاں خود موسیقی کا مربی تھا اس کے عہد کے موسیقی کاروں میں رام داس اور مہاپاتر مشہور ہیں۔ غرض کہ مغل عہد میں موسیقی کو عروج حاصل ہوا۔

مغل بادشاہوں نے ادب و فن کی سرپرستی کی ایک مثال قائم کی جس کی ہندو شہزادوں نے تقلید کی چنانچہ قدرتی طور پر مغل دربار کے ہندو مسلم مصوروں نے جس اسلوب کو جنم دیا تھا اسے دور افتادہ مقامات اور صوبوں کے درباری مصوروں نے مقامی تبدیلیوں کے ساتھ اس کی نقل کی اور اس طرح ایک مشترکہ اسلوب اور کلچر چاہے وہ کسی بھی فن کا ہو سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔

مغل عہد میں رواداری عام تھی، مسلمانوں اور ہندؤں کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ نیک نیتی، خلوص، باہمی محبت اور ہم آہنگی عام تھی۔ ہندو مسلم دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا اور مشترکہ تمدن کی سرزمین کی تخلیق ہوئی۔ تصوف اور بھگتی کی تحریکات نے مذہبی عقائد کے اختلاف کو بڑی حد تک مٹا دیا تھا۔ ادبی سرگرمیوں، فن تعمیر، مصوری، موسیقی اور نظام تعلیم کی بدولت ہندو اور مسلم ایک دوسرے کے قریب آئے اور ان کے آپسی میل ملاپ، طبقات کی معاشرتی مساوات، قانون کی یکجہتی اور رسم و رواج کی یکسانیت نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتفاق کے فروغ میں امداد دی۔ طبقہ وسطیٰ عام طور پر دست کار لوگوں، روشن خیال لوگوں اور محرروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے آزادانہ رابطہ قائم رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ اتحاد کے لئے سیمنٹ کا کام کرتا تھا۔ جاگیردار امراء کے ہاتھوں دونوں کو تکلیف پہنچی۔ معاشرتی و اقتصادی عناصر نے مذہبی تلخی کو ختم کر دیا تھا۔ مذہبی جنون کے سخت گیر اصولوں سے وہ لوگ دور بھاگتے تھے۔

ہندو مسلم دونوں نے ساتھ ساتھ تصوف کی شاعری کے ذوق کو فروغ دیا وہ اس طرح سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے کہ دونوں ناقابل امتیاز تھے۔اسلام قبول کرنے والے ہندؤں نے مادّی لحاظ سے اپنا نظریہ تبدیل نہیں کیا تھا اور اپنے گزشتہ معاشرتی اور مذہبی طور طریقہ سے وابستہ تھے وہ ان کی عام مصیبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ مسلم ہندؤں کے تیوہاروں مثلاً ہولی، دسہرہ، دیوالی میں شرکت کرتے تھے اور ہندو مسلم تیوہاروں میں شرکت کرتے تھے۔ صدیوں کے مسلسل تعلقات اور ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ ثقافت کے فروغ سے دو قوموں کی باہمی قربت کو اس قدر استقامت دیدی تھی کہ معاشرتی ربط واختلاف ناگزیر ہو گیا تھا۔ مسلم امراء، ہندو راجہ اور امراء نجی اور روزمرہ کی زندگی میں ان سے ملاقات کرتے اور ان کے تیوہاروں اور رسومات میں آزادانہ شرکت کرتے۔

اکبر نے صلح کل اور مذہبی رواداری کی جو پالیسی بنائی تھی وہ تمام مغل حکمرانوں کے عہد میں جاری رہی یہاں تک کہ داراشکوہ نے بھی اس پالیسی کو جاری رکھا اور ہندو مسلمانوں میں نظریاتی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش علمی سطح پر کی۔ داراشکوہ نے دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو یدانت میں چھان بین شروع کی جس کا پہلا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے اور داراشکوہ نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف اور یوگ کے خیالات ایک دوسرے کے مطابق ہیں ۔ہندؤں اور مسلمانوں کا ادبی ذوق یکساں تھا سنسکرت اور فارسی زبانوں میں مذہبی کتابوں کے تراجم ہوئے اور فن تعمیر و مصوری میں ہندو مسلم طرز نمایاں ہے اس طرح علوم و فنون ،تراجم اور ادبی کاوش میں دونوں قوموں کی شراکت سے ایک نیا کلچر پروان چڑھا۔ فارسی میں مہابھارت، بھگوت گیتا اور سنسکرت کی دوسری کتابوں کا ترجمہ ہونے اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور پنڈتوں اور ان کے اہل فکر و نظر سے ربط و ضبط کا موقع ملنے کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ویدانتی یہ دیکھنے لگے کہ مثنوی مولانا روم اور اسلامی تصوف کی کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہیں جنہیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے ہیں کہ ہندؤں میں فقط بت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب کرنے والے لوگ نہیں بلکہ کئی پاکیزہ خیال، بے حرص اور بے ریا تارک دنیا میں ہیں۔ مسلمانوں میں داراشکوہ، ملاشاہ بدخشی، سرمد شہید اور محسن فانی کے علاوہ دوسرے کئی آزاد خیال روحانی مفاہمت کے ترجمان اور داراشکوہ کے حاشیہ نشین تھے۔ان کے علاوہ دوسرے کئی ایسے مسلمان تھے جو ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کی روحانیت کے قائل تھے اور ان سے مل کر متاثر ہوتے تھے۔ ہندؤں اور مسلمانوں میں اتحاد اور یکانگی پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ ایک مشترکہ ثقافت کی شکل میں رونما ہوا جو نہ تو خاص مسلم کلچر تھا اور نہ ہی اسے خالص ہندو کلچر ہی کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ ہمہ گیر ہندو مسلم کلچر تھا۔اس کلچر کے اثرات دونوں قوموں کے ہر شعبہ زندگی میں سرایت کر گئے۔

15.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغل عہد میں ہر زبان و ادب نے علوم و فنون اور مشترکہ ثقافت کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ فارسی سرکاری زبان کے ہونے ساتھ ہی اعلیٰ ادبی و تاریخی تخلیقات کی زبان تھی اور ہندو مسلم دونوں نے فارسی شاعری، نثر نگاری اور تاریخ نویسی میں اہم کردار ادا کیا۔ ترکی ،عربی، سنسکرت ہندی اور اردو بھی رائج تھیں۔ان زبانوں میں بھی اہم نگارشات منظر عام آئیں۔ عربی زبان میں تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ وہ کتابیں ہیں جو عام طور پر درسیات میں شامل تھیں ان پر حواشی لکھے گئے اور بہت سی تفسیریں بھی لکھی گئیں۔ سنسکرت سے فارسی میں اور

فارسی سے سنسکرت میں تراجم ہوئے۔

ہندوستان میں مغلوں نے دہلی سلاطین کی طرح علم کی ترویج واشاعت میں دلچسپی لی اور مرکز وصوبوں میں بہت سے مدارس قائم کیے۔ زیادہ مدارس رہائشی ہوتے تھے جہاں طلباء واساتذہ اور مدرسے پر آنے والے خرچ کے لئے حکومت کی طرف سے گرانٹ دی جاتی تھی۔ اس طرح کے مدارس دہلی، لکھنؤ، جون پور، سوارت وگجرات وغیرہ میں قائم تھے مرکز وصوبوں کے علاوہ قصبات وقریات میں بھی مدارس قائم تھے۔ سوارت کے مدرسوں میں بیرون ملک کے طلباء بھی تعلیم کے حصول کے لیے آتے تھے۔ آج کی جامعات کی طرح مدارس میں ہاسٹل کا بہترین انتظام تھا۔ مشترکہ تہذیب وثقافت کے فروغ میں ہندوستان کے تمام مسلم حکمرانوں نے کوشش کی لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ دانستہ اور شعوری کوشش مغل عہد میں ہوئی۔ مغل عہد میں علم وفن کی کوئی ایسی شاخ نہیں تھی جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندؤں کا تعاون نہ رہا ہو۔ فن تعمیر، فن مصوری، خطاطی اور موسیقی کا عروج ہندو و مسلم دونوں کی کوششوں سے ہوا اور ان فنون میں ہندو مسلم امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ تاریخ نویسی میں ہندؤں نے دلچسپی لی اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ فارسی شاعری، انشاء وخطوط نویسی میں بھی ہندؤں کا حصہ کچھ کم نہیں ہے۔ انشاء یعنی خطوط نویسی کو ہندؤں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ اس میں منشی ہر کرن، چندر بھان برہمن، منشی مادھورام ، منشی لال اور منشی اودھے راج اچھے انشاء نگار اور خطوط نویس تھے۔ ادبی سرگرمیوں، فن تعمیر، مصوری، موسیقی اور کتابوں کے تراجم کے باعث ہندو مسلم ایک دوسرے کے قریب آئے اور ان کے آپسی ملاپ سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتفاق کے فروغ میں مدد ملی۔ جس کے نتیجہ میں ایک مشترکہ ثقافت پروان چڑھی جس کے اثرات سوسائٹی کے تمام افراد پر پڑتے۔

15.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

مقامات حریری	:	کلاسیکی عربی کی کتاب جو ہندوستان کے عربی مدارس میں داخل نصاب تھی۔
اردوئے معلیٰ	:	ممتاز فوجی پڑاؤ
ریختہ	:	ملی جلی زبان خصوصاً اردو
مدد معاش	:	علماء کو دی جانے والی گرانٹ تاکہ وہ سکون سے تعلیم وتدریس اور مذہبی کاموں میں مصروف رہیں۔

15.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. 'آئین اکبری' کا مصنف کون ہے؟

(الف) ابوالفضل (ب) فیضی (ج) بدایونی (د) عبدالحمید لاہوری

2. مہابھارت کا فارسی ترجمہ کس نام سے کیا گیا تھا؟

(الف) سرِ اکبر (ب) رزم نامہ (ج) تاریخ الفی (د) انوار سہیلی

3. 'پدماوت' کس زبان اور کس مصنف کی تخلیق ہے؟

(الف) اودھی، ملک محمد جائسی (ب) برج، سورداس (ج) فارسی، امیر خسرو (د) اردو، ولی دکنی

4. شاہجہاں کے دور میں جونپور کو کس نام سے پکارا جاتا تھا؟

(الف) دارالعلوم (ب) شیرازِ ہند (ج) بغدادِ ہند (د) فرنگی محل

5. 'مجمع البحرین' (دو سمندروں کا سنگم) کس کی تصنیف ہے؟

(الف) اورنگزیب (ب) شاہ ولی اللہ (ج) دارا شکوہ (د) ابوالفضل

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل عہد میں ترکی زبان پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. گجرات کے مدارس کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کریں۔
3. اکبر کے عہد میں سنسکرت کے فارسی تراجم کن کتابوں کے ہوئے تحریر کریں۔
4. مدرسہ رحیمیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔
5. مغل عہد میں اردو زبان و ادب کے فروغ پر اظہار خیال کیجیے۔

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل عہد میں مختلف زبان و ادب کی ترویج پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔
2. مغل عہد کے تعلیمی مراکز پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔
3. مشترکہ ثقافت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تحریر کریں۔

جوابات: 1-(الف), 2-(ب), 3-(الف), 4-(ب), 5-(ج)

اکائی 16۔مذہب

(Religion)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 بھکتی تحریک

16.3 بھکتی فلسفہ

16.4 چند بڑے بھکتی سنت

16.5 سکھ مت

16.6 تصوف

16.7 مغل حکمران اور مذہب

16.8 اکتسابی نتائج

16.9 کلیدی الفاظ

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.0 تمہید (Introduction)

مذہب اور روحانیت انسانی وجود کا لازمی حصہ رہے ہیں اور عام لوگوں کے مذہبی تجربات کا مطالعہ بہت ہی مسحور کن رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں عہد وسطیٰ کے عام لوگوں کے مذہبی عقائد اور طریقوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ جدید ہندوستان میں، جہاں مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کی تکمیل کا ذریعہ بنادیا گیا ہے، عہد وسطیٰ کے مذہبی منظر نامے کو سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے فرقہ پرستی اپنا بدصورت سر اٹھا رہی ہے، مختلف تاویلات پیش کی جانے لگی ہیں۔ جہاں کچھ لوگوں نے خود مذہب کو فرقہ واریت کا ذمہ دار قرار دیا، وہیں دوسروں نے اس کی نفی کرتے ہوئے ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ کے دور کی طرف اشارہ کیا جب لوگ بہت زیادہ مذہبی تھے لیکن فرقہ پرستی کا کوئی نشان تک نہیں تھا۔ کئی ماہرین نے بلاشبہ یہ بات ثابت کی ہے کہ جب تک مذہبی برادریوں کے درمیان تنازعات میں شدت کم تھی، لوگ مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے اچھے سلوک کرتے تھے اور مذہب کے باہمی تجربات کہیں زیادہ مضبوط تھے۔ اس اکائی میں ہم عہد وسطیٰ کے ہندوستانیوں کے مذہبی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس میں عام لوگ اور اشرافیہ دونوں کی مذہبی زندگی شامل ہے۔

سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک، ہندوستان میں مذہبی زندگی اسلام اور ہندومت کے درمیان مسلسل بقائے باہمی سے عبارت تھی۔ مغل حکمرانوں نے اس پہلو کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر جہانگیر کو اس بات پر فخر تھا کہ اس کے دور حکومت میں مختلف مذاہب کے پیروکار امن اور ہم آہنگی سے رہتے تھے۔ اس کے مطابق، ازبکوں اور صفویوں کے تحت ایسا نہیں تھا۔ دو متضاد رویوں کا واضح مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ستیش چندر جیسے مورخین کہتے ہیں کہ اس عرصے کے دوران، ان دونوں ہی مذہبی عقائد نے 'ایک جانب آزاد خیال ازم کے متضاد رجحانات اور دوسری جانب سخت قدامت پسندی اور امتیاز' کا سامنا کیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مشہور مورخ تاراچند کے مطابق اسلام نے ہندو ثقافت کے ہر پہلو کو متاثر کیا چاہے وہ مذہب ہو، فن ہو، ادب ہو یا سائنس ہو۔ مسلمان بھی ہندومت سے متاثر تھے۔ چنانچہ ہم البیرونی، امیر خسرو، ابوالفضل، داراشکوہ اور دیگر جیسے مسلمان علماء کو ہندو مذہب کو سمجھنے اور مسلمانوں میں اس کی تفہیم کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اکبر، جہانگیر اور کشمیر کے زین العابدین جیسے حکمرانوں نے شاہی سرپرستی کے ذریعے ہندومت کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح کی وسیع النظری کے نتیجے میں 18 ویں صدی کے عالم مرزا جان جہاں نے لارڈ سری رام اور لارڈ سری کرشنا دونوں کو نبی قرار دیا۔ ثقافتوں اور فلسفوں کے امتزاج و اختلاط نے ہندوستانی روحانی ماحول میں بھکتی اور صوفی تحریکوں جیسی مضبوط سماجی و روحانی تحریکوں کو جنم دیا جس سے مختلف برادریوں کے درمیان سماجی رشتے مزید مضبوط ہوئے۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں لوگوں کی مذہبی اور روحانی زندگی کو سمجھ سکیں۔
- عہد وسطیٰ میں ہندوستانیوں کی سماجی، مذہبی اور ثقافتی زندگی کی ترقی میں بھکتی اور صوفی تحریکوں کے تعاون کا اعتراف کر سکیں۔

- سکھ مت کے ظہور کو سمجھ سکیں۔
- مغل حکمرانوں کے مذہبی عقائد اور طریقوں کی داد دے سکیں اور ان کا تجزیہ کر سکیں جس نے ان کی سیاست کے ساتھ ساتھ وسیع طور پر معاشرے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔
- اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ عہد وسطیٰ کا ہندوستانی سماج کوئی فرقہ وارانہ سماج نہیں تھا اور باہمی میل ملاپ اپنے عروج پر تھا۔

16.2 بھکتی تحریک (Bhakti Movement)

بھکتی تحریک ایک اہم ترین سماجی، مذہبی اور ثقافتی تحریک تھی جس نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ بھکتی تحریک کے منظر نامے پر کئی بھکتی مصلحین ابھرے جنہوں نے اس بات کی تبلیغ کی کہ خدا ایک ہے، تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ انہوں نے بت پرستی کو رد کیا اور ذات پات کے غیر انسانی نظام اور اچھوت ہونے کے تصور کی مذمت کی۔ رفتہ رفتہ بھکتی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور میرا بائی اور کرناٹک کی اکا مہادیوی جیسی خواتین بھی اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔ اس تحریک نے سماجی اور روحانی جمہوریت کے لیے مہم چلائی اور اعلان کیا کہ خدا کو مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کے طبقے کے چنگل سے آزاد کر کے عام لوگوں کے قریب لایا جانا چاہیے۔ اس تحریک نے یہ بھی ثابت کیا کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی اثر ورسوخ کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

موکش یا نجات حاصل کرنے کے حتمی مقصد کے ساتھ وقف ہو کر خدا کی عبادت کو بھکتی کہا جاتا ہے۔ بھکتی کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہندوستانی مذہبی روایت جو کہ وادی سندھ کی تہذیب سے جا کر ملتی ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب میں، ہمیں پشوپتی شیو کی پوجا کے ابتدائی شواہد ملتے ہیں جو جانوروں سے گھرے مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ویدوں، اپنشدوں، رزمیہ داستانوں اور پرانوں میں بھکتی کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے۔ ویدانت یا ویدک مذہبی فلسفہ بنیادی طور پر اپنشدوں پر مبنی ہے، جو رسمی اور سطحی شکلوں سے اوپر اٹھ کر ہند آریائیوں کے مذہبی عقائد واعمال کے فلسفیانہ پہلو سے بحث کرتا ہے۔ یہ تخلیق کے اسرار کو حل کرنے اور انسانی زندگی کے معنی اور مقصد کو مابعد الطبیعاتی اندازوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ویدانت کے فلسفے کا اصل محور خالق اور مخلوق، خدا (پرماتما) اور روح (آتما) کا تصور ہے۔ یہ دو بنیادی اصولوں کے گرد گھومتا ہے۔ ا۔ روح کی دوبارہ پیدائش یا منتقلی کا نظریہ۔ ۲۔ کرما کا نظریہ یا 'مکافات عمل کا قانون۔' روح اور خدا کے درمیان تعلق ایسا ہی ہے جیسے کامل اور جز کے درمیان تعلق؛ پانی کے قطرے اور سمندر کے درمیان تعلق۔ انسان فانی ہے لیکن روح لافانی ہے۔ خدا کا ایک حصہ اور جز ہونے کے ناطے، اس کا حتمی مقصد خدا کے ساتھ دوبارہ ملاپ کی تلاش اور خدا کے ساتھ ایک ہو جانا ہے۔ یہی نجات (جسے مکتی، موکش یا نروان بھی کہا جاتا ہے) یا پنر جنم کے چکر سے آزادی ہے۔

ویدانت، نجات کے حصول کے لیے تین طریقے بتاتا ہے۔ وہ ہیں گیان مارگ، کرما مارگ اور بھکتی مارگ۔ گیان مارگ، نجات کے حصول کے لیے حقیقی علم کی تحصیل یا عرفان پر زور دیتا ہے۔ کپل کا سانکھیہ درشن اس طریقے کی سفارش کرتا ہے۔ کرما مارگ، نجات کے

حصول کے لیے خالص عمل پر زور دیتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن نے اپنے شاگرد ارجن کو اسی کی تعلیم دی۔ بھکتی مارگ، خدا کی دل لگا کر عبادت، بندے کی خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور پاک نیت، اچھے الفاظ اور عمل کے ساتھ خدا سے لو لگانے پر زور دیتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق قائم کرتا ہے، ایک ایسا تعلق جو آقا اور غلام، شوہر اور بیوی یا عاشق و معشوق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کی عقیدت کے ذریعے مکتی حاصل کی جاسکتی ہے۔ گیان مارگ کو اپنانا سب سے مشکل ہے۔ غیر معمولی خدائی اوصاف کے حامل بہت کم سادھو اور مادی دنیا کی خواہشات سے عاری، پاک ذہن و قلب کے حامل سنیاسی، حقیقی علم یا عرفان کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بھکتی کے لغوی معنی 'لگاؤ' یا 'عقیدت' کے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ بھکتی ایک تحریک کے طور پر جنوبی ہندوستان میں ابھری۔ بھکتی کا تصور پہلے الوار جو وشنو بھگوان کو ماننے والے تھے ان کے بھجنوں میں اور بعد میں نیناروں جو شیو بھگوان کو ماننے والے تھے ان میں فروغ پایا۔ یہ تصور بنیادی طور پر برہمنوں کے مذہبی غلبے، اس وقت موجود سخت گیر سماجی اصولوں اور رسوم و رواج کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔ بعدازاں بھکتی، بتدریج ایک اخلاقی اصول میں تبدیل ہوگئی۔ بھگوت گیتا سے لے کر 13 ویں صدی تک جب کہ اسلام ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا، بھکتی عقیدہ ویدک دانشوریت کے بنیادی عقیدے میں باقی رہا کیونکہ اس وقت بھی اس نے ہندوستانی معاشرے کی ذات پات کی تقسیم کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ تاہم، بعد میں، چند بھکتی سنتوں نے ذات پات کے نظام کو چیلنج کیا۔

16.3 بھکتی فلسفہ (Bhakti Philosophy)

شمالی ہندوستان میں ترک قوت مضبوط ہونے کے بعد ہندوستان میں اسلام نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ اسلام کا توحید کا فلسفہ بتدریج ہندوستانی سرزمین پر پھیل گیا اور اس نے مقامی مذہبی نظریات اور فرقوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ عہد وسطیٰ کے دور میں صوفی شاعری اور ہندو فکر نے بھکتی تحریک کے نظریات اور تعلیمات کو متاثر کیا۔ دانشوران نے بھکتی روایت کو دو وسیع زمروں میں تقسیم کیا ہے: سگُن اور نِرگُن۔ سگُن کا مطلب ہے 'گُن (صفات) کے ساتھ'، اور نِرگُن کا مطلب ہے 'گُن (صفات) کے بغیر'۔ سگُن بھکتی ایک ایسی روایت ہے جہاں مخصوص دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے، مثال کے طور پر، وشنو یا شیو، یا ان کے اوتار یا دیوی کی پوجا کرنا۔ نِرگُن بھکتی کا مطلب خدا کی ایک مابعد الطبیعیاتی شکل (یعنی بے شکل خدا) کی عبادت ہے۔ قدیم ہندوستانی تاریخ کی ماہر مشہور مورخ رومیلا تھاپر کے مطابق، دوسری صدی ء کے اوائل تک، بھکتی نے شیومت، وشنومت اور اس سے بھی اہم بات، شَرمَن روایات سے تعلیمات اخذ کرتے ہوئے ایک اہم نئے مذہبی اظہار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جنوبی ہند کے بھکتی سنتوں نے تیلگو، تمل اور دیگر مقامی زبانیں استعمال کیں جبکہ سنسکرت اب بھی ابلاغ کا اہم ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ تاہم، نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے اوائل میں جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں بھگوت پران کے ترجمہ کو بھکتی فلسفہ میں ایک اہم پیش رفت سمجھا جاتا ہے۔ اس پران نے اپنا مواد اور اپنا قصہ جنوبی ہند کے تامل ذرائع بالخصوص الوار بھکتی شاعری سے اخذ کیا ہے۔

اپنے تاریخی ارتقا کے دوران، مختلف مراحل میں بھکتی کے تصور کی مختلف طریقوں سے وضاحتیں اور تجزیے ہوتے رہے۔ جنوبی ہند کے ایک برہمن، آدی شنکراچاریہ (50-700ء)، نے بھکتی کی وضاحت ادویتا کے نظریے (توحید یا غیر ثنویت) کے ذریعے کی۔ اس

فلسفے کے ذریعے، شنکر نے برہما کے علم کے حصول کے ذریعے نجات کے اپنشد والے نظریے کی تبلیغ کی۔ ایک اور جنوبی ہندوستانی بھکتی سنت رامانج تھے جن کی بھکتی کی فکری تعریف مختلف تھی۔ ان کے مطابق، خدا کی شکل بھی ہے اور خوبیاں بھی، اور نجات بھکتی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ رامانج نے وِشِشٹادویتا (پابند توحید یا مشروط توحید) کا تصور دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جیسے لوگوں کو خدا کی ضرورت ہے اسی طرح خدا کو بھی لوگوں کی ضرورت ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ کی مذہبی روایت کو بھکتی روایت نے تقویت بخشی۔ اسی دور میں یہ تحریک جنوبی ہند کے علاقوں سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ بھکتی نظریات کے اہم مبلغین میں ، جنہوں نے اسے شمالی ہندوستان تک پہنچایا، نام دیو (1270-1350)، اور رامانند (70-1400) شامل ہیں۔ اول الذکر نے 14ویں صدی کے اوائل میں تبلیغ کی تھی اور مؤخر الذکر نے چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی کے اوائل میں اس کا پرچار کیا۔ ان سنت شاعروں نے اپنے ارد گرد مریدین کا ایک حلقہ تیار کیا۔ انہوں نے نچلے طبقے اور خواتین کو اپنے دائرے میں شامل کر کے ذات پات کے درجہ بندی کے موجودہ سماجی نظام پر حملہ کیا۔ ان بھکتی سنتوں نے اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے بھجن لکھے۔ یہ بھجن تین بڑے موضوعات پر پیش کیے گئے تھے: شخصی خدا کے تئیں عقیدت، سخت گیر برہمنیت کے خلاف مزاحمت، اور بدھ مت کے ماننے والوں اور جینوں کو بدعتی (مرتد) اور بے عقیدہ کہہ کر بدنام کرنا۔

16.4 چند ایک اہم بھکتی سنت (A Few Major Bhakti Saints)

نام دیو کی پیدائش مہاراشٹر میں ایک نچلی ذات سمجھے جانے والے گھرانے میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے تخلیق کردہ مختلف ابھنگوں (بھجنوں) میں ذات پات کی پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ ورکری پنتھ (یاتریوں کا راستہ) کے بھی زبردست شارح تھے، ورکری پنتھ یعنی وہ مکتب فکر ہے جو مساوات اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ نام دیو نے اپنے نظریات اور تعلیمات کی تبلیغ کے لیے مراٹھی زبان کا استعمال کیا۔ نام دیو کی شاعری خدا کے لیے محبت اور لگن کے جذبہ کو بیدار کرتی ہے۔ انہوں نے دور دراز کے سفر کیے اور دہلی میں صوفی عارفوں کے ساتھ روحانی مباحث کرتے رہے۔ تاہم، بھکتی تحریک کو رامانند کی سرپرستی میں زبردست تقویت ملی، جو ہندوستانی عہد وسطیٰ کے عظیم بھکتی سنتوں میں سے ایک تھے۔ وہ رامانج کے پیروکار تھے اور انہوں نے وشنو کی جگہ رام کی پوجا کی۔ رامانند نے پورے ہندوستان کا سفر کیا جس نے انہیں شمالی ہندوستان میں اسلام کے فروغ کا مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انہوں نے چاروں ورنوں کو وید سکھائے اور ذات پات کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق نہیں کی۔ تاہم، اپنی 'آنند بھاشیہ' میں، رامانند نے لکھا ہے کہ شودروں کو وید پڑھنے کا حق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے ہر ذات، بشمول نچلی ذات کے سمجھے جانے والے لوگوں کو اپنے پیروکاروں میں شامل کیا۔ کبیر (1518-1440) اور روی داس (جو رائے داس کے نام سے بھی مشہور ہیں) ان کے غیر معمولی چیلے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رامانند کے 12 چیلے تھے اور ان میں سے ایک عورت تھی۔

کبیر جن کی تاریخ اسرار میں ڈوبی ہوئی ہے ہندوستان کے سب سے زیادہ بااثر بھکتی سنت تھے۔ اپنے ایک دوہے میں کبیر اپنے آپ کو ایک بنکر کا بیٹا بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق، صحیفوں کے علم کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ کوئی فرد تعقل کے ذریعہ علم حاصل نہ

کرلے۔ وہ مذہب کے نام پر ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے منائی جانے والی خالی خولی (بے جا) رسومات کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حقیقی مذہب اور روحانیت رسومات میں پوشیدہ نہیں ہو سکتی۔ کبیر کاشی میں رہتے تھے جہاں وہ اس وقت کے ہندو اور مسلم باباؤں کے ساتھ فلسفیانہ گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیمات میں کچھ بنیادی اسلامی اصولوں کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اچھوت اور دیگر سماجی سختیوں جیسے ذات پات کے نظام، ورن آشرم، مذہبی یاتراؤں اور کتابی علم کی مذمت کی۔

کبیر اس قدر متاثر کن بھکتی شخصیت تھے کہ ان کے حوالہ جات صوفی ادب جیسے 'مرآۃ العصر' اور 'دبستانِ مذاہب' میں ملتے ہیں۔ تاراچند کے مطابق، 'کبیر کا مشن ایک ایسے محبت بھرے مذہب کی تبلیغ کرنا تھا جو تمام ذاتوں اور مذاہب کو متحد کردے۔' کبیر کسی الگ مذہب کی بنیاد ڈالنا نہیں چاہتے تھے لیکن جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر ہوتا آرہا ہے ان کے بھکتوں نے شمالی اور وسطی ہندوستان میں ایک فرقہ جو 'کبیر پنتھ' کے نام سے جانا جاتا ہے اس کی بنیاد رکھی۔ کبیر خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے، قطع نظر اس کے کہ اسے کس ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبیر نے ہندوؤں میں موجود بت پرستی، ذات پات کے نظام اور اچھوت پرستی کی شدید مخالفت کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کی دقیانوسی اور بے معنی رسومات کی بھی مذمت کی۔ انہوں نے پاکیزگی قلب اور خلوص خدا کے بغیر مسجد میں پانچ نمازیں ادا کرنے کو فضول قرار دیا۔ کبیر نے مذہبی رواداری پر زور دیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق سکھایا۔ وہ ان نمایاں بھکتی اصلاح کاروں میں سے ایک تھے جنہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی پوری کوشش کی۔ کبیر نے ستی اور بچپن کی شادی کے رواج کے خلاف آواز اٹھائی، یہ دو برائیاں مکمل طور پر سماجی تھیں۔ کبیر دنیا کو ترک کرنے اور حقیقی علم یا نجات کی تلاش میں جنگلوں یا پہاڑیوں پر جانے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے بجائے، انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی کہ وہ محنت کر کے اپنی روزی کمائیں اور ایک دیانتدار، شریف اور پرخلوص زندگی گزارتے ہوئے گھر کے تمام فرائض انجام دیں۔ کبیر کی تعلیمات وقت کے سماجی اور مذہبی تقاضوں سے کامل ہم آہنگ تھیں۔ انہوں نے خود کو ایک مربوط ہندوستانی سماج کے تصور سے پوری طرح ہم آہنگ کیا اور لاکھوں لوگوں کے دل جیت لیے۔ ان کے دوہے اور مشہور انقلابی اقوال بڑے پیمانے پر مشہور ہیں اور عہد وسطیٰ کے ہندوستانی ثقافتی ورثے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ آیئے کبیر کے دوہے ملاحظہ کرتے ہیں:

'جاتی نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجیے گیان
مول کرو تلوار کا پڑا رہن دو میان۔'

'پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آخر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے۔'

'پاہن پوجے ہری ملے، تو میں پوجوں پہار
یاتے چاکی بھلی جو پیس کھائے سنسار۔'

'سائیں اتنا دیجیے، جامے کُٹُم سمائے
میں بھی بھوکا نہ رہوں، سادھو نا بھوکا جائے۔'

16.5 سکھ مت (Sikhism)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایک انتہائی اہم پیشرفت، سکھ مت کا ارتقاوفروغ تھی۔اس مذہبی فرقے نے گرونانک (1469-1539ء) کے روحانی نظریات اور تعلیمات سے اپنے افکار و تصورات کو اخذ کیا۔ گرونانک عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی متحرک مذہبی شخصیات میں سے ایک تھے۔ان کا جنم ننکانہ (پنجاب) کے ایک کھتری گھرانے میں ہوا۔ وہ ہندومت اور اسلام دونوں کے توحیدی فلسفے سے متاثر تھے۔ پچھلے بھکتی سنتوں نام دیو اور رامانند کی طرح، گرونانک نے بھی پورے ہندوستان کا وسیع دورہ کیا۔انہوں نے برہمنی سماج کی سخت گیریت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی۔انہوں نے ان تمام مذہبی علوم کو مسترد کر دیا جو ذات پات اور نسل کی بنیاد پر سماجی تقسیم کو جائز قرار دیتے تھے۔اس طرح، انہوں نے کسی فرد کے حقیقی حیثیت کے تعین کے لیے ذات (جو کہ پیدائش سے وراثت میں ملتی ہے) کے بجائے اعمال کو بنیاد بنایا۔انہوں نے کھلے عام سماجی انصاف کی بات کی جس سے ذات پات کے بندھنوں کی بناپر کئی لوگ محروم تھے۔ان کا فلسفہ تین بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا: 'گرو' جو ایک کرشماتی شخصیت ہوتی ہے؛ 'شبد' جس کا مطلب نظریہ ہے؛ اور 'سنگت' جس کا مطلب تنظیم ہے۔

گرونانک نے ہندوستانی سماجی تانے بانے کو انتہائی سخت اور رسوم ورواج میں ڈوبا پایا۔ان کا مقصد ایک ذات پات سے پاک اور طبقہ بندی سے آزاد سکھ پنتھ کی بنیاد رکھنا تھا۔ کئی ذاتوں اور طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے آگے بڑھ کر اس مساوات والے پنتھ کو گلے لگایا۔انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کو سچے اخلاق اور عبادت کے اصولوں کو اپنانے کی نصیحت کی جیسے کہ 'سچ' (حق کو تھامے رکھنا)، 'حلال' (جائز طریقے سے کمانا)، 'خیر' (دوسروں کی بھلائی چاہنا) اور 'نیت' (صحیح نیت)۔ گرونانک نے سماجی امتیاز کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی اور وہ معاشرے میں خواتین کو برابری کا مقام دلانے کے لیے کوشاں رہے۔ کبیر کی طرح، انہوں نے بھی یاترا (مذہبی سفر)، بت پرستی، اور معاشرے میں رائج دیگر دنیاوی رسومات کی مذمت کی۔اس کے بجائے، گرونانک نے کسی فرد کی زندگی میں 'گرو' رکھنے کی اہمیت پر بہت زور دیا جو رہنمائی کرتا ہے اور خدا تک پہنچاتا ہے۔انہوں نے لنگر متعارف کرایا، جو عہد وسطیٰ کے لحاظ سے ایک انقلابی اقدام تھا: ان دنوں، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، مختلف ذاتوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ مل کر نہیں کھاتے تھے۔انہوں نے لوگوں کو جہالت اور توہم پرستی کی زنجیروں سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہوئے سماج کی تشکیل نو پر زور دیا۔ گرونانک کا خود کسی مذہب کی بنیاد رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن بعد ازاں، ان کی تعلیمات کی بنیاد پر سکھ ازم کے نام سے ایک نیا مذہب تشکیل دیا گیا جس کے پیروکار آج پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہیں سکھ کہا جاتا ہے اور ان کے مذہب کو سکھ مت کہا جاتا ہے۔

بھکتی فرقہ چودھویں صدی کے اختتام پر ایک وسیع عوامی تحریک بن گیا۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی تحریک تھی جس میں ہندوؤں کے تمام طبقات اور ذاتیں شامل تھیں۔اس کی ابتدا یا مقبولیت اسلام کی مرہون منت نہیں تھی حالانکہ یہ کسی حد تک صوفیوں کے صوفیانہ فلسفے سے متاثر تھا۔ بھکتی تحریک نے اپنے معلنہ مقاصد کو کافی حد تک حاصل کر لیا۔اس نے سماج میں برہمن پجاریوں کے غلبہ پر شدید ضرب لگا کر ہندومت کا احیا کیا۔اس نے مذہبی اور سماجی ثقافتی ورثے پر عوام کا اعتماد بحال کیا اور بڑے پیمانے پر اسلام قبول کرنے پر روک لگائی۔ذات پات کے نظام کا قلعہ تو نہیں ٹوٹ سکا تاہم ذات پات کی بنیاد پر امتیاز کے برے اثرات کو اونچی ذات اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے درمیان ہم آہنگی

کے رشتوں اور آزادانہ سماجی میل جول کے ذریعے کم کیا گیا۔ ہندوؤں کو جن بے شمار سماجی برائیوں کا سامنا تھا ان کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جاسکا۔ تاہم، جب ان برائیوں کو پوری طرح سے بے نقاب کر دیا گیا اور ان کی مذمت کی گئی تب لوگوں کے اخلاقی شعور میں ان کی اہمیت کم ہونے لگی۔ بھکتی تحریک نے زندگی کی عمدہ اقدار پر زور دیا اور اس طرح مجموعی طور پر معاشرے کے عمومی اخلاقی رویہ کو بہتر بنایا۔ بھکتی مصلحین اور صوفیاء نے نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی طور پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں مدد کی۔ بھکتی تحریک نے نام نہاد ہندو اور مسلم ثقافتوں یا مقامی اور غیر ملکی ثقافتی روایات کے درمیان قومی یکجہتی اور میل ملاپ پیدا کیا۔

بھکتی تحریک کے کچھ ضمنی اثرات یا اس کے بعد پڑنے والے اثرات بھی قابل ذکر ہیں۔ تمل، تیلگو، ہندی، پنجابی، بنگالی اور مراٹھی سمیت مقامی زبانوں کے فروغ کا زیادہ تر سہرا بھکتی مصلحین کے سر جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کی مقامی بولیوں اور عام لوگوں کے درمیان بولی جانے والی زبانوں میں اپنی مہم کو آگے بڑھایا۔ بھکتی کے موضوع نے ان زبانوں کے ادبی ذخیرے کو بھی مالا مال کیا جیسا کہ اس نے ان ہندوستانی اسکالروں کو فکر اور اظہار کا ایک نیا گوشہ فراہم کیا جو مبلغین کے طور پر تحریک میں شامل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر، دو قابل ذکر پنڈت سنتوں، سورداس اور تلسی داس نے سولہویں صدی کے دوسرے نصف اور سترہویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں ہندی ادب کے فروغ میں قابل قدر تعاون دیا۔ اور سب سے بڑھ کر پنجاب میں سکھ مت کی پیدائش، بھکتی تحریک کا براہ راست نتیجہ تھی جو پنجاب میں گرو نانک نے 1594ء میں شروع کی تھی، اس طرح، بھکتی تحریک نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، معاشرہ اور ثقافت میں کثیر جہتی تعاون کیا۔

16.6 تصوف (Sufism)

تصوف دنیا کے ہر مذہب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اسلامی تصوف، جسے تصوف یا صوفی ازم کے نام سے جانا جاتا ہے، اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسلام کے بطن سے پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کچھ نیک طینت اور شریف لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو بخوشی قبول کیا لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں سستی کا مظاہرہ کیا۔ ایسے آزاد منش بندگانِ خدا قرآنی تعلیمات اور حیات نبویؐ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیر پا روحانی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنے باطن کی تطہیر پر زیادہ زور دیا۔ اسلام میں قادرِ مطلق، اللہ تعالی جیسی اعلی ترین ہستی کے وجود کے بارے میں شعور ہی نیک لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ خود سپردگی، مراقبہ اور خدمت خلق کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ تصوف کا اسلام کے علاوہ کوئی علاحدہ مقصد یا عقیدہ نہیں تھا اور ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی تنظیم یا خانقاہی نظام نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نویں صدی میں اسلام کی سخت گیر رسمیت (شعائر) کے خلاف رد عمل کے طور پر ایران میں ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ بغداد کے عباسی خلفا کے زمانے میں اسے ایک نظریاتی بنیاد حاصل ہوئی اور صوفی بزرگوں نے عیسائیت، ہندومت، بدھ مذہب اور جین مذہب سمیت دیگر مذاہب اور لوگوں سے تصوف کے نظریات کو فراخ دلانہ طور پر اخذ کرنا شروع کیا۔ تاراچند کے مطابق تصوف ایک پیچیدہ رجحان ہے، جس کا موازنہ ایک دریا سے کیا جاسکتا ہے جو کئی سرزمینوں سے آنے والی معاون دریاؤں کے پانی کو اکٹھا کر کے اپنی جسامت بڑھاتا رہتا ہے۔ تصوف کو مسلم قدامت پرستوں، سنی

اور شیعہ دونوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔اس کے نتیجے میں بعض اوقات صوفیوں کو ستایا گیااور ان میں سے بعض کا اسلام سے ارتداد کے الزام میں در حقیقت سر قلم کر دیا گیا۔ قدامت پسندوں یا سخت گیر اسلام اور تصوف کے درمیان مفاہمت کا سہرا الغزالی (1112-1057ء) کے سر جاتا ہے، جو ایک عرب فلسفی تھے۔انہوں نے تصوف کو اسلامی الہیات کے ایک اٹوٹ جز کے طور پر ایک مابعد الطبیعیاتی بنیاد فراہم کی۔

ہندوستان بھی عہد وسطیٰ کے دور میں تصوف کے ایک غیر معمولی مرکز کے طور پر ابھرا۔ 11ویں اور 12ویں صدی میں، شمالی ہندوستان کے بڑے حصوں میں صوفیوں کی آمد ہوئی اور اتفاق سے 13ویں صدی میں دہلی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ تیرہویں صدی کے ہندوستان میں دو بڑے صوفی سلسلے، چشتی سلسلہ اور سہروردی سلسلہ بالترتیب دہلی/ہانسی اور ملتان میں پھیلے۔ عہد وسطیٰ کے میں ہمیں ایسے علمائے کرام نظر آتے ہیں جو قابل قدر سرکاری عہدوں پر فائز تھے اور انہوں نے کسی بھی ایسی مذہبی تحریک کی مخالفت کی جو ان کے بقول اسلام کی قدیم پاکیزگی کو چیلنج کرتی تھی۔ مغربی ایشیا کی طرح ہندوستان میں بھی شریعت اور طریقت (تصوف) کے حامیوں کے درمیان کشمکش دیکھنے میں آئی۔ دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ریاست سے وابستہ علماء کے سخت گیر طبقے نے ہندوستان میں شریعت کے نفاذ کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ تاہم، اس وقت کے سلاطین نے اس مطالبہ کو یہ کہتے ہوئے ٹال دیا کہ ہندوستانی ماحول میں شریعت کا نفاذ ناقابل عمل ہے جہاں لوگوں کی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور مسلمانوں کے پاس نہ تعداد تھی اور نہ وسائل۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے نامور مورخ مظفر عالم کے مطابق مغلوں کو مختلف نظریاتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے متنوع گروہوں کو راضی کرنے اور ان کو سمونے کی پیچیدہ صورت حال سے نمٹنا پڑا۔ مزید برآں، مظفر عالم کے مطابق، نچلی سطح سے اوپر آکر خود کی محنت اور ہمت سے حکمران بننے والے 13ویں صدی کے سلطانوں کے برعکس، مغل تیمور کی اولاد تھے۔ تیمور، سنی مسلم سلطنتوں کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک انتہائی اہم شخصیت تھی۔ وسطی ایشیا میں مغلوں کے آباؤاجداد اپنے خود کے مذہبی آقاؤں سے مانوس تھے یا انس رکھتے تھے اور یہ مذہبی آقا، مجازی شاہی پیروں کا کردار ادا کرتے تھے۔

سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندوستان میں، صوفی پہلے ہی مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کے کام کرنے کے مراکز مختلف تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ صوفیاء کے مختلف گروہوں میں روحانی مسابقت اور رقابت پائی جاتی تھی۔ یہ چپقلش خاص طور پر چشتی پیروکاروں اور نقشبندیوں میں بہت زیادہ نمایاں تھی۔ ابتدا میں جب مغلوں نے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا تو اس وقت بھی چشتی ہندوستان میں برتر مقام پر تھے۔ اکبر کے دور حکومت میں، چشتی سلسلے کو دوبارہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی بنیادی وجہ شیخ سلیم چشتی سے اس کی وابستگی تھی۔ اکبر وحدت الوجود کے عقیدہ سے متاثر تھا، اور اس کے زمانے کے بہت سے صوفی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

نقشبندی صوفی سلسلہ کی بنیاد خواجہ بہاؤالدین نقشبندی (1389-1317) نے ڈالی تھی۔ اس سلسلے کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ (1603-1563) نے متعارف کرایا۔ خواجہ باقی باللہ ایک سرکردہ شخصیت تھے جنہوں نے اکبر کی آزاد خیال مذہبی پالیسیوں کے خلاف تحریک چلائی۔ وہ دہلی میں آباد ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کے بہت سے امراء، ان کے شاگرد بن گئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نقشبندی مکتب فکر شروع سے ہی شریعت کی پابندی پر پختہ یقین رکھتا تھا اور بدعات کی مذمت کرتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے نے وحدت الوجود کے فلسفے کو چیلنج کیا۔

شیخ احمد سرہندی (1564-1624) نے وحدت الوجود کے تصور پر کڑی تنقید کی۔ آپ خواجہ باقی باللہ کے خاص مرید تھے۔ آپ نے صوفیاء کے ان تمام اعمال پر تنقید کی جنہیں آپ غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ اس طرح کے اعمال میں، جن کی مخالفت کی گئی، سماع اور اولیاء کے مقبروں کی زیارت بھی شامل تھی۔ انہوں نے ان رسومات اور تقاریب کی مذمت کی جو ہندوؤں سے ماخوذ تھیں لیکن مسلم ثقافت کا حصہ بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی قسم کے سماجی روابط برقرار رکھنے کے خلاف تھے۔ انہوں نے ہندوؤں پر جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے اور گائے کے ذبیحہ کو دوبارہ شروع کرنے کی پرزور وکالت کی۔ ان دونوں اعمال (جزیہ اور گائے کشی) پر اکبر نے پابندی لگادی تھی۔ وحدت الوجود کے عقیدہ کو رد کرتے ہوئے شیخ احمد سرہندی نے وحدت الشہود کے عقیدہ کی وکالت کی۔ وحدت الوجود کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی معروضی تجربہ نہیں بلکہ ایک موضوعی تجربہ ہے: صوفی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا جز ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ خوشی کی یہ کیفیت ایک عارضی تجربہ ہے جس میں انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نفس مکمل طور پر فنا ہو چکا ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ چونکہ خدا اور انسان کا رشتہ آقا اور غلام کا ہے اور چونکہ وحدت الوجود خالق اور مخلوق کے درمیان فرق کو ختم کر دیتا ہے، چنانچہ یہ (عقیدہ وحدت الوجود) مظاہر پرستی کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ صرف شریعت کے ذریعے سے ہی وجود ربانی کے اسرار کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مجدد (تجدید کرنے والا) کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے تصوف کے فلسفے کو راسخ العقیدہ اسلامی عقائد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ شیخ احمد سرہندی کا عقیدہ تھا کہ وہ مجدد ہیں اور انہیں خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ سنی راسخ العقیدہ کی شکل میں حقیقی ایمان بحال کریں۔ وہ شیعوں کو کافر سے بدتر سمجھتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کی جانب سے بھیجے گئے ہیں۔ ان کے اس دعویٰ پر بہت سے سخت گیر عناصر نے تنقید کی اور کہا کہ شیخ احمد سرہندی نے پیغمبر کے برابر درجہ کا دعویٰ کیا ہے۔ اس پر جہانگیر نے انہیں قید میں ڈال دیا۔

اکبر کے دور میں موجود دیگر سلسلوں میں سے ایک قادریہ سلسلہ بھی تھا۔ اس سلسلے کو شیخ عبدالقادر (و 1533) نے مشہور کیا جن کے بیٹے اکبر اور ابوالفضل کے قریبی حامی تھے۔ قادریہ سلسلہ وحدت الوجود کے عقیدہ پر یقین رکھتا تھا۔ قادریہ سلسلہ کے صوفیاء میں سے، جو سیاسی حلقوں میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے، میاں میر بھی تھے۔ دارا شکوہ اور جہاں آرا دونوں ہی میاں میر سے بیعت تھے۔ دارا شکوہ، ایک روشن خیال شہزادہ، اپنی فکر میں آزاد خیال تھا اور مذہبی تنوع کا بہت بڑا مداح تھا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف 'مجمع البحرین' میں ویدوں کو آسمانی کتابیں قرار دیا گیا ہے۔ راسخ العقیدگی والے عہد وسطیٰ کے دور میں جبکہ سخت گیر عناصر کا غلبہ تھا، اس طرح کا کوئی بھی خیال ایک بہت بڑا انقلابی بیان تھا۔

اورنگ زیب کے دور میں راسخ العقیدہ مذہبی مطالعات پر زیادہ زور دیا گیا۔ فتاویٰ عالمگیری کو علمائے کرام کے ایک گروپ نے ترتیب دیا تھا جس میں ہندوستان اور بیرون ملک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جاری ہونے والے فتاویٰ شامل ہیں۔ تاہم یہ خیال غلط ہے کہ وحدت الوجود کا تصور اورنگ زیب کے دور حکومت میں زوال پذیر ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اسلام کے آزاد خیال اور قدامت پسند (راسخ العقیدہ) دونوں عناصر حرکت میں تھے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مایہ ناز مورخ ستیش چندر استدلال کرتے ہیں کہ آزاد خیال قادریہ سلسلے کے مقابلے نقشبندی سلسلے کو راسخ العقیدہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، ایسی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ اپنے قول کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے شیخ

عبدالحق کی مثال پیش کی جو کہ قادریہ سلسلہ سے وابستہ تھے لیکن سوچ میں قدامت پسند تھے۔اسی طرح نقشبندی سے تعلق رکھنے والے مرزا مظہر جان جاناں کا خیال تھا کہ وید آسمانی کتابیں ہیں اور اسی لیے ہندو بھی اہل کتاب سے تعلق رکھتے ہیں۔

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مختلف علاقائی طاقتیں جیسے مراٹھے، جاٹ اور سکھ، بکھرتے مسلم اقتدار کے لیے ایک سنگین خطرہ بن گئے۔اب مذہبی طبقے خصوصاً علمائے کرام کی ریاستی سرپرستی ختم ہوگئی تھی اور اس بناپر ان کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔یہ احساس اس وقت بہت زیادہ ہوا جب نوآبادیاتی ریاست نے ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم کی۔اس پس منظر میں 18 ویں صدی میں مختلف احیائی تحریکیں ابھریں جو کہ مذہبی و سیاسی نوعیت کی تھیں ۔ شاہ ولی اللہ (62-1703) اسلامی احیا کی تحریکوں کی ایک اہم شخصیت کے طور پر ابھرے۔ تصوف پر ان کی گفتگو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان تصوراتی تعلق کو ہم آہنگ کرنے اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ان کا ماننا تھا کہ صوفی کا بنیادی مقصد روحانی حصول ہے اور 'وہ سب خدا کے وجود میں وجود کی حقیقت کو دیکھتے ہیں' (مظفر عالم، صفحہ 13)۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس پہلو میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ تخلیق شدہ دنیا کو پرتَو (مظہر) سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ انعکاس (ظل)۔ لہذا، ان دو گروہوں کے درمیان یہ فرق صرف 'تشریح اور تراکیب کے معاملات میں' ہے۔(مظفر عالم، ص 13)۔ان کی مذہبی فکر کا 18 ویں اور 19 ویں صدی کے مختلف مذہبی مصلحین اور احیاء پسندوں پر کافی اثر پڑا۔

16.7 مغل حکمران اور مذہب (Mughal Rulers and Religion)

مغل حکمرانوں کے مذہبی عقائد اور طرز عمل بحث کا ایک بڑا موضوع رہے ہیں۔ عام لوگوں کے ذہنوں میں ایک بڑی غلط فہمی نے اپنے قدم جما لیے ہیں اور اس کی ایک بڑی وجہ چند فرقہ پرست پروپیگنڈہ کرنے والے (دروغ گو لوگ) ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مغل حکمران اسلام کے راسخ العقیدہ (سخت گیر) پیروکار تھے اور اس وجہ سے انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو خاص طور پر ان کی عبادت گاہوں کو تباہ کر کے ان پر ظلم کیا۔ مغل حکمرانوں پر دیگر عقائد کے تئیں عدم رواداری کا الزام لگایا گیا۔ متعدد مشہور مورخین کا کہنا ہے کہ اس طرح کے الزامات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد بابر نے رکھی تھی۔ بابر پر الزام ہے کہ اس نے ایودھیا میں بھگوان سری رام کے مندر کو تباہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن کئی سرکردہ مورخین اس الزام کو قبول نہیں کرتے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بابر کے رویہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر گز مذہبی جنونی نہیں تھا۔ مثال کے طور پر، ایک بار بابر نے گوالیار قلعہ کے قریب جین کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔اس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ 'بتوں کے ستر والے حصے کو ڈھانپے بغیر انہیں بالکل برہنہ دکھایا گیا تھا... ویسے یہ کوئی بری جگہ نہیں ہے... بت اس جگہ کا عیب تھے۔ میں نے، اپنی جانب سے انہیں تباہ کرنے کا حکم دیا۔' کیا اس بات کی بابر کے مذہب کے تناظر میں وضاحت کی جاسکتی ہے؟ مورخ ابراہم ایرالی لکھتا ہے کہ بابر نے قریبی ہندو مندروں کا بھی دورہ کیا۔ لیکن اس نے مندروں میں موجود مورتیوں کو تباہ کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ایرالی کے مطابق، 'یہ بابر کے مذہبی جذبات نہیں بلکہ اس کی جمالیاتی حساسیت تھی جو جینی مجسموں سے مجروح ہوئی۔' اب بات بالکل واضح ہو گئی ہو گی۔ مزید برآں، ہمایوں کے نام بابر کی درج ذیل وصیت، بابر کی ہندوستانی عوام اور ان کی ثقافت کے تئیں فکرمندی اور احترام کی بہترین عکاس ہے:

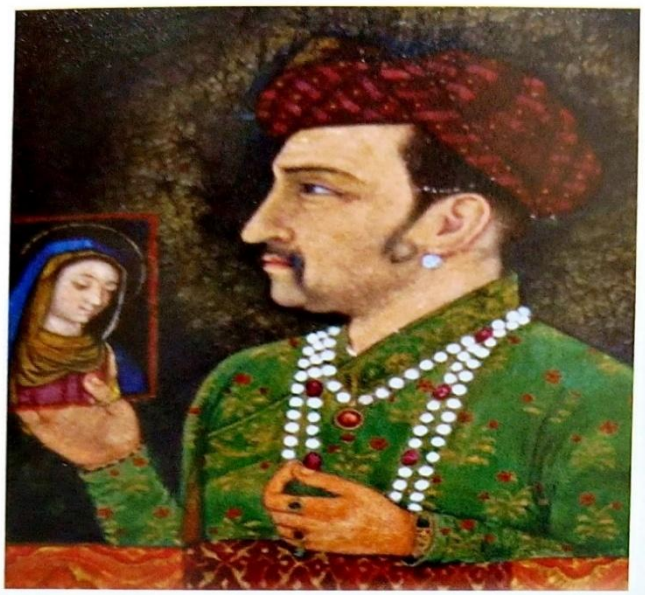
بیٹا! اس ملکِ ہندوستان کے مختلف مذاہب ہیں۔ اللہ کا شکر مناؤ کہ اس نے ہمیں یہ بادشاہت دی ہے۔ ہمیں اپنے دل سے تمام اختلافات کو نکال دینا چاہیے اور ہر برادری کے ساتھ اس کے رسم ورواج کے مطابق انصاف کرنا چاہیے۔ اس سرزمین کے لوگوں کے دل جیتنے اور انتظامیہ کے معاملات میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے گاؤکشی سے پرہیز کیا جائے۔ ہماری حکومت کی حدود میں آنے والی عبادت گاہوں اور مندروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ حکمرانی کا ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس کے تحت مملکت کے تمام لوگ بادشاہ سے خوش ہوں اور بادشاہ عوام سے خوش ہو۔ اسلام نیک اعمال سے ترقی کر سکتا ہے نہ کہ دہشت گردی سے۔ شیعہ اور سنی کے اختلافات کو نظرانداز کرو کیونکہ یہ اسلام کی کمزوری ہے۔ مختلف رسم ورواج کی پیروی کرنے والے لوگوں کو یکجا کر کے رکھو تاکہ اس مملکت کے جسم کا کوئی حصہ بیمار نہ ہو۔

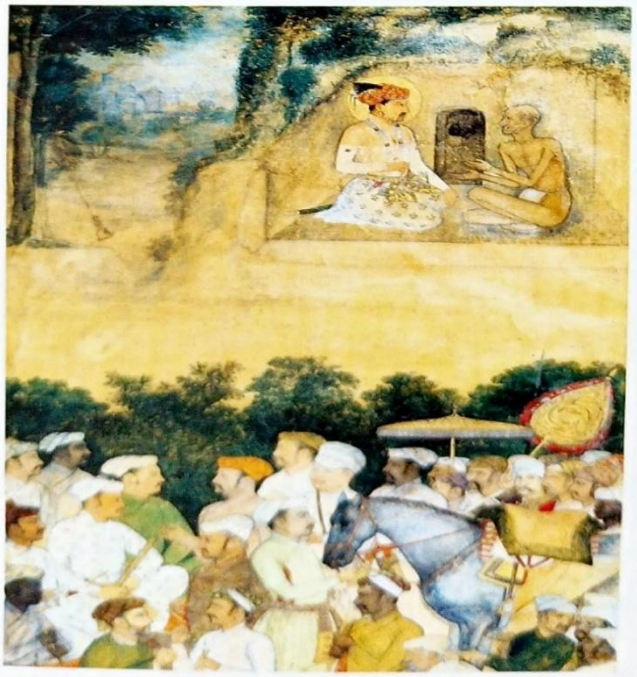
اس حقیقت کے باوجود کہ بابر اور اس کا بیٹا ہمایوں دونوں آزاد خیال سوچ کے حامل تھے، اپنی مختصر حکمرانی کی وجہ سے وہ ایک مضبوط مذہبی پالیسی تیار نہیں کر سکے۔ یہ بابر کا پوتا اکبر تھا جس کی قسمت میں ایسا کرنا لکھا تھا۔ اکبر اپنے دورِ حکومت کے آغاز سے ہی کھلے ذہن کا انسان تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے سیکولر خیالات 1580 کے آس پاس واضح طور پر سامنے آئے۔ اکبر کا دوسرے مذاہب اور اپنے مذہبی عقائد کے تئیں احترام اس قدر مضبوطی سے ہم آہنگ تھا کہ کٹر عبدالقادر بدایونی اور کرسچن جیسوئٹس بھی اسے مسلمان نہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے۔ اکبر چشتی صوفیاء کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ 1560 کی دہائی میں چشتیوں نے اسے ایک آزاد طریقۂ فکر سے متعارف کرایا۔ اکبر خواجہ معین الدین چشتی کا بہت احترام کرتا تھا اور وہ شیخ سلیم چشتی کے بھی بہت قریب تھا جن کے لیے اس نے سیکری میں شاندار آستانہ اور مسجد کے ساتھ ایک وسیع محل تعمیر کروایا۔ اکبر کو بعد میں چشتی صوفیاء نے فنا اور وحدت الوجود کے تصور سے متعارف کروایا۔

اکبر اپنی صلح کل مذہبی پالیسی کے لیے جانا جاتا ہے جس کا مطلب سب کے ساتھ امن وآشتی سے رہنا ہے۔ اکبر نے یہ پالیسی اپنے متنوع عوام کے درمیان رواداری اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اختیار کی تھی۔ اس نے 1575 میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ قائم کیا۔ ابتدا میں اس نے یہاں پر صرف سنی مسلمانوں کو ہی بحث کے لیے مدعو کیا۔ لیکن 1578 سے، اس نے بین المذاہب مکالمے کی راہ ہموار کرتے ہوئے ہندومت، جین مت، عیسائیت، یہودیت، زرتشتی جیسے مختلف مذاہب کے مذہبی علما کو مدعو کیا۔ یہاں اکبر نے مختلف مذہبی نقاط نظر کا گہرا فہم حاصل کیا۔ اکبر بعض علما کے رویے سے بہت مایوس ہو گیا تھا جو ہمیشہ مذہبی مسائل پر جھگڑتے رہتے تھے۔ اکبر نے ایک 'معصوم عن الخطا حکم نامہ' جاری کیا اور خود کو مجدد قرار دے دیا۔ اس حکم نامے نے مذہبی قانون کی تشریح اور اطلاق کے تمام اختیارات علمائے کرام کے ہاتھوں سے چھین کر بادشاہ کو منتقل کر دیے۔ پروفیسر عزیز احمد کے بقول یہ فرمان قرآن پاک کے اصول اور سنت نبوی پر مبنی تھا۔ یہ اجتہاد کے اسلامی اصول کے مطابق انفرادی استنباط پر مبنی تھا۔ اس حکم نامے میں اعلان کیا گیا کہ بادشاہ کا حکم سب پر لازم ہو گا بشرطیکہ اس سے قرآن کریم کی کسی آیت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ بعض علماء کی رائے تھی کہ اکبر کے فرمان کا مقصد علمائے کرام کی طاقت پر لگام لگانا تھا۔

1581 میں، اکبر نے اپنے نئے دین، دینِ الٰہی کا اعلان کیا جس نے تعقل کو مذہب کے فہم کی بنیاد بنایا۔ اس کے تحت دھوکہ دہی، بہتان، ظلم، ڈرانے دھمکانے، شہوت پرستی، حرص وہوس اور غبن ممنوع تھے۔ یہ تمام احکام اسلام اور دیگر مذاہب میں مشترک تھے۔ اکبر نے اس فہرست میں جینوں کے اس عقیدہ کو بھی شامل کیا جس کے تحت وہ کسی جاندار کو ہلاک نہیں کرتے تھے اور انتہائی تجرد (celibacy) کے

عیسائی تصور کو بھی شامل کیا۔اس میں پروہتوں یا پجاریوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔پروفیسر عزیز احمد استدلال کرتے ہیں کہ 'نہ تو روشنی، سورج اور آگ کے ساتھ وابستگی اور نہ ہی اس کے عبادات یا رسوم کے اصولوں میں کوئی ایسی چیز تھی جو دینِ الٰہی کو اسلام میں موجود دیگر متفرق بدعتوں سے





Top: Jahangir holding a picture of the Madonna, c. 1620. This is one of the best-known portraits of Jahangir, whose court was replete with paintings of Hindu deities and Christian iconography. European visitors, accustomed to sectarian strife back home, were amazed by Jahangir's eclecticism and the religious freedom of his empire.

Bottom: Jahangir converses with Jadrup Gosain, c. 1620. Jahangir met the Hindu ascetic Jadrup when passing through Ujjain on his way to spur Khurram's first campaign in the Deccan. He went to the ascetic's cave twice and for three hours each time. The ascetic appears many times in Jahangir's memoirs thereafter, often because the emperor had a 'great yearning' or 'another overwhelming desire' to meet him. Jahangir always returned from these conversations strangely elated. 'Without exaggeration,' he once wrote, 'it was hard for me to part from him.'

National Museum, New Delhi / Wikimedia Commons

Musée Guimet, Paris / Wikimedia Commons

Source: Parvati Sharma, *Jahangir: An Intimate Portrait of a Great Mughal*, Juggernaut, New Delhi, 2018.

مختلف زمرے میں رکھ سکتی تھی۔'اس مذہبی تجربے پر اکبر کو ان کے بہت سے ہم عصروں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر تھا اور وہ انہیں اپنے خاطر اختیار کرنے سے نہیں ہچکچایا۔مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ راجپوت شہزادیوں سے شادیوں نے اکبر کی کی شخصیت کو بہت متاثر کیا۔ابوالفضل کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ اکبر گھر میں اور سفر کے دوران دونوں جگہ گنگا کا پانی پیتا تھا۔

آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندو گنگا کے پانی کو مقدس مانتے ہیں۔ نسرین لکھتی ہیں کہ 'یہ پانی اس کے لیے مہر بند برتنوں میں لایا جاتا تھا۔ بارش کے پانی یا جمنا یا چناب کے پانی میں کھانا پکایا جاسکتا تھا لیکن اس میں گنگا کا تھوڑا سا پانی ضرور ملایا جاتا'۔ بلاشبہ، اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کو بہتر طور پر سمجھنے اور فارسی بولنے والی دنیا میں اس کی تفہیم کو مقبول بنانے کے لیے، اکبر نے 1573 میں 'مکتب خانہ' (ترجمہ بیورو) قائم کیا۔ اس کے زمانے میں بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنگھاسن بتیسی (نامہ خرد افزا)، اتھروید (اتھربن)، مہابھارت (رزم نامہ)، رامائن، ہری ونش پران (ہری بن)، لیلاوتی (بھاسکراچاریہ کی 1150 میں لکھی گئی ریاضی کی تصنیف)، تاجک انیل کنتھی (تاجک؛ فلکیات پر ایک تصنیف)، راج ترنگنی (کلہن کی تصنیف کردہ کشمیر کی تاریخ)، پنچ تنتر (جانوروں کی کہانیوں کے توسط سے حکمت کے اسباق) وغیرہ ان میں سے چند تصنیفات تھیں جن کا ترجمہ کیا گیا۔ ابوالفضل کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستانی ثقافت کا مطالعہ نہیں کیا کیونکہ انہیں وراثت میں ملی روایت نے آزادی سے چھان بین کی اجازت نہیں دی۔ 'کیوں' اور 'کس طرح' یہ پوچھنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں تعقل واستدلال کے دروازے دوبارہ کھل گئے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

اکبر کے جانشینوں، جہانگیر اور شاہ جہاں نے اکبر کی مذہبی ہم آہنگی کی پالیسی کو جاری رکھا۔ جہانگیر مذہب کے معاملے میں بھی، اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اس نے اکبر کی 'صلح کل' کی پالیسی میں 'انصاف' کا عنصر شامل کیا۔ اس نے ایک زنجیرِ عدل نصب کرنے کا حکم دیا جو کہ خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے مذہبی عقائد اور عادات اس کے والد کے مشابہ تھے اور اس حقیقت کو ان کے زمانے کے عیسائی مشنریوں نے پوری طرح تسلیم کیا اور انہیں ریکارڈ کیا۔ فادر رڈولفو ایکواویوا (Ridolfo Aquawiva) جہانگیر کے ذاتی دوست تھے۔ اسلامی تہواروں اور فارسی نوروز کے ساتھ ساتھ، اس نے کئی ہندو تہوار منائے جیسے ہولی، دسہرہ، دیوالی، رکشا بندھن (راکھی) اور شیوارتری۔ شیوارتری کے موقع پر، وہ ہندو یوگیوں کے ساتھ بات چیت کرتا اور دسہرہ کے تہوار کے دوران گھوڑوں کو سجایا جاتا اور ان کی پریڈ کروائی جاتی۔ برہمن اس کی کلائیوں پر راکھی باندھتے تھے۔ وہ اس قدر وسیع النظر تھا کہ ایک بار جب راکھی اور شب برات دونوں ایک ہی دن آئے تو بے حد خوش جہانگیر نے اس دن کو مبارک شنبہ (خوش قسمتی کا دن) قرار دیا۔ اپنے والد ہی کی طرح، جہانگیر نے سرکاری تقریروں کے معاملے میں ہندوؤں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کیا گیا۔ مسلمان افسروں کو ہندوؤں کو زبردستی اسلام قبول کروانے سے منع کیا گیا تھا۔ جہانگیر کو ہندو یوگی، جدروپ گوسائیں سے بہت عقیدت تھی، جسے اس نے پہلے 1616 میں اجین میں اور بعد میں متھرا میں دیکھا۔ اس نے کبھی یوگی کو اپنے پاس نہیں بلایا بلکہ خود ان سے ملنے جاتا تھا، جو کہ یوگی کے تعظیم کی ایک بڑی علامت تھی۔ جہانگیر جدروپ گوسائیں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کو، اکتساب کے بہترین مواقع اور خوش نصیبی اور خالص خوشی کے مواقع سمجھتا تھا۔ غیر معمولی مذہبی طرز عمل کے ان تمام شاندار ریکارڈوں کے باوجود، جہانگیر کے دامن پر ایک انمٹ داغ پڑ ہی گیا اور یہ داغ سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن سنگھ کا قتل تھا۔ جب اس کے بیٹے خسرو نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تو گرو نے اسے آشیر واد دیا۔ اس عمل سے مشتعل ہو کر جہانگیر نے گرو کے قتل کا فرمان جاری کیا۔ فرحت نسرین بتاتی ہیں کہ 'جہانگیر کے لیے مسئلہ مذہب کا نہیں، بغاوت کا تھا۔' تاہم،

افسوسناک بات یہ ہے کہ سیاسی غنڈہ گردی اور تشدد کی کارروائیوں کو اکثر مذہبی رنگ دیا جاتا ہے، اور یہ رنگ پھیکا ہی نہیں پڑ رہا ہے بلکہ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم، مذہبی وسیع النظری کے لحاظ سے، مغل دور کی سب سے نمایاں شخصیت دارا شکوہ کی تھی۔ وہ اتنا آزاد خیال مذہبی شخص تھا کہ اس پر مرتد ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس کے بھائی اورنگزیب نے اسے قتل کر دیا۔ دارا، اکبر سے کیسے الگ تھا؟ فارسی بولنے والی دنیا کو ہندو فلسفے سے واقف کروانے کے لیے، اکبر نے ہندو مذہبی متون کے مطالعہ کا کام شروع کروایا، جب کہ دارا نے خود اس کام کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجے میں متعدد فلسفیانہ تصنیفات تیار ہوئیں جو اس کے 'صوفیانہ اور سیکولر رجحانات' کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس نے 'سفینۃ الاولیا'، 'سکینۃ الاولیا'، 'رسالہ حق نما'، 'حسنات العارفین'، 'مجمع البحرین'، 'سرِّ اکبر' وغیرہ کتابیں لکھیں۔ مؤخر الذکر اُپنِشَد کے تقریباً پچاس ابواب کا ترجمہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ دارا کے مطابق ہندومت نے توحید کی نفی نہیں کی۔ وہ اس خیال کا حامی تھا کہ اسلام اور ہندومت دو متوازی خطوط ہیں۔ مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ 'اس کی تصنیفات کو پڑھنے سے واضح طور پر عقائد کے تمام نظاموں کے لیے اس کا احترام ظاہر ہوتا ہے۔ دارا شاید ایک ایسی سلطنت کے لیے ایک مثالی بادشاہ تھا جو مذہب، زبان اور ثقافت کے تنوع سے بھری ہوئی تھی۔' اپنے مضمون 'Socio-Cultural Interactions in India: Does Contemporary India Disrespect Its Past?' میں پروفیسر عبدالرحیم پی۔ وجاپور دارا شکوہ کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> اس کلاسیکی تصنیف [مجمع البحرین] میں دارا شکوہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندو رہبانیت اور صوفی مسلک کے دقیق عناصر کو دونوں مذاہب کے بہترین لوگوں کے ذریعے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے اسلامی صوفی نظریات کا ہندو رہبانیت کے نظریات کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ 'وہ ایک دوسرے کے مماثل ہیں'۔ مذہب سے متعلق اپنی گفتگو کے دوران دارا نے حریت پسندی کی روح کو عہد وسطی کی ہندوستانی زندگی میں سرایت کرنے کی کوشش کی اور ہندوستانی فکر کے افق کو وسیع کیا۔

تمام مغل حکمرانوں میں اورنگزیب، بالخصوص اپنے سخت گیر سمجھے جانے والے مذہبی عقائد کی بنا پر، سب سے زیادہ متنازعہ شخصیت ہے۔ آپ اس کی تفصیلات اورنگ زیب پر لکھی گئی اکائی میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں ہم مورخ فرحت نسرین کے الفاظ میں اس کی مذہبی پالیسی کا خلاصہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ انہیں کتنا کٹر مذہبی بتایا جاتا ہے یا وہ کتنے کٹر مذہبی تھے۔ انہوں نے سیکولر انداز میں اتنے فیصلے لیے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تخت پر اپنی حیثیت محفوظ ہو جانے کے بعد وہ مذہب کو سیاست کے ساتھ ملانا نہیں چاہتے تھے۔ ان سے اکثر اس بنیاد پر نفرت کی جاتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن جن لوگوں کو انہوں نے انتہائی بے رحمی سے کچلا وہ درحقیقت مسلمان تھے — بالکل ان ہی کی طرح اور ان ہی کے عقیدے کے حامل — ان کا اپنا خون۔ مذہب نے ان کی فوجوں کی راہنمائی نہیں کی۔ ان کے لیے ان گنت غیر مسلموں نے کام کیا اور ان کی فوج میں خدمات انجام دیں۔ جانشینی کی جنگ کے دوران بھی 1000 ہزاری منصب سے اوپر کے راجپوت امرا میں سے 23 اورنگ زیب کی حمایت کر رہے تھے اور 24 دارا کی حمایت میں تھے۔...اورنگ زیب نے زور دے کر کہا کہ وہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے بادشاہ ہیں، اور انہوں نے دونوں کے لیے یکساں طور پر کام کیا۔ ایک ہندو نجومی ایشور داس نے 1663 میں سنسکرت میں لکھا کہ اورنگ زیب دھرمیہ (صالح) تھے اور ان کی پالیسیاں وِودھیوت (قانونی) تھیں۔

16.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کے لوگوں کی مذہبی اور روحانی زندگی کو سمجھ چکے ہوں گے۔ آپ عہد وسطیٰ کے ہندوستانیوں کے سماجی مذہبی اور ثقافتی ماحول کو مالا مال کرنے میں بھکتی اور صوفی تحریکات کی متعدد حصہ داریوں کو جان چکے ہونگے۔ آپ سکھ مذہب کے ابھرنے اور سکھ مذہب کے بانی گرونانک کی تعلیمات سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ آپ مغل حکمرانوں کے مذہبی افکار اور اعمال کو سمجھ چکے ہوں گے جن کے ان کی سیاست اور اسی طرح وسیع سماج پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس کائی نے آپ کو یہ سمجھنے کے لائق بنادیا ہوگا کہ عہد وسطی کا ہندوستانی سماج ایک فرقہ وارانہ سماج نہیں تھا جیسا کہ غلط طور پر متعدد لوگ محسوس کرتے ہیں۔ آپ اس بات کا اعتراف کر پائیں گے کہ مذہبی منافرت پر مبنی ایک فرقہ وارانہ سماج ہونے کے برعکس عہد وسطی کا ہندوستانی سماج مشترکہ مذہبی اطوار اور روحانی تجربات کے عناصر سے بھرپور تھا۔

16.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

سگن بھکتی	:	صفات یا شکل کے ساتھ خدا کی عبادت کرنا
نرگن بھکتی	:	بے شکل خدا کی عبادت کرنا
سماع	:	صوفی موسیقی کی محفل
سنگت	:	تنظیم

16.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سکھ مت کے بانی کون ہیں؟

(الف) گروارجن دیو (ب) گرو گوبند سنگھ (ج) گرونانک (د) گرو تیغ بہادر

2. رام چرت مانس کس بھکتی سنت نے لکھی تھی؟

(الف) کبیر (ب) تلسی داس (ج) سورداس (د) روی داس

3. ہندوستان میں صوفیوں کے 'نقشبندی سلسلہ' کو کس نے متعارف کرایا؟

(الف) خواجہ معین الدین چشتی (ب) شیخ بہاؤالدین زکریا (ج) خواجہ باقی باللہ (د) شیخ احمد سرہندی

4. 'صلح کل' (سب کے ساتھ امن) کی پالیسی کس نے متعارف کرائی؟

(الف) شیر شاہ (ب) اکبر (ج) جہانگیر (د) داراشکوہ

5. بے شکل اور بے صفات خدا کی پوجا کرنے والی بھکتی روایت کیا کہلاتی ہے؟

(الف) سگن بھکتی (ب) نرگن بھکتی (ج) ویدانت (د) شرمن

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بھکتی تحریک میں نام دیو کے کردار پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. نقشبندی صوفی سلسلہ پر ایک نوٹ لکھیں۔
3. داراشکوہ پر ایک نوٹ لکھیں۔

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستانی مغل حکمرانوں کے مذہبی نظریات اور اعمال پر ایک مضمون لکھیں۔
2. کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ فرقہ واریت کا ذمہ دار مذہب ہی ہے؟ اگر، ہاں/نہیں، تو کیوں اور کیسے؟

جوابات: 1-(ج), 2-(ب), 3-(ج), 4-(ب), 5-(ب)

Suggested Learning Resources

1. Alam, Muzafar, *The Mughals and the Sufis: Islam and Political Imagination in India 1500-1750*, Permanent Black in association with Ashoka University, Ranikhet, 2022.
2. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State, 1526 – 1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1998).
3. Aquil, Raziuddin, *Sufism Culture and Politics: Afghans and Islam in Medieval North India*, Oxford University Press, 2007.
4. Asher, Catherine B., *Architecture of Mughal India*, Cambridge University Press, 1992.
5. _____, Catherine B. and Cynthia Talbot, *India Before Europe*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006.
6. Ashraf, K.M., *Life and Conditions of the People of Hindustan*.
7. Athar Ali, M., *Mughal India: Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. 2006).
8. _____, M., *The Mughal Nobility under Aurangzeb*, Oxford University Press, New Delhi, 2001.
9. Azizuddin Husain, S.M., *Structure of Politics Under Aurangzeb, 1658-1707*, Kanishka Publishers Distributors, New Delhi, 2002.
10. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
11. Berinstain, Valerie, *Mughal India: Splendours of the Peacock Throne*, Thames and Hudson, London, 1998.
12. Bhargava, Meena, *Understanding Mughal India: Sixteenth to Eighteenth Centuries*, Orient Blackswan, New Delhi, 2020.
13. Bhatt, Rajendra Shankar, *Maharana Pratap*, (trans. Shubhankar Mishra), National Book Trust, India, 2004 (first pub. 1967).
14. Brown, Percy, *Indian Architecture: Islamic Period*, CBS Publishers & Distributors, 2018.
15. Champakalashmi, R., *Religion, Tradition and Ideology: Pre-Colonial South India*, Oxford University Press, New Delhi, 2011.
16. Chand, Tara, *Influence of Islam on Indian Culture*, LG Publishers, New Delhi, 2018 (first pub. 1963).
17. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
18. Chandra, Satish, *Essays on Medieval Indian History*, Oxford University Press, New Delhi, 2003.
19. _____, Satish, *History of Medieval India: 800-1700*, Orient Longman, New Delhi, 2007.
20. _____, Satish, *Medieval India: From Sultanate to the Mughal Empire (1526-1748), Part 2*, Har-Anand Publication, New Delhi, 2004.
21. Dale, Stephen Frederick, *Babur: Timurid Prince and Mughal Emperor, 1483-1530*, Cambridge University Press, New Delhi, 2018.
22. Dalrymple, William, *The Anarchy: The East India Company, Corporate Violence, and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
23. Day, U.N., *The Mughal Government*, Delhi, 1970.
24. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
25. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
26. Eaton, Richard M., *India in the Persianate Age (1000-1765)*, Penguin Books, New Delhi, 2020.

27. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne: The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
28. Farooqui, Salma Ahmed, *Islam and the Mughal State*, Sundeep Prakashan, New Delhi, 2005.
29. Freedman, Paul, *Out of the East: Spices and the Medieval Imagination*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2008.
30. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India: A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
31. Gascoigne, Bamber, *A Brief History of the Great Mughals, India's Most Flamboyant Rulers*, Robinson, London, 2002.
32. Gordon, Stewart, *Marathas, Marauders and State Formation in Eighteenth-Century India*, OUP, New Delhi, 1994.
33. _____, Stewart, *The Marathas, 1600-1818*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005 (first pub. 1998).
34. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1997).
35. _____, Irfan, *Agrarian System of Mughal Empire, 1526-1707*, Oxford University Press, New Delhi, 2013.
36. _____, Irfan, 'Caste in Indian History', in *Essays in Indian History: Towards a Marxist Perception*.
37. _____, Irfan, 'Kabir: The Historical Setting', in *Religion in Indian History*.
38. _____, Irfan, *Medieval India: The Study of a Civilization*, National Book Trust, New Delhi, 2008.
39. _____, Irfan and Tapan Raychaudhuri eds., *The Cambridge Economic History of India, Vol. 1*, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
40. Hardas, Balshastri, *Chatrapati Shivaji, Vols. 1-4*, Kale Prakashan, Pune, 1984.
41. Hooja, Reema, *Maharana Pratap: The Invincible Warrior*, Juggernaut, New Delhi, 2018.
42. Hussain, Syed Ejaz, *The Bengal Sultanate: Politics, Economy and Coins, (A.D. 1205-1576)*, Manohar, New Delhi, 2003.
43. Ibne-Hasan, *The Central Structure of the Mughal empire*, London, 1936.
44. Kadam, V.S., *Maratha Confederacy (A Study in its Origin and Development)*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1993.
45. Karandikar, S.L., *Rise and Fall of the Maratha Power*, S.S. Karandikar, Pune, 1969.
46. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black and Ashoka University, Ranikhet, 2016.
47. Koch, Ebba, *Mughal Architecture: An Outline of its Hist*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1998).
48. Kulke, Herman, *History of Precolonial India: Issues and Debates*, Oxford University Press, 2018.
49. Lal, Ruby, *Domesticity and Power in the Mughal World*.
50. Majumdar, R.C. and V.G. Dighe eds., *Maratha Supremacy*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1977.
51. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India, Vol. II. (1526-1707): Mughal Empire*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1996 (first pub. 1981).
52. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
53. Moosvi, Shireen, *The Economic History of the Mughal Empire, c. 1595*, Oxford University Press, New Delhi, 2015.
54. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb: A Study in Indian Economic History*, Manohar,

New Delhi, 2022 (first pub. 1923).
55. Mukhia, Harbans, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2005.
56. Mukhoty, Ira, *Akbar: The Great Mughal*, Aleph, New Delhi, 2020.
57. Nadkarni, R.V., *Rise and Fall of the Maratha Empire*, Popular Prakashan, Bombay, 1966.
58. Nasreen, Farhat, *If History has Taught Us Anything*, Rupa, New Delhi, 2019.
59. _____, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
60. Nath, R., *Private Life of the Mughals of India (1526-1803 A.D.)*, Rupa & Co., New Delhi, 2005.
61. Pande, Rekha, 'The Bhakti Movement: An Interpretation', in *Proceedings of the Indian History Congress*, 1987, pp. 214-221.
62. Pearson, M.N., *The Portuguese in India: The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006 (first pub. 1987).
63. Pollock, Sheldon ed., *Literary Cultures in History: Reconstruction from South Asia*, University of California Press, Berkeley, 2003.
64. Prasad, Beni, *History of Jahangir*, Allahabad, 1930.
65. Puniyani, Ram, *Communal Politics: Facts versus Myths*, Sage, New Delhi, 2003.
66. Qureshi, I.H., *The Administration of the Mughal Empire*, Patna, 1979.
67. Raghavan, T.C.A., *Attendant Lords: Bairam Khan and Abdur Rahim, Courtiers and Poets in Mughal India*, Harper Collins, Noida, 2017.
68. Ranade, M.G., *Rise of the Maratha Power*, Bombay University, Bombay, 1963 (first pub. 1900).
69. Richards, John F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, Cambridge, 1993.
70. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That was India, Part II*, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. 1987).
71. Robinson, Francis, *The Mughal Emperors and the Islamic Dynasties of India, Iran and Central Asia*, Thames and Hudson, London, 2007.
72. Roy, Tirthankar, *The East India Company: The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
73. Sarkar, J.N., *The Mughal Administration*, Calcutta, 1935.
74. Sarkar, Jadunath, *A Short History of Aurangzib*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2009.
75. Sen, Surendranath, *Administrative System of the Marathas*, K.P. Bagchi, Calcutta, 1976.
76. Sewell, Robert, *A Forgotten Empire Vijayanagar a Contribution to the History of India*, Seltzer Books, 2018.
77. Sharma, Manimugdha S., *Allahu Akbar: Understanding the Great Mughal in Today's India*, Bloomsbury, New Delhi, 2019.
78. Sharma, Parvati, *Akbar of Hindustan*, Juggernaut, New Delhi, 2022.
79. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal Empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.
80. Streusand, Douglas E., *Islamic Gunpowder Empires: Ottomans, Safavids, and Mughals*, Westview Press, 2011.
81. Subramanian, Lakshmi, *History of India, 1707-1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
82. Thackston, W.M., *The Baburnama: Memoirs of Babur, Prince and Emperor*, Random House Publishing, New Delhi, 2002.
83. Thapar, Romila, 'Imagined Religious Communities? Ancient History and the Modern Search for a Hindu Identity', *Modern Asian Studies*, 23, No. 2, (Fall: 1989): 209-231.
84. _____, Romila, *The Penguin History of Early India: From the Origins to AD 1300*, Penguin Books, New Delhi, 2002.
85. Tripathi, R.P., *Rise and Fall of the Mughal Empire*, Central Book Depot, Allahabad, 1956.

86. Truschke, Audrey, *Aurangzeb: The Man and the Myth*, Penguin Books, New Delhi, 2018.
87. _____, Audrey, *Culture of Encounters: Sanskrit in the Mughal Court*, Penguin Books, 2016.
88. Vijapur, Abdulrahim P., 'Socio-Cultural Interactions in India: Does Contemporary India Disrespect Its Past?', *Ars Artium: An International Refereed Research Journal of English Studies and Culture*, Vol.11, January 2023, pp. 122-142.
89. Wilson, Jon, *India Conquered: Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

90. احمد، پروفیسر عزیز، ہندوپاک میں اسلامی کلچر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1991۔
91. احمد، ڈاکٹر شبیر، عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں، لکھنؤ، 1982۔
92. تاراچند، ڈاکٹر، دی انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر، انڈین پریس، الٰہ آباد، 1926۔
93. ترپاٹھی، آر پی، مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
94. جعفر، ایس ایم، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1980۔
95. چندر، ستیش، عہد وسطیٰ کا ہندوستان: دہلی سلطنت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
96. حبیب، عرفان، میڈیول انڈیا۔ دی اسٹڈی آف سویلائزیشن، نئی دہلی۔
97. حسین، سید محمد عزیز الدین، تاریخ عہد وسطیٰ۔
98. سروانی، عباس خاں، تاریخ شیر شاہی، (مترجم: مظہر علی خاں ولا)، سلمان اکیڈمی حق نشان، کراچی، 1963، معاون: ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد۔
99. یٰسین، ڈاکٹر محمد، ہندوستان کے عہد مغلیہ کی سماجی تاریخ، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 1998۔
100. _____، پروفیسر، مغل عہد کی سماجی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

نمونہ پرچہ امتحان

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

بی۔اے۔(آنرس) تاریخ، چوتھا سمسٹر

تاریخ ہندوستان (1526 تا 1707 عیسوی)

DSC 3, History of India (1526 –1707 CE)

Paper Code: BNHS401DCT

وقت: تین گھنٹے Time: 3 hours **نشانات** :Marks 70

ہدایات:

یہ پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1. حصہ اول کے تمام سوالات لازمی ہیں۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)
2. حصہ دوم میں 08 سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔(5x6=30 Marks)
3. حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی 03 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال: 1

i سکندر لودی نے زمین کی پیمائش کے لیے کون سا نیا پیمانہ رائج کیا تھا؟

(الف) گزِ سکندری (ب) جریب (ج) بیگھہ (د) طناب

ii وجے نگر کی فوج کا سپہ سالار رام رائے کس جنگ میں مارا گیا تھا؟

(الف) کھانوا (ب) چوسا (ج) تالی کوٹا (د) پانی پت

iii پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر کی فتح کا ایک اہم سبب کون سی جنگی تدبیر تھی؟

(الف) چھاپہ مار جنگ (ب) تلوغمہ اور رومی (ج) خندق کی کھدائی (د) بحری جنگ

iv 1540ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو کس مقام پر فیصلہ کن شکست دی؟

(الف) قنوج/بلگرام (ب) چوسا (ج) پانی پت (د) سرہند

v شیر شاہ کے مالگزاری نظام میں اوسط پیداوار کا کتنا حصہ ریاست کے مطالبے کے طور پر لیا جاتا تھا؟

(الف) نصف (ب) ایک چوتھائی (ج) ایک تہائی (د) پانچواں حصہ

vi شیر شاہ کے صوبائی نظم و نسق میں دیوانی مقدمات اور مالگزاری کے معاملات دیکھنے والا افسر کیا کہلاتا تھا؟

(الف) شقدار شقداران (ب) منصف مصنفان (ج) کوتوال (د) قاضی

vii اکبر کے قائم کردہ 'دین الٰہی' کو قبول کرنے والا واحد ہندو رکن کون تھا؟

(الف)راجہ مان سنگھ (ب)راجہ ٹوڈر مل (ج)راجہ بیر بل (د)راجہ بھگوان داس

viii ہلدی گھاٹی کی جنگ میں اکبر کی مغل فوج اور کس راجپوت حکمران کے درمیان مقابلہ ہوا تھا؟

(الف)رانا سانگا (ب)راؤ مالدیو (ج)رانا پرتاپ (د)جئے مل

ix جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد عوام اور سلطنت کے لیے کتنے اعلانات (دستور العمل) جاری کیے؟

(الف)آٹھ (ب)دس (ج)بارہ (د)پندرہ

x دکن میں مغلوں کی پیش قدمی کو روکنے والا اور گوریلا جنگ کا ماہر نظام شاہی وزیر کون تھا؟

(الف)چاند بی بی (ب)ملک عنبر (ج)میاں منجھو (د)راجو دکنی

حصہ دوم

2. محمود بیگڑا کے عدل و انصاف، مسافروں اور طلباء کے لیے کیے گئے فلاحی کاموں کا مختصراً ذکر کریں۔
3. پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح میں بارود اور جنگی تدابیر کے کردار کو مختصر طور پر بیان کریں۔
4. ہمایوں کی ناکامی اور اس کے خلاف شیر شاہ کی کامیابی کے کیا اسباب تھے؟
5. شیر شاہ کے دور میں 'سرکار' اور 'پرگنہ' کے انتظامی ڈھانچے کی مختصر وضاحت کریں۔
6. اکبر کے قائم کردہ 'عبادت خانہ' کا بنیادی مقصد اور اس میں ہونے والے مباحث کی نوعیت کیا تھی؟
7. اکبر اور رانا پرتاپ کے درمیان تنازعے کی نوعیت کیا تھی اور کیا یہ ایک مذہبی جنگ تھی؟
8. شہنشاہ جہانگیر کے 'دستور العمل' (بارہ اعلانات) کے چند اہم نکات تحریر کریں۔
9. ملک عنبر کون تھا اور اس نے دکن میں مغلوں کے خلاف کس قسم کی جنگی حکمت عملی اپنائی؟

حصہ سوم

10. سولہویں صدی میں بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان، دکن، گجرات اور بنگال کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیں۔
11. ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام میں بابر کی جنگی حکمت عملیوں، خاص طور پر پانی پت اور کھانوا کی جنگوں کا تفصیلی تجزیہ کریں۔
12. شیر شاہ سوری کے زمینی مالگزاری نظام، عدل و انصاف اور رفاہ عامہ کے کاموں پر ایک جامع مضمون لکھیں۔
13. اکبر کی توسیع پسندانہ پالیسی، راجپوتوں کے ساتھ اس کے تعلقات اور مغل سلطنت کے استحکام میں اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔
14. دکن میں مغلوں کی پالیسی، احمد نگر سے جنگ، جہانگیر کی مشکلات اور ملک عنبر کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیں۔

اہم نکات

اہم نکات